عقیدۂ توحید و عدل پر گراں قدر تصنیف

خزینۂ ایمانیہ

ترجمہ: حدیقۂ سلطانیہ

اکمل المحققین، فخر المتفقہین، افضل المتکلمین

آیۃ اللہ العظمیٰ

السیّد حسین علیین مکان

آل غفران مآب اعلی اللہ مقامہ

(لکھنؤ)

ترجمہ مع توضیحات و تشریحات

سیّد المحققین، عمدۃ الموحدین، استاذ العلماء

حضرت علاّمہ السیّد گلاب علی شاہ نقوی

مؤسس اعلیٰ، جامعہ عربیہ مخزن العلوم الجعفریہ شیعہ میانی ملتان

نظر ثانی و تصحیح

سیّد العلماء رئیس الواعظین محسن ملّت

علاّمہ سیّد محمّد تقی نقوی (حفظہ اللہ تعالیٰ)

جامعہ عربیہ مخزن العلوم الجعفریہ شیعہ میانی ملتان

عقیدۂ توحید و عدل پر گراں قدر تصنیف

خزینۂ ایمانیہ

ترجمہ: حدیقۂ سلطانیہ

اکمل المحققین، فخر المتفقہین، افضل المتکلمین

آیۃ اللہ العظمیٰ **السیّد حسین علیین مکان** آل غفران مآب اعلی اللہ مقامہ

(متوفی ۱۲۷۳ھ، مدفون: آستانۂ غفران مآب، لکھنؤ)

—— ترجمہ مع توضیحات و تشریحات ——

سیّد المحققین، عمدۃ الموحدین، استاذ العلماء

حضرت علامہ السیّد گلاب علی شاہ نقوی

مؤسس اعلیٰ، جامعہ عربیہ مخزن العلوم الجعفریہ شیعہ میانی ملتان

—— نظر ثانی و تصحیح ——

سیّد العلماء رئیس الواعظین، محسن ملت

(حفظہ اللہ تعالیٰ)

علامہ سیّد محمد تقی نقوی

۞ نقش کتاب ۞

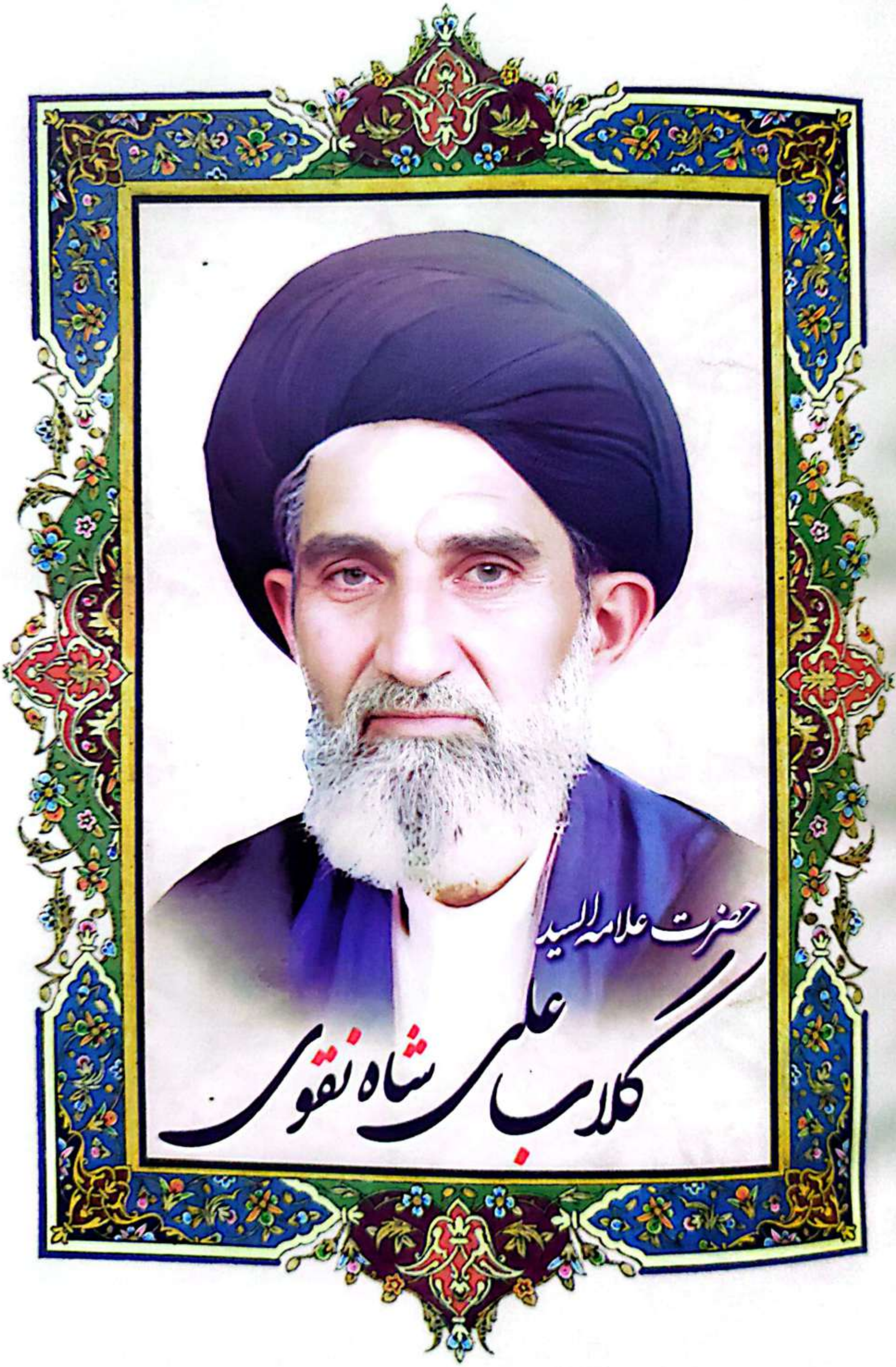
کتاب کا نام	:	خزینہ ایمانیہ ترجمہ حدیقہ سلطانیہ
تصنیف	:	آیت اللہ العظمیٰ السید حسین علیین مکان (آلِ غفران مآب)
ترجمہ مع توضیحات وتشریحات	:	علامہ السید گلاب علی شاہ نقوی (قدس سرّہ الشریف)
نظر ثانی وتصحیح	:	اُستاد العلماء علامہ سید محمد تقی نقوی
ترتیب وتہذیب	:	سہیل رضا صالحی
طبع اوّل	:	سنہ ۱۹۷۴ء
طبع دوم	:	سنہ ۲۰۲۴ء/ ۱۴۴۶ ہجری
تعداد	:	۱۰۰۰
ناشر	:	جامعہ عربیہ مخزن العلوم الجعفریہ شیعہ میانی، ملتان، پاکستان۔
ڈیزائننگ و پرنٹنگ:	:	سید رضوان الیاس جعفری
ہدیہ	:	Rs. 1200/-

۞ ملنے کا پتہ ۞

مولانا غلام شبیر حیدری،
جامعہ عربیہ مخزن العلوم الجعفریہ، شیعہ میانی ملتان
رابطہ نمبر: 0307-7861214

ادارہ منہاج الصالحین
الحمد مارکیٹ، دکان نمبر 20، غزنی اسٹریٹ، اردو بازار، لاہور
رابطہ نمبر: 0301-4575120


آیۃ اللہ العظمیٰ السید
حسین علیین مکان (لکھنؤ)
آلِ غفران مآب اعلی اللہ مقامہ


حضرت علامہ السید
گلاب علی شاہ نقوی

بسم الله الرحمن الرحیم

انتساب!

امیر المومنین امام الموحدین یعسوب الدین علی ابن ابی طالب علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کی روح اطہر کے نام، جن کی زندگانی کا ہر ہر لمحہ توحید شناسی سے عبارت ہے آپ نے اپنے خطبات وارشادات کے ذریعہ توحید برحق کی ایسی ترجمانی کی کہ قیامت تک اس کی مثال لانا محال ہے۔

حضرت حجۃ ابن الحسن قائم آل محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام (عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف) کے وجود مقدس کے نام، جو لیظھرہ علی الدین کلہ کا کامل مصداق ہیں آپ ہی عالم ہستی میں عملاً نظام توحید کی بالادستی کو قائم کریں گے اور عالم بشریت کو شاہراہ توحید پر گامزن کریں گے۔

علماء، صلحاء، شہداء، محدثین، محققین، مبلغین ومومنین کے نام، جنہوں نے دورِ غیبت کبریٰ میں انسانی معاشرہ کو توحید برحق کی معرفت سے روشناس کرانے میں موثر کردار ادا کیا تھا، کیا ہے اور تا ظہورِ امام زمان علیہ السلام (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کرتے رہیں گے۔

❀❀❀❀❀

مخزن المطالب

تذکرۂ مصنف آیت اللہ العظمیٰ سید حسین علیین مکان اعلی اللہ مقامہ فی دار الکرامۃ

شجرہ وسوانح حیات
استاذ العلماء علامہ سید گلاب علی شاہ نقوی

باب اوّل: توحید

فصل اوّل

فصل دوم: اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ کا بیان

فصل سوم: صفات سلبیہ کا بیان

تکملہ باب اول: از علامہ سید محمد تقی نقوی

حصہ اول (توحید اساس دین اسلام)

حصہ دوم (توحید در افعال)

باب دوم: عدل

فصل اول: افعال کے حُسن وقبح کا عقلی ہونا

فصل دوم: اللہ تعالی عادل ھے

فصل سوم: بندگان کو تکلیف دینا حسن ہے

فصل چہارم: بندگان کے اختیاری افعال کا بیان

فصل پنجم: قضاء وقدر کا بیان

فصل ششم: اللہ تعالی حکیم ہے

فصل ہفتم: لطف، توفیق، خذلان، ابتلاء، تمحیص، محق

فصل ہشتم: مسئلہ اَصلَح کا بیان

فصل نہم: آلام واعواض کا بیان

فصل دھم: طینت کا بیان

دعائے سلامتی امام زمانہ علیہ السلام (عجل اللہ فرجہ الشریف)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَللّٰهُمَّ كُنۡ لِّوَلِيِّكَ الۡحُجَّةِ بۡنِ الۡحَسَنِ صَلَوَاتُكَ عَلَيۡهِ وَ عَلٰى اٰبَائِهٖ، فِيۡ هٰذِهِ السَّاعَةِ وَ فِيۡ كُلِّ سَاعَةٍ وَلِيًّا وَّ حَافِظًا، وَ قَائِدًا وَّ نَاصِرًا، وَ دَلِيۡلًا وَّ عَيۡنًا، حَتّٰى تُسۡكِنَهٗ اَرۡضَكَ طَوۡعًا، وَ تُمَتِّعَهٗ فِيۡهَا طَوِيۡلًا.

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرف دل

از: سہیل رضا صالحی

خزینہ ایمانیہ درحقیقت فضل خداوندی ہے

الحمدللہ، خداوند قدوس کا عظیم احسان اور امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرج الشریف کی نصرت و تائید ہے کہ یہ توفیق نصیب ہوئی کہ بزرگان، اساتذہ کرام، مخلصین و معتمدین کی طرف سے مختلف مواقع پر مکتب تشیع کی عظیم الشان کتاب "خزینہ ایمانیہ" کے بارے میں تعریفی کلمات جاری ہوتے رہتے تھے جس کے سبب یہ جذبہ بیدار ہوا کہ اس کی تجدید نو کی جائے۔

استاد العلماء، زین الاتقیاء حضرت علامہ سید گلاب علی شاہ نقوی نور اللہ مرقدہ کی زندگانی اول روز سے ہی عقیدۂ توحید کے دفاع سے عبارت ہے اور اسی باب میں عوام الناس کی اصلاح کیلئے جو عالمانہ کردار ادا کیا وہ ایک اٹل حقیقت ہے اور اسی اصلاحی و دفاعی صدا کو پہنچانے کیلئے انہوں نے جہاں درس و تدریس کی راہ کو اپنایا وہاں انہوں نے اسوقت کے میڈیا یعنی رسائل و جرائد کے ذریعے آواز پہنچانے کی حتی الامکان جدوجہد کی۔

استاد العلماء قدس سرہ الشریف نے 1974 میں کتاب حدیقہ سلطانیہ کا بنام خزینہ ایمانیہ اردو میں ترجمہ کیا بلکہ متن کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ضروری حاشیے بھی لگائے، جس کا حجم اصل متن سے بھی زیادہ ہے۔

اس دور میں قلیل الوسائل و اسباب کے باوجود اسے زیور اشاعت سے آراستہ کیا گیا اور ملت اسلامیہ بالخصوص مکتب تشیع کے سامنے عقیدہ توحید پر محکم و مدلل کتاب "خزینہ ایمانیہ" کو پیش کیا اور اس دور سے لے کر آج تک تشنگان علم، عقیدۂ توحید کی حقیقی معرفت کیلئے استفادہ کر رہے ہیں اور سینکڑوں افراد اس کے مطالعہ سے شرک جیسے ظلم سے بچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ الحمدللہ، طویل عرصہ گزرنے کے باوجود بھی یہ عظیم تصنیف محققین و مدرسین کیلئے گرانقدر سرمایہ ہے۔

عنایت خداوندی سے بندہ حقیر کو یہ توفیق نصیب ہوئی کہ کتاب "خزینہ ایمانیہ" کے "باب توحید" کو جدید اسلوب میں مدون کر کے مکمل کر سکوں اور استاد العلماء قدس سرہ کے اس عظیم صدقہ جاریہ کو مزید دوام دینے میں ادنیٰ سا حصہ ڈال سکوں۔ بارگاہ رب العزت میں اعتراف کرتا ہوں کہ قبلہ بزرگوار، نور اللہ مرقدہ، نے اپنے دور کے حالات میں جس انداز میں قلمی جہاد کیا، ہماری محنت ان کے ایک حرف کے برابر بھی نہیں ہے۔

اپنی بے ثباتی، کم علمی اور فنی علوم سے عدم صلاحیت ہونے کا مکمل اعتراف کرتا ہوں، مگر اس کے باوجود بھی ان سب توفیقات وعنایات ربانی اور پُرخلوص قلب وروح سے اُس لم یزل ولایزال کی بارگاہِ اقدس میں عاجزی وانکساری کا نتیجہ ہے کہ اس نے کام کی تکمیل کی ہمت نصیب فرمائی۔

خزینہ ایمانیہ کے باب "توحید" کی جدید اسلوب میں تدوین کرنے کیلئے حتی المقدور دقت نظر سے کام لیا گیا ہے تاکہ کوئی سقم باقی نہ رہ جائے پھر بھی اس سلسلے میں کوئی کمی، کوتاہی یا غلطی کی طرف آگاہی حاصل ہو تو برادران ایمانی تحریری مکتوب کے ذریعہ متوجہ فرمادیں گے تو اسے آئندہ اشاعت میں اصلاح کے ساتھ شائع کیا جاسکے گا اور اس سے ان کیلئے بھی بلند پایہ اجر ہوگا۔

ان امور کے ساتھ ساتھ اس بات کا اعادہ بھی ضروری ہے کہ کتاب خزینہ ایمانیہ کے "باب توحید" کے ساتھ ساتھ "باب عدل" کو بھی شامل اشاعت کیا گیا، جس کے ترجمہ کی سعادت سید العلماء علامہ سید محمد تقی نقوی کو حاصل ہوئی۔

خزینہ ایمانیہ کے مرتب کرنے کے سلسلے میں نمائندہ ولی امر مسلمین و قائد ملت جعفریہ حضرت آیت اللہ سید ساجد علی نقوی، سید العلماء علامہ سید محمد تقی نقوی، علامہ ڈاکٹر شبیر حسن میثمی، علامہ الطاف حسین کولاچی، مولانا غلام شبیر حیدری، مولانا سبط حسن نوری، مولانا سجاد حسین قائمی، مولانا شاہد نذیر حسینی اور سید اظہار بخاری صاحب نے رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی، ان سب بزرگان محترمین اور ہمارے قلب و جان، سید و سردار قائد محترم و سید مظلوم آیت اللہ سید ساجد علی نقوی حفظ اللہ کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس کے علاوہ مرحوم و مغفور مولانا عابد رضا عرفانی ؒ کے بلندی درجات اور مغفرت کاملہ کیلئے بھی ملتمس دعا ہوں۔

رب کریم کی بارگاہ قدس میں دعا گو ہوں کہ بحق معصومین علیہم السلام ہماری مخلصانہ کاوشوں کو شرف قبولیت نصیب فرمائے اور استاد الاساتذہ علامہ سید محمد باقر نقوی اور استاد العلماء، زین الاتقیاء علامہ سید گلاب علی شاہ نقوی کے درجات بلند فرمائے اور ان کے آثار کے احیاء کی مزید توفیق نصیب فرمائے اور ام العلماء سیدہ سردار فاطمہ بنت سید اورنگزیب شاہ نقوی کے بھی درجات بلند ہوں اور شفاعت سیدہ کائنات سلام اللہ علیہا نصیب ہو۔

آمین یارب العالمین. حسبنا اللہ و نعم الوکیل نعم المولی و نعم النصیر.

العبد للہ العزیز الغفار

سہیل رضا صالحی

روز عید الغدیر ۱۴۴۵ھ

در مزار استاد العلماء، شیعہ میانی، ملتان۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تقریظ

(نمائندہ ولی امر مسلمین و قائد ملت جعفریہ آیت اللہ سید ساجد علی نقوی مدظلہ العالی)

قرآن و سنت اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں بالخصوص حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے اپنی محافل دروس میں جس امر اور جس چیز کو سرفہرست رکھا وہ عقیدۂ توحید ہے۔ ائمہ اطہار علیہم السلام نے وجودِ خدا اور توحید خدا پر جو براہین اور دلائل قائم کیے وہ نہ صرف اہل اسلام بلکہ خدا کو ماننے والے ہر انسان کے لیے رہنمائی کا اہم ترین ذریعہ ہیں۔ تاریخ کے حقائق پر غور کر کے اور ان کا تجزیہ کر کے ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کر سکتے ہیں کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں نے اپنے اپنے وقت کے حکمرانوں بالخصوص بنوامیہ و بنوعباس کے خلاف جو استقامت دکھائی اس کا مرکز و محور یہی تھا کہ حکمرانوں نے اپنے مخصوص مقاصد کے لیے عقیدۂ توحید کو مسخ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔

اسی استقامت کا تسلسل ہے کہ گذشتہ کئی صدیوں سے اگر نئے سے نئے خدا تشکیل پا رہے ہیں اور توحید کے مقابل نئے سے نئے تصوراتی عقیدے گھڑے جا رہے ہیں تو اس کا سدباب کرنے کے لیے ہر زمانے اور ہر دور میں توحید پرست بھی میدانِ عمل میں رہے ہیں۔ انہوں نے توفیق خدا سے تحفظ عقیدہ توحید کا فریضہ انجام دینے کے لیے ہمہ جہت جدوجہد کی ہے۔ تحفظ عقیدہ توحید کے لیے قلمی جہاد کا ایک نمونہ برصغیر کے عظیم عالم اور محقق جناب آیت اللہ العظمیٰ سید حسین علیین مکان آل عفران مآب کی تصنیف حدیقہ سلطانیہ ہے۔ جس کے باب توحید کے ترجمہ و توضیح کی نازک ترین ذمہ داری اُستاد العلماء زین الاتقیاء حضرت علامہ سید گلاب علی شاہ نقوی بخاری قدس سرہ نے "خزینہ ایمانیہ" کے نام سے انجام دی ہے۔ ان دونوں بزرگان کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے زمانے میں حامیانِ توحید اور پرستارانِ خدا کے سالار و سرخیل رہے ہیں۔ اب یہ ترجمہ و توضیح مرحوم استاد العلماء کے فرزند ارجمند ممتاز عالم دین جناب حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید محمد تقی نقوی کی نظر ثانی و اصلاح کے ساتھ استفادہ کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔

کتاب کی اہمیت اور اس میں موجود مواد کی افادیت کے بارے میں کچھ کہنے سے بہتر ہے کہ قارئین اس کا بغور مطالعہ فرمائیں کیونکہ ہر دور کی طرح ہمارے دور میں بھی خدا تراشی کا سلسلہ دشمنانِ خدا کی طرف سے جاری ہے۔ خالص عقیدۂ توحید کو زنگ آلودہ کرنے کی کوششیں صرف غیر از اسلام سے نہیں بلکہ اندرونِ اسلام سے نہایت زوروں پر ہیں۔ اہل اسلام کو توحید سے دور کرنے کے لیے، قرآن کا سہارا لیا جاتا ہے تو کہیں سنت و احادیث کے مطالب کو دھندلا یا جا رہا

ہے، کہیں اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے توحید کا حلیہ بگاڑا جا رہا ہے تو کہیں اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عشق و محبت کو بہانہ بنا کر عقیدۂ توحید کی اساس پر حملے کیے جا رہے ہیں۔

ان حالات میں عقیدۂ توحید کے تحفظ اور زیادہ سے زیادہ بیان اور تبلیغ و ترویج کی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے پیش نظر کتاب ایک حد تک اس ضرورت کو پورا کرتی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ حساس دور میں ہمیں ذرائع ابلاغ کی ہر قسم کو استعمال کرتے ہوئے اسے توحید کے پرچار کا ذریعہ بنانا چاہیے تا کہ وحدہٗ لاشریک کی ذات کے سامنے دونوں جہانوں میں سرخرو و سربلند ہو سکیں۔

والسلام

۱۱/ذیقعدہ ۱۴۳۷ھ

روزِ ولادت باسعادت

حضرت امام علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام

راولپنڈی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تقریظ

از: علامہ سید رضی جعفر نقوی

یہ بات صاحبانِ فکر و دانش سے ہرگز مخفی نہیں ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین، ہادیانِ برحق اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کا بنیادی ہدف بندوں کے عقائد کو انحراف سے بچانا اور انہیں صراطِ مستقیم پر گامزن کرنا ہے اور اس سلسلے میں انہیں باطل قوتوں سے ہر دور میں نبرد آزما رہنا پڑا۔ ہمارے ممتاز علمائے کرام نے بھی زمانے کی ہر قسم کی مخالفت کا سامنا کیا اور پیغامِ حق کو بندگانِ خدا تک پہنچاتے رہے اور ان کے عقائد میں استحکام پیدا کرنے کے لیے زبان وقلم سے جہاد کرتے رہے۔ ان ہی ممتاز علمائے کرام میں برصغیر کے نہایت عظیم المرتبت عالم دین، سید الموحدین، آیت اللہ حضرت علامہ سید حسین علیین مکان اعلی اللہ مقامہ کی ذات گرامی ہے جو برصغیر کے سب سے پہلے فقیہ و مجتہد جناب غفران مآب طاب ثراہ کے جلیل القدر فرزند ارجمند تھے۔ انہوں نے ملت جعفریہ کے عقائد و مسلمات کے موضوع پر نہایت گرانقدر کتاب تحریر فرمائی اور اس کا نام "حدیقہ سلطانیہ" رکھا اور اسے عقلی ونقلی دلائل سے آراستہ کیا۔

سرکارِ عالی وقار، عمدۃ الموحدین، استاد العلماء حضرت علامہ سید گلاب علی نقوی اعلی اللہ مقامہ نے اس عظیم الشان کتاب کا ترجمہ "خزینہ ایمانیہ" کے نام سے کیا ہے۔ ترجمہ نہایت ہی سلیس اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ آپ نے مصادر پر بھی پوری تحقیق فرمائی ہے۔ اور حواشی میں ایسی مفصل دلیلیں درج فرمائی ہیں جن سے اس کتاب کی افادیت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے۔ اس گرانقدر تالیف کا دوسرا حصہ "عدل" کے موضوع پر ہے اور "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْهِ" کے مصداق حضرت علامہ سید گلاب علی نقوی طاب ثراہ کے فرزند ارجمند گرامی مرتبت و عالی وقار حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید محمد تقی نقوی صاحب دام مجدہ نے اس کے ترجمہ کی سعادت حاصل کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طالبانِ علم و دانش اور فکر ونظر سے کام لینے والوں کے لیے یہ کتاب نادر معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے اور وہ صاحبانِ فکر و دانش جو عقائد و مسلمات کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے ایک نادر علمی تحفہ ہے۔ اور اس کا نام بجا طور پر "خزینہ ایمانیہ" رکھا گیا ہے۔ خداوند عالم کی بارگاہ میں دعا ہے کہ اس کتاب کے مؤلف اور مترجم اول حضرت علامہ سید گلاب علی نقوی طاب ثراہ کے درجات بلند فرمائے اور مترجم دوم حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید محمد تقی نقوی مدظلہ العالی کو صحت و عافیت کے ساتھ طولِ حیات عطا فرمائے اور ان کی اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے۔

آمین، یا رب العالمین۔ بحق محمد وآلہ الطاہرین۔

۱۰؍ربیع الثانی ۱۴۴۶ھ

سید رضی جعفر نقوی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تقریظ

از: علامہ محمد باقر نجفی

کتاب مستطاب "خزینہ ایمانیہ" جو کتاب "حدیقہ سلطانیہ" کا ترجمہ ہے، اس کتاب کے مصنف، مؤلف، سرکار سید العلماء سید حسین علیین مکان اعلی اللہ مقامہ ہیں، جو اپنے زمانے کی ایک مثالی علمی شخصیت تھے۔ ان کی یہ کتاب توحید کے موضوع پر ایک بے مثل و بے مثال شاہکار ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ جلیل القدر استاذ العلماء علامہ سید گلاب علی شاہ صاحب نقوی بخاری قبلہ نے کیا تھا۔ اس کتاب کے ترجمہ کی اشاعت کا پس منظر یہ ہے کہ اُس زمانہ میں منبروں پر شرک اور غلو کا پرچار زوروں پر تھا۔ ضرورت ایسے لٹریچر کی تھی کہ جو توحید کی ترجمانی کرے، استاذ العماء نے اس ضرورت کے پیش نظر "حدیقہ سلطانیہ" کا ترجمہ کیا اور جہاں حاشیہ کی ضرورت تھی وہاں حاشیہ لکھ دیا تا کہ قاری تشنہ نہ رہے۔ عقیدۂ توحید پر یہ ایک جامع، کامل اور اکمل کتاب ہے۔ ۱۹۷۴ء میں مکتبہ کاظمیہ ملتان نے اسے شائع کیا تھا۔ عرصہ دراز سے یہ کتاب دوبارہ نہیں چھپ سکی تھی۔ لیکن اس کتاب کی موجودہ زمانے میں اشد ضرورت تھی۔ لہٰذا جامعہ مخزن العلوم الجعفریہ کے زیر اہتمام اس کی اشاعت نو کی جارہی ہے جس پر ہم انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

استاذ العلماء علامہ سید گلاب علی نقوی قبلہ جہاں علوم آلِ محمد کے مروج تھے وہاں آپ قومی اور فلاحی امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ آپ کی خدمات کا موضوع بہت وسیع ہے۔ آپ ہمیشہ قومی قیادت کے پشت پناہ رہے۔ علامہ سید محمد دہلوی سے لے کر علامہ مفتی جعفر حسین قبلہ تک، پھر وہاں سے لے کر قائد شہید علامہ سید عارف حسین الحسینی تک تمام قائدین کے معاون و مددگار رہے۔

پروردگار عالم کی بارگاہ میں التجا ہے کہ وہ بزرگواروں کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کی ان کاوشوں کو قبول کرے۔

محمد باقر نجفی

چوبارشریف،

خیر پور ناتھن شاہ، سندھ

۱۴/۱۰/اکتوبر ۲۰۲۴ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تقریظ

از: علامہ ڈاکٹر شبیر حسن میثمی

اسلام میں ہستی باری تعالیٰ کا اقرار اور اس کی یکتائی کا اعتراف اصل اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی عقیدہ پر دوسرے عقائد کا دارومدار اور تمام اعمال کی صحت کا انحصار ہے۔ اسی اہمیت کی بناء پر علمائے اسلام نے اسے خصوصی توجہ کا مرکز قرار دیا، اس پر سیر حاصل بحثیں کیں اور تحقیقی و استدلالی کتابیں تحریر میں لائے، اگرچہ ان سب کی کاوشیں قابل قدر ہیں مگر ان ابحاث کے نتیجہ میں وحدت و کثرت کی آمیزش، ذات و صفات کے تفرقہ، ثنویت و دوئیت کا تصور، حلول و اتحاد کے جھمیلے، رویت بصری، تمثیل، تشبیہ، احتیاج، ترکیب، تفصیل، تعطیل اور تجسیم ایسے غلط نظریات اور شکوک و شبہات سامنے آئے۔

مسلمانوں کے خیالات و افکار کو ایسے باطل و گمراہ شکوک و شبہات کے دھندلکوں میں بھٹکنے سے بچانے کے لیے سب سے پہلے حضرت علی علیہ السلام نے مسائل الہیہ میں عقلی و فلسفی استدلال کی طرح ڈالی، دقیق گتھیوں کو آسان لفظوں میں سلجھایا اور خداشناسی کی منزل میں دلیل راہ کی حیثیت اختیار کر گئے اور امام علی علیہ السلام کے بعد الہیاتی ابحاث کی دنیا میں جو کچھ بھی بیان ہوا وہ امام علی علیہ السلام کے بیان کردہ اصولوں ہی کی تفصیل و تشریح ہے۔

جس اسلوب معرفت کی داغ بیل حضرت علی علیہ السلام نے ڈالی تھی، اسے مکتب اہل بیت علیہم السلام کے ممتاز و مایہ ناز شاگرد ایک نسل سے دوسری نسل تک علمی عرق ریزی اور جانفشانی سے منتقل کرتے رہے اور الہیات کی وادی میں جنم لینے والے اعتراضات و غلط نظریات کو اہل بیت علیہم السلام کے بیان کردہ اصولوں کی روشنی میں سرکوب کرتے رہے۔

وقت کی گردش الہیات کے باب میں ماضی کے غلط اور بوسیدہ نظریات کو نئی زبان اور جدید انداز میں آج بھی پیش کر رہی ہے اور نوجوان نسل کسی نہ کسی صورت ان سے متاثر بھی ہو رہی ہے ایسے میں برادر ارجمند سہیل رضا صالحی سلمہ نے احساس ذمہ داری کرتے ہوئے کمر ہمت باندھی اور ان ابحاث سے بہتر آشنائی کے لیے ایک کتاب "خزینہ ایمانیہ" کا انتخاب کیا جس میں توحید کے بارے میں علمی و استدلالی انداز میں الہیات کو بیان کیا گیا تھا۔

خزینہ ایمانیہ دراصل حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید حسین علیین مکان، آل غفران مآب کی کتاب "حدیقہ سلطانیہ" کے پہلے باب کا ترجمہ تھی جسے ستر کی دہائی میں برصغیر کے عظیم اور جید عالم دین استاد العلماء علامہ سید گلاب علی شاہ نور اللہ

مرقدہ نے اردو میں ترجمہ کر کے شیعہ عقیدہ توحید کو متعارف کروایا تھا اور اس میں صرف متن کے ترجمہ پر ہی اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ بہت سے تشریحی اور وضاحتی حاشیے بھی لگائے تا کہ عوام الناس کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

توحید کے باب میں خزینہ ایمانیہ اگرچہ اپنی جگہ ایک مکمل دستاویز تھی لیکن اس کے باوجود الٰہیات کے باب میں حسن و قبح، جبر و اختیار، قضا و قدر، فلسفہ آلام، طینت وغیرہ ایسے موضوعات تھے جن کے اضافہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی چنانچہ زین الاتقیاء علامہ سید محمد تقی نقوی حفظہ اللہ نے "حدیقہ سلطانیہ" کے دوسرے باب "عدل" کا ترجمہ فرمانے کے علاوہ توحید کے بارے میں مختلف مقالات بھی تحریر فرما دیئے جنہیں "خزینہ ایمانیہ" کے نئے ایڈیشن کا حصہ بنایا جا رہا ہے۔

یہ کتاب علماء و محققین، دانشوران ملت، طلباء اور اسلامی و عقلی علوم کے دقیق و عمیق مطالعہ کا ذوق رکھنے والے اہل علم کے لیے ایک انمول و بے بہاء خزانہ ہے۔ خزینہ ایمانیہ کے انتخاب سے اشاعت تک کے تمام مراحل میں شریک کار تمام افراد خاص طور پر استاد العلماء علامہ سید محمد تقی نقوی، برادر گرامی سہیل رضا صالحی، مولانا سجاد حسین قائمی، اراکین جامعہ مخزن العلوم الجعفر یہ ملتان اور دیگر احباب کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں اور ان کی توفیقات خیر میں اضافہ کے لیے اللہ تعالی سے دعا گو ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

شبیر حسن میثمی

چیئرمین زہرا (س) اکیڈمی

کراچی پاکستان

یکم ربیع الثانی ۱۴۴۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خزینۂ ایمانیہ کی روشنی

از : علامہ سید محمد تقی نقوی

معرفت توحید ہر انسان پر واجب ہے اور رب کریم نے اس سلسلے میں انسان کے فطری وجود میں مختلف انواع کے نمونے رکھ دیئے ہیں اور اگر انسان اپنے وجود میں ہر وقت غور وخوض کرے تو یقیناً اسے بآسانی اپنے رب مطلق کی معرفت حاصل ہوجائے گی۔ اسی طرح کی مختلف نشانیاں رب کریم نے انسانی معرفت وعلم کیلئے کائنات میں پھیلا دی ہیں جن کے ذریعہ بشر اپنے رب کی معرفت سے بہرہ ور ہوسکتا ہے، اپنے کردار وعمل سے اپنے رب کے وجود کی گواہی دے سکتا ہے، اسی مقصد کو مزید روشن کرنے کیلیئے اس نے انبیاء ورُسل کو اس دنیا میں بھیجا تا کہ وہ اس کی مخلوق کو مختلف قرائن کے ذریعے اس کے وجود کی طرف متوجہ کریں اور عملاً انہیں توحید شناسی کی راہ پر گامزن کریں۔

اس سلسلے میں قرآن ان تمام باتوں کی گواہی دیتا ہوا نظر آتا ہے اور خود انبیاء ورُسل کی حیات مقدسہ اس کی بین دلیل ہے انہوں نے دنیائے انسانیت کو نظام توحیدی سے متعارف کرانے کیلیئے کس قدر محنت کی اور اس نظام توحیدی کی راہ میں انہیں کن کن آزمائشوں سے گزرنا پڑا مگر انہوں نے بشریت کو توحید حقیقی کی معرفت کرانے میں کوئی کمزوری نہیں دکھائی۔

اسی طرح خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے اس سلسلے میں جو کردار ادا کیا وہ انسان کو گمراہی کی دلدل سے نکالنے کیلیئے کافی ہے اور اس کے نقوش تاریخ انسانیت میں موجود ہیں، کیونکہ انہی نقوش ائمہ ہدیٰ علیہم السلام نے اپنی حیات کو اس امر پر وقف کیا کہ انسانیت کو توحید برحق کی معرفت عطا کر دی جائے اس سلسلے میں انہوں نے مختلف انواع کے ذریعہ اس فریضہ کو انجام دیا، اور آج اگر ائمہ علیہم السلام کی ولایت وامامت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرنے والے توحید برحق میں تزلزل اور کمزوری وگمراہی کا شکار نظر آئیں تو یہ مقام افسوس ہے کیونکہ ائمہ علیہم السلام کا وجود برحق اس دنیا میں وارد ہی اس لئے ہوا تھا کہ بشریت کو توحید برحق کی شناخت کرائی جاسکے، ائمہ معصومین علیہم السلام دراصل توحید برحق کے حقیقی ترجمان ہیں اور انہوں نے اس ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔

یہ امتیاز مکتب تشیع کو حاصل ہے جو اپنے عقائدی امور میں محکم دلائل سے سرفراز ہے کیونکہ اس کا سرچشمہ قرآن وسنت ہے جبکہ اس کے برعکس جن مکاتیب فکر نے ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے روگردانی کی اور کسی دوسری طرف رجوع کیا ان کی عقائدی کجی خود ان کی کتابوں میں نمایاں ہے کہ خود ذات برحق کے بارے میں توہین وتمسخر آمیز بیانات ان کے مکاتیب کی

پستی پر محکم دلیل ہے۔

بعد از غیبت امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) علمائے تشیع نے عالم اسلام میں عقائد ونظریات کے محکمات کو پیش کرنے میں بہت اہم فرائض انجام دیئے ہیں چونکہ معصومین علیہم السلام کے دورِ حیاتِ مقدسہ میں بھی فریقین اور دشمنانِ اسلام قوتوں کی طرف سے عقائد حقہ پر اشکالات وابہامات کے ذریعہ حملے کئے جاتے تھے اور ائمہ علیہم السلام اس کا مدلل انداز میں جواب دیتے تھے۔

آج دورِ حاضر میں دشمنانِ اسلام کی سازشوں اور ہمارے بعض نام نہاد اہل منبر کی لالچ وحرص کے نتیجے میں جو عقائد ونظریات معاشرے میں نمودار ہوئے اور پھر یہ عقائد منقبت، سلام، نوحوں اور مرثیوں میں شامل ہوگئے اور ہمارے عقائد جو کہ ائمہ معصومین علیہم السلام اور ان کے باوفا اصحاب وعلماء کے ذریعے ہم تک پہنچے ہیں ان میں خلط ملط ہو چکے ہیں اور آج ہمارے معاشرے میں سادہ لوح عوام انہی مخلوط عقائد کو مکتب تشیع سمجھ رہے ہیں۔

اسی عقائدی انحرافات کی اصلاح کی خاطر برصغیر پاک و ہند کے عالم ربانی، استاذ العلماء، زین الفقہاء و الاتقیاء علامہ السید گلاب علی نقوی (قدس سرہ الشریف) مؤسس اعلیٰ، جامعۃ العربیہ مخزن العلوم الجعفریہ، شیعہ میانی ملتان نے قرآن وسنت کی روشنی میں مکتب تشیع کے عقائد ونظریات کو تحریر وتصنیف کے ذریعہ مہذبانہ و عالمانہ روش کے ساتھ پیش کیا اور جہاں جہاں انہیں منبر کے ذریعہ اس کا موقع فراہم ہوتا وہ اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اس سے بھی استفادہ کرتے، اسوقت کے بعض علماء نما ذاکرین بھی اس روش سے خائف تھے کیونکہ وہ خود اسی عقائدی کجی کا شکار تھے اور بعض اوقات وہ اپنی خطیبانہ گفتگو میں اس انداز کو اپناتے تھے جو مکتب تشیع کے عقائد سے صریحاً انحراف ہوتا تھا، مگر استاذ العلماء نے اپنی اس شرعی مسؤلیت کی ادائیگی میں کسی بھی مخالفت کو مانع نہیں ہونے دیا بلکہ وہ اس روش پر ڈٹے رہے اور ملت جعفریہ کو عقائدی انحراف سے بچانے کیلئے آخری دم تک کوشش کی۔

الحمد للہ، اسی کوشش وسعی کے درمیان ہمارے والد بزرگوار علامہ السید گلاب علی شاہ نقوی اعلی اللہ مقامہ الشریف کو مکتب تشیع کی جلیل القدر و یگانۂ روزگار شخصیت حضرت آیت اللہ العظمیٰ السید حسین علیین مکان آل غفران مآب ابن حضرت آیت اللہ العظمیٰ السید دلدار علی غفران مآب (لکھنوَ) کی عظیم الشان کتاب حدیقۂ سلطانیہ ایک سید نقوی کے وسیلہ سے میسر آ گئی، یہ کتاب فارسی میں اصول وفروع دین پر مشتمل ہے اور ہر لحاظ سے مکتب اہل بیت علیہم السلام کی ترجمان ہے۔

یہ تقریباً ۱۹۷۱ء کا زمانہ تھا۔ اس کتاب کا ملنا یقیناً تائید ربانی تھا اور سید بزرگوار نے اسی تائید وحمایت سے استفادہ کرتے ہوئے اس کتاب کے بابِ توحید کا ترجمہ "خزینۂ ایمانیہ مع توضیحاتِ نورانیہ" کے نام سے کیا اور بہت محنت و دقت کیساتھ اس کی شرح بھی لکھی جو کہ اصل کتاب سے بہت زیادہ ہے اور اس میں ان تمام اشکالات، ابہامات اور سوالات کا مدلل جواب موجود ہے جو آج ہمارے معاشرے میں صریحاً سرایت کر گئے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت نے اس دور سے لے کر اب تک معاشرے میں بہت اثرت مرتب کئے ہیں عوام الناس کے عقائد میں جو انحراف پیدا ہوا تھا اس کی اصلاح میں بہت پیش رفت ہوئی بلکہ علمائے کرام، واعظین اور مبلغین کیلئے یہ کتاب بہت ہی مفید ثابت ہوئی۔ ہمارے جامعہ میں اسے نصاب میں شامل کیا گیا اور حق بھی یہی ہے کیونکہ اس کتاب کو مطالعہ کی زینت بنایا جائے تو انسان عقیدۂ توحید میں راسخ ہوسکتا ہے۔ الحمد للہ، استادِ بزرگوار کے شاگرد اور ان سے تعلق رکھنے والے مخلصین ومومنین عقائدی اعتبار سے مضبوط ومحکم ہیں بالخصوص ان کے شاگرد دنیا میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں اور حساسیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی متانت سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے ہیں اور مملکت خداداد پاکستان میں ان کے لائق شاگرد اسی مقصد وہدف کی راہ میں سربکف ہیں اور عوام الناس تک مکتب تشیع کے عقائد ونظریات کی ترویج میں سرگرم عمل ہیں۔

الحمد للہ، اس عظیم الشان کتاب کی دورِ حاضر میں ضروریات کے مطابق تجدیدِ نو کی گئی ہے اور جدید انداز کیساتھ اسے شائع کیا جارہا ہے تاکہ مومنین اس سے بہتر استفادہ کرسکیں اور آپ کے باقیات الصالحات میں مزید اضافہ ہو۔

رب کریم بحق ائمہ معصومین علیہم السلام، علماء و بزرگان کی اس کاوش کو درجۂ قبولیت نصیب فرمائے اور حضرت بقیۃ اللہ الاعظم عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہورِ پُرنور کی زمینہ سازی کیلئے ایک تحرک قرار دے۔

آخر میں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ کتاب حدیقۂ سلطانیہ کے باب عدل کے ترجمہ کی توفیق بندۂ حقیر کو حاصل ہوئی ہے اور اسے بھی اس کتاب کے آخر میں شامل کیا گیا ہے۔

العبد الذليل الحقير المسكين المستكين.

والسلام

السید محمد تقی نقوی

مدیر اعلیٰ، جامعۃ العربیہ مخزن العلوم الجعفریہ، شیعہ میانی ملتان

۱۵ رشعبان المعظم ۱۴۳۵ھ بمطابق ۱۴ رجون ۲۰۱۴ء

روزِ ولادت باسعادت فرزندِ زہرا حضرت حجت ابن الحسن الزکی العسکری

(عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف)

تذکرہ مصنف

آیت اللہ العظمیٰ سید حسین علیین مکان

(قدس سرہ الشریف)

کتاب مستطاب حدیقۂ سلطانیہ کے آخر میں جن بلند پایہ الفاظ کے ساتھ مصنف علام کا تذکرہ موجود ہے اختصاراً اسے درج کیا جاتا ہے امام ہمام، حَبر علام، نحریر قمقام، حجۃ الاسلام، شمس فلک افادات، بدر سماء افاضات، محیط نقطہ کرم، مرکز دائرۂ ہمم، معدن کمالات انسانی، مخزن فواضل نفسانی، مہبط فیوض ربانی، منزل برکات سبحانی، مقتدائے عادل، ہادیٔ کامل، زنگ زدای مرأت تدقیق، مصقل آئین تحقیق، درج رفعت و اعتلاء کے گوہر درخشاں، برج مجد و علا کے اختر تاباں، غصن دوحۂ امامت و ولایت، ثمر شجرۂ نبوت و رسالت، نور حدیقۂ افتاء و اجتہاد، نور حدقۂ ہدایت و ارشاد، مجمع فضائل رضیہ، منبع شمائل مرضیہ، صاحب قوت قدسیہ، مالک ملکاتِ ملکیہ، ممہد ارکان شریعتِ خیر البشر، مشید بنیانِ ملتِ ائمہ اثناعشر، جامع معقول ومنقول، ہادی فروع و اصول، مرجع علماء فحول، موسس دین رسول، ملاذ فضلاء کاملین، ملجاء علماء عاملین، افضل المتکلمین العلام، اکمل المحققین، آیۃ اللہ فی العالمین، فخر المتفقہین الکرام، خاتم المجتہدین العظام، ظہیر الملت والدین، مولانا ومولی الخافقین، سید العلماء السید حسین اسکنہ اللہ بحبوحۃ جنابہ وافاض علیہ شاہبیب رضوانہ۔

آپ کے علم وکمال کا جھنڈا تابفلک بلند ہوا اور آپ کے فضل وجلال کا ذکر خیر روئے زمین کے مشرق ومغرب تک پہنچا آپ کے مکارم اخلاق اور محاسن اوصاف سے آفاق دنیا معطر ہوئے اور آپ کی تحقیقات عالیہ کی شعاعوں نے مثل آفتاب عالمتاب اطراف عالم کو روشن اور منور کیا، آپ کے فضائل ومناقب حد احصاء سے زیادہ ہیں اور آپ کے علوم و کمالات کے بیان سے زبان عاجز ہے اور قلم قاصر۔

علماء کرام وفقہاء عظام نے اپنے تقریظات میں جن بلند پایہ الفاظ سے ان کا ذکر خیر کیا اور جن باعظمت القاب سے ان کو نوازا ہے ان سے آپ کی جلالت قدر اور رفعت شان پر کافی روشنی پڑتی ہے اور ان کے علم وفضل کی بلندی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نسب شریف و تاریخ ولادت:

آپ کا نام نامی اور اسم گرامی اپنے جد امجد، ثالث ائمہ اطہار، خامس اہل کساء حضرت سید الشہداء علیہ وعلیٰ جدہ و ابیہ و امہ و بنیہ المعصومین الوف التحیہ والثناء کے نام مبارک پر سید حسین ہے علیین مکان لقب ہے آپ اعلیٰ حضرت آیۃ اللہ فی العالمین حجۃ اللہ علی الانام اجمعین علامۂ دہر، وحید عصر جناب سید دلدار علی غفران مآب اعلی اللہ مقامہ ورفع درجاتہ فی دار الکرامہ کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ کا شجرۂ عالیہ چوبیسویں پشت پر عاشر ائمہ معصومین حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے اتصال پذیر ہو جاتا ہے۔

آپ کی ولادت باسعادت بتاریخ چودہ ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ کو سرزمین لکھنؤ پر ملک ہندوستان میں واقع ہوئی۔ خورشید کمال آپ کی ولادت کا مادۂ تاریخ ہے۔ آپ اپنے چار برادران بزرگ سید محمد، سید علی، سید حسن اور سید مہدی کے بعد تولد ہوئے، اسوۃ المتکلمین، قدوۃ المجتہدین، اکرم الناس حضرت علامہ مفتی سید محمد عباس اعلی اللہ مقامہ اپنی کتاب اوراق الذہب میں رقم طراز ہیں کہ بعض باوثوق حضرات کا بیان ہے کہ جب آپ کے برادر بزرگ جناب سید مہدی اعلی اللہ مقامہ اپنے تین برادر سید محمد، سید علی اور سید حسن اعلی اللہ مقامہم کے بعد تولد ہوئے تو جناب کے والد ماجد حضرت علام غفران مآب اعلی اللہ مقامہ نے حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی عالم خواب میں زیارت کی امام عالی مقام علیہ التحیۃ والسلام نے حضرت علامہ غفران مآب اعلی اللہ مقامہ سے سبب دریافت کیا کہ آپ نے اپنے فرزندان کے نام تجویز کرنے میں جس ترتیب کو ملحوظ رکھا تھا اپنے اس چوتھے فرزند کا نام تجویز کرتے وقت اسی ترتیب کا لحاظ کیوں نہیں کیا کیونکہ ترتیب مذکور کا تقاضہ یہ تھا کہ چوتھے فرزند کا نام سید حسین رکھا جائے نہ کہ سید مہدی، تو حضرت علامہ علیہ الرحمۃ نے جواباً عرض کیا کہ میرا یہ فرزند میری زندگی کے ان ایام میں پیدا ہوا کہ جب میں کبیر السن ہو چکا ہوں، قویٰ ضعف پذیر ہو گئے ہیں لہٰذا مجھے یہ خیال دامن گیر ہوا کہ اب میرا کوئی اور فرزند تولد پذیر نہیں ہوگا اور یہ میرا آخری فرزند ہوگا اس لئے میں نے اس کا نام قائم آل محمد (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے نام پر سید مہدی تجویز کیا کیونکہ قائم آل محمد (عجل) سلسلۂ معصومین علیہم السلام کے آخری فرد ہیں۔

حضرت سید الشہداء علیہ التحیۃ والثناء نے ارشاد فرمایا کہ واقعہ اس طرح نہیں ہے جیسا آپ کو خیال ہوا بلکہ عنقریب آپ کا ایک اور پاکیزہ فرزند ہوگا لہٰذا جب وہ تولد پذیر ہو تو اس کا نام میرے نام پر تجویز کیجئے گا چنانچہ جیسے حضرت امام عالی مقام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بشارت دی تھی ایسے ہی ہوا کہ اللہ جل شانہ نے حضرت علامہ غفران مآب رحمۃ اللہ علیہ کو بعد از سید مہدی ایک اور فرزند عطا فرمایا جس کا نام آپ نے اپنے جد امجد حضرت امام حسین علیہ السلام کے ارشاد پاک کے مطابق سید حسین رکھا جو یہی ہمارے ممدوح حضرت علامہ فہامہ ملقب بہ علیین مکان ہیں۔

بچپن اور زمانۂ تعلیم کے حالات:

آپ اپنے عہد طفولیت اور زمانہ بچپن میں ہمیشہ لہو ولعب اور کھیل کود سے کنارہ کش رہے۔ ابتدائی نشونما کے زمانہ میں بھی آپ مسلسل تحصیل علوم وفنون میں مصروف رہے۔ دیگر بچوں کی طرح کھیل کود وغیرہ سے کوئی محبت نہ تھی ہمیشہ اپنے اوقات کو اکتساب کمالات میں صرف کیا آپ نے علوم وفنون کا تمام تر استفادہ اپنے والد ماجد حضرت آیت اللہ غفران مآب اعلی اللہ مقامہ اور اپنے برادر بزرگ سلطان العلماء حضرت سید محمد رضوان مآب رضوان اللہ علیہ سے کیا۔

آپ نے اپنے فرزند ارجمند افضل المتکلمین، مخزن مدرسین، عمدہ اساتذہ عظام، زبدۂ جہابذۂ کرام، ممتاز العلماء جناب سید محمد تقی اعلی اللہ مقامہ کے لئے جو اجازۂ اجتہاد تحریر فرمایا اس میں آپ خود بیان فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی ابتدائی تعلیم بھی اور انتہائی بھی اپنے والد علام اعلیٰ حضرت غفران مآب اعلی اللہ مقامہ سے حاصل کی۔ اسی اثناء میں والد گرامی کی طبع اقدس کچھ عرصہ کے لئے ناساز ہوگئی تو والد ماجد نے میرا درس برادرم بزرگ جناب سلطان العلماء سید محمد رضوان مآب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ ایک زمانہ تک میں نے کچھ علوم حکمیہ فنون رسمیہ اور قدرے علوم دینیہ اپنے برادر بزرگ سے حاصل کئے۔ جب والد بزرگوار کو مرض سے افاقہ حاصل ہوگیا تو پھر میرے اسباق والد گرامی کی خدمت میں عود پذیر ہو گئے۔

فرماتے ہیں کہ کتاب مرآۃ العقول کو جو عماد الاسلام فی علم الکلام کے لقب سے ملقب ہے میں نے اپنے والد گرامی کی خدمت میں پڑھا یہ کتاب والد بزرگوار ہی کی تصانیف عالیہ میں سے ہے نیز کتب حدیث کا ایک حصہ بھی جیسے کہ شیخ بہاء الدین عاملی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح اربعین، اصول کافی وفروع کافی اور کتاب منتقی الجمان کو والد ماجد سے پڑھا۔ سترہ سال کی عمر میں آپ جمیع علوم وفنون کی تکمیل کر کے فارغ التحصیل ہو گئے اور مدارج اجتہاد میں سے اعلیٰ مرتبہ پر فائز اور کامران ہوئے۔ آپ اگرچہ عمر میں اپنے تمام بھائیوں سے چھوٹے تھے لیکن میدانِ علم وفضل میں اکثر پر فوقیت رکھتے تھے اور وجہ اس کی آپ کی طبع وقاد کی جودت، ذہن دراک کی حدت اور تیزی تھی کیونکہ آپ اپنی ذہانت و فطانت کے اعتبار سے تمام علماء زمانہ وفضلاء روزگار کے سرتاج تھے۔ آپ نے نہایت بلند پایہ تحقیقات وتدقیقات پر مشتمل تصنیفات وتالیفات عالیہ کا خزانہ اہل دنیا کو عطا کیا۔

شرم وحیا کا معیارِ بلند:

صاحب تذکرۃ العلماء تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے ایک روز خود آنجناب کی زبان درفشان سے سنا کہ آپ نے فرمایا: سات سال کی عمر میں، میں نے رسالہ تجزی فی الاجتہاد کی تصنیف شروع کی بعد ازاں حکم ظن رکعتین اولیین کے متعلق ایک رسالہ تصنیف کیا لیکن انتہائی شرم وحیا کے باعث یہ رسالہ جات میں کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتا تھا۔ البتہ

اپنے بڑے بھائی جناب علامہ سید مہدی طاب ثراہ سے ان چیزوں کے متعلق مذاکرہ اور مکالمہ کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ وہ مجھ سے تقریباً تین سال بڑے تھے، وہ جو کچھ لکھتے تھے مجھے دکھا دیتے تھے اور میں جو کچھ لکھتا ان کی نظر سے گزار دیا کرتا حتیٰ کہ وہ وقت آ گیا کہ والد ماجد نے مجھے اجازۂ اجتہاد تحریر کر دینے کے بارے میں مجھ سے کلام فرمایا تو میں عرض گزار ہوا کہ اوّلاً حضور میرے ان رسالہ جات کو ملاحظہ فرماویں جن کو میں تا حال تصنیف کر چکا ہوں تا کہ مجھے ان کے حسن و قبح سے آگاہی حاصل ہو کہ آیا وہ حضور والا شان کی نگاہِ عالی میں طرز مناسب اور معیار صحت و صواب کا درجہ حاصل کر سکتی ہیں یا نہیں؟

چنانچہ میری اس عرضداشت کو شرفِ قبولیت حاصل ہوا اور میں نے اپنا تصنیف شدہ رسالہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ والد بزرگوار جب اس رسالہ کے مضامین کو سماعت فرمارہے تھے اس دوران میں انہوں نے فرمایا کہ تقریر کا اسلوب اور تحریر کا طرز اور متانت تو اس بلند معیار پر ہے جو ایک مبتدی اور نو آموز سے صادر نہیں ہو سکتا لیکن ابھی رسالہ اختتام پذیر نہ ہوا تھا کہ بزگوارم کی طبیعت بوجھل ہوگئی اور رسالہ کا ملاحظہ التوا میں پڑ گیا۔ لہٰذا برادرم معظم سلطان العلماء علامہ سید محمد رضوان مآب رحمۃ اللہ علیہ کو آنجناب والد بزرگوار نے فرمایا کہ وہ رسالہ مذکور کو ملاحظہ کریں اور پھر اس کی کیفیت کے متعلق انہیں مطلع کریں۔ چنانچہ حضرت سلطان العلماء طاب ثراہ نے تعمیل حکم کرتے ہوئے رسالہ ملاحظہ فرمایا اور اسے بہت پسند فرمایا لیکن میں چونکہ اپنے تمام برادران سے خوردسال تھا لہٰذا میں نے چاہا کہ میری جودت تبحر علمی کا حال ظہور پذیر ہو اس لئے برادرم سلطان العلماء سے اس امر کے عدم اظہار کی التجا کی۔

پدر بزرگوار کی ہدایات پر عمل:

آپ اپنے والد ماجد کے ارشادات کا تاثر لیتے اور ان کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی ہمیشہ سعی اور کوشش کیا کرتے چنانچہ آپ نے اپنے برادرزادہ جناب عمدۃ العلماء سید محمد ہادی قدس سرہ کے لئے جو اجازۂ اجتہار تحریر کیا تھا اس میں آپ نے یہ تذکرہ فرمایا ہے کہ پدرم بزرگوار جناب اعلیٰ حضرت غفران مآب اعلی اللہ مقامہ ہمیشہ فاضل طلبہ کو استنباط مسائل کے بارے میں پوری کوشش صرف کرنے اور انتہائی طور پر محنت کو بروئے کار لانے کی ترغیب دلایا کرتے اور بڑی تاکید کے ساتھ انہیں اس امر پر آمادہ کرتے رہتے تھے اور فرمایا کرتے تھے میں نے ان ممالک میں علم دین کو رائج کرنے، فقاہت و اجتہاد کی بنیاد قائم کرنے اور علوم ائمہ اطہار علیہم السلام کی نشر و اشاعت کے متعلق بڑی کوشش سے کام لیا ہے اور علم دین کے راستوں اور رشد و ہدایت کے طریقوں سے ہر قسم کے خس و خاشاک کو دور کر کے انہیں خوب واضح اور روشن کر دیا ہے مگر مجھے خطرہ ہے کہ کچھ مدت گزرنے اور میرے دنیا سے انتقال کر جانے کے بعد یہ آثار کہیں مٹ نہ جائیں اس لئے تمہیں بڑی توجہ، محنت اور جانفشانی سے کام کرنا چاہئے۔

والد ماجد کی ان ہدایات و ارشادات کے باعث میں نے ابتدا سے ہی دامن ہمت کو سمیٹے رکھا اور کمسنی کے زمانہ میں ہی مسائل دقیقہ کو حل کرنے اور تحقیقات انیقہ پر مشتمل رسائل کی تصنیف و تالیف میں مصروف رہا۔ رسالہ تجزی فی الاجتہاد، مسئلہ شک در رکعتین اولیین، مسئلہ تقلید اموات میرے اسی جذبے کے ثمرات ہیں۔

ان رسالہ جات میں سے بعض اعلیٰ حضرت غفران مآب علی اللہ مقامہ کی خدمت اقدس میں پیش کئے۔ آنجناب نے ملاحظہ فرما کر پسند کیا، تحسین سے نوازا اور فرمایا کہ یہ کلام تو ایک فاضل ماہر کے کلام کی مثل ہے۔ مبتدی اور نو آموز افراد کے کلام میں جو خامیاں پائی جاتی ہیں ان سے اس کلام کا دامن پاک ہے۔

اجازۂ روایت احادیث:

آپ کا سلسلہ اجازۂ روایت احادیث اپنے والد ماجد اعلیٰ حضرت سید دلدار علی غفران مآب اعلی اللہ مقامہ اور برادر بزرگ سلطان العلماء حضرت علامہ سلطان العلماء سید محمد رضوان مآب طاب ثراہ کے واسطہ سے جناب مستطاب مستغنی عن الالقاب، بحر ذاخر، فقیہ ماہر، محقق نحریر، عدیم النظیر، استاد الکل فی الکل، آقا محمد باقر بہبھائی طاب مرقدہ سے اتصال پذیر ہوتا ہے نیز جناب سید المحققین، سند المدققین، رئیس الفقہاء الفخام، یعسوب العلماء العلام، مولانا آقا سید علی طباطبائی عطر اللہ مرقدہٗ سے اور جناب عالم عامل، فاضل کامل، فقیہ جلیل، مجتہد عدیم البدیل، بحر العلوم مولانا سید محمد مہدی طباطبائی نجفی روح اللہ ضریحہ سے اور جناب علامہ فخر خاصہ و عامہ، سید السادات، منبع الفضل و الافادات، متکلم عدیم العدیل، مجتہد بے بدیل مولانا محمد مہدی ہدایت اللہ موسوی اصفہانی مشہدی طاب مشہدہ و طہر مرقدہ سے اور جناب عالم نبیل، فاضل جلیل، فقیہ ربانی مرزا محمد مہدی ابن القاسم موسوی شہرستانی سقی اللہ ثراہ جعل الجنۃ مثواہ سے اتصال و الحاق پذیر ہوتا ہے۔

مقلدین و عقیدتمندان:

آپ کے زمانہ میں مومنین ممالک ہند و سندھ، دکن بنگال، پنجاب اور کشمیر آپ کے کمال علم و عمل، جود و سخا، تواضع و تورع، تقویٰ اور عفاف کا صدق دل سے اعتراف و اقرار کرتے ہوئے آپ کے عقیدتمندان اور آپ کی تقلید سے مشرف تھے۔ ان علاقہ جات کے شاہانِ وقت بھی آپ کی تعظیم و تکریم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے خصوصاً بادشاہِ دین پناہ، ثریا جاہ مصلح الدین ابو المظفر محمد امجد علی شاہ جنت مکان انار اللہ برہانہ کو جناب علامہ سے انتہائی عقیدت اور کمال خلوص حاصل تھا چنانچہ شاہ عالی جاہ مذکور نے از خود حضرت علامہ کے نام نامی و اسم گرامی کی نقرئی مہر تیار کرائی، چاندی ہی کے الفاظ میں آنجناب کے درج ذیل خطابات اس پر کندہ کرائے اور آپ کی خدمت میں اسے پیش کیا۔ خطابات یہ تھے: "حاوی علوم دین، حامی سادات و مومنین، حافظ احکام الٰہ، مجتہد العصر، سید العلماء اور تمام دفاتر مملکت

کے اہلکاروں اور محررین کے نام حکم عالی صادر ہوا کہ جناب حضرت علامہ کے اسم گرامی کو ہمیشہ انہیں القاب سے ملقب کر کے تحریر کیا جائے۔

کتاب مستطاب حدیقہ سلطانیہ کی تصنیف و تالیف بھی اسی شاہ ذی جاہ کی خواہش سے عمل میں لائی گئی اور حضرت علامہ کے ایماء پر اس نیک بخت بادشاہ نے طلبہ علوم دین کے لئے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جس میں علماء کی اور فضلا ذی وقار کی مناسب مشاہرہ پر بحیثیت مدرس تعیناتی حضرت علامہ ہی کی رائے عالی پیرائے کے مطابق عمل میں لائی گئی اور طلباء کے لئے وظائف بھی مقرر کئے گئے نیز بادشاہ، دین پناہ، سکندر جاہ، ابوالمنصور ناصر الدین، سلطان عالم، محمد واجد علی شاہ نور اللہ مرقدہ بھی حضرت علامہ سے برابر راہِ عقیدت و خلوص پر ہی گامزن رہے اور ہمیشہ آپ کی انتہائی تعظیم و تکریم بجالاتے رہے۔ مدرسہ عالیہ کو اسی طور پر جاری اور قائم رکھا۔

حضرت علامہ اپنے برادر بزرگ کی نگاہ میں:

یہ سب حضرت علامہ کے کمالات عالیہ کے اثرات تھے اور انہیں کمالات کے پیش نظر جناب کے برادر بزرگ سلطان العلماء نے جو اپنے مقام پر مجمع علوم دین، مرجع سادات و مومنین، محافظ احکام اللہ العالمین کی شان عالی سے مشرف اور رضوان مآب کے ایسے بلند پایہ لقب سے ملقب تھے حضرت علامہ سید العلماء کو اپنی ذات والا صفات پر مقدم کر دیا تھا اور تمام امور کو ان کی رائے عالی پیرائے پر موقوف اور ان کے سپرد کر دیا تھا اور آپ کی نگاہ میں اپنے اس برادر خورد کی جو شان اور عظمت تھی اس کی عکاسی وہ الفاظ بھی کرتے ہیں جو آپ نے اپنے برادرزادہ ممتاز العلماء حضرت علامہ سید محمد تقی اعلی اللہ مقامہ کے اجازہ کی تحریر میں حضرت سید العلماء علیین مکان طاب ثراہ کی شان عالی شان میں استعمال فرماتے ہیں چنانچہ ان کی شان میں لکھتے ہیں:

> السمیدع الالمعی، والحبر اللوزعی بدیٔ النظر الصائب، و الذهن الثاقب، عالی الکعب فی الفنون، العظیم طویل الباع فی العلوم النقلیة، الرائع فی ریاض الاجتهاد والافادة، الکارع من حیاض احادیث الجدودة السادة، سید العلماء العالمین، سند الفقهاء الکاملین عین الانسان و انسان العین اخی دصنوی و مهجة قلبی السید الحسین لازال قریر العین محفوظا عن اصابة العین.

یہ الفاظ جن معنوی بلندیوں، عظمتوں اور لطافتوں کے حامل ہیں انہیں ایک عربی دان ہی سمجھ سکتا ہے اور ان کی تصویر کشی کے لئے ایسی طولانی شرح درکار ہے کہ دامن وقت و قرطاس میں جس کی وسعت نہیں۔

حضرت علامہ علیہ الرحمہ علماء عراق و ایران کی نگاہ میں:

حضرت علامہ علیین مکان اعلی اللہ مقامہ فی دار الکرامہ کے ہمسر علماء عتبات عالیات نجف اشرف و کربلائے معلیٰ وغیرہ سب آپ کے کمال فضل و اجتہاد کو تسلیم کرتے اور آپ کو بڑی عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ سب کے قلوب مبارکہ میں آنجناب کی محبت و مودت کی کھیتیاں سرسبز اور لہلہاتی رہتی تھیں، باہم خط و کتابت اور مراسلات کے ابواب کھلے رہتے تھے۔ اس کے ثبوت کے لئے عالم جلیل، فاضل نبیل، حضرت علامہ سید حسین الموسوی اعلی اللہ مقامہ مہتمم طباعت کتاب مستطاب حدیقہ سلطانیہ نے تذکرۃ المصنف میں عالی جناب معلیٰ القاب، جامع منقول و معقول، واقف اسرار فروع و اصول، شیخ الاسلام، مجتہد الانام عالی حضرت شیخ محمد حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ، صاحب جواہر الکلام شرح شرائع الاسلام کا ایک طولانی مکتوب مرسلہ بسوئے حضرت سند الفقہاء، سید العلماء مولانا سید حسین علیین مکان رحمۃ اللہ و رضوانہ علیہ نقل کیا ہے جس میں شیخ صاحب مرحوم و مغفور اعلی اللہ مقامہ نے نہایت ہی انوکھے انداز میں اور نرالے طریقہ سے حضرت علامہ سید العلماء رحمۃ اللہ علیہ کی عظمت و جلالت اور فضل و کمال کی مدح سرائی فرمائی جس کے چند ایک اقتباسات سپردِ قلم کئے جاتے ہیں۔ پورے خط کو زینت قرطاس کرنے سے خوف طوالت مانع ہے، چنانچہ عالی جناب شیخ محمد حسن صاحب نجفی طاب ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ حضرت علامہ کی شان والا شان میں یوں رقم طراز ہیں:

هو الشاخص فی مرابع الاجتهاد معرسا و قائلا و الصادر و الوارد عذب معین معتلا و ناهلا، الحارس ثمر الاسلام و شرائعه والفارس نقد القرآن فی حدائق جوامعه و الحبیب الذی تقربه کل عین والروح التی بین الجنبین، ذی القدر العُلی سید العلماء السید حسین نجل العلامة السید دلدار علی اعلی الله مقامه لازالت طلائع التوفیق عاکفة علیه و محاسن الایام متصلة لدیه بالنبی واله الطاهرین صلی الله علیه و علیهم اجمعین (بغرض اختصار ترجمہ ترک کیا جاتا ہے)۔

تقسیم اوقات:

کتاب تذکرۃ العلماء نیز ایسے معتمدین کرام کے بیان سے کہ جو حضرت علامہ کی خدمت بابرکت میں عموماً حاضر رہتے تھے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علامہ نے اپنے شب و روز کے اوقات کو اس طرح تقسیم کر رکھا تھا کہ ابھی رات کا کچھ حصہ باقی ہوتا تھا کہ آپ مسجد میں تشریف لے جاتے تھے اور طلوع صبح صادق تک نوافل شب اور اذکار وغیرہ میں مشغول رہتے۔ صبح صادق کے بعد نماز فریضہ با جماعت بجا لاتے اور پھر ادعیہ و تعقیبات میں مصروف ہو جاتے۔ جب فراغت ہو جاتی تو اندرون خانہ تشریف لے جاتے اور ضروری کاغذات کو ملاحظہ فرماتے اور پھر کچھ وقت تصنیف و تالیف میں صرف کرتے۔

جب کسی قدر دن بلند آجاتا تو بیرون خانہ تشریف لاتے۔ اتنے تک بکثرت لوگ جمع ہو جاتے، طلبہ کرام، فضلاء عظام اور طالبین فتاویٰ وغیرہ کا ہجوم ہو جاتا۔ اوّلاً آپ طلباء کرام کو درس دیتے جن میں سے اکثر فضلاء کبار اور علماء عالی وقار ہوتے۔ بعد ازاں ہر حاجت مند کی حاجت روائی کے لئے مناسب وقت صرف فرماتے۔ جب آفتاب عالم تاب زوال پذیر ہوتا تو نماز با جماعت کے لئے مسجد میں تشریف لے جاتے اور بعد از تعقیبات نمازِ عصر واپس مراجعت فرما کر اپنے برادر بزرگ حضرت سلطان العلماء سید محمد قدس سرہ کی خدمت اقدس میں تشریف لے جاتے۔ کچھ دیر وہاں توقف فرما کر پھر اپنے دولت کدہ پر واپس تشریف لاتے اور دوبارہ تدریس طلبہ میں مشغول ہو جاتے۔ نماز مغرب دولت کدہ پر ہی باجماعت ادا کر کے استفادہ اور طلب رشد و ہدایت کرنے والوں کے لئے مجلس قائم کرتے، ان کو درس دینے کے بعد افتاء مسائل میں مصروف ہو جاتے۔ کبھی کبھی تو نصف شب تک مسائل پر دستخط ثبت فرمانے میں مشغول رہتے۔

موعظہ شریفہ:

آپ بالالتزام سارے سال میں بروز جمعہ، دوشنبہ اور پنجشنبہ اور ماہ رمضان المبارک میں ہر روز نماز عصر کے بعد موعظہ فرمایا کرتے جس میں تفسیر قرآن، تصحیح عقائد، توضیح حقائق و دقائق پر مشتمل بیانات سے حاضرین کو مستفیض فرماتے۔ لوگ آپ کے پر از تاثیر مواعظ و نصائح سماعت کرنے کے لئے جوق در جوق جمع ہوتے اور ہدایت و رشد کے بیش قیمت موتیوں سے اپنے دامن پر کر کے واپس ہوتے۔

تصانیف و تالیفات:

بکثرت تصنیفات و تالیفات آپ کے قلم حق رقم سے ظہور پذیر ہوئے جن کی فہرست درج ذیل ہے:

(۱) رسالہ تجزی فی الاجتہاد: یہ رسالہ آپ نے سترہ سال کی عمر میں تصنیف فرمایا، جیسا کہ تذکرہ العلماء سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) رسالہ در تحقیق جوازِ تقلید میت و عدم آں،

(۳) رسالہ مسئلہ شک در رکعتین اولیین: یہ دونوں رسالے بھی آپ نے اپنی عمر کے ابتدائی دور میں تصنیف فرمائے۔

(۴) مناہج التدقیق و معارج التحقیق: یہ عدیم النظیر اور لاجواب کتاب تحقیقات دقیقہ و استدلالات انیقہ پر مشتمل ہے۔ حضرت علامہ اعلی اللہ مقامہ نے اپنے فرزند ارجمند افضل المتکلمین، فخر المدرسین، ممتاز العلماء سید محمد تقی جنت مآب کے لئے جو اجازہ تحریر فرمایا تھا اس میں آپ نے تذکرہ فرمایا کہ کتاب مناہج التدقیق و معارج التحقیق کو میں نے نہایت عمدہ طرز و طریق پر تصنیف کیا ہے۔ اسے میں نے دلائل اور تنقیح مسائل سے پُر کیا ہے اور اقوال مختلفہ کے نقص و ابرام کو

ایسے نہج پر بیان کیا ہے کہ اہل حق نے اسے بہت پسند کیا۔ اس میں تدقیقات کا ایک ایسا حصہ بیان کیا کہ جو علماء اسلاف کی کتابوں میں نہیں پایا جاتا ہے لیکن بعض امراض کے معارض ہو جانے کے باعث وہ کتاب پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی (انتہیٰ)۔ اس کتاب کا مقصد ثانی احکام صلوٰۃ سے متعلق ہے جس میں اوقات نماز یومیہ سے لے کر سلام تک کے احکام بیان ہوئے ہیں اور یہ ایک ضخیم جلد بن گئی ہے۔

(۵) وجیز رائق: اجازۂ مذکورہ میں خود حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ وجیز رائق کو میں نے بہترین اور بلند پایہ طریقہ پر تالیف کیا ہے، احکام طہارت کا ایک شطر وافی اس میں تحریر کر دیا ہے۔ اس کتاب کا باب الطہارۃ طبع ہو چکا ہے۔

(۶) روضۃ الاحکام: حضرت علامہ نے اجازہ مذکورہ میں ہی تحریر فرمایا ہے کہ مقلدین کی ایک جماعت نے پرزور اصرار کیا تھا کہ روضۃ الاحکام کی تالیف کو انجام دیا جائے مگر میں دیگر چند رسائل متفرقہ میں مشغول ہو گیا اس وجہ سے اس کتاب کے اتمام کی نوبت نہیں آسکی (انتہیٰ)۔ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار مقاصد پر مشتمل ہے کیونکہ اس کتاب میں جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق مسائل فقہ کے طالب کی بصیرت سے ہوتا ہے یا اصل مسائل فقہ سے، شق اول مقدمہ ہے اور شق ثانی میں اگر نیت شرط ہو تو عبادت کہلاتے ہیں ورنہ اگر اس میں ایجاب وقبول دونوں متحقق اور موجود ہوں تو وہ عقود کہلاتے ہیں اور اگر اس میں صرف ایجاب کا وجود ہو تو وہ ایقاعات کہلاتے ہیں اور اگر ایجاب وقبول میں سے کوئی بھی معتبر نہ ہو تو وہ احکام کہلاتے ہیں۔ علم فقہ کے ارکان صرف یہی چار ہیں۔ انتہیٰ کلامہ

مقدمہ بھی اور مقصد اوّل بھی کہ جو احکام طہارت، صلوٰۃ وصوم کے بیان میں ہے یہ مطبوع ہو چکے ہیں اور مقصد چہارم بھی طبع ہو چکا ہے کہ بیان میراث میں ہے۔

(۷) رسالہ مبسوط دراحکام میراث بعبارۃ عربی۔

(۸) کتاب مستطاب حدیقۂ سلطانیہ مذکور۔ بعدازاں اس کتاب کے ابواب کی فہرست تحریر کی ہے۔

(۹) رسالہ وسیلۃ النجاۃ فارسی دراصول دین تا آخر مبحث نبوت۔

(۱۰) رسالہ در بیان مسئلہ جلالۃ الطہارۃ۔

(۱۱) رسالہ منع از بیع مائعات نجس و متنجس۔

(۱۲) رسالہ طرد المعاندین در جواز لعن بر اہل نفاق، یہ رسالہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

(۱۳) حاشیہ بر ریاض المسائل مشہور بشرح کبیر بر کتاب الصوم و کتاب الہبہ و کتاب الصدقہ۔

(۱۴) تعلیقات بر شرح ہدایۃ الحکمۃ ملا صدر الدین شیرازی۔

(۱۵) رسالہ تحقیق النسبۃ بین الحقیقۃ والمجاز۔

(۱۶) تفسیر سورۃ الحمد، یہ نہایت ہی مبسوط تفسیر ہے۔

(۱۷) تفسیر سورۃ البقرۃ، از شروع تا چند آیات۔

(۱۸) تفسیر سورہ ہل اتی علی الانسان۔

(۱۹) تفسیر سورۃ التوحید۔

(۲۰) تفسیر آیۃ کریمۃ: کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، متضمن بر نقض کلام فخر رازی۔

(۲۱) المجالس المفجعہ

(۲۲) الفوائد فی تنقیح العقائد، ملقب بہ افادات حسینی، یہ علامہ علیہ الرحمہ کی آخری تصنیف ہے جو شیخ احمد احسائی اور اس کے شاگرد سید کاظم رشتی کے اقوال کی تردید میں تحریر فرمائی۔

صاحب تذکرۃ العلماء نے مصنفات سید العلماء علیین مکان کے ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت علامہ کو شب و روز مسائل متفرقہ کے جوابات تحریر کرنے کا اتفاق ہوتا ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آپ بعض مسائل کی تفصیل پر کما حقہ خامہ فرسائی فرما دیتے۔ لہٰذا اگر تمام مسائل کو جمع کیا جائے تو ان کی کئی ضخیم جلدیں بن جائیں گی۔ اس طرح آپ نے بذریعہ مواعظ حسنہ جن مسائل عالیہ کی تشریح فرمائی ان کا دامن بھی نہایت وسیع ہے لیکن علامہ رحمہ اللہ نے چونکہ ان چیزوں کی تدوین کا قصد نہیں فرمایا اس لئے ان کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔

کتابت قرآن مجید:

باوجود مشاغل کی اس کثرت اور بہتات کے آپ بعض اوقات قرآن مجید کے متن کی کتابت کا ثواب حاصل کرنے کی سعی اور کوشش فرماتے رہتے چنانچہ لکھتے ہیں کہ آپ کے دست مبارک کا لکھا ہوا قرآن مجید کا ایک نسخہ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے عالم عامل، فاضل کامل مجتہد علی الاطلاق، المشہور بین الآفاق، کریم ابن کریم جناب مستطاب سید محمد ابراہیم اعلی اللہ مقامہ کے پاس موجود پایا گیا جس کا خط بہترین خط تھا اور اس کے گردا گرد حضرت علامہ ہی کے دست مبارک کے لکھے ہوئے بکثرت حواشی موجود تھے اور اس کے آخر میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

قد وقع الفراغ من كتابة القرآن المجيد والفرقان الحميد بتائيد الله سبحانه وحسن توفيقه على يد اقل الخليفة بل لا شئى فى الحقيقة اقل العباد عملا و اكثر هم زللا ابن العلامة المرحوم الساكن فى جوار رحمة ربه الكريم السيد دلدار على رفع الله درجاته فى جنات النعيم السيد حسين صانه عن كل شين ورزقه شفاعة سيد البشر رسول الثقلين صلى الله عليه واله وكان ذلك يوم الاحد

لخمس بقين من شهر جمادی الآخرة سنة ستة اربعين بعد الف ومأتين من الهجرة النبوية على الصادع بها الف الف تسليم و تحية.

تائیدات الھیہ و کرامات ربانیہ:

صاحب تذکرۃ العلماء تحریر کرتے ہیں کہ حضرت علامہ نور اللہ مضجعہ اعلی اللہ مقامہ تائیدات ربانیہ سے مؤید اور فیوضات یزدانیہ کا مہبط تھے ورنہ باوجود مشاغل کی اس کثرت اور طبع کے نحیف اور کمزور ہونے کے ایک فرد بشر سے کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ ایسے کارنامے اس کے دست ہائے مبارکہ پر ظہور پذیر ہوں اور اتنی مشقتوں اور تکالیف کو برداشت کر سکے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی حد تک صفات ملائکہ سے متصف کیا تھا کیونکہ آپ خورد ونوش اور کھانے پینے کے معاملہ اور راحت و آرام اور نیند وغیرہ کے سلسلہ میں بہت کم مقدار اور اقل قلیل صورت پر اکتفاء فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نہایت نحیف الطبع تھے۔ قد وقامت میانہ تھا اور چہرہ مبارک پر ہر وقت نورانیت برستی رہتی تھی۔ رُخ اَنور سے نور ساطع ہوتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کمزوری اور ضعف کی صورت میں شب و روز تصنیف و تالیف تدریس و موعظہ وحل مسائل وغیرہ میں مصروف رہنا ہی گرچہ اپنے مقام پر ایک خارق عادت امر اور کرامت کی شان رکھتا ہے لیکن یہی نہیں اس کے علاوہ آپ سے جو کرامات صادر ہوئے، اگر لکھتے ہیں تو ان کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔

اسوۃ المتکلمین، قدوۃ المجتہدین، اکرام الناس مفتی سید محمد عباس قدس سرہ کتاب اوراق الذہب میں تحریر کرتے ہیں کہ لکھنؤ میں ایک سال حبس باراں ہوگیا، بارش رک گئی، لوگوں نے درگاہ رب العزت میں تضرع اور زاری شروع کی۔ حضرت علامہ سید حسین علیین مکان اعلی اللہ مقامہ نے صحرا میں جا کر نماز استقاء باجماعت ادا کی۔ ابھی آپ نے چادر کو حرکت نہ دی تھی کہ بارش شروع ہوگئی اور اتنی کثرت سے مینہ برسا کہ ہر طرف پانی ہی پانی ہوگیا۔

وفات حسرت آیات:

باوجود ضعف ناتوانی کے بطریق مذکور مشقتیں اور تکالیف برداشت کرنے کے باعث متعدد امراض وعوارض لاحق ہوگئے بالآخر روحانی صدمات اور جسمانی امراض کی تاب نہ لا سکے اور شب شنبہ سترہ ماہ صفر ۱۲۷۲ھ ندائے يَاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبْدِي وَادْخُلِي جَنَّتِي، پرصدائے لبیک بلند کردیا اور عالم قدس کو رحلت پذیر ہوگئے۔

آپ کی نماز جنازہ کے لئے اس کثرت سے لوگوں کا اجتماع اور اژدہام ہوگیا کہ لکھنؤ کی تاریخ میں اتنا اجتماع کسی کے جنازہ پر دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اب سوچنے لگے کہ کس مقام پر نماز جنازہ ادا کی جائے جس میں اس قدر آدمیوں کا انبوہ سما سکے بالآخر تجویز کیا گیا کہ نواب آصف الدولہ کے امام باڑہ کے صحن میں نماز جنازہ ادا کی جائے جو کہ شہر لکھنؤ کی

عمارتوں میں سے سب سے بڑی اور وسیع ترین عمارت ہے چنانچہ آپ کے برادر بزرگ حضرت مولانا سلطان العلماء سید محمد رضوان مآب اعلی اللہ مقامہ نے اس امام باڑہ آصفیہ میں نماز جنازہ پڑھائی امام باڑہ غفران مآب میں غربی حجرہ میں اپنے والد ماجد غفران مآب رضوان اللہ علیہ کی پائنتی کی جانب مدفون کر دیئے گئے تا حال سنگ سفید کی ایک لوح اور چوب صندل کی ضریح قبر اقدس پر نصب ہے۔ مدت عمر اکسٹھ سال دو ماہ اور تین روز ہوتی ہے۔

تقریظ وقطعات تاریخ:

از رشحات قلم فیض رقم عالی جناب علی جناب، معلیٰ القاب، حبر علام، تحریر فہام، مفتی ملتِ بیضاء محافظ شریعت غرا "اسوۃ المتکلمین قدوۃ المجتہدین اکرم الناس" مفتی محمد عباس دامت ایام افاداتہ وافاضتہ۔

اصل۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ گل سر سبد کلم و کلام و نور حدیقه دین و اسلام، حمد خداوند مِنْعام است که از توفیقاتش دریں ایام، برکت التیام، جلد امامت از حدیقۂ سلطانیه که روضۂ ایمانیه و منجملۂ تصانیف محقق علامه و مدقق فهامه سید العلماء والمجتهدین مشید ارکان دین، مرجع الانام، کافل الارامل الایتام الشهیر فی العجم والعرب المذکور مناقبه فی اوراق الذهب مولی الخافقین المعروف فی المشرقین سمی ابی عبدالله الحسین مولانا السید حسین اعلی الله مقامه و اکرمه فی دار المقامه می باشد باهتمام و مساعی جمیله عالی شان والا دودمان زبدة السادات مولوی سید حسین ایده الله بالائمة المصطفین در قالب طبع ریخته شد الحق که این کتاب مستطاب مشتمل بر فوائد بی حساب و نادرۂ روزگار لطافت و متانتش کالشمس في رابعة النهار بر نظار آشکار و مستغنی از اظهار و طبعش موجب احیاء ذکر جناب علیین باب و باعث رضا رب الارباب، و خوشنودئ آئمه اطهار سلام الله علیهم ما اتصل اللیل والنهار است و الحمد لله علی نواله والصلوة علی محمد و اٰله.

قطعہ تاریخ بتخریج یک سال:

شده شهره کتابی که ثواب در جر طبعش	گل عیش جاودانی بدهند در قیامت
بمصنفش چه پرسی که ملک کند سلامش	بفلک رسیده نامش بجلالت و شهامت
زاد فگنده سر را قلم ز سال طبعش	چه بهار تازه کامد لحدیقۂ امامت

قطعہ دیگر بے تعمیہ:

فرح بخش است سلطانی حدیقه ز گلهای عبارات انیقه
مصنف سید علامه بود که بنوشت این مضامین دقیقه
سمیشن ریخته در قالب طبع که از بهر شیوع است این طریقه
بقرط زر که در معدن نهان بود مزین گشت هر صاحب سلیقه
بود نام و نشان و سال طبعش کرامات مصنف في الحقيقة
برآمد مصرع تاریخ طبعش بشد شائع امامت از حدیقه ۱۳۰۴ھ

ترجمہ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

چمن دین اسلام کا غنچہ اور گلہائے کلمہ وکلام کے ظرف کا بہترین پھول۔ منعم حقیقی خداوند عالم کا حمد وشکر ہے کہ اس بابرکت ایام میں اس کی توفیقات شامل حال ہونے کے باعث کتاب مستطاب حدیقۂ سلطانیہ کی جلد امامت جناب والا شان عالی خاندان زبدۃ السادات مولوی سید حسین ایدہ اللہ بتصدق ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے اہتمام اور مساعی جمیلہ سے مطبوع ہو چکی ہے کہ جو حدیقہ سلطانیہ ایک روضۂ ایمانیہ ہے اور جناب محقق علامہ مدقق فہامہ سید العلماء والمجتہدین مشید ارکان دین، مرجع ہر خاص و عام کفیل بیوہ گان و ایتام شہیر عجم و عرب کہ جن کے محامد و مناقب اوراق الذہب میں مذکور اہل مشرق و مغرب کے رہبر مشارق و مغارب میں شہرت یافتہ حضرت جناب امام ابی عبداللہ حسین علیہ السلام کے ہمنام ہیں یعنی جناب مولانا سید حسین اعلی اللہ مقامہ واکرمہ فی دار الکرامہ کے تصنیفات میں، سے ہے بے شک یہ کتاب مستطاب بے شمار فوائد پر مشتمل اور نادرۂ روزگار ہے اس کی لطافت اور متانت اظہار سے مستغنی اور دیکھنے والوں کے لئے مثل الشمس فی رابعۃ النہار واضح اور آشکار ہے اس کا طبع ہو جانا جناب مصنف علام سید حسین علیین مکان کے ذکر عالی کے احیاء کا موجب اور جناب رب العزت خداوند عالم کی خوشنودی اور ائمہ اطہار علیہم السلام الیٰ ابد الآباد کی رضامندی کا باعث ہے۔

والحمد للہ علی نعمہ والصلوٰۃ علی محمد و آلہ۔

قطعہ تاریخ بذریعہ تخریج یک سال:

اس کتاب مستطاب کو انتہائی شہرت حاصل ہوئی کیونکہ اس کے طبع ہونے کا ثواب بروز قیامت زندگی جاوید کا

خوشبودار پھول عطا کیا جائے گا اس کے مصنف علام کی کیا پوچھتے ہیں اس پر تو فرشتے سلام کرتے ہیں اور اس کا نام عظمت وجلالت کے باعث آسمان تک رسائی حاصل کر چکا ہے چونکہ کتاب مذکور کی طباعت کے سال چمن امامت میں تازہ بہار آ گئی ہے اس لئے میرے قلم نے از روئے ادب سر تسلیم کر دیا ہے۔

دوسرا قطعہ بغیر ابہام:

ترجمہ:

حدیقۂ سلطانیہ اپنی عمدہ عبارتوں کے خوشنما پھولوں کے باعث فرحت بخشنے والا ہے اس کا مصنف کہ جس نے یہ مضامین دقیقہ سپردِ قلم کئے ہیں بے شک بہت بڑا عالم اور سید تھا مصنف علام کے ہمنام دوسرے ایک سید نے اسے طبع کرایا کیونکہ کسی کتاب کے فائدہ کو عام اور شائع کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

ہر صاحب سلیقہ اس کتاب کے طفیل سونے کے ایک ایسے گوشوارے سے مزین ہو گیا کہ پہلے قلب مصنف کی کان علم میں پنہاں تھا اس کتاب کی طباعت اور اس کا نام ونمود درحقیقت مصنف کے کرامات میں سے ہے اس طباعت کی تاریخ کا یہ مصرع ظاہر ہوا کہ بشد شائع امامت از حدیقہ ۱۳۰۴۔

جناب حضرت علامہ مفتی محمد عباس صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ نے جب کتاب مستطاب حدیقہ سلطانیہ کی تاریخ کے متعلق مذکورہ بالا دو قطعات ارسال کئے تھے تو ساتھ ہی مفتی صاحب مرحوم نے ایک خط بھی ارسال کیا جس کی نقل درج ذیل ہے۔

اصل:

عالی مرتبت والا منزلت مصدر لطف و محبت، زاده عطف بعد سلام با اکرام ملتمس آنکه الوکه ولاد مسبوکه طلاء اعنی نمیقه انیقه و تعلیقه رشیقه رسید و سرور موفور بخشید در طبع حدیقه سلطانیه که کتابی است عزیز الوجود بذل جهد نموده اند۔ از آن خیلی مسرور گردیدم انشاء الله أجر این همت و خلوص نیت از بارگاه رب العزت بروز قیامت خواهند یافت، نحیف باوجودیکه در مکاره و آلام و اقسام اسقام گرفتارم و دل و دماغ حاضر بتاریخ گوئی ندارم اما باستماع این مژده روح پرور و خبر فرحت اثر بالاستعجال دو تا قطعهٔ تاریخ انشاء کردم، و همین روز تقریظ هم تحریر نمودم چنانکه مصحوب این خط بملاحظه خواهد رسید، اما بسبب آنکه در ڈاک خانه تعطیل بود تعویق افتاد و تاخیر رو داد. فقط السید محمد عباس عفی عنه.

از مٹیا برج کلکتہ ۸ / ربیع الثانی ۱۳۰۴ھ

ترجمہ: بعد از سلام با اکرام عرض اینکہ محبت نامہ سبیکہ زر یعنی جناب والا کا خوبیوں اور کمالات سے پر مکتوب گرامی موصول ہو کر بکثرت مسرت اور شادمانی کا باعث ہوا۔ کتاب عزیز الوجود حدیقہ سلطانیہ کی طباعت کے لئے سعی بلیغ سے کام لیا گیا ہے، بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ اس ہمت اور خلوص کا اجر انشاء اللہ بروز قیامت حاصل ہوگا۔ یہ کمزور و ناتواں، اگرچہ گوناگوں تکالیف و آلام اور قسم قسم کی بیماریوں اور اسقام میں مبتلا ہے اور تاریخ گوئی کے لئے دل و دماغ حاضر نہیں تاہم اس روح افزا خوشخبری اور مسرت اور خیر کے سنتے ہی بڑی شتابی اور عجلت سے تاریخ کے متعلق دو اور قطعات تیار کر دیئے ہیں۔ اسی روز کتاب مذکور کے متعلق تقریظ کو بھی سپرد قلم کر دیا۔ چنانچہ حضور والا اس خط کے ساتھ ان پر دو اشیاء کو بھی ملاحظہ فرماویں گے۔ چونکہ ڈاک خانہ میں تعطیل تھی اس رکاوٹ کے باعث قدرے تاخیر ہوگئی۔

فقط، السید محمد عباس عفی عنہ، از مٹیا برج کلکتہ ۸ / ربیع الثانی ۱۳۰۴ھ

(خط دیگر کا متن)

جناب علامہ مفتی محمد عباس اعلی اللہ مقامہ عالی مرتبت والا منزلت مصدر لطف و محبت سلالۃ الائمۃ المصطفین صین عن کل شین، بعد سلام با اکرام ملتمس آنکہ مدتیست کہ جواب خط سامی مع تقریظ دو تا تاریخ فارسی نگاشتم و ارسال داشتم و خیال کردم کہ شاید نرسیدہ و تلف گردیدہ مگر پریروز از مکتوب مرغوب مفصل معلوم شد کہ خیلے مسرور و محبور شدہ اید فالحمدللہ علی ذلك لکن ازیں نامہ محبت شمامہ کہ سطر سطرش مودت خیز و عطف و رأفت انگیز بود.

معلوم شد کہ احباب اطیاب تاریخ و تقریظ عربی، میخواہند بسبب کثرت مشاغل و توارد مسائل در مسائل و ضعف و ناتوانی و غایت بی سامانی کہ دارم چہ بگوئیم و چہ نویسم بہرحال در استعجال و توزع بال یک تقریظ مع دو تا تاریخ عربی نگاشتہ میفرستم اگر لطفے دراں نیست عیاں را حاجت بیان نیست فان العذر واضح صریح فاین الفکر الصحیح و اگر ہست خیلے عجب است و این تاریخ و تقریظ را مع اعراب و حواشی چاپ سپارند،

فقط السید محمد عباس عفی عنہ۔ از مٹیا برج کلکتہ یاز دہم جمادی الأولی ۱۳۰۴ھ

ایک دوسرا خط بھی ارسال کیا جس کے الفاظ یہ ہیں:

جناب عالی مرتبہ، بلند منزل، مہر و محبت کے مصدر، برگزیدہ ائمہ اطہار علیہم السلام کی اولاد، ہر عیب سے محفوظ، جناب کی خدمت میں پس از سلام و اکرام التماس ہے کہ مدت ہوئی گرامی نامہ کا جواب مع تقریظ اور دو عدد قطعات تاریخ بزبان فارسی لکھ کر

ارسال کیا تھا اور خیال ہوا کہ شاید وہ ضائع ہو گیا ہے خدمت حضور میں نہیں پہنچ سکا لیکن پرسوں جناب والا کے نامہ سے منفصل معلوم ہوا کہ حضور تقریظ اور قطعات مذکورہ کے باعث بہت خوش ہوئے ہیں اور جناب نے بڑی مسرت و بہجت محسوس کی ہے فالحمد للہ علی ذلک لیکن اسی نامہ محبت شمامہ سے کہ جس کی ہر ہر سطر مودت خیز اور مہر و رافت انگیز ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ احباب اطیاب کی خواہش اور تمنا ہے کہ تقریظ و تاریخ بزبان عربی تحریر کروں ضعف و ناتوانی اور انتہائی بے سروسامانی کے ساتھ ساتھ کثرت مشاغل اور مسائل و رسائل کا جو توارد و تسلسل دامن گیر ہے اس کے سبب ظاہر ہے کیا کہہ سکتا اور کیا لکھ سکتا ہوں؟

بہر حال پریشانی اور عجلت کی حالت میں ایک تقریظ اور دو عدد قطعات تاریخ عربی میں سپرد قلم کر کے ارسال کر رہا ہوں اگر ان میں کوئی خوبی اور لطف نہ ہو تو اس کی علت اس قدر واضح ہے کہ عیاں را چہ بیان؟ کیونکہ عذر صراحۃً ظاہر ہے لہٰذا فکر صحیح کیسے میسر آسکتا ہے اور اگر یہ کسی خوبی کے حامل ہیں تو پھر حالات بالا کے پیش نظر یہ ایک انتہائی تعجب خیز امر ہے تاریخ مذکور اور تقریظ ہر دو کو اعراب اور حواشی کے ساتھ چھاپنے کا اہتمام کیا جائے۔

السید محمد عباس عفی عنہ

از مٹیا برج کلکتہ. ۱۱/ جمادی الاول ۱۳۰۴ھ

تقریظ بزبان عربی:

از جناب مفتی محمد عباس اعلی اللہ مقامہ

(اصل)

بشری لکم یا معشر الشیعة الامامیة قد شاع کتاب الامامة من الحدیقة السلطانیة للامام الهمام حجة الاسلام المقیم بدر الاسلام سید العلماء الاعلام سمی سید الشهداء علیه السلام وهو کتاب مستطاب مشتمل علی مباحث دقیقة فی عبائر رشیقة خلت عنها الکتب العتیقة فانعموا النظر فیه وتدبروا ما فی مطاویه و محاویه فانه الدین القویم والصراط المستقیم فاستندوا الیه و اعتمدوا علیه و اتبعت هذا التقریظ بتاریخین فی القریض احدهما خال عن التکلف و الورطة وثانیهما وان اشتمل علی التعمیة لکونه ناقصا محتاجا الی التتمیم منجبرا بعدد حرف الجیم لکنه لاشعاره بالمصنف و المصنف و السلالة وایمائه الی الطبع ارغب وارفق بالطبع مع أن مثل هذه التعمیة الجدیدة لطیف لذید لما فیها الخفاء والایهام التشحید.

قطعہ تاریخ

طوبی لسلطان الحدائق انه　　فیض جری من سید العلماء
باب الامامة شیدت أركانه　　بیراع جرذی ید بیضاء
هو فی حدیقة جنة و ریاضه　　مخضرة الاغصان فی الغبراء
قد ضل ناس كالغلاة وغیرهم　　فی كل داد كاتم الارجاء
یا طالبا للحق ارخ طبعه　　الحق باب[۱] حدیقة غلباء[۲]
قد كان مكتوبا و مكتوما　　فبالطبع اجتلی كالليلة القمراء
فبذلت اقصی[۳] الجهد فی تاریخه　　شاعت حدیقة افقهه الفقهاء

۱۳۰۱/۳/۱۳۰۴[۱][۲][۳]

ترجمہ:

اے شیعہ امامیہ! تمہیں خوشخبری ہو کہ حدیقہ سلطانیہ کی کتاب الامامۃ شائع ہو چکی ہے جو امام ہمام حجۃ الاسلام مقیم "جنت" دار السلام سید العلماء الاعلام حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے ہم نام یعنی آقائے سید حسین علیین مکان اعلی اللہ مقامہ کی تصنیف ہے اور وہ ایسی پاکیزہ کتاب ہے جو دقیق بحثوں، پیاری عبارتوں، فصیح اور سلیس الفاظ میں عمدہ نکات اور ایسی پختہ و محکم تحقیقات پر مشتمل ہے کہ جن سے کتب اسلامی خالی تھیں لہٰذا اس میں غور و خوض کے ذریعہ تمہیں دادِ فکر دینا چاہئے اور اس کے مضامین و مفاہیم کے متعلق خوب سوچ و بچار اور حسن تدبر سے کام لینا چاہئے کیونکہ یہ کتاب دین قویم اور صراط مستقیم ہے لہٰذا اس پر اعتماد اور بھروسہ کر کے اس کی جانب اپنے آپ کو منسوب کرنے کا شرف حاصل کیجئے۔

---

[۱] قوله باب حدیقة غلباء۔ غلباء باغی باشد که درختانش باهم پیوسته باشند، منه قوله تعالی و حدائق غلبا چونکه حدیقه سلطانیه مثمر ثمرات عظام و كثرة المباحث و متسق النظام و گویا که باب دار السلام است این صنعتها برائش خیلی مناسبت دارد و حدائق بهشت عنبر سرشت را که درین آیه مذکور است یاد می آرد. ۱۲ مدظله

[۲] همزه اگرچه ملفوظ میشود ولکن در تاریخ محسوب نیست بلکه نزد اساتذه محققین مثل خلیل مکتوب نیست، عنه

[۳] معناه اللفظی واضح و أما المعنی بالتطرالی المعنی فهوا فی زدت فی التاریخ عدد حرف الجیم فان الاقصی معناه الاعلی جمعه الاقاصی فی مقابلة الادانی واقصی اللفظ اعلاه أی الحرف الأول منه كما أن ادنی اللفظ معناه حرفه الاخیر ولذا أرخ مغلوبیة الروم یقوله تعالی "غلبت الروم فی ادنی الأرض" وهو الضاد فاقصی لفظ الجهد الجیم و بذلها فی التاریخ صرف عدد هائیه. ۱۲ عنه ظله تعالی.

اس تقریظ کے بعد میں نے بذریعہ کلام منظوم اس کی تاریخ کے دو عدد قطعات سپرد قلم کئے ہیں جن میں سے ایک ت تکلف اور تمہید سے خالی ہے اور دوسرا اگر چہ ایک اغلاق اور تعمیہ پر مشتمل ہے کیونکہ وہ ناقص ہونے کے باعث عدد حرف جیم کو تاریخ میں شمار کرنے کی طرف احتیاج رکھتا تھا لیکن یہ تاریخ طبیعت کے زیادہ موافق اور مناسب ہے کیونکہ یہ مصنف کتاب کے خاندان اور کتاب اور اس کی طباعت کی طرف اشارہ کرتا ہے علاوہ ازیں اس قسم کا اغلاق اور چیستاں ہونے کی صورت بطرز جدید زیادہ لطیف اور لذیذ شمار ہوتی ہے کیونکہ اس میں خفاء ابہام کی چاشنی موجود ہے۔

ترجمہ قطعہ تاریخ:

سلطان الحدائق کو خوشخبری نصیب ہو کہ سید العلماء کی طرف سے فیض جاری ہوا ہے ایک عالم نحریر کے قلم سے کہ جو ید بیضاء رکھنے والا ہے باب امامت کی بنیادیں استحکام پذیر ہوگئی ہیں وہ خود جنت فردوس میں سکونت پذیر ہے مگر اس کے مضامین عالیہ کے باغات روئے زمین پر سبز اور شاداب ہیں، غالیوں وغیرہ کے ایسے لوگ بے شک تاریک وادیوں میں بھٹک گئے ہیں، اے طالب حق طباعت کتاب مذکور کی تاریخ بیان کرو بے شک وہ سرسبز[1] جنت کا دروازہ ہے[2] ہے، ایک زمانہ میں گو وہ لکھی جا چکی تھی لیکن عدم طباعت کے باعث پردہ پوش تھی اب طباعت کے ذریعہ وہ چاندنی رات کی طرح روشن ہوگئی ہے اس کی تاریخ کے بیان میں[3]، میں نے اپنی پوری کوشش صرف کی کہ اعلم علماء، افقہ فقہاء کی کتاب حدیقہ شائع ہوگئی۔

تقریظ دلپذیر از رشحات خامہ فیض شمامہ جناب مستطاب معلی القاب فاضل کامل، عامل کامل فقیہ بادل، مقتداء عادل جامع معقول و منقول، حاوی فروع و اصول بارع علام مجتهد انام السيد محمد أدام الله فيضه عنه خلف ارشد زبدة الفضلاء عمدة الفقهاء المولوی السيد دلدار علی شاه رحمه الله.

---

(۱) غلباء اس باغ کا وصف ہے جس کے درخت سرسبز اور اور باہم پیوست ہوں اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: وحدائق غلبًا چونکہ کتاب حدیقہ سلطانیہ باعظمت ثمرات کا فائدہ دینے والی، بکثرت مباحث پر مشتمل اور موزوں و مناسب نظم ونسق رکھنے والی ہے لہٰذا گویا کہ وہ دار السلام اور جنت الفردوس ہے لہٰذا یہ صفت یعنی غلباء اس سے بڑی مناسبت رکھتی ہے اور بہشت عنبر سرشت کے جو باغات اس آیت مبارکہ: وحدائق غلبا میں مذکور ہیں یہ کتاب ان کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔

(۲) (غلباء) کا ہمزہ اگر چہ پڑھا جاتا ہے لیکن تاریخ میں شمار نہیں ہوتا بلکہ خلیل کے ایسے اساتذہ محققین کہ ہاں یہ لکھا بھی نہیں جاتا۔

(۳) قولہ: بذلت أقصى الجهد الخ۔ اس کا لفظی معنی واضح ہے، رہا اس کا چیستاں ہونے کے لحاظ سے معنی تو وہ یہ ہے کہ میں نے تاریخ میں حرف جیم کے عدد کو زیادہ کیا ہے کیونکہ اَقصیٰ کا معنی ہے اعلیٰ، جمع اس کی اقاصی ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں ادانی کا لفظ مستعمل ہوتا ہے، اقصی اللفظ سے لفظ کا اعلیٰ حرف یعنی پہلا حرف مراد ہوتا ہے جیسے کہ "ادنی اللفظ" سے لفظ کا حرف آخیر مراد ہوتا ہے اسی وجہ سے مغلوبیت روم کی تاریخ آیت پاک غلبت الروم فی ادنی الارض سے بیان کی گئی کیونکہ "الارض" کا ادنیٰ حرف ضاد ہے لہٰذا لفظ "الجهد" کا اقصیٰ حرف جیم ہے اور تاریخ میں اس کے بذل سے مراد اس کے عدد کو تاریخ میں شمار کرنا ہے۔ ۱۲ مدظلہ العالی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله على نواله وصلى الله عليه و بيني حرامه وحلاله محمد و آله و بعد فان الكتاب الموسوم بالحديقة السلطانية في العقائد الايمانية من مصنفات السيد الامام الهمام علم اعلام و حجة الاسلام آيت الله في العالمين حجة الله البالغة في الارضين و حامي حمى الدين و ماحي آثار المفسدين عماد العلماء والمجتهدين ضياء الفقهاء والمتكلمين و سلالة الاخيار المصطفين مولانا سيد العلماء السيد حسين قدس الله روحه الزكية كتاب شريف و مصنف منيف الطري على العجب العجاب احتوى على الفصل الخطاب وميز القشر عن اللباب والخطاء عن الصواب ببيانات نافعة للخاص والعام و تقريبات قريبة إلى الافهام و احتجاج يقطع لسان الجاحدين و حجاج تكشف عن لجاج المعاندين و ادلة تقضم ظهور الملحدين و ترغم معاطس أعداء الدين ولا بدع ولا عجب فانه من افادات مثل ذلك العلامة المهذب و جذيلها المحكك و عذيقها المرجب رجل الرجال وواحد الأحاد و هم اهل بيت لولاهم في هذه البلاد.

ترجمہ:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، اللہ تعالیٰ کی نعمت پر اس کا حمد وشکر ہے اللہ والوں پر اور اس کے حلال وحرام کو واضح کرنے والوں یعنی محمد و آل محمد علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ کا درود وسلام ہو بعد از حمد وصلوٰۃ واضح باد کہ کتاب مستطاب حدیقۂ سلطانیہ فی العقائد الایمانیہ جناب والا شان آقا سید امام ہمام علم الاعلام، حجۃ الاسلام آیۃ اللہ فی العالمین حجۃ اللہ البالغہ فی الارضین۔

عزت دین کے حامی آثار مفسدین کو مٹانے والے عماد العلماء والمجتہدین سناد الفقہا و المتکلمین برگزیدہ گانِ خدا، ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی اولاد حضرت مولانا سید العلماء السید حسین قدس اللہ روحہ الزکیہ کی تصانیف میں سے ایک بلند مرتبہ اور عالیشان کتاب ہے جو عجیب اور فیصلہ کن مضامین پر مشتمل ہے۔

اس نے باطل کو حق سے اور غلط کو صحیح سے ایسے بیانات کے ذریعہ ممتاز کر دیا ہے جو ہر خاص و عام کے لئے نافع اور مفید ہیں اور ایسے براہین قائم کئے ہیں جو ہر انسان کے لئے مطالب کے سمجھنے میں سہولت کا باعث ہیں اور ایسے استدلالات پیش کئے ہیں جنہوں نے منکرین کا ناطقہ بند کر دیا ہے اور ایسے طریقہ پر حجت قائم کی ہے جس سے معاندین کی ہٹ دھری واشگاف ہوگئی ہے اور ایسے دلائل پیش کئے ہیں جنہوں نے ملحدین کی کمریں توڑ دیں ہیں اور دشمنانِ دین کی ناک کو خاک میں رگڑ دیا ہے اور یہ کوئی انوکھا اور خلاف توقع امر بھی نہیں کیونکہ یہ ایسے علامہ دھر کے افادات میں سے ہے جو اس میدان کا مانا ہوا شہسوار اور اس وادی کا ایسا بے نظیر تجربہ کار ہے کہ جو اپنی مثال آپ ہے اور یہ اس خاندان کا فرد فرید ہے۔

لما قام للدين عمود و لا خضر به عود ولهم أسوة فى هذه الحدود، فجددهم خير الجدد و اولياء الملك الودود سلام الله عليهم مافاح عود وناح الرعود وهذا الباب الرابع من الكتاب فى امامة الائمة الاطياب كان عزيز الوجود ولا تيسير الا بعد الفحص والاستكتاب وامتدت اليه أعناق الطلاب فوفق الله السيد الخير الصفى السيد حسين الموسوى الرضوى حيث اهتم بطبعه واشاعته و بالغ فى تصحيحه و مقابلته فلله دره ولا نشمل عشره وعظم أجرها و كتب الفقير الى ربه الاسير بذنبه أبو الحسن بن على تجاوز الله عن زلاتهما بسادتهما وولاتهما.

کہ اگر وہ ان ممالک میں نہ ہوتے تو ان دیار میں نہ دین کا ستون قائم ہوتا اور نہ ہی شجرۂ اسلام کی شاخ سرسبز ہو سکتی وہ ان اطراف میں اپنے ان آباء و اجداد کے تصدق، مخلوق خدا کے ہادی ہیں، خداوند عالم کے اولیاء ہیں ان کی ذوات مقدسہ پر تا قیام قیامت درود و سلام ہو۔

یہ اس کتاب کا چوتھا باب ہے جو ائمہ اطہار علیہم السلام کی امامت کے بیان میں ہے یہ کتاب انتہائی کمیاب تھی بڑی جستجو اور کوشش کے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھی خواہشمند طالبین کی گردنیں اس کے متعلق ہمیشہ دراز اور فراز رہتی تھیں اللہ تعالیٰ نے ایک برگزیدہ ہستی جناب سید حسین موسوی رضوی کو اس کے متعلق موفق کر دیا کہ آپ نے اس کے طباعت اور اشاعت کا اہتمام فرمایا اور اس کی تصحیح اور مقابلہ کے متعلق بڑی ہمت اور جانفشانی سے کام لیا اس سلسلہ میں ان کے کمال کا کیا کہنا ہے بے شک آپ نے ایسا کارنامہ انجام دیا جو اجر عظیم کا موجب ہے۔

یہ چند حروف سید ابوالحسن بن علی نے سپرد قلم کئے کہ جو اپنے پروردگار کی طرف ہر رنگ اور ہر آن میں محتاج اور اپنے گناہوں میں گرفتار ہے اللہ تعالیٰ باپ بیٹا دونوں کے گناہ اور خطائیں بتصدق ائمہ ہدی علیہم السلام معاف کرے۔

تقریظ آقائے سید ناصر حسین اعلی اللہ مقامہ کا تذکرہ:

عبارت بلاغ آگیں و الفاظ دلنشیں، چکیدہ کلک جواہر سلک، ادیب ماہر، بحر زاخر، فاضل کامل، عالم عامل، جمع معقول ومنقول، منبع فروع و اصول حاجی الحرمین الشریفین، زائر ابی عبداللہ حسین المولوی السید ناصر حسین ادامہ اللہ بدوام النیرین، خلف المولوی سید مظفر حسین مرحوم ومغفور۔

آپ کی تحریر چونکہ کافی طویل ہے لہٰذا اختصاراً ذیل میں اس کے چند اقتباسات کا تذکرہ کیا جاتا ہے بعد از تمہید آپ کتاب مستطاب حدیقۂ سلطانیہ کی مدح سرائی میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں۔

درین زمان فرحت اقتران بل از محاسن و برکات ایام، ومکارم وھو راعوام، باب چہارم از کتاب

مستطاب حدیقه سلطانیه ورسائل ایمانیه که بوجه تقالیب ادوار زمان و فقدان انصار و اعوان بقالب طبع در نیامده، قدرت ذوالجلال ملاحظه کردنیست که از اشتهار این کتاب خش وخارترهات اهل خلاف بے انصاف مثل ملل و نحل ایشان، کرماد اشتدت به الریح و بناء مقالات پر تدلیسات ایشان ادهن من بیت العنکبوت صریح گردیده، پایه نهایة العقول در رفتار طریق سبعش عارج و توصیف تر صیغش از ناطقه زبان خارج میباشد کتاب است یا بحر مسجور و روض ممطور صفحاتش و جنات حور، سطورش قلائد نحور، عناول مضامین رشیعته برافنان الفاظش نغمه زن و جلاجل دقائق شریعة براغصان معانیش ترنم فگن، در سواد خط و کتابت آب حیات و هنگام طوفان سفینة النجات روش شعلهٔ کی از حوعاث هفوات اهل عدوان مصون تابندهٔ چراگی که از اول تا آخر از گزند انفاس ارباب استناب مامون علم و جوهر کال را جانی و جان فضل و علم را تاب و توانی مالا مال افشان ریاحین نادره که نرگس را از برائے مقدمش انتظارے و بوستان خلد عنوان رابسی شرم ساری بل از شوق دیدارش دیدهائے نرگسها بیدارها باشتیاق جمائش کلها بر بستر خارها، مجموعه فرائد ایمانی لم یطمثهن انس قلبهم ولا جان گنجیند پر از ذخائر کانهن الیاقوت والمرجان، فقرات آبدارش حدائق پر از ازهاد انوار، وسطور و بینش کأنها جنات تجری من تحتها الانهار هر حرف این کتاب طبع را مرغوب کانه حیات القلوب، هر فصلش تماشائی فصل بهارے هر بابش باب رحمت باری، سبحان الله این در شهوار نادرة الادوار نادیدهٔ چشم فلك و ناشنیده گوش ملك، از تصنیفات و تالیفات سید علام سرآمد متکلمین عظام، نخل بند حدیقه براهین، چمن آرائے گلبن کشف الحق والدین، المؤید من الله الجلیل، مشریف علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل، ممدوح قدسیان اطباق خضراوی، مسلم الثبوت میان انام عنبراوی، واسطه عروج سلامیه قرب الهی، زینت افزائی اریکه اوامر و نواهی و بمفاد اما بنعمة ربك فحدث ریزنده قطرات علوم بکام مستحقین از منبع دانش و یقین و بمضمون و اما السائل فلا تنهر، بخشنده خزائن علوم بکمال جود و سخا بسائلین، پیشوائی اهل ایمان، رهنمائے طریق ایقان، خضر راه شریعت، هادئ طریق حقیقت، موسس ارکان شرع نبوی مشید بنیان آئین و آداب مصطفوی، منصور در معرکه مناظره، غالب بر جنود فلاسفه و اشاعره، برآرنده رود خیالات فاسده از دماغ هوا خاهان شوکت عمریه بیك شعله افگنی ضربت حیدریه، خامه اش مانند صمصام قاطع لسان منکرین امامت ائمه اطهار را قلم مینماید، و چون ذوالفقار از خود زبان خود ترانه توصیف لسان الحق فی سراید، تحقیقات مشائیان پیش افاداتش همچون قیل و قال اطفال دبستان و توجیهات اشراقیان در مقابله اضافاتش چون نور چراغ پیش آفتاب درخشان هنگام گرمی او در بازار حکمتش متاع هر فلسفی کاسد وقت باریدن سحاب جحتش آتش فتنه انگیزی هر

اشعری خامد۔

اس مسرت و شادمانی کے زمانہ میں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ زمانہ کے برکات اور خوبیوں کے باعث کتاب مستطاب حدیقۂ سلطانہ و رسائل ایمانیہ کا چوتھا باب چھپ کر منظر عام پر آگیا ہے جو کہ قبل ازیں انقلاب زمانہ اور فقدان اعوان و انصار کے باعث طبع نہیں ہو سکا تھا اور لباس شہرت سے ملبوس نہ ہو سکا تھا قدرت ذات ذوالجلال کا کرشمہ دیکھنے کے لائق ہے کہ اس کتاب کے شہرت حاصل کرتے ہی صاحب الملل والنحل کے ایسے بے انساب اہل خلاف کے خرافات "کرماد اشتدت بہ الریح" کے مصداق بن کر اس راکھ کی طرح فنا اور برباد ہو گئے جس کے ذرات کو تیز آندھی اڑا لے گئی ہو اور ان کے وہ اقوال صاف طور پر مکڑی کے جالہ سے زیادہ کمزور ثابت ہو گئے جو انہوں نے مکر و زور کے ذریعہ تیار کئے ہوئے تھے انتہائی بلند عقل بھی اس کتاب کے دشوار گزار راستے میں عاجز ہے کہ اس کے مضامین تک اسے رسائی نہیں ہو سکتی اور اس کی تالیف و تنظیم کے معیار کی وصف بیان کرنے سے زبان گویائی عاجز ہے، کیا یہ کتاب ہے یا علم کا بھرپور سمندر یا باران رحمت سے سیراب شدہ تر و تازہ باغ ہے، اس کے صفحات حوران بہشت کے خوشنما چہرے ہیں، اس کی سطریں پر رونق گلے کے ہار ہیں، اس کے پیارے پیارے مضامین کی بلبلیں اس کے الفاظ کی شاخوں پر نغمہ سرائی کر رہی ہیں، گہرے اور دقیق مطالب اپنی سریلی آوازوں سے اس کے معنی کی خوشنما ٹہنیوں پر مترنم ہو رہے ہیں، اس کے خط اور کتابت کی سیاہی میں آب حیات کی تاثیر ہے اور طوفان ضلالت میں کشتی نجات کا فائدہ دینے والی ہے یہ ایسی روشن شمع ہدایت ہے کہ جو اہل عناد کے لغویات کے ضرر اور نقصان سے محفوظ ہے، اور یہ ایسا جگمگاتا ہوا چراغ ہے جو ان کے پھونکوں کے ضرر اور نقصان سے محفوظ اور مامون ہے، علم اور جوہر کمال کی یہ کتاب جان ہے اور جان فضل و علم کیلئے یہ بھرپور طاقت اور توانائی ہے اس سے ایسے نادرۂ روزگار گل و پھول نمودار ہوئے ہیں کہ گل نرگس کو ان کا انتظار تھا گلستان خلد نشان اس کی آب و تاب کو دیکھ کر اپنے مقام پر بے حد شرمسار ہو رہے ہیں بلکہ اس کے دیدار کے شوق کے باعث گلہائے نرگس کی آنکھیں پیوستہ کھلی اور بیدار ہیں، اس کے حسن و جمال کے اشتیاق میں ہر قسم کے پھول ایسے مضطرب اور بے چین ہیں کہ گویا کانٹوں کے بستر پر لیٹ رہے ہیں یہ ایسے اچھوتے فصیح و بلیغ ایمانی الفاظ و معانی کا مجموعہ ہے کہ ان تک پہلے کسی فرد انس و جن کو رسائی نصیب نہ ہو سکی یہ ایسے بیش قیمت مطالب کا بھرپور خزانہ ہے کہ گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں، اس کے پر رونق اور آب و تاب رکھنے والے فقرات تر و تازہ پھولوں اور بچوں سے پر باغات کا منظر پیش کرتے ہیں اس کی خوبصورت اور مزین ہر سطر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت ہے جس کے نیچے نہریں جاری ہیں اس کتاب کا ہر حرف اس طرح دلربا اور پسندیدہ ہے کہ گویا دلوں کیلئے حیات و روح رواں ہے اس کی ہر فصل موسم بہار کا نظارہ پیش کرتی ہے اور ہر باب، رحمت خدا کا دروازہ ہے۔ سبحان اللہ یہ درشہوار یگانہ روزگار جس کی مثل کو چشم فلک نے دیکھا نہیں اور گوش ملک نے سنا نہیں، ایک

ایسے سید علام کے تصنیفات و تالیفات میں سے ہے جو بڑے بڑے با عظمت علماء متکلمین کا سردار، باغیچۂ دلائل و براہین کا باغبان کشف دین وحق کے چمن کا زینت و آرائش عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید یافتہ حدیث "علماء امتي كأنبياء بني اسرائيل" کا صحیح طور پر عزت یافتہ، قدسیان فلکی ملائکہ آسانی کا ممدوح، اہل زمین کے درمیان مسلم الثبوت باکمال، قرب الٰہی کے زینوں پر بلندی حاصل کرنے کا واسطہ، تخت اوامر ونواہی کی زینت افزائی کرنے والا، ارشاد ربی: اما بنعمة ربك فحدّث (کہ اپنے رب کی نعمت کا تذکرہ کیجئے) اس کے مطابق منبع دانش ویقین سے علوم عالیہ کے قطرات کی مستحقین کے کام و دہن میں بارانی کرنے والا، ارشاد الٰہی: و اما السائل فلا تنهر (کہ سائل کو جھڑکی نہ دیجئے) کے مطابق کمال جود وسخا سے سائلین کو علوم کے خزانے بخشنے والا، اہل ایمان کا پیشوا، راہ ایقاں کا رہنما، راستہ شریعت کیلئے خضر صفت رہبر، طریق حقیقت کا ہدایت کنندہ، ارکان شرع نبوی کا مؤسس، آداب و آئین مصطفوی کو استحکام پذیر کرنے والا، میدان مناظرہ میں منجانب اللہ نصرت یافتہ فلاسفہ اور اشاعرہ کے لشکروں پر غلبہ حاصل کرنے والا، شمشیر آتش بار کی ایک ہی ضرب حیدری کے ذریعہ شوکت عمری کے ہوا خواہوں کے دماغ سے خیالات فاسدہ کے دھوئیں کو نکال باہر کرنے والا، اس کا قلم حق رقم شمشیر قاطع کی طرح منکرین امامت ائمہ اطہار علیہم السلام کی زبان کو قلم کر دیتا ہے اور ذوالفقار کی طرح اپنی دونوں زبانوں سے لسان الحق جناب امیر علیہ السلام کی مدح و ثناء کے ترانے الاپتا ہے۔ مصنف علام کے افادات عالیہ کے مقابلہ میں فلاسفہ مشائین کی تحقیقات اطفال مکتب کی قیل و قال کا درجہ رکھتی ہے اور حکماء اشراقین کی توجیہات آپ کے ارشادات عالیہ کے سامنے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے آفتاب عالم تاب کے مقابلہ میں ٹمٹاتے چراغ کی روشنی، آپ کی حکمت و دانش کے بازارِ گرم کے مقابلہ میں ہر فلسفی کا کلام متاع کاسد شمار کیا جاتا ہے آپ کے دلائل و براہین کے بادل جب برستے ہیں تو ہر اشعری کی فتنہ انگیزی کی آتش گل ہو جاتی ہے۔ اس بلند پایہ شخصیت سے ہماری مراد علامہ دہر، وارث ائمہ اطہار علیہم السلام مشرق ومغرب کے سردار آقا سید حسین علیین مکان ہیں۔ اللہ تعالیٰ ائمہ طاہرین علیہم السلام کے ساتھ اعلیٰ علیین میں ان کے مدارج کو بلندی بخشے۔ (آمین)۔

ازاں بعد مصنف علام کی مدح میں چند اشعار زیب قرطاس کرتے اور پھر لکھتے ہیں:

اعني علامۂ روزگار وارث ائمه اطهار، مولی الخافقين آقا سيد حسين عليين مكان اعلى الله مقامه في عليين مع ائمه الطاهرين الهدين۔

اس طرح مصنف علام کی مدح وثناء کرتے ہوئے آخر میں ان الفاظ کے ساتھ دعائیہ فقرہ تحریر کرتے اپنی تقریر دلپذیر کو ختم کر دیتے ہیں۔

شجرۂ مترجم

حضرت علامہ سید گلاب علی نقوی

(قدس سرہ الشریف)

۱	علامہ السید گلاب علی شاہ نقویؒ	۲	ابن السید صفت علی شاہ نقویؒ
۳	ابن السید شیر علی شاہ نقویؒ	۴	ابن السید فتح علی شاہ نقویؒ
۵	ابن السید قائم علی شاہ نقویؒ	۶	ابن السید شاہ مراد بخش نقویؒ
۷	ابن السید شاہ عبد الغفور حسین نقویؒ (المعروف کپور شاہ)	۸	ابن السید شاہ محمد داؤد نقویؒ
۹	ابن سید نوری شاہ عبد الرحمٰن نقویؒ	۱۰	ابن سید شاہ عبد الوہاب نقویؒ
۱۱	ابن سید شاہ قطب شیر نقویؒ	۱۲	ابن سید شاہ جنید نقویؒ
۱۳	ابن سید شاہ عبد الرحمٰن کبیر نقویؒ	۱۴	ابن سید شاہ عبد الکریم نقویؒ
۱۵	ابن سید شاہ نور الدین حسین نقویؒ	۱۶	ابن سید شاہ محمد نقویؒ
۱۷	ابن سید شاہ ابو سعید نقویؒ	۱۸	ابن سید شاہ محمد غوث نقویؒ
۱۹	ابن سید جلال الحق والشرع والدین شیر شاہ سرخپوش نقویؒ بخاری مدفون اوچشریف	۲۰	ابن سید علی نقویؒ
۲۱	ابن سید جعفر نقویؒ	۲۲	ابن سید محمد ابو الفتح نقویؒ
۲۳	ابن سید محمود اصغر نقویؒ	۲۴	ابن سید احمد یوسف نقویؒ
۲۵	ابن سید عبداللہ نقویؒ	۲۶	ابن سید علی اصغر نقویؒ
۲۷	ابن سید جعفر الثانی التوابؒ	۲۸	ابن الامام علی نقی الہادی علیہ السلام
۲۹	ابن الامام محمد تقی الجواد علیہ السلام	۳۰	ابن الامام علی الرضا علیہ السلام
۳۱	ابن الامام موسیٰ کاظم علیہ السلام	۳۲	ابن الامام جعفر الصادق علیہ السلام
۳۳	ابن الامام محمد الباقر علیہ السلام	۳۴	ابن الامام علی زین العابدین علیہ السلام
۳۵	ابن الامام حسین سید الشہداء علیہ السلام	۳۶	ابن ابی الائمہ امیر المومنین علیہ السلام

سوانح حیات

حضرت علامہ سید گلاب علی نقوی

(قدس سرہ الشریف)

استاذ العلماء حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید گلاب علی نقوی مرحوم کی ذات محتاج تعارف نہیں، آپ ایک فقید المثال عالم دین تھے، جنہوں نے اپنی زندگی دین مبین کی خدمت میں بسر کی ان کی زندگانی کی ایک جھلک پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسم گرامی: سید گلاب علی نقوی بخاری

اسم والد بزرگوار: سید صفت علی نقوی بخاری (مرحوم)

تاریخ پیدائش: 1914ء

جائے ولادت: بستی ملہووالی (یہ بستی ضلع اٹک کی تحصیل پنڈی گھیپ میں مکھڈ روڈ پر واقع ہے)

خانوادہ:

آپ دسویں امام حضرت علی نقی علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔آپ کے جد امجد سید جلال الدین سرخپوش بخاریؒ مدفون اوچشریف ہیں جو بخارا سے ہجرت کر کے ہند میں تشریف لائے۔ان کی اولاد میں سے ایک شاخ بلوٹ شریف، ڈیرہ اسماعیل خان میں آباد ہے۔سید محمد عیسیٰ شاہ بخاری اور سید محمد داؤد بخاری دو بھائی تشریف لے گئے۔آپ سید محمد داؤد بخاری کی اولاد میں سے ہیں۔ان کے دادا سید غفور حسین بخاری تھے جن کی نسل ملہووالی میں آباد ہے اور ان کی عبادت گاہ آج بھی ملہووالی میں زیارت کے نام سے موجود ہے اور وہاں کے لوگ اس کی زیارت کو آتے ہیں۔

نشوونما:

آپ کی ابتدائی نشوونما اپنے آبائی گھر میں ہوئی، بچپن میں ہی آپ کے سر سے والد بزرگوار کا سایہ اُٹھ گیا تھا۔آپ

کی والدہ ماجدہ نے آپ کی تعلیم وتربیت کی، ملھو والی میں اکثر وبیشتر علماء کرام مجلس کے سلسلہ میں آتے رہتے تھے۔ حضرت علامہ سید محبوب علی شاہ آف خوشاب اُس وقت کی ایک روحانی شخصیت تھی، وہ بھی مجالس کے سلسلہ میں ملھووالی میں آتے رہتے تھے۔علامہ موصوف کا اپنا بیان ہے کہ میرا بچپن تھا جب قبلہ محبوب علی شاہ ملھووالی آئے تو میں ان کی خدمت کے لئے حاضر ہوا، اُنہوں نے ہی مجھے علم دین کی طرف متوجہ کیا۔

آغاز تعلیم:

قبلہ سید گلاب علی نقوی نے پنڈی گھیپ کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے گورنمنٹ اورنٹیئل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اس زمانے میں یہ پنجاب کا واحد کالج تھا۔ آپ نے اس کالج میں مولوی فاضل کا کورس کیا۔ جب امتحان ہوا تو اس ہونہار طالب علم نے صوبہ بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کی ۔ جب آپ مذکورہ کالج میں زیر تعلیم تھے تو اس دوران آپ لاہور کے ایک معروف عالم مولانا غلام رسول خان کے پاس عربی علوم پڑھنے جاتے تھے۔علامہ غلام رسول عربی علوم وفنون کے ایک ممتاز عالم تھے۔

حوزوی تعلیم کا آغاز:

استاذ العلماء نے حوزوی تعلیم کا آغاز اٹک شہر کی ایک مسجد سے کیا۔ اس دور میں مسجد کے خطیب اور امام ایک جیّد عالم دین علامہ سید رضی عباس مرحوم تھے۔ آپ نے یہاں کچھ عرصہ ادبیات وفنون عربی پڑھے، پھر آپ نے خوشاب کی ایک مسجد میں حضرت علامہ محبوب علی شاہ نقوی کے حضور زانوئے تلمذ طے کئے۔ علامہ موصوف نے وہاں چار سال تک دروس پڑھے اور فنون علوم عربیہ میں استحکام پیدا کیا۔ قدرت آپ پر مہربان تھی، اس ذات نے ذہانت فطانت جیسی نعمت عظمیٰ آپ کو عطا کر رکھی تھی۔ چار سال کے قلیل عرصے میں صرف،نحو،منطق ، بلاغت وغیرہ پر عبور حاصل کر لیا۔

لکھنؤ روانگی:

تقسیم ہند سے پہلے حوزہ علمیہ لکھنؤ شہر میں تھا۔ تشنگان علم و دانش وہاں جاتے تھے اور اس سرچشم علم سے اپنی پیاس بجھاتے، کیونکہ وہاں علمائے اعلام موجود تھے۔ استاذ العلماء لکھنؤ تشریف لے گئے، وہاں آپ نے منطق ،فلسفہ اور علم کلام میں تخصص کی ڈگری حاصل کی۔ وہاں طبیعت ناساز رہنے لگی، آپ واپس اپنے وطن تشریف لے آئے۔ یہ 1938ء کی بات ہے کہ استاذ العلماء نے زین الاتقیاء علامہ سید محمد باقر نقویؒ سے کسب فیض کیا اور فقہ اسلامی میں کمال حاصل کیا اور ساتھ ہی منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی۔ جوہر شناس اُستاد نے اپنے لائق فائق شاگرد میں علمی وعملی جوہر دیکھے تو اُنہیں اپنا محبوب نظر بنالیا۔

دورِ خدمات :

حضرت علامہ سید محمد باقر نقوی قبلہؒ نے ہی علامہ موصوف کو ملتان کے قریب ایک بستی شیعہ میانی میں بطور امام جمعہ والجماعت مقرر کیا۔ علامہ موصوف نے مسجد میں امامت کا آغاز کیا، کچھ عرصہ تک مسجد میں یہ نظام چلتا رہا کیونکہ اُستاد محترم مروج علوم آل محمدؐ تھے۔اس دور میں دینی مدارس کا فقدان تھا اس لئے آپ نے چاہا کہ یہاں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی جائے۔ آپ نے اپنے اُستاد بزرگوار حضرت علامہ سید محمد باقر نقوی سے اس سلسلہ میں مشاورت کی، اُنہوں نے آپ کو مدرسہ کے قیام کی اجازت دے دی تو یہاں آپ نے شیعہ میانی کے مومنین سے اس کا اظہار کیا تو اُنہوں نے مالی واقتصادی کمزوری کی وجہ سے معذرت کی ،کیونکہ مسافر طلباء کے لئے نان ونفقہ کی ضرورت تھی ۔بالآخر شیعہ میانی کے باایمان مومنین کی مشاورت سے امام بارگاہ وڈا تھلا میں درس وتدریس کا آغاز کر دیا۔ جب جامعہ کے قیام کی خبر پھیلی تو تشنگان علم ودانش نے مدرسہ میں آنا شروع کر دیا۔ شیعہ میانی کے مومنین مزدور طبقہ لوگ تھے، اِن میں مالی اعتبار سے مدرسہ چلانے کی طاقت نہیں تھی۔ ایک دن اُستاذ العلماء نے اپنے بزرگ اُستاد کی تربیت کے مطابق مومنین کے سامنے ایک تجویز رکھی کہ تم سب لوگوں کے گھروں میں صبح وشام کھانا تو پکتا ہے، اگر تم میں سے ہر ایک خاندان ایک آدمی کا کھانا دے تو وہی کھانا ایک طالب علم کے لئے کفایت کر سکتا ہے۔اس طرح سب مل کر مدرسہ کے مسافر طلباء کے خوردونوش کا انتظام کر سکتے ہیں ،مومنین کرام نے قبلہ مرحومؒ کی اس تجویز پر لبیک کہا اور اس طرح مدرسہ کے طلباء کی یہ مشکل آسان ہوگئی۔ مدرسہ کے طلباء کے کھانا پکانے کا یہ سلسلہ 10 سال پر محیط رہا، نا معلوم اس طویل دورانیہ میں کتنے طلباء تحصیل علم کر کے علوم آل محمدؐ سے آشنائی حاصل کر کے دین مبین کے مروج ومبلغ بنے اور بحمد اللہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے بلکہ یہ قیامت تک جاری رہے گا۔ اس وسیع وعریض سلسلہ کا اجر وثواب قیامت تک ان گھرانوں کے لئے محفوظ ہے کہ جن کے گھروں سے مسافر طلباء کے لئے کھانا آتا رہا تھا۔ان ماؤں بہنوں کا صدیقہ، طاہرہ، بضعۃ الرسول، سیدۃ النساء العالمین کی بارگاہ عصمت وطہارت میں کیا منزلت وعظمت ہے؟ وہ صرف خالق کون ومکان کے علم میں ہے، اس دور کی یہ خواتین اس ہستی کی کنیزیں تھیں جن کے بارے ہیں ڈاکٹر علامہ اقبال نے کہا

ے

آں ادب پروردہ صبر ورضا — آسیا گردان ولب قرآن سرا

گریہ ہائے زبالین بے نیاز — گوہر افشاندے برداماں نماز

اشک او برچید جبرائیل از زمین — ہم جو شبنم ریخت برزمین

رشتہ آئین حق وزنجیر پا است — این فرمان جناب مصطفٰی است

ورنہ گرد تربتش گردیدمے — سجدہ ہائے برخاک او پاشیدمے

ان خدمت گزار ماؤں، بہنوں پر کروڑوں سلام!

اُستاذ العلماء کی خدمات:

یہ ایک وسیع موضوع ہے جس کے لئے کئی دفاتر مطلوب ہیں، ان مختصر صفحات میں گنجائش نہیں ہے۔ ہاں ازراہ اختصار اُستاذ العلماء کی خدمات کے حوالے سے چند ایک واقعات حسب ذیل ہیں۔ اُستاذ العلماء جہاں ایک امام جمعہ والجماعت تھے وہاں ایک عظیم مدرس بھی تھے اور جہاں ایک اعلیٰ پایہ کے مدرس تھے وہاں ایک بہترین واعظ اور مبلغ بھی تھے۔ علاوہ ازیں آپ ملکی سطح پر فلاحی کاموں میں اپنا حصّہ رکھتے تھے۔

جامعہ مخزن العلوم الجعفریہ کی بنیاد:

اُستاذ العلماء اس ادارے کے بانی، مؤسس اور مہتمم تھے۔ اس ادارے کی تمام ذمہ داریاں آپ کے کندھوں پر تھیں۔ ادارہ بڑا پاکستان کا سب سے بڑا دینی ادارہ تھا۔ آپ طلباء کے دروس کی کلاسیں بھی لیتے اور اس کے علاوہ زندگی کے باقی اُمور میں بڑھ چڑھ کر حصّہ بھی لیتے تھے۔ یہ جامعہ جس کا آغاز 1941ء میں ایک امام بارگاہ سے ہوا تھا اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد اور مومنین باوفا کے تعاون سے 1951ء میں اپنی عمارت میں منتقل ہوا۔ اور اس عرصہ میں سینکڑوں طلبہ قم مقدسہ اور نجف اشرف کے حوزہ جات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے اور واپس آ کر پاکستان میں مدارس قائم کئے، منبر و محراب کے ذریعہ قوم کے علمی و اخلاقی شعور کی ترقی کا موجب بنے۔

یتامیٰ اور بیوگان کی سرپرستی:

ایک دفعہ حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید محمد تقی نقوی مدظلہ نے راقم سے ایک محفل میں فرمایا کہ ہمارے والد بزرگوار نے اپنی زندگی میں شیعہ میانی اور گرد و نواح کے علاقہ کے یتامیٰ اور بیوگان کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ آپ ہر مہینے غریبوں میں ایک خاص رقم ادا کرتے اور ہمیشہ معاشرے کے نادار و مفلس اور بے حال لوگوں کی خبر گیری کرتے تھے۔ یہ سلسلہ خیر اُستاذ العلماء کی وفات حسرت آیات کے بعد بھی اب تک جاری و ساری ہے۔ علاوہ ازیں اُستاذ العلماء نے سادات و غیر سادات بچیوں کی شادی خانہ آبادی کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے رکھی تھی اور غریب مومنین کے علاج معالجہ کے سلسلہ میں تعاون کرنا بھی اس خدمت دین میں شامل تھا۔

مدارس دینیہ کی نگرانی اور ان کی مالی معاونت:

جب اُستاذ العلماء کا حلقہ شاگردان وسیع ہوا تو ارض پاک پر نئے نئے مدارس اور تعلیمی ادارے وجود میں آئے اور

اُستاذ العلماء وہاں تشریف لے جاتے اور وہاں کے اساتید کی حوصلہ افزائی کرتے، اُن کی مشکلات پوچھتے، پھر اُن کا حل بتاتے تھے۔ شیخ الجامعہ علامہ اختر عباس نجفی مرحوم آپ کے ہونہار اور باکمال شاگردوں میں سے تھے۔ جب شیخ الجامعہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد نجف اشرف سے واپس آئے اور اُنہوں نے آیت اللہ العظمیٰ سید محسن الحکیمؒ کی مشاورت سے لاہور میں جامعۃ المنتظر کی بنیاد ڈالی تو جامعہ کے مالی حالات زیادہ بہتر نہ تھے۔ چونکہ اُستاذ العلماء، حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید محسن الحکیمؒ کے پاکستان میں وکیل مطلق تھے تو اُن کے حکم پر جامعہ مخزن العلوم الجعفریہ سے ہر ماہ ایک مدرس کی تنخواہ جامعۃ المنتظر کی طرف جاتی رہی اور کافی سالوں تک جاری رہی۔ پاکستان میں قائم دینی مدارس میں سے اکثر میں اب بھی اُستاذ العلماء کے شاگردان سربراہ یا مدرس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

اسکول کی بنیاد:

شیعہ میانی ملتان میں جس امام بارگاہ میں مدرسہ تھا، اُستاذ العلماء نے وہیں ایک پرائمری اسکول کی بنیاد بھی ڈالی تاکہ علاقہ کے بچوں کی عصری تعلیم کے تقاضے بھی پورے ہوتے رہیں۔ بعد میں وہ پرائمری اسکول مڈل بن گیا جو 70 سال سے آج تک گورنمنٹ اسلامیہ جعفریہ مڈل اسکول کے نام سے مسلسل کام کر رہا ہے۔ اس اسکول سے ہزاروں طلباء نے استفادہ کیا اور کر رہے ہیں۔

احساس ذمہ داری:

راقم کو عزیز محترم مولانا سبط حسن نوری نے بتایا استاذ العلماء نے شیر شاہ کے نزدیک غیر آباد زمین کو آباد کیا۔ وہاں کھیتی باڑی خود کرتے، اس کی نگرانی بھی خود کرتے، وہاں سائیکل پر تشریف لے جاتے تھے اور زمینوں پر جو بھی کام کرنا ہوتا تھا وہ خود اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ ایک دفعہ کسی شخص کو میراث کی تقسیم کا مسئلہ درپیش آیا تو اس نے مدینۃ الاولیاء ملتان کا رُخ کیا، اس کا مسئلہ شرعی ملتان کے دینی اداروں میں سے کسی سے بھی جب حل نہ ہو سکا تو لوگوں نے اُسے بتایا کہ تم شیعہ میانی، جامعہ مخزن العلوم الجعفریہ میں جاؤ، وہاں تمہارا یہ مسئلہ شرعی حل ہوگا۔ وہ آدمی جب جامعہ پہنچا تو اُستاذ العلماء اپنی زرعی زمین کی طرف جا چکے تھے، وہ آدمی وہیں زمینوں پر آپ کے پاس پہنچ گیا۔ اُس وقت اُستاذ العلماء پاؤں سے جوتے اُتار کر بیلچے سے پانی کی اُڈ صاف کر رہے تھے اور درانتی لے کر فصل کو کاٹ رہے تھے۔ اُس شخص نے سلام کیا، قبلہ اُستاذ العلماء نے جواب سلام دیا اور اُس شخص مومن کی احوال پُرسی فرمائی۔ آنے کا مقصد پوچھنے پر اُس شخص نے اپنی مشکل شرعی بیان کی۔ استاذ العلماء نے بیلچہ زمین پر رکھا، اُڈ کے کنارے پر بیٹھ کر اپنی جیب سے کاغذ اور قلم نکالا اور مسئلہ میراث تحریر فرمایا اور سائل اطمینان قلب کے ساتھ اپنے وطن روانہ ہو گیا۔ جی ہاں! یہ احساس ذمہ داری کا ایک درس ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ اپنے کسی عبد خاص کو ایک منصب عطا کرتا ہے تو پھر اس منصب کا تقاضا ہے کہ

اُس کی مخلوق کے لئے آسانیاں پیدا کی جائیں۔ اُستاذ العلماء ہمیشہ اپنا دفتر اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جہاں کہیں بھی سائل آجاتا، چاہے آپ حضر میں ہوتے تھے یا سفر میں تو وہیں سائل کی ضرورت پوری کردیتے تھے۔

تربیت اولاد:

اُستاذ العلماء نے جہاں اپنی ملت کی تعمیر کی، اپنے آبائی وطن کے مومنین کو تحصیل علم کی دعوت دی وہاں پر آپ نے اپنی اولاد کی بھی اسلامی خطوط پر بہترین تربیت کی۔ الحمد اللہ آپ کا خانوادہ دُنیا بھر میں عقیدت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک دن آپ کے فرزند جلیل حجۃ الاسلام والمسلمین سید محمد تقی نقوی مدظلہ فرمارہے تھے کہ ہمارے والد بزرگوار روزانہ ہمیں مختلف کتابوں پر درس دیتے تھے۔ کبھی کبھار جب اپنے مزرع پر جاتے تو وہاں بھی دروس کا سلسلہ جاری رہتا، یہاں تک کہ جب خود گندم کی فصل کی کٹائی کرتے تو ہمیں بھی ساتھ شامل کرلیتے اور اسی دوران کھیتوں کے بیچ کسی نہ کسی شرعی مسئلہ پر بحث کر کے ہماری علمی پیاس بھی بجھاتے رہتے تھے، اور سوال وجواب کے ذریعہ علم دین کی تدریس وتعلیم کو بھی جاری رکھتے تھے۔ اور اسی طرز پر رہتے ہوئے میراث کی مشکل ترین گتھیوں کو سلجھاتے تھے۔ اور پھر رات کو جب کھیتوں سے واپس تھکے ماندے آتے تھے تو مجھے فرماتے کہ "تقی" فلاں آیت کی ترکیب کرو، یا کوئی ادبی و فقہی سوال چھیڑ دیتے تھے۔ اس طرح اُستاذ العلماء نے اپنی اولاد کی تربیت کی۔

ایفائے عہد:

اُستاذ العلماء ایفائے عہد میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک دفعہ ملک پاکستان میں الیکشن ہو رہے تھے کہ ایک امیدوار نے آپ سے ووٹ کی درخواست کی، آپ نے اُس سے وعدہ کرلیا، کچھ دنوں بعد مخالف امیدوار آپ کے پاس آیا جو آپ کا قریبی دوست تھا اس نے جب ووٹ کی درخواست کی تو اُستاذ العلماء نے فرمایا کہ اس دفعہ میں فلاں سے عہد کر چکا ہوں اس لئے اپنے عہد کی پابندی کروں گا۔

جرأت وشجاعت:

جنرل ضیاالحق نے اپنے دورِ حکومت میں ملت تشیع کے لئے مشکلات کھڑی کی ہوئیں تھیں۔ حضرت علامہ مفتی جعفر حسین قبلہؒ ملت کے قائد تھے، قوم ان کی آواز پر اسلام آباد میں جمع تھی، کارکنان ملت نے مفتی صاحب قبلہ سے کہا کہ احتجاجی جلوس نکالیں تاکہ مسائل حل ہوں۔ مفتی صاحب قبلہ نے فرمایا اس سلسلہ میں کسی کا خون ہوگیا تو؟ اگر آپ میں سے کوئی اس ذمہ داری کو اُٹھالے تو ٹھیک ورنہ میرے ہاتھ کھڑے ہیں۔ اُس وقت استاذ العلماء نے فرمایا: مفتی صاحب یہ ذمہ داری میں لیتا ہوں آپ آگے بڑھیں۔ کیا حدیث میں نہیں ہے کہ جو اپنے دین، ایمان، جان وآبرو کے دفاع میں

مارا جائے تو وہ شہید قرار پاتا ہے۔ہم اپنے دین ومذہب کے حقوق کے لئے نکل رہے ہیں ،اگر کوئی ہمارا خون کرے گا تو اس کی گردن پر ہمارا خون آئے گا۔

بندگی وعبادت:

زُہد وتقویٰ عبادت اور بندگی میں آپ کی مثالیں دی جاتی ہیں ۔آپ شب زندہ دار تھے، حضر میں یا سفر میں آپ نماز تہجد ضرور ادا کرتے تھے بلکہ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے بھی چلتی ٹرین میں چادر بچھا کر نوافل ادا کرتے اور درس پڑھایا کرتے تھے۔آپ اپنی آخری عمر میں بہت زیادہ کمزور ہو چکے تھے لیکن پھر بھی نماز کھڑے ہوکر پورے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتے تھے۔آپ خوش اخلاقی اور خوش مزاجی میں اپنی مثال آپ تھے ۔ہمیشہ طلباء اور علماء پر بہت زیادہ مہربان رہتے تھے۔

جی ہاں! سید گلاب علی شاہ نقوی ایک شخص کا نام نہیں ،ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ایک انجمن کا نام ہے،ایک فکر کا نام ہے اور ایک ادارے کا نام ہے۔

استاذ العلماء The School Of Thougt تھے۔

جس طرح آپ نے توحید پیش کی ،عقیدہ توحید کو رواج دیا اور گمراہی کا مقابلہ کیا ،زبان وقلم سے جہاد کیا اور بڑے بڑے مشاہیر کی غلط گوئی پر گرفت کی اور اس سلسلہ میں کسی لومۃ لائم کی پرواہ نہ کی ۔ہمیشہ ہر میدان میں ڈٹے رہے اور حق کے پرچم کو بلند رکھا اور ہر موقع پر شمع علم کو روشن رکھا اور دین آلِ محمدؐ کی ترویج کے لئے ہر وقت اور ہر لمحے شمعیں روشن فرمائیں اور ابھی تک روشن ہو رہی ہیں ،اس کوشش وکاوش اور خلوص پر مبنی زندگی کی نظیر اُستاذ العلماء کے علاوہ کسی شخصیت میں ناپید اور بہت کم نظر آتی ہے۔

تاریخ وفات:

استاذ العلماء نے اپنی زندگی اپنی ملت کے لئے بسر کی ۔اُنہوں نے تہذیب آل محمدؐ کی بھرپور انداز میں ترویج کی ۔آپ اپنی آخری عمر میں بہت زیادہ کمزور ہو گئے تھے۔ 1431ھ ماہ ربیع الاول کی ایک صبح تھی، سوموار کا دن تھا (بمطابق یکم ستمبر 1992ء) کہ آپ کی طبیعت بہت زیادہ ناساز ہوئی تو آپ کو فوراً نشتر ہسپتال ملتان میں منتقل کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے علاج شروع کیا لیکن وقت آخر آن پہنچا۔آپ کے فرزند جلیل حضرت علامہ سید محمد تقی نقوی مدظلہ نے آپ کے بستر کو قبلہ رُخ کیا اور سورہ یٰسین کی تلاوت شروع کی کہ آپ کی رُوح پُرفتوح اعلیٰ علیین کی طرف پرواز کر گئی۔ تجہیز و تکفین کے امور آپ کے فرزند علامہ سید علی اصغر نقوی مدظلہ نے سرانجام دیئے اور آپ کی نماز جنازہ کی امامت آپ کے

بھتیجے اور پروردہ فرزند قائد ملت اسلامیہ آیت اللہ سید ساجد علی نقوی مدظلہ العالی نے کی۔

ے خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

اساتذہ کرام:

1۔ حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید محمد باقر نقویؒ

2۔ علامہ سید رضی عباسؒ

3۔ علامہ سید محبوب علی نقویؒ

4۔ علامہ سید صغیر حسین لکھنویؒ

5۔ حضرت علامہ سید عبد الحسین لکھنویؒ

حلقہ شاگردان:

استاذ العلماءؒ کے چند معروف شاگردوں کے نام درج ذیل ہیں

1۔ حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید حسن علی شاہ نقوی قبلہ (جانے یا علیؑ)

2۔ قائد ملت اسلامیہ علامہ سید ساجد علی نقوی مدظلہ

3۔ حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ محمد حسین مرحوم (سربراہ جامعۃ المعصومین فیصل آباد)

4۔ حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید شیر علی نقوی قبلہ

5۔ حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ اختر عباس نجفیؒ

6۔ حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ شیخ نصیر حسینؒ (سربراہ مدرسہ محمدیہ سرگودھا)

7۔ حجۃ الاسلام والمسلمین محسن ملت علامہ سید صفدر حسین نجفیؒ

8۔ حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ شیخ محسن علی نجفیؒ (رئیس جامعۃ الکوثر اسلام آباد)

9۔ حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید فضل حسین شاہ (کوٹ ادو)

10۔ حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ سید محمد تقی نقوی قبلہ مدظلہ العالی

اُستاذ العلماء کے تربیت یافتہ شاگردان سے پورا ملک بھرا ہوا ہے۔ اور دُنیا کے گوش و کنار میں آپ کے شاگردان علم دین کی شمع کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ آج تک آپ کے شاگردان عزیز کی وجہ سے مدارس میں بہار ہے اور ہر طرف

اس گلاب کی خوشبو پھیل چکی ہے۔

قلمی خدمات:

اُستاذ العلماء نے اپنی زندگی کے ہر میدان کو جہاں انتہائی خوش اسلوبی سے طے فرمایا وہاں پر قلمی لحاظ سے بھی آپ کی بے پایاں خدمات ہیں جن کا تذکرہ ذیل میں درج ہے۔

1۔ خزینہ ایمانیہ ترجمہ حدیقہ سلطانیہ (تألیف علامہ سید حسین علیین مکان۔ لکھنؤ)

2۔ ترجمہ منہاج الصالحین (آیت اللہ سید محسن الحکیمؒ)

3۔ فروعِ دین

4۔ تبیان الخمس

5۔ نوری انسان

6۔ حکومتِ اسلامی

7۔ دین اسلام میں جبر کیوں؟

8۔ شیخیت کی نرالی منطق

9۔ معارف الولایت ونجات الآخرت

؎ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ترتیب وتقدیم:

الطاف حسین کلاچی

مدرسہ باب العلم تونسہ شریف

0333-6461042

ابتدائیہ از مترجم

اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان اللعین الرجیم
بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العٰلمین و الصلوٰۃ و السلام علیٰ محمد
سید الانبیاء والمرسلین و اٰلہ الطیبین الطاھرین المعصومین ولعنۃ اللہ علی
اعدائھم اجمعین من یوم عداوتھم الیٰ یوم الدین و الیٰ أبد الأبدین.

اربابِ فہم و دانش و صاحبانِ عقل و خرد پر مخفی اور مستور نہیں کہ اس جہانِ فانی اور عالم بوقلمونی میں ہر آنے والا نہ اپنے ارادہ و اختیار سے آتا ہے اور نہ ہی اپنے اختیار و ارادہ اور اپنی خوشی اور رضا سے اگلے جہان کی طرف رخت سفر باندھ کر کوچ کر جاتا ہے۔ یہی اپنے اختیار و ارادہ سے نہ آنا اور اپنی رضا و رغبت سے نہ جانا واضح اور بیّن دلیل ہے کہ کوئی ایسی قادر اور جابر ہستی ہے جو ہر شخص کو بغیر اس کی خواہش اور تمنا کے اور بغیر کوئی درخواست و عرض داشت پیش کرنے کے اس دنیا میں لاتی بھی ہے اور پھر اسے اس کی منشاء اور مرضی کے خلاف جب چاہتی ہے ایک اَن دیکھے دیس کی طرف لے جاتی ہے۔

اس کا یہ وطیرہ ہر شخص سے مساوی اور یکساں ہے خواہ کوئی امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا رعایا، طاقتور ہو یا ضعیف اور کمزور، ہر کوئی اس قادر مطلق کی مشیت کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ نہ کسی شخص کو اس کے اعوان و انصار، فوج ولشکر کی کثرت اس سے بچا سکتی ہے اور نہ ہی اسلحہ یا بری، بحری اور فضائی طاقت کی بہتات اسے محفوظ رکھ سکتی ہے اور نہ ہی مال و دولت، سیم و زر وغیرہ کی فراوانی سے اس کی مشیت کو ٹالا جا سکتا ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے ہو کر رہتا ہے، ماشاء اللہ کان و ما لم یشأ لم یکن۔

پھر ایسے موزوں اور مناسب طریقہ و ہیئت پر پیدا کیا کہ جن جن چیزوں کی اس منصۂ شہود پر آنے والے کو ضرورت تھی وہ سب اسے بلا قیمت عطا کر دیں۔ اسے دیکھنے کی ضرورت تھی تو اس کو چشم بینا سے سرفراز کر دیا، سننے کی ضرورت تھی تو قوت سامعہ مرحمت فرما دی، بولنے کے لئے قوت گویائی اور نطق سے نوازا، اشیاء خوردنی و آشامیدنی سے لطف اندوز ہونے کے لئے ذائقہ عطا کیا، خوشبو سے فرحت و راحت حاصل کرنے، بدبو اور خوشبو میں امتیاز کرنے کے لئے قوت شامہ عطا فرمائی، سرد و گرم اور درشت و نرم کا احساس، علم حاصل کرنے کے لئے قوت لامسہ پورے بدن میں رکھ دی۔ اسی طرح عقل و فہم، دل و دماغ، ہاتھ پاؤں ہر قسم کے آلات اور اعضاء و جوارح سے اسے مرصع اور مزین کر کے بھیجا اور ہر

عضو کو ایسے موزوں مقام پر جاگزیں کیا کہ بجا طور پر اسے جہاں ہونا چاہئے تھا۔

یہ سب امور مثل خورشید ضوء پاش رہبری کرتے ہیں کہ جہاں وہ قادر مطلق ہے وہاں علیم وحکیم بھی ہے، اس کا ہر فعل حکمت ومصلحت کے مطابق ہوتا ہے، جو کرتا ہے صحیح اور بجا کرتا ہے۔ اس کا کوئی فعل غلط اور بے جا نہیں ہوسکتا۔ انہی حقائق کی طرف قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

وَفِيٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ. (سورہ ذاریات، آیت:۲۱)

کہ خود تمہارے نفوس میں اس کے وجود فیض الجود، قدرت کاملہ اور علم وحکمت وغیرہ کے دلائل موجود ہیں، کیا تم دیکھ نہیں سکتے، کیا تم ان کے ادراک سے قاصر ہو؟

یہ سب طاقتیں اور قوتیں عطا کرنے کے بعد ان کو انسان کے کنٹرول اور اس کی قدرت میں دیا۔ ان کے استعمال کرنے اور نہ کرنے کو اس کے اختیار میں دے کر اسے فاعل مختار بنایا۔ وہ چاہے جس طاقت سے کام لے، چاہے نہ لے، چاہے اسے درست اور صحیح طریقہ پر استعمال کرے، چاہے ان سے غلط اور ناجائز کام لے، جہاں وہ آنکھوں سے دیکھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرسکتا ہے، ادعیہ و اوراد پڑھ سکتا ہے، اپنے روزمرہ کی حاجات میں جائز طریقہ پر ہر چیز کو دیکھ سکتا ہے وہاں وہ اپنی آنکھوں سے نامحرم کی طرف بھی نگاہ کرسکتا ہے، کھیل تماشا اور لہو ولعب کا نظارہ بھی کرسکتا ہے۔ ان تمام چیزوں کو دیکھ سکتا ہے جن کا دیکھنا ممنوع اور ناجائز ہے۔ اسی طرح دیگر تمام قویٰ سے جائز اور ناجائز ہر دو قسم کے کام لے سکتا ہے۔

ان مناظر قدرت اور پُر از حکمت مخلوق کو دیکھ کر عقل سلیم حتمی فیصلہ کرتی ہے کہ اس عجیب وغریب کارخانۂ دنیا کو اس حکیم وعلیم نے بے مقصد، فضول، عبث اور بغیر کسی مصلحت وحکمت کے پیدا نہیں کیا۔ یقیناً اس بہت بڑے کارنامے کا کوئی بہت بڑا مقصد اور اس کی کوئی عظیم الشان غرض وغایت ہے، جیسا کہ یہ ارشاد پروردگار رہنمائی کرتا ہے:

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (سورہ آل عمران، آیت:۱۹۱)

کہ وہ صاحبان عقل زمین و آسمان میں غور وخوض کرتے ہیں تو بے ساختہ بول اٹھتے ہیں کہ پروردگار: یہ اتنا عظیم الشان کارخانۂ دنیا تو نے لغو اور بے مقصد پیدا نہیں کیا، کوئی نہ کوئی بلند مرتبہ غرض وغایت اس کی ضرور ہے۔

نیز فرمان ربی ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (سورہ مومنون، آیت:۱۱۵)

"کیا تم نے یہ گمان کرلیا کہ ہم نے تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہے؟ اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے۔"

عقل انسانی اس قدر فیصلہ ضرور کرتی ہے کہ اس عالم دنیا کو پیدا کرنے اور خلقت اشرف المخلوقات انسان کی کوئی نہ کوئی علت غائیہ ہے لیکن عقل بعینہٖ اس کی نشاندہی کرنے اور اس کا تعین کرنے سے قاصر تھی، اس لئے اللہ جل شانہ نے

اپنے منتخب بندوں انبیا علیہم السلام کو اس غرض سے روشناس کرانے کے لئے مبعوث کیا، جن کے آخری اور سب کے خاتم آنحضرت نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ حدیث قدسی کے ذریعہ اسی مقصد عالی کا انکشاف کیا کہ خلقت انسان کی غرض، غایت انسان کا اپنے خالق، رازق اور پروردگار کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ ارشاد حدیث قدسی ہے:

كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِكَيْ اُعْرَفَ.

"کہ میں ایک مخفی خزانہ تھا، مجھے محبت لاحق ہوئی کہ میری معرفت حاصل کی جائے، لہٰذا میں نے مخلوق کو پیدا کیا تا کہ میری معرفت حاصل کی جائے۔"

نیز ارشاد قدرت ہوا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورہ ذاریات، آیت:۵۶)

"کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ یہ میری عبادت کریں"، اور ظاہر ہے کہ عبادت وہی شرف قبولیت سے مشرف ہوسکتی ہے جو معرفت کے ساتھ ہو، لہٰذا حصول معرفتِ پروردگار ہر شخص کے لئے فرض عینی قرار پایا جس کے باعث اصول خمسہ میں سے توحید اور عدل کی معرفت کا حاصل کرنا ہر فرد و بشر کے لئے ضروری اور لازم ہے اور جہاں توحید و عدل کی معرفت ضروری ہے وہاں معارف حقہ اور عبادت و احکام کی تفصیلات کو منجانب خالق حقیقی اخذ کر کے پہنچانے والے مبلغ اسلام نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت بھی ضروری اور دین اسلام کے محافظ امام زمان (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی معرفت بھی لازم اور ضروری ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِهٖ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً.

"کہ جو شخص اس حالت میں مر گیا کہ اس نے اپنے زمانہ کے امام کی معرفت حاصل نہ کی وہ کفر اور زمانہ جاہلیت کی موت مرگیا۔"

لہٰذا توحید اور عدل کے ساتھ ساتھ نبوت اور امامت کی معرفت بھی لازم ہوئی۔ پھر جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام معارف کے حاصل کرنے اور احکام شرع شریف کے بجالانے سے ہر انسان کو مکلف کیا، چنانچہ فرمایا:

اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا. (سورہ ملک، آیت:۲)

"کہ اس ذات پاک پروردگار نے موت و حیات کو اس لئے پیدا فرمایا کہ تمہاری آزمائش کرے اور تمہارا امتحان لے کہ تم میں سے سب سے اچھے اعمال بجالانے والا کون ہے۔"

تو پھر ضروری ہے کہ ان تکالیف اور اعمال کی جزا یا سزا بھی منجانب اللہ ملے اور اس کا کوئی وقت مقرر ہو کیونکہ عدل وحکمت ربی کا تقاضہ ہی یہی ہے۔ چنانچہ اس جزا و سزا کے لئے جو دن مقرر کیا گیا اس کا نام قیامت بھی ہے، یوم آخرت

بھی ہے، یوم الدین بھی اسے کہا گیا، ارشاد قدرت ہے:

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (سورۃ بقرہ، آیت:۴) "کہ وہ متقی لوگ یوم آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔"

لہٰذا قیامت کی معرفت کا حاصل کرنا بھی ہر مکلف پر واجب اور لازم ہوا۔

غرض اصولِ ایمان علماء کے نزدیک پانچ شمار کئے جاتے ہیں، توحید، عدل، نبوت، امامت اور قیامت۔ ان پانچوں کی معرفت حاصل کرنا اور ان پر ایمان رکھنا ہر فردِ بشر پر فرض اور واجب ہے، اور یہ معرفت اس وقت میسر آسکتی ہے جب انسان کو ان کے تفصیلی مباحث پر بقدر ضرورت اطلاع ہو اور ہر شخص ان کو مدلل طور پر سمجھتا ہو، کیونکہ اصول دین میں تقلید کافی نہیں اور دلائل پر مطلع ہونے کے لئے ایسی کتب کا مطالعہ ضروری ہے جن میں علماء نے ان معارف کے مباحث پر سیر حاصل بحث کی ہو مگر ایسی کتابیں بہت کمیاب ہیں۔

اس سلسلہ میں بعض احباب سے کتاب مستطاب حدیقۂ سلطانیہ کی تعریف سنی تھی جس کے باعث اس کی محبت دامن گیر ہوئی لیکن چونکہ شیعیانِ پاکستان کی عدم توجہی کے باعث کتب کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ نہیں اس لئے کسی کتابِ شیعہ کا حاصل ہونا کارے دارد، مگر حسن اتفاق کہ ایک مرتبہ سید الصلحاء و زین الاتقیاء سید محمد ناصر نقوی محلہ شاہ گردیز ملتان سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں انہوں نے اس بلند پایہ کتاب اور اس کے مصنفؒ کے علم و فضل اور عظمت و جلالت کی بڑی تعریف کی تو ناچیز نے ان سے التماس کی کہ کتاب مذکور اگر چند ایام کے لئے مرحمت فرمائی جائے تو مہربانی ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے کتاب مذکور کے مطالعہ کا موقعہ دیا۔ غرض یہ کتاب دیکھنے میں آئی تو وہ اس معیار تعریف سے بدرجہا بلند پایہ ثابت ہوئی جو اس سے قبل سننے میں آئی تھی۔ کتاب مذکور کے مصنف علام انتہائی بلند پایہ عالم ہیں جن کی عظمت و جلالت کا اندازہ علمائے کرام کی ان تقریظات سے ہوسکتا ہے جو انہوں نے کتاب ہٰذا کے بابِ امامت کے متعلق سپردِ قلم کی ہیں۔

حقائق و دقائق کے جو جواہر ریزے اس کتاب میں ودیعت کئے گئے ہیں اور عقلی و نقلی دلائل و براہین کے ذریعہ جس شان سے کتاب ہٰذا کے مطالب و مقاصد کو مبرھن کیا گیا ہے اس کے پیش نظر خیال پیدا ہوا کہ اس بے مثال کتاب کا اُردو زبان میں ترجمہ ہونا چاہئے تاکہ عامۃ المومنین اس میں ذخیرہ کردہ بیش بہا موتیوں سے استفادہ کرسکیں اور دورِ حاضر کے اربابِ ایمان کو پتہ چل سکے کہ قدیم اور بلند پایہ شیعہ علماء کی نگاہ میں مذہب تشیع کے خدوخال کیا ہیں اور عقل سلیم، قرآن کریم اور احادیث معصومین علیہم السلام کی رُو سے وہ کس قدر پختہ، مستحکم اور حقانیت پر مبنی مذہب ہے۔ بعض احباب اور ہمدردانِ مذہب و ملت نے بھی اس خیال کی پرزور تائید کی اور اس کارِ خیر کو بہت جلد عملی جامہ پہنانے پر آمادہ کیا۔

چنانچہ باوجود نامساعد حالات اور گوناگوں دماغی و جسمانی پریشانیوں اور کثرتِ مشاغل کے توکل بر خدا کر کے اس پُرخار وادی میں قدم رکھ دیا اور کئی ماہ کی مسلسل جدوجہد سے تاحال کتاب ہٰذا کے بابِ اوّل یعنی بابِ توحید کا ترجمہ سپرد

قلم کر دیا گیا ہے جو "خزینۂ ایمانیہ ترجمہ حدیقۂ سلطانیہ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے نیز ترجمہ کے علاوہ بعض مقامات پر توضیحی حواشی اور تعلیقات کا اضافہ کیا گیا ہے جن میں حسب ضرورت بعض مصطلحات کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ اصل کتاب میں پیش کردہ آیات کی پارہ، سورہ، رکوع اور آیت کے نمبر کے اعتبار سے پوری نشاندہی بھی کر دی گئی ہے کتب کے پیش کردہ حوالہ جات جن کے ساتھ کتاب کا صفحہ درج نہیں تھا، جو کتابیں ہمیں میسر آ سکی ہیں ان کے مفصل صفحات درج کر دیئے ہیں۔ بعض احادیث کے تراجم بزبان فارسی مصنف علامؒ نے تحریر فرما دیئے تھے اور اصل متن کو درج نہیں کیا تھا تو ان کے عربی اصل متنوں کو جہاں تک میسر آ سکے درج کر دیا گیا اور کئی ایسے مطالب جن کے دلائل مصنفؒ نے ایک مخصوص حد تک تحریر فرمائے تھے حسب تقاضائے ضرورت ان کے مزید دلائل سپرد قلم کر دیئے گئے ہیں۔

اسی طرح کتاب مذکور کو نسبتاً پہلے سے بھی زیادہ مفید بنانے کے مساعی عمل میں لائے گئے ہیں، ان تعلیقات کا نام "توضیحاتِ نورانیہ" رکھا گیا ہے۔ ترجمہ اور مطلب سلیس اور عام فہم اُردو میں ادا کئے گئے ہیں تا کہ عامۃ الناس کو سمجھنے میں دقت درپیش نہ ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔ یہ محنت محض خدمت دین مبین وحمایت حق کے لئے برداشت کی گئی ہے لہٰذا کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ کسی کے مقابلہ یا کسی پر طعن وتشنیع کے پیش نظر یہ اقدام کیا گیا ہے لہٰذا کسی مقام پر کسی صاحب یا کسی فرقہ کے نظریہ کی مخالفت ہوگئی ہو تو اس کی وجہ اتباع حق ہے اور بس۔

آخر میں قارئین کرام سے التجا ہے کہ بندۂ ناچیز کو اپنی دعاء خیر سے فراموش نہ کریں گے اور اگر دورانِ بیان انہیں کوئی لغزش محسوس ہو تو اسے انسانی کمزوری پر مبنی کر کے اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے اور ناچیز کو اس سے مطلع کر کے شکریہ کا موقع دیا جائے اور دربارِ رب العزت و درگاہِ قاضی الحاجات میں انتہائی عجز و نیاز کے ساتھ التجا ہے کہ بہ تصدق جاہِ محمد و آل محمد علیہم السلام ان ادنیٰ مساعی کو اس غریق بحر عصیاں کی مغفرت و بخشش کا ذریعہ قرار دے، آمین ثم آمین۔

بجاہ محمد و علی و فاطمہ و الحسن والحسین و اولادھم الطاھرین صلوات اللہ وسلامہ علیھم اجمعین و برحمتک یا ارحم الراحمین، اللھم صل علی محمد و آل محمد، حررہ اقل العباد عملاً و اکثرھم زللا.

السید گلاب علی شاہ نقوی البخاری عفی عنہ
ابن السید صفت علی شاہ نقوی (قدس سرہ الشریف)
مؤسس اعلیٰ، جامعۃ العربیہ مخزن العلوم الجعفریہ،
شیعہ میانی، ملتان (پاکستان)۔

خزینہ ایمانیہ
ترجمہ
حدیقہ سلطانیہ، مع توضیحات نورانیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمدلله رب العٰلمین و الصلٰوۃ و السلام علی محمد و آله الطیبین الطاهرین المعصومین.

مصنف علام کتاب مستطاب حدیقۂ سلطانیہ کی ابتدا میں خطبہ اور چند تمہیدی سطور کے بعد فرماتے ہیں یہ کتاب دو مقاصد پر مشتمل ہے مقصدِ اوّل اصول عقائد حقہ کے بیان میں ہے اور یہ ایک مقدمہ، پانچ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ وجوبِ معرفت کے بیان میں ہے، پہلا باب: اصول دین میں ہے۔ اصلِ اوّل یعنی توحید پروردگار اللہ جل شانہ اور اس کے صفات ثبوتیہ اور صفات سلبیہ کے بیان میں ہے۔

دوسرا باب: اصول ایمان میں سے اصل ثانی یعنی خالق عالم کے عدل اور مسئلہ جبر و اختیار کے بیان میں ہے کہ جو عدل باری تعالیٰ سے تعلق پذیر ہے۔ تیسرا باب: حضرت سید المرسلین خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بقیہ انبیاء و مرسلین کی نبوت اور اس کے متعلقات کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب: ائمہ اثناء عشر علیهم ألوف التحیة والسلام کی امامت اور اس کے متعلقات کے بیان میں ہے۔

یعنی اس میں ائمہ میں سے ہر ایک کی ولادت، وفات، قدرے ان کے معجزات کا تذکرہ، بارہویں لعل ولایت حضرت صاحب الامر (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی غیبت اور کسی قدر زمانہ رجعت کے حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پانچواں باب: قیامت کے اجمالی بیان میں ہے۔ خاتمہ: احکام اسلام اور ایمان کے بیان میں ہے۔

مقصد ثانی: فروع دین یعنی عبادت و طاعت کے بیان میں ہے۔ یہ ایک مقدمہ، چھ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں طریقۂ اصول و اخبار کے اختلاف کے متعلق اشارہ ہے۔ پہلا باب: احکام طہارت کے بیان میں ہے۔ دوسرا باب: نماز یومیہ وغیر یومیہ کے احکام اور ان کے متعلقات کے بیان میں ہے۔ تیسرا باب: زکوٰۃ و خمس کے احکام کے بیان میں ہے۔ چوتھا باب: احکام روزہ و اعتکاف کے بیان میں ہے۔ پانچواں باب: احکام حج و عمرہ کے بیان میں ہے۔ چھٹا باب: معصومین علیہم السلام کی زیارت کے بیان میں ہے۔

مقصد اوّل اصول اعتقادیہ کے بیان میں ہے۔

مقدمہ معرفت خداوند عالم عز شانہ کے وجوبِ وجود کے بیان میں ہے۔

معرفت خدا، معارف دینیہ یقینیہ میں سے پہلی معرفت ہے۔ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا:

اَوَّلُ الدِّیْنِ مَعْرِفَتُہٗ۔ (۱)

دین کی بنیاد معرفت خدا ہے۔

واضح باد کے خالق کائنات کی معرفت ہر صاحب عقل وتمیز پر واجب ہے اور اس سے مراد کنہ ذات کی معرفت نہیں کیونکہ انسانی عقل اللہ تعالیٰ کی کنہ ذات کے ادراک سے عاجز ہے۔ اس کی ذات اس سے بلند و برتر ہے کہ عقول و اوہام انسانی اس کا احاطہ کرسکیں۔ بے شک ہر وہم وفہم اور ہر عقل و دانش اس کی ذاتِ والا صفات کی حقیقت اور اس کی صفات کی کیفیت کو سمجھنے اور اس کا ادراک کرنے کے متعلق حیران اور سرگرداں ہے۔ لہٰذا اس کی معرفت سے مراد اس کی صفات کے مفاہیم کو جاننے اور اس کی طرف اشیاء و افعال کی جو اضافتیں ہیں ان کے ذریعہ اور جن امور کا اس سے سلب ہونا ہے ان کے ذریعہ اس کی ذات کو پہنچاننا ہے۔ اس کے بعد اس کے وجودِ فیض الجود کے متعلق یقین رکھنا مراد ہے اور ازاں بعد اس کے ان صفات ثبوتیہ کی پہچان حاصل کرنا مراد ہے جن سے اس کی ذات پاک کو متصف کیا جاسکتا ہے اور اس کے لئے وہ صفات ثابت کی جاسکتی ہیں نیز ان صفات سلبیہ کی شناسائی حاصل کرنا مراد ہے جن سے اس کی ذات ستودہ صفات کو مبرا اور منزہ قرار دینا ضروری ہے اور جن کی نفی کرنا اس کی ذات پاک سے لازم اور واجب ہے۔ اس تفصیل کے مطابق معرفت حاصل کرنا ہر مکلف پر واجب اور لازم ہے کیونکہ طالبین معرفت جب اپنے نفوس اور ذوات میں بھی اور ان کے علاوہ آفاق عالم میں بھی بکثرت نعمتوں اور ظاہری اور باطنی حکمتوں کو موجود پاتے ہیں۔

تو معرفت اور یقین حاصل ہونے سے پہلے کم از کم ان کو یہ احتمال بلکہ ظن ضرور دامن گیر ہوتا ہے کہ آثار عالم اور موجودات دنیا کے لئے (کہ جو طرح طرح کی خوبیوں اور حکمتوں سے پُر ہیں اور گونا گوں مہربانیوں اور الطاف پر مشتمل اور رنگا رنگ کرامتوں کو اپنے دامنِ آغوش میں لئے ہوئے ہیں) کوئی ایسا پیدا کرنے والا صانع موجود ہے جو دانا و عالم اور قدرت رکھنے والا اور رحیم ہے۔ وہ وصفِ رضا و غضب ہر دو سے متصف ہوتا ہے لہٰذا جویانِ معرفت اگر غفلت سے

❁ توضیحات نورانیہ ❁

از۔۔۔۔۔ علامہ السید گلاب علی شاہ نقوی (قدس سرہ الشریف)

بسم اللہ الرحمن الرحیم الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی محمد سید الانبیاء والمرسلین و آلہ الطیبین الطاہرین المعصومین

(۱) نہج البلاغہ، الخطبۃ الاولی ج صفحہ: ۱۴، طبع بیروت۔

کام لیں اور ایسے منعم ومحسن حقیقی کے حالات کا علم حاصل نہ کریں جس کی طرح طرح کی بے شمار نعمتیں اور احسانات ان کو ہر وقت گھیرے ہوئے ہیں اور وہ یہ جاننے کی کوشش نہ کریں کہ کون سی چیز اس کی ناراضگی اور غضب کا باعث ہوتی ہے اور کون سی اس کی رضامندی اور خوشنودی کا سبب ہوتی ہے تو یقیناً انہیں یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ وہ علیم وحکیم جو اُن پر اس قدر مہربان اور شفقت سے کام لینے والا ہے ان کے طریق کار کے باعث انہیں اس رستہ کے خلاف گامزن قرار دے گا جو اس کی رضامندی کا موجب ہوسکتا ہے اور ان کے کفرانِ نعمت اور ناشکر گزاری کے باعث انہیں اپنے عتاب وعقاب کا مورد قرار دے گا اور عذابِ ابدی میں معذب رکھنا ان کی سزا تجویز کرے گا۔

جب از روئے عقل یہ ثابت ہوا کہ عذابِ ابدی کا خوف ان لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہوتا ہے جو معرفت پر فائز نہ ہوں اور خدا شناسی کا شرف انہیں حاصل نہ ہو نیز نزدِ عقلاء خوف کو دور کرنا اور اس کے ازالہ کے لئے تا حد امکان کوشش اس وقت لازم اور ضروری ہوتی ہے جب کہ اس کے ازالہ پر قدرت ہو۔ تو ثابت ہوا کہ ایسے منعم حقیقی کی معرفت حاصل کرنا بھی لازم ہے تا کہ خوفِ عذاب کا ازالہ ہو سکے اور اس کے متعلق اطمینان اور سکونِ قلب حاصل ہو جائے۔ لہٰذا اس بارے میں کسی قسم کی غفلت کو راہ نہ دینا چاہئے۔

دربارۂ حکم عقل مذہب اَشاعرہ کی تردید:

ان میں سے فرقۂ اشاعرہ کا اعتقاد یہ ہے کہ اس حکم کو دلیل عقل سے نہیں بلکہ دلیل نقل سے طے کرنا چاہئے کیونکہ عقل کو کسی امر میں دخل نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا وہ وجوبِ معرفت کو دلیل نقلی سے ثابت کرتے ہیں۔ بے شک یہ حکم جہاں دلیل عقلی سے ثابت ہے وہاں آیاتِ قرآن پاک اور بکثرت احادیث کے ذریعہ بھی ثابت ہے، لیکن اشاعرہ کا مسلک درست نہیں کیونکہ قرآن وحدیث کے ذریعہ ان لوگوں پر احتجاج قائم نہیں ہوسکتا جنہوں نے قرآن وحدیث کی حقانیت کو تسلیم نہ کیا ہو اور ابھی تک وہ اللہ تعالیٰ اور اس کی صفاتِ کمال کی معرفت پر فائز اور انبیاء کی تصدیق سے مشرف ہی نہ ہوئے ہوں اور ان کو ابھی تک یہ علم حاصل نہ ہو کہ عالم دنیا کا کوئی پیدا کرنے والا اور مدبر ہے یا نہیں۔

اس نے اپنی طرف سے پیغمبر بھی مبعوث کئے ہیں یا نہیں، اشاعرہ کا ایسے لوگوں کے سامنے قرآن وحدیث سے استدلال اور احتجاج کرنا کہ جو تا حال پیغمبر خدا کی سچائی اور حقانیت کو معلوم نہیں کر سکے، یہ اشاعرہ کی بے سمجھی اور نافہمی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے حجت کہ جو بھی قرآن وحدیث کی حقانیت سے نابلد اور معرفت الٰہیہ سے محروم ہیں نورِ عقل ہے کہ جو منجانب اللہ فطرت سلیمہ کے اعتبار سے ہر شخص پر حجت ہے اور ہر اس شخص کو راہِ حق کی راہنمائی کرنے والا ہے جو سلیم الفطرت ہے۔

عقل کی حجیت پر حدیث کے ذریعہ استدلال:

نیز حدیث شریف [۱] میں وارد ہوا ہے کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں پر دو قسم کی حجت قائم کی گئی ہے۔ ایک حجت ظاہرہ ہے اور دوسری حجت باطنہ، حجت ظاہرہ انبیاء ومرسلین اور ائمہ علیہم السلام ہیں اور حجت باطنہ ہر شخص کی عقل ہے۔"

اصول دین میں تقلید:

نیز مخفی نہ رہے کہ اصولِ دین میں تقلید کرنا اور بلا تحقیق اور حق کو باطل سے دلائل کے ذریعہ ممتاز کر لینے کے بغیر قول غیر کو قبول کرنا جائز نہیں اور اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک مکلف مذاہب مختلفہ میں سے کسی مذہب کی حقانیت کو دلیل اور برہان کے ذریعہ نہ سمجھے بلکہ یوں ہی کسی ایک قول کو اختیار کرے تو خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ اس نے باطل کو سمجھ لیا ہو اور جب یہ احتمال باقی ہوگا تو ایسے اعتقاد کا حامل، حاکم روزِ جزاء کی بارگاہ میں اپنے آپ کو کس طرح معذور ثابت کر سکے گا اور عذابِ الٰہی سے اپنے آپ کو کس طرح محفوظ کر سکے گا۔

اگر ایسے اعتقاد کے ذریعہ کوئی معذور سمجھا جا سکتا ہے کہ جو اس نے یوں ہی کسی غیر سے اخذ کر لیا ہو اور اس اعتقاد کی حقانیت پر کوئی دلیل اس کے پاس نہ ہو تو پھر مذاہب باطلہ کو اختیار کرنے والوں کا کیا قصور ہے کہ جس کے باعث وہ بروزِ قیامت عذاب وعقاب میں مبتلا کئے جائیں گے اور گونا گوں سزاؤں کا ان کو مستوجب قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا اے برادرِ ایمانی: آپ کو چاہئے کہ آپ ان امور سے غافل نہ رہیں اور اپنے انجام کار کو سمجھ کر معرفت و ایمان کے استحکام اور پختگی کے ذریعہ آخرت کے لئے زادِ راہ حاصل کریں تا کہ ایسا نہ ہونے پائے کہ اس روز اپنے آپ کو ابدی ہلاکت وخسران اور دائمی ناکامی میں جھونک دیں جس دن کہ تابعین اپنے سرداروں اور ماموین اپنے اماموں سے تبرا اور بیزاری حاصل کریں گے اور اپنے افعال واعمال پر ندامت اور پشیمانی کے آنسو بہائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء دین اور اہل حق ویقین ہمیشہ نسلاً بعد نسل اپنی پوری طاقت و ہمت سے اصول دین و معارف شرعِ متین کی بنیادوں کو پختہ اور مضبوط کرنے میں مصروف چلے آرہے ہیں اور خصوصیت سے اس مقصد کے متعلق اپنی پوری کوشش کو صرف کرتے رہتے ہیں۔

جب آپ یہ جان چکے تو اب آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ خالق عالم کے وجود اور اس کی عدالت وقدرت کی معرفت اور دیگر ان چیزوں کی معرفت کو ایسے خاص عقلی دلائل سے ثابت کرنا ضروری ہے جن پر نبوت انبیاء کا اثبات مبنی وموقوف ہوتا ہے لیکن جن امور دینیہ کی یہ شان نہیں اور جن کا ثابت کرنا نبوتِ انبیاء کے اثبات کے بعد ممکن ہے ان پر دلائل

---

[۱] اصول الکافی، شیخ کلینیؒ کتاب العقل والجہل، حدیث: ۱۲، جلد: ۱، صفحہ: ۲۵، طبع تہران، ایران۔

عقلیہ کا قائم کرنا ضروری نہیں بلکہ ان امور کو ثابت کرنے کے لئے ارشاداتِ معصومین علیہم السلام کا پیش کر دینا کافی ہے کیونکہ ہر معصوم سراپا صدق اور واجب الاطاعت و لازم الاتباع ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امورِ دینیہ کی اس دوسری قسم کے متعلق رسالہ میں دلائل نقلیہ اور ادلۂ سمعیہ پر اکتفاء کیا گیا ہے کیونکہ اس کتاب کے مصنف اور ان اوراق کے جامع کا مقصود اصلی اور مطمع نظر یہ ہے کہ رسالہ ہذا کا فائدہ عام ہو اور طالبین معرفت کے لئے اس کے مطالب کو حاصل کرنا دشوار نہ ہو۔ پھر چونکہ بمفاد حدیث نبوی:

سَتَفْتَرِقُ أُمَّتِيْ عَلٰى ثَلَاثٍ وَّ سَبْعِيْنَ فِرْقَةً كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا فِرْقَةٌ وَّاحِدَةٌ۔[1]

"اہل اسلام تہتر (۷۳) فرقوں پر متفرق ہو چکے ہیں اور ان میں سے صرف ایک ناجی ہے، دیگر سب ناری ہیں"۔

لہٰذا معرفت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اسلام کے ان متفرق مذاہب میں سے ایک مذہب کو ترجیح دینا واجب و لازم ہے اور اس ناجی فرقہ کی شناخت ضروری ہے اور اس ناجی فرقہ کی شناخت اور مذہب حقہ کی تشخیص حدیث ثقلین:[2]

إِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثِّقْلَيْنِ كِتَابَ اللهِ وَ عِتْرَتِيْ أَهْلَ بَيْتِيْ وَ إِنَّهُمَا لَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ مَا إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوْا۔

کی رو سے کہ جو فریقین کے ہاں متفق علیہ ہے قرآن پاک اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی اتباع میں منحصر ہے کیونکہ از روئے نص رسول و حدیث پاک[3]

مَثَلُ اَهْلَ بَيْتِيْ كَمَثَلِ سَفِيْنَةِ نُوْحٍ مَنْ رَكِبَهَا نَجٰى وَ مَنْ تَخَلَّفَ عَنْهَا غَرِقَ وَ هَوٰى۔

کہ جس کی حقانیت پر تمام اہل اسلام کا اجماع ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام نجات کا سفینہ اور برکات کا خزینہ ہیں۔

لہٰذا دلیل نقلی صرف دو چیزوں میں منحصر ہے۔ ایک کتاب خدا قرآن پاک کی آیات اور دوسرے معصومین علیہم السلام کی روایات۔ چونکہ اصولِ دین اور عقائد یقینیہ کے لئے دلیل قطعی درکار ہوتی ہے اس وجہ سے اصول اعتقاد کی بنیاد اخبارِ آحاد پر نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ امر فرقہ حقہ اثناء عشریہ کے متفقہ مسلمات میں سے ہے کہ خبر واحد اصول میں حجت نہیں ہوسکتی

---

[1] حدیث ستفترق، تفسیر فخر الدین رازی جلد:۱، صفحہ:۲۔

[2] کتب عامہ مشکوۃ المصابیح، مطبع اصح المطابع، صفحہ ۵۶۹، جامع الترمذی ج:۲، صفحہ ۲۱۹، ۲۲۰ طبع مجتبائی دہلی، صحیح المسلم باب فضائل علی بن ابی طالب، نیز نووی ج:۲، صفحہ:۲۷۹، حدیث ثقلین کا تتمہ یہ ہے: اَنَّهُمَا لَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ الخ کہ قرآن پاک اور اہل بیت علیہم السلام آپس میں جدا نہیں ہوں گے حتی کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر وارد ہوں گے۔ یہ حدیث عصمت اہل بیت علیہم السلام کا بیّن ثبوت ہے۔ نیز امیر المومنین علیہ السلام کی خلافت بلافصل کی واضح دلیل ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کو تمام مسلمین، صحابہ وغیرہم کا حاکم اور مطاع واجب الاطاعت قرار دیا ہے۔ لہٰذا جس طرح کوئی صحابی قرآن پاک کا حاکم نہیں ہوسکتا اس طرح جناب امیر علیہ السلام کا حاکم بھی نہیں ہوسکتا نیز یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ ائمہ علیہم السلام کی کوئی حدیث قولی ہو یا فعلی خلاف قرآن نہیں ہوسکتی نیز حدیث سفینہ بھی ان تمام مطالب پر دال ہے۔

[3] مشکوۃ المصابیح، ج:۲، صفحہ:۵۷۳۔

اور آیات و روایات میں سے جو متشابہات ہوں ان کی آیات محکمات اور روایات متواترہ[۱] اور ضروریات دینیہ کے مطابق تاویل کرنا چاہئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ. (سورۃ آل عمران، آیت:۷)

کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ پر قرآن کریم کو نازل فرمایا جس کا ایک حصہ آیاتِ محکمات ہیں جو کہ اس کتاب کی اصل اور اس کا مرجع ہیں اور اس کا دوسرا حصہ آیاتِ متشابہات ہیں جن کا معنی اور مراد ظاہر نہیں، یا ان کا ظاہر مقصودِ الٰہی نہیں جن لوگوں کے دلوں میں کجی اور راہِ حق سے انحراف موجود ہوتا ہے وہ اپنی خواہش کے مطابق تاویل کرنے اور فتنہ پھیلانے کی غرض سے آیاتِ متشابہات کی اتباع اور پیروی کرتے ہیں حالانکہ ان کی تاویل کو سوائے خدا اور ان برگزیدہ ہستیوں کے کوئی نہیں جانتا جو راسخین فی العلم ہیں کہ جنہیں علم میں پختگی اور رسوخ کا شرف حاصل ہے۔

بعض روایات[۲] میں حضرت صادق آل محمد امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

نَحْنُ الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ وَنَحْنُ نَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗ.

"کہ ہم ہی ہیں راسخین فی العلم اور ہم ہی (متشابہات) قرآن کی تاویل کو جانتے ہیں"۔

باب اول

باب اول خالق عالم کے وجود، علم، قدرت اور دیگر صفاتِ ثبوتیہ و صفات سلبیہ کے اثبات میں ہے اور اس میں تین فصلیں ہیں۔

فصل اول:

فصل اول وجودِ واجب کے اثبات میں ہے کہ جو سارے جہاں اور تمام مخلوقات کا پیدا کرنے والا ہے جاننا چاہئے کہ اس مطلب کو ثابت کرنے کی عقلی دلیل کو علمائے کرام رضوان اللہ علیہم نے چند صورتوں پر بیان کیا ہے اور قرآن مجید و

(۱) خبر متواتر اس حدیث کو کہا جاتا ہے جس کو نقل کرنے والے راوی ہر قرن میں اس کثرت کے ساتھ ہوں کہ عقل ان کے متعلق یہ حتمی فیصلہ کرے کہ اس حدیث کے بارے میں یہ سب کے سب جھوٹ پر متفق نہیں ہو سکتے اور جس حدیث کے راوی ہر قرن میں اس کثرت کے ساتھ نہ پائے جائیں بلکہ ہر قرن میں یا کسی قرن میں اس قدر کم ہو جائیں کہ عقل ان کا اس حدیث کے بارے میں جھوٹا ہونا ممکن قرار دے سکتی ہو تو اس حدیث کو خبر واحد کہتے ہیں اور "آحاد" واحد کی جمع ہے۔

(۲) اصول الکافی، صفحہ:۲۱۰، ج۱، کتاب الحجۃ، باب الراسخین فی العلم ہم الائمۃ علیہم السلام؛ تفسیر البرہان ج:۱، صفحہ:۲۶۷ تفسیر آلاء الرحمٰن صفحہ:۲۵۷۔

احادیث معصومین علیہم السلام میں بھی ان میں سے بعض دلائل کی طرف اشارہ واقع ہوا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے مطالب و مقاصد کے بارے میں جن آیات و روایات کا تذکرہ کیا جائے گا وہ اس اعتبار سے نہیں ہے کہ ان دلائل نقلیہ سے استدلال کرنا مقصود ہے بلکہ ان کا ذکر اس لحاظ سے ہے کہ دلائل عقلیہ ان آیات و روایات میں بہترین طریقہ سے واقع ہوئی ہیں۔

دلیل اول:

یہ ہے کہ جب ایک صاحب عقل اس عالم دنیا کے پُر از حکم مصالح، عجیب و غریب مصنوعات ومخلوقات کو غور وخوض کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو وہ یہ سمجھنے اور یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان تمام اشیاء کا کوئی پیدا کرنے والا ہے جو علم وقدرت رکھنے والا، علیم وحکیم اور قادر وتوانا ہے کیونکہ بغیر ایک مدبر علیم اور صانع حکیم کے ان مصنوعات عجیبہ اور مخلوقات غریبہ کا ظہور پذیر ہونا ممکن اور مقصود نہیں ہوسکتا۔ ذیل میں مزید اطمینان وبصیرت اور کمالِ یقین واذعان ہو جانے کے لئے اس مطلب کو چند وجوہ سے بیان کیا جاتا ہے۔

وجہ اوّل: آیت مبارکہ "اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ..." سے استدلال

قرآن مجید میں اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:[1]

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ. (سورۃ بقرۃ، آیت: ۱۶۴)

❁ توضیحات نورانیہ ❁

(حواشی: فصل اوّل)

از۔۔۔۔۔ علامہ السید گلاب علی شاہ نقوی (قدس سرہ الشریف)

[1] آیت: ۱۶۴ سورۂ بقرہ، یہ آیت مبارکہ ان آیات میں سے ہے جو مفوضہ وغیرہ باطل فرقوں کے مذاہب باطلہ کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ ان فرقوں کے مذاہب خلاف قرآن مجید ہیں کیونکہ یہ آیت کہتی ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنا، سورج کو پیدا کر کے لیل ونہار اور شب وروز کا امتیاز پیدا کر دینا، بارش برسانا اور آبِ باراں کے ذریعہ درخت پیدا کرنا، جن سے کشتیاں اور جہاز بنائے جاتے ہیں نیز سبزیاں، میوہ جات، غلہ جات وغیرہ ہر قسم کے نباتات پیدا کر کے زمین کو زندہ اور شاداب وسرسبز کر دینا، زمین میں ہر قسم کے حیوانات کو پیدا کرنا، ہواؤں کو پیدا کر کے ان کے ذریعہ بادلوں کو چلانا، یہ سب قدرتِ خدا کا کام اور اللہ جل شانہ کا عمل ہے اور مفوضہ کہتے ہیں کہ یہ سب آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے افعال ہیں کیونکہ خدا نے ان کو پیدا کر کے ان افعال پر قادر کر دیا ہے اور ہر شئے کو پیدا کرنے پر ان کی ذمہ داری لگا دی ہے اور یہ افعال ان کے سپرد کر دیئے ہیں، (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اس آیہ والیۃ الہدایۃ کا حاصل معنی مع مختصر تفسیر یہ ہے کہ ان آسمانوں کا پیدا کرنا اور ان کے دائرہ کے اندر زمین کو اپنے طبقاتِ ارضیہ کے ساتھ اس انوکھی وضع پر جاگزین کرنا کہ نہ کوئی ستون اس کے نیچے قائم کیا گیا ہے جس کے سہارے وہ ٹھہری ہوئی ہو اور اس نے اس کے بوجھ کو برداشت کر رکھا ہو اور نہ ہی اوپر سے از جانب آسمان کوئی زنجیر یا رسی وغیرہ دائرۂ سماویہ کے اندر لٹکا کر زمین کو اس سے آویختہ کیا گیا ہے کہ جس کے رابطہ اور علاقہ سے آویزاں ہو اور وہ اسے گرنے سے مانع اور روکے ہوئے ہو بلکہ محض قدرت کاملہ کے ذریعہ خالی فضا میں اسے قرار دے دیا اور ٹھہرا ہوا چھوڑا گیا ہے اور اس پر اپنے بندوں، کنیزوں، مردوں اور عورتوں وغیرہ کو اس طرح سکونت پذیر کر دیا ہے کہ وہ اس کے قبضۂ قدرت میں اسیروں اور قیدیوں کی مانند ہیں زمین ان کے پاؤں تلے ایک بچھایا ہوا فرش ہے اور آسمان ان کے سروں پر ایک محیط شامیانہ ہے اس کے ساکنین بندوں وغیرہ کو یہ قدرت اور طاقت حاصل نہیں کہ زمین و آسمان کی اس فضاء سے اگر باہر جانا چاہیں تو جاسکیں۔ پس وہ اسی فضاء کے اندر بند ہیں۔ اگر وہ چاہے تو آسمان کو ان کے اوپر گرا کر انہیں تباہ کر دے اور چاہے تو زمین کو شگافتہ کر کے انہیں ہلاک کر دے۔

پھر اس نے ایک آسمان میں سراج وہاج آفتابِ درخشاں سورج کو جاگزین کر دیا ہے جس کی روشنی ہر ستارے وغیرہ کی روشنی پر غالب ہے اور اسے ایجاد کرنے اور خلعت وجود مرحمت فرمانے کی غرض و غایت اور مصلحت اس کی ضیاء پاشی کے ذریعہ مخلوق کو فوائد اور منافع سے مشرف کرنا ہے کہ وہ اس کی روشنی میں راستے دیکھ کر اِدھر اُدھر چل پھر سکیں اور اپنی

(بقیہ حاشیہ۔ ۱) انہوں نے ہی ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور ہر شئے کو پیدا کرنا ان کا فعل ہے، وہی جہاں خالق ہیں وہی رازق بھی ہیں کیونکہ انہوں نے ہی جہاں دیگر اشیا کو پیدا کیا وہاں مرزوقات یعنی اشیاء خوردنی و پوشیدنی وغیرہ کو بھی پیدا کیا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا مذہب آیت مذکورہ کے خلاف ہونے کے باعث اور دیگر ان آیاتِ قرآنیہ کے خلاف ہونے کے باعث باطل ہے جو اس معنی پر دلالت کرتی ہیں کہ خالق و رازق خدا کی ذات ہے نیز ان لوگوں کا مذہب بھی باطل ہے جو کہتے ہیں کہ ائمہ معصومین علیہم السلام ہر شئے کو پیدا کرتے ہیں لیکن نہ بایں معنی کہ پیدا کرنے کے تمام اختیارات ان کے سپرد کر دیے گئے ہیں اور وہ اپنی ہی صوابدید کے مطابق اور اپنے ہی کلی اختیارات اور ارادہ سے ہر شئے کو پیدا کرتے ہیں۔ کسی چیز کو پیدا کرنے میں انہیں حکم خدا حاصل کرنے کی بھی احتیاج نہیں ہوتی بلکہ وہ ہر شئے کو بایں صورت پیدا کرتے ہیں کہ ہر چیز کو پیدا کرنے میں وہ حکم خدا حاصل کرنے کی احتیاج رکھتے ہیں۔ خدا انہیں حکم دیتا رہتا ہے اور وہ پیدا کرتے رہتے ہیں۔ تمام اشیائے عالم اسی طریقہ سے ائمہ معصومین علیہم السلام نے ہی پیدا کی ہیں۔ اس کو تفویض غیر استقلالی کہا جاتا ہے اور مقدم الذکر صورت تفویض کو تفویضِ استقلالی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں دیگر کوئی فرق نہیں صرف حکم خدا کی احتیاج و عدم احتیاج کا فرق ہے مگر تفویض کی یہ دونوں صورتیں جہاں دیگر آیاتِ قرآنیہ کے خلاف ہیں وہاں آیت مذکورہ بالا اِن فی خلق السمٰوٰت و الارض الخ کے بھی خلاف ہیں، لہٰذا یہ دونوں مذہب باطل ہیں۔

نیز ان لوگوں کا مذہب بھی اس آیت اور دیگر ان کی ہم معنی آیات کے خلاف ہے جو نور وظلمت کو خالق عالم قرار دیتے یا عقول عشرہ کو عالم دنیا کا پیدا کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ غرض اس قسم کے تمام مذاہب خلاف قرآن ہونے کے باعث باطل ہیں۔ پھر مصنف علام اعلی اللہ مقامہ نے جس مقصد کے لئے یہ آیت پیش کی ہے اس پر بوجہ احسن یہ دال ہے کیونکہ اس سے نہ صرف وجود باری ہی پر دلالت ہوتی ہے بلکہ اس کی قدرت اور علم وحکمت پر بھی نہایت حسن وخوبی سے دلالت کرتی ہے۔

دنیا و آخرت کی حاجات کو حاصل کرنے کی سعی اور کوشش کر سکیں اور ایک دیگر آسمان میں قمر منیر، ماہِ تاباں چاند کو جگہ دے دی ہے کہ اندھیری اور تاریک راتوں میں نور افشانی کر کے اہل زمین کے مفاد کا سامان مہیا کرے۔

رات کو اس نے دن کی تکان سے راحت و آرام پانے کا ذریعہ بنایا اور شب و روز کو آپس میں اختلاف رکھنے والا قرار دیا جس اختلاف کے باعث موسم گرمی، سردی، ربیع اور خریف پیدا ہوتے اور ان کے طفیل قدرت خدا کے عجیب و غریب کرشمے ظہور پذیر ہوتے ہیں گوناں گوں اشجار، قسم قسم کے میوہ جات و اثمار اور رنگا رنگ پھول، ان موسموں کی تبدیلی سے پیدا ہوتے ہیں۔ قدرت خداوند عالم کے عجائبات میں سے ہی کشتیاں اور جہاز ہیں جو پانی کی سطح پر رواں دواں رہتے، اموالِ تجارت وغیرہ، اسبابِ منافع کو ادھر ادھر اٹھا کر لے جاتے اور لوگوں کے لئے حصول منافع کا باعث بنتے ہیں اور دن رات سفر کرنے اور چلتے رہنے کے باوجود گھاس چارا حتیٰ کہ پانی تک کی طلب بھی نہیں رکھتے اور صرف ہوا کے واسطہ سے دور دراز کی مسافتیں بہت تھوڑے وقت میں طے کر لیتے ہیں۔ اگر ہوا رک جائے اور چلنا چھوڑ کر ٹھہر جائے تو بحر ذخار میں تمہاری خوراک کا سامان اٹھا کر لانے والے وہ جہاز اور کشتیاں رک جائیں، حرکت تک نہ کر سکیں نیز اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائبات میں سے قطرات برسانے کے ذریعہ آبِ باراں کا نازل کرنا پُراز حکمت ہے کیونکہ اگر پانی دفعۃً، یک لخت اکٹھا اوپر سے زمین پر گر پڑتا تو اسباب، معیشت کی تباہی اور بربادی کا باعث بن جاتا مگر وہ حکیم مطلق اسے بسلسلۂ تقاطر بتواتر نازل فرماتا ہے تا کہ عمومی طور پر وہ فائدہ بخش اور نافع ہو سکے اور اس کے باعث وہ مردہ اور ویران زمین کو زندہ اور آباد کر دیتا اور اشجار و اثمار، کھیتوں اور سبزہ زار اور ہر قسم کی نباتات کو اُگا کر اسے سرسبز اور شاداب بنا دیتا ہے اور زمین کی اس پیداوار میں ان بے شمار اقسام کے حیوانات میں سے ہر قسم کا خاص اور جداگانہ فائدہ ملحوظ رکھا گیا ہے جن کو زمین میں خلق فرمایا ہے۔ زمین اور آسمان کے درمیان ہر جانب سے وہ ہواؤں کو حرکت میں لا کر انہیں مختلف قسم کی ایسی تاثیرات عطا فرماتا ہے کہ وہ گونا گوں غلہ جات کے پیدا ہونے، پھلوں کے پکنے اور دیگر لاتعداد منافع وفوائد کا باعث ہوتی ہیں۔ ان تمام پُراز حکمت افعال اور فوائد و مصالح سے بھرپور موجودات عالم میں خداوند عالم کے وجود اور اس کی قدرت وعلم پر ان لوگوں کے لئے براہین قاطعہ اور دلائل ساطعہ موجود ہیں جو اپنی عقلوں سے غور وخوض اور نظر وفکر کا کام لیتے ہیں۔

وجہ دوم: کشتی سوار کی حالت سے استدلال پر مشتمل حدیث

تفسیر حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام میں منقول ہے:[1]

قَالَ الْإِمَامُ علیہ السلام وَ هُوَ مَا قَالَ رَجُلٌ لِلصَّادِقِ علیہ السلام: يَا ابْنَ رَسُوْلِ اللهِ دُلَّنِيْ عَلَى اللهِ مَا هُوَ؟ فَقَدْ أَكْثَرَ الْمُجَادِلُونَ عَلَيَّ وَ حَيَّرُوْنِيْ فَقَالَ (له): يَا عَبْدَ اللهِ هَلْ رَكِبْتَ سَفِيْنَةً قَطُّ قَالَ: بَلٰى. فَقَالَ:

(۱) تفسیر الامام حسن عسکری علیہ السلام صفحہ: ۶، برحاشیہ تفسیر علی ابن ابراہیم القمی، طبع ایران۔

هَلْ كُسِرَتْ بِكَ حَيْثُ لَا سَفِينَةَ تُنْجِيْكَ وَلَا سِبَاحَةَ تُغْنِيْكَ قَالَ: بَلَى. قَالَ: فَهَلْ تَعَلَّقَ قَلْبُكَ هُنَالِكَ أَنَّ شَيْئاً مِنَ الْأَشْيَاءِ قَادِرٌ عَلَى أَنْ يُخَلِّصَكَ مِنْ وَرْطَتِكَ قَالَ: بَلَى. قَالَ الصَّادِقُ ﷺ: فَذٰلِكَ الشَّيْءُ هُوَ اللّٰهُ الْقَادِرُ عَلَى الْإِنْجَاءِ حِينَ لَا مُنْجِيَ، وَعَلَى الْإِغَاثَةِ حِيْنَ لَا مُغِيْثَ.

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا کہ اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ تعالیٰ کے بارے میں میری راہنمائی فرمائیے کہ وہ کیسی اور کون سی ہستی ہے کیونکہ مجادلین نے مجھ سے اس بارے میں بکثرت جھگڑے کئے ہیں اور مجھے حیران کر دیا ہے، تو حضرتؑ نے فرمایا کہ بندۂ خدا تو کبھی کشتی پر بھی سوار ہوا ہے؟ کہا: جی ہاں۔ فرمایا کہ کبھی ایسا بھی ہوا کہ وہ کشتی کسی ایسے مقام پر جا کر شکستہ ہوگئی ہو جہاں کوئی دوسری کشتی بھی آپ کو نجات نہ دے سکتی ہو اور تیراکی یا کوئی تختہ بھی آپ کو فائدہ نہ پہنچا سکتا اور مستغنی نہ کر سکتا ہو؟ عرض کیا کہ جی ہاں ایسا بھی ہوا ہے، فرمایا کہ کیا ایسا بھی ہوا کہ تیرے دل میں یہ خیال آیا ہو اور اس طرف رجوع کیا ہو کہ کوئی ہستی ایسی بھی ہے جو تجھے اس بلاکت کے بھنور سے نجات دینے پر قادر ہے، عرض کیا: جی ہاں ایسا بھی ہوا، تو حضرت صادق آل محمد علیہ السلام نے فرمایا کہ وہی ہستی خدا ہے کہ جو اس وقت بھی نجات دینے پر قادر ہے جب کہ کوئی نجات دینے پر قادر نہ ہوا اور اس وقت بھی فریاد رسی اور امداد کرنے پر قدرت رکھتا ہے جب کوئی فریاد رسی اور امداد نہ کر سکتا ہو۔ وہ قادر مطلق ہر شئے پر قدرت رکھتا ہے، جب کوئی فریاد رسی اور امداد نہ کر سکتا ہو۔ وہ قادر مطلق ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

آیت کریمہ:

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ (سورۃ النمل، آیت: ۶۲)

میں گویا اسی معنی اور مطلب کی طرف اشارہ[1] ہے کہ وہ ذات کہ جب کوئی بے سہارا اور بے چارہ شخص اس سے دعا کرے اور اسے اپنی امداد کے لئے پکارے تو وہ اس کی حاجت روائی کر سکتا اور مصیبت اور تکلیف کو دور کر سکتا ہے۔

وجہ سوم: جناب امیر المومنینؑ کے خطبہ کے فقرات سے استدلال

امیر المومنین امام المتقین یعسوب الدین اپنے خطبہ میں فرماتے ہیں:

وَلَوْ فَكَّرُوا فِي عَظِيمِ الْقُدْرَةِ وَجَسِيمِ النِّعْمَةِ لَرَجَعُوا إِلَى الطَّرِيقِ وَخَافُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ وَ

[1] مصنف علام قدس سرہٗ کا مضمون آیت کو اشارہ کہنا بظاہر اس امر کی دلیل ہے کہ حدیث مذکور صرف وجود باری تعالیٰ اور اس کی قدرت کی ہی دلیل نہیں بلکہ اس کے علم کی بھی دلیل ہے کیونکہ حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کا مقصد یہ ہے کہ جب انسان ظاہری اسباب سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے اور فقدانِ اسباب کے باعث بیچارہ ہو جاتا ہے تو اس وقت بھی خداوند عالم اس کی حاجت روائی پر قادر ہے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو وہ اسے سنتا، قبول کر سکتا اور اس کی حاجت کو پورا کر سکتا ہے۔ جیسے کہ آیت: اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ الخ، ان کا بھی یہی مطلب ہے۔

لٰكِنِ الْقُلُوبُ عَلِيلَةٌ وَ الْبَصَائِرُ مَدْخُولَةٌ أَلَا يَنْظُرُونَ إِلىٰ صَغِيرِ مَا خَلَقَ كَيْفَ أَحْكَمَ خَلْقَهُ وَ أَتْقَنَ تَرْكِيبَهُ وَ فَلَقَ لَهُ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ سَوَّى لَهُ الْعَظْمَ وَ الْبَشَرَ انْظُرُوا إِلَى النَّمْلَةِ فِي صِغَرِ جُثَّتِهَا وَ لَطَافَةِ هَيْئَتِهَا لَا تَكَادُ تُنَالُ بِلَحْظِ الْبَصَرِ وَ لَا بِمُسْتَدْرَكِ الْفِكَرِ كَيْفَ دَبَّتْ عَلَى أَرْضِهَا وَ صُبَّتْ عَلَى رِزْقِهَا تَنْقُلُ الْحَبَّةَ إِلَى جُحْرِهَا وَ تُعِدُّهَا فِي مُسْتَقَرِّهَا تَجْمَعُ فِي حَرِّهَا لِبَرْدِهَا وَ فِي وِرْدِهَا لِصَدَرِهَا مَكْفُولٌ بِرِزْقِهَا مَرْزُوقَةٌ بِوَفْقِهَا لَا يُغْفِلُهَا الْمَنَّانُ وَ لَا يَحْرِمُهَا الدَّيَّانُ وَ لَوْ فِي الصَّفَا الْيَابِسِ وَ الْحَجَرِ الْجَامِسِ وَ لَوْ فَكَّرْتَ فِي مَجَارِي أَكْلِهَا فِي عُلْوِهَا وَ سُفْلِهَا وَ مَا فِي الْجَوْفِ مِنْ شَرَاسِيفِ بَطْنِهَا وَ مَا فِي الرَّأْسِ مِنْ عَيْنِهَا وَ أُذُنِهَا لَقَضَيْتَ مِنْ خَلْقِهَا عَجَباً وَ لَقِيتَ مِنْ وَصْفِهَا تَعَباً فَتَعَالَى الَّذِي أَقَامَهَا عَلَى قَوَائِمِهَا وَ بَنَاهَا عَلَى دَعَائِمِهَا لَمْ يَشْرَكْهُ فِي فِطْرَتِهَا فَاطِرٌ وَ لَمْ يُعِنْهُ عَلَى خَلْقِهَا قَادِرٌ.[1]

حاصل معنی حضرت کے ان ارشادات کا یہ ہے کہ وجود صانع با تدبیر و خالق با تقدیر کا انکار کرنے والے کافر، اگر اس کی قدرت کاملہ و نعمت عظیمہ کے متعلق غور و خوض کرتے تو یقیناً وہ راہ راست پر آ جاتے اور آتش جہنم کے عذاب سے خوفزدہ ہو جاتے لیکن ان کے دل جہالت اور نادانی کے مریض ہیں اور چشم بصیرت، عیب، نافہمی و ناکامی کے باعث معیوب اور نقصان زدہ ہے، کیا وہ اس کی چھوٹی سی چھوٹی مخلوق کی طرف ہی نہیں دیکھتے کہ اس کی خلقت کو کس طرح اس پاک پروردگار نے محکم اور پختہ بنایا ہے اور اس کی ترکیب کو کیسے متقن کیا ہے؟ اور کس طرح اس کے کان اور اس کی آنکھ کو پیدا کیا اور اس کی ہڈیوں اور چمڑے کو درست کیا، ذرا چیونٹی کی طرف، اس کے جسم کے چھوٹا سا ہونے اور اس کی ہیئت کے لطیف ہونے کے اعتبار سے تو دیکھو، اس قدر چھوٹی سی تو ہے کہ نظر ہی مشکل سے آتی ہے اور قریب ہے کہ دکھائی نہ دے اور لطیف اس قدر کہ بڑے غور و خوض کے باوجود اس کی لطافت کی حقیقت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ تعجب ہوتا ہے کہ وہ اس قدر چھوٹی سی ہونے کے باوجود زمین پر کس طرح چل پڑی ہے اور کس طرح وہ اس قدر حریص ہوگئی ہے کہ اپنے رزق پر ٹوٹی پڑی ہے۔ دانے اٹھا اٹھا کر اپنے سوراخ میں داخل کئے جاتی ہے۔ گرمیوں میں سردیوں کے لئے ذخیرہ کرتی رہتی ہے اور اپنے باہر ہونے کے ایام میں اندر واپس چلے جانے کے ایام کے لئے جمع کرتی رہتی ہے حالانکہ اللہ جل شانہ اس کے رزق کا بھی کفیل ہے۔ ضرورت کے مطابق اسے بھی عطا فرما دیتا ہے۔ وہ سخی اس سے بھی غافل نہیں، وہ

[1] نہج البلاغہ ج:۲ر ۱۴۱، خطبہ: ۱۸۰ طبع مصر و بحار الانوار ج: ۳، صفحہ: ۲۶ طبع جدید طہران، احتجاج طبری صفحہ: ۱۰۷ طبع قدیم، جناب امیر علیہ السلام کا یہ فرمان شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تعلق تمام ممکنات سے یکساں حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس کے لئے کوئی امر مشکل نہیں سب کچھ اس کے لئے آسان ہے، کما قال عز شأنہ: إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (سورۂ یٰسین، آیت: ۸۲) کہ اس کی شان عالی یہ ہے کہ جب کسی شئے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے حکم دیتا ہے کہ اس طرح ہو جا تو وہ اس طرح ہو جاتی ہے جس طرح کہ مشیت ایزدی کا تقاضا ہوتا ہے بس اس کا ارادہ ہی عین فعل ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے لہٰذا مشکل اور آسان کی تقسیم و تنویع ہماری قدرت کے لحاظ اور خارجی اسباب کے اعتبار سے ہوتی ہے اس کی قدرت کاملہ کے اعتبار سے سب کچھ آسان ہے۔

جواد و کریم اسے بھی محروم نہیں رکھتا، اگرچہ کہ وہ خشک چٹان اور ٹھوس پتھر کے اندر ہی کیوں نہ ہو وہیں اسے اس کا رزق مل جاتا ہے۔ اگر آپ اس کے ان اعضاء کے متعلق غور وفکر کریں جن سے اس کی غذا گزرتی ہے اور اس کے اوپر اور نیچے کے تمام اجزاء کا بغور مطالعہ کریں اور اس کے بطن میں اس کی پسلیوں اور اضلاع کو اور اس کے سر میں پیدا کردہ اس کی آنکھوں اور کانوں کو بھی بغور دیکھیں تو اس کی انوکھی خلقت اور اچھوتی وضع کے متعلق آپ کے تعجب کی انتہا نہ رہے گی اور اس کی عجیب وغریب خلقت کی وضاحت کرنے اور اس کی تفصیلات کو بیان کرنے سے آپ عاجز آجائیں گے۔ بے شک بلند مرتبہ ہے وہ ہستی، جس نے اس کے پاؤں پر اسے قائم کر دیا اور مناسب ستونوں پر اس کے جسم و جثہ کی عمارت کو استوار کر دیا اور اس قدر عجائبات کے ودیعت ہونے کے باوجود اس کی آفرینش میں اس ذات احدیت کے علاوہ دوسرا کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں اور اس کے پیدا کرنے میں اس کا کوئی مددگار نہیں۔

وَ لَوْ ضَرَبْتَ فِي مَذَاهِبِ فِكْرِكَ لِتَبْلُغَ غَايَاتِهِ مَا دَلَّتْكَ الدَّلَالَةُ إِلَّا عَلَى أَنَّ فَاطِرَ النَّمْلَةِ هُوَ فَاطِرُ النَّخْلَةِ لِدَقِيقِ تَفْصِيلِ كُلِّ شَيْءٍ وَ غَامِضِ اخْتِلَافِ كُلِّ حَيٍّ وَ مَا الْجَلِيلُ وَ اللَّطِيفُ وَ الثَّقِيلُ وَ الْخَفِيفُ وَ الْقَوِيُّ وَ الضَّعِيفُ فِي خَلْقِهِ إِلَّا سَوَاءٌ.

وَ كَذٰلِكَ السَّمَآءُ وَ الْهَوَآءُ وَ الرِّيَاحُ وَ الْمَآءُ فَانْظُرْ إِلَى الشَّمْسِ وَ الْقَمَرِ وَ النَّبَاتِ وَ الشَّجَرِ وَ الْمَاءِ وَ الْحَجَرِ وَ اخْتِلَافِ هٰذَا اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ تَفَجُّرِ هٰذِهِ الْبِحَارِ وَ كَثْرَةِ هٰذِهِ الْجِبَالِ وَ طُوْلِ هٰذِهِ الْقِلَالِ وَ تَفَرُّقِ هٰذِهِ اللُّغَاتِ وَ الْأَلْسُنِ الْمُخْتَلِفَاتِ فَالْوَيْلُ لِمَنْ أَنْكَرَ الْمُقَدِّرَ وَ جَحَدَ الْمُدَبِّرَ زَعَمُوْا أَنَّهُمْ كَالنَّبَاتِ مَا لَهُمْ زَارِعٌ وَ لَا لِاخْتِلَافِ صُوَرِهِمْ صَانِعٌ وَ لَمْ يَلْجَئُوا إِلَى حُجَّةٍ فِيْمَا ادَّعَوْا وَ لَا تَحْقِيقٍ لِمَا أَوْعَوْا وَ هَلْ يَكُوْنُ بِنَآءٌ مِنْ غَيْرِ بَانٍ أَوْ جِنَايَةٌ مِنْ غَيْرِ جَانٍ.

حاصل معنی یہ ہے کہ اگر تو اپنی فکر کے رہوار تیز رفتار کو ہر جانب اور ہر جہت میں اس لئے دوڑائے کہ عجائبات قدرت کو معلوم کرنے کے لئے فکر کی انتہائی حدود تک پہنچ جائے اور ان کا جائزہ لے لے تو بالآخر تمام چیزوں میں کامل غور وخوض کے بعد دلیل فکر تمہاری یہی راہنمائی کرے گی کہ چھوٹا سا جسم رکھنے والی چیونٹی اور دراز قامت شجر خرما ہر دو کا پیدا کرنے والا ایک ہی ہے۔ بے شک ہر شئے کی تفصیل دِقت کی حامل ہے اور جاندار اشیاء کا باہمی اختلاف بھی بڑی گہرائیوں پر مشتمل ہے تاہم بقدر طاقت انسانی غور وخوض آپ کی یہی راہنمائی کرے گا کہ سب چیزوں کا پیدا کرنے والا صرف ایک ہی وحدہٗ لاشریک ہے اور اس کی قدرت کے لحاظ سے سب چیزیں برابر ہیں کیا چھوٹی کیا بڑی، کیا ثقیل کیا خفیف، کیا قوی کیا ضعیف، سب کی سب چیزوں کا پیدا کرنا اس کے لئے یکساں طور پر آسان ہے اور باوجود اَلوان و اَشکال کے اختلاف اور اعراض و احوال کے تفاوت کے سب کا موجد ایک ہی ہے۔ زمین و آسمان اس کی قدرت و مشیت کے قبضہ میں ہے اور عناصر اربعہ آگ، ہوا، مٹی، پانی اور موالید ثلاثہ جمادات، نباتات اور حیوانات سب اسی کے ارادہ اور تقدیر کے محکوم ہیں۔ لہٰذا اپنی چشم بصیرت سے میل کچیل کو دور کیجئے اور شمس وقمر، گھاس پات، اشجار وثمار، لیل ونہار، دریا و

انہار، پہاڑوں کی بلند چوٹیاں اور کثرت کوہسار، لغات کا اختلاف اور السنۂ مختلفہ کی تعداد و شمار کا بغور ملاحظہ کیجئے تو آفتاب و مہتاب اپنی صفائی اور روشنی کے ساتھ اس قادرِ قدیم کی کمالِ قدرت پر شہادت دیں گے اور اشجار و نباتات اپنی رونق و خوبصورتی اور تروتازگی کے ساتھ اس صانع حکیم اور خالق علیم کے وجودِ ذی جود اور وحدت و یکتائی پر دلالت کریں گے اور اسی طرح پتھر کا سکون، پانی کا اضطراب، زمین کا آرام، چلتے پھرتے جانوروں کی حرکت، شب و روز کا اختلاف، دریاؤں، سمندروں کی ظاہری حالت، پہاڑوں کی کثرت اور ان کی چوٹیوں کی بلندی، کیفیتوں کا اختلاف اور طبائع و عادات کا تفاوت و افتراق یہ سب کے سب امور صانع عالم کے وجود، اس کی قدرت کاملہ وحکمت شاملہ اور اس کی وحدت و یکتائی اور یگانگت کے لئے براہین ساطعہ اور دلائل باہرہ وقاطعہ ہیں۔ لہٰذا لائق نفرین ہے وہ شخص جو ایسے باتقدیر قادر کے وجود سے انکار کرتا ہے اور اس حکیم وعلیم مدبر کے وجود اور کمالات کا اعتراف نہیں کرتا۔

بے دین زندیق گمان کرتے ہیں کہ یہ سارے موجودات خودرو بوٹیوں کا سا حکم رکھتے ہیں کہ جو بغیر کاشت کے زمین سے نکل کر سر بلند کر دیتی ہیں۔ ان کی صورتوں اور اشکال کے اختلاف کے لئے کسی صانع اور فاعلِ موثر کا ہونا ضروری نہیں اور ان کے حالات اور اعراض کی تبدیلی اور تغیر کے لئے کسی فاعل کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ وہ اپنے اس دعویٰ کی کوئی دلیلِ عقلی یا عملی نہیں رکھتے اور بلاسوچے سمجھے اس سراپا قباحت کلام کو اپنی زبان پر جاری کر دیتے ہیں حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ کوئی بناء بغیر بانی کے اور کوئی عمارت بغیر معمار کے وجود میں آجائے اور کوئی کام بغیر کرنے والے کے وجود پذیر ہو جائے۔

وَ إِنْ شِئْتَ قُلْتَ فِي الْجَرَادَةِ إِذْ خَلَقَ لَهَا عَيْنَيْنِ حَمْرَاوَيْنِ وَ أَسْرَجَ لَهَا حَدَقَتَيْنِ قَمْرَاوَيْنِ وَ جَعَلَ لَهَا السَّمْعَ الْخَفِيَّ وَ فَتَحَ لَهَا الْفَمَ السَّوِيَّ وَ جَعَلَ لَهَا الْحِسَّ الْقَوِيَّ وَ نَابَيْنِ بِهِمَا تَقْرِضُ وَ مِنْجَلَيْنِ بِهِمَا تَقْبِضُ يَرْهَبُهَا[1] الزُّرَّاعُ فِي زَرْعِهِمْ وَ لَا يَسْتَطِيعُونَ ذَبَّهَا وَ لَوْ أَجْلَبُوا بِجَمْعِهِمْ حَتّٰى تَرِدَ الْحَرْثَ فِي نَزَوَاتِهَا وَ تَقْضِيَ مِنْهُ شَهَوَاتِهَا وَ خَلْقُهَا كُلُّهُ لَا يُكَوِّنُ إِصْبَعًا مُسْتَدِقَّةً فَتَبَارَكَ اللهُ الَّذِيْ يَسْجُدُ لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ طَوْعًا وَ كَرْهًا وَ يُعَفِّرُ لَهُ خَدًّا وَ وَجْهًا وَ يُلْقِيْ إِلَيْهِ بِالطَّاعَةِ سِلْمًا وَ ضَعْفًا وَ يُعْطِيْ لَهُ الْقِيَادَ رَهْبَةً وَ خَوْفًا فَالطَّيْرُ مُسَخَّرَةٌ

---

(۱) يَرْهَبُهَا یعنی اس کی قدرتِ کاملہ کا کرشمہ ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی کمزور اور ناتواں چیز کو بڑے بڑے طاقتور سرکشوں پر غالب کر دیتا ہے چنانچہ مچھر نے نتھنوں کے راستے دماغ نمرود پر غلبہ پا کر اس کے غرور کو چکنا چور کیا، کما جاء فی راویة الاحتجاج أدخلت البعوضة فی منخر نمرود حتی وصلت الی دماغه فقتلته کہ نمرود کے نتھنے میں مچھر داخل ہو گیا حتی کہ اس کے دماغ تک پہنچ گیا اور اس مردود کو واصلِ جہنم کر دیا (سفینۃ البحار، ج:۱صفحہ:۸۹)۔ ابابیل پرندہ کے ذریعہ ابرہہ بادشاہ کے لشکر کو تباہ کیا چنانچہ ارشاد قدرت ہے: اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيْلِ ۝ اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ ۝ وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۝ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝ (سورہ فیل، آیت:۱ تا ۵)۔ تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے ہاتھی والوں سے کیا کیا کہ ان کی طرف ابابیل پرندوں کو بھیجا جو ان کو مٹی کی کنکریوں کا نشانہ بناتے رہے۔ بالآخر ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی مانند بنا دیا۔

لِأَمْرِهِ أَحْصٰى عَدَدَ الرِّيْشِ مِنْهَا وَ النَّفَسِ وَ أَرْسٰى قَوَائِمَهَا عَلَى النَّدٰى وَ الْيَبَسِ وَ قَدَّرَ أَقْوَاتَهَا وَ أَحْصٰى أَجْنَاسَهَا فَهٰذَا غُرَابٌ وَ هٰذَا عُقَابٌ وَ هٰذَا حَمَامٌ وَ هٰذَا نَعَامٌ دَعَا كُلَّ طَآئِرٍ بِاسْمِهٖ وَ كَفَلَ لَهٗ بِرِزْقِهٖ وَ أَنْشَأَ السَّحَابَ الثِّقَالَ فَأَهْطَلَ دِيَمَهَا وَ عَدَّدَ قِسَمَهَا فَبَلَّ الْأَرْضَ بَعْدَ جُفُوْفِهَا وَ أَخْرَجَ نَبْتَهَا بَعْدَ جُدُوْبِهَا.

حاصل معنی یہ ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو ٹڈی کے حالات میں غور وفکر کیجئے اور اس کے جسم وجثہ میں ودیعت شدہ صانعِ عالم کے دقائقِ صنعت کو ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سرخ سرخ دو آنکھیں عطا فرمائی ہیں اور چاند کی مثل دو نورانی ڈھیلے ان میں روشن کئے ہیں۔ نہایت چھوٹے چھوٹے مخفی سے اسے کان بھی مرحمت فرمائے، نہایت درست اور مناسب اس کو منہ عطا کیا، بڑی تیز اور قوی حس اسے بخشی، منہ میں اس کے دو دانت بڑے تیز پیدا کئے جن سے ہر شئے کو کتر کر رکھ دیتی ہے اور درانتی کی شکل والے اس کے دو پاؤں پیدا کئے جن کے ذریعہ وہ ہر چیز کو پکڑ لیتی ہے۔ کسان اپنی کھیتیوں میں ہمیشہ اس سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ کسی بھی حیلہ وتدبیر سے اس کو ہٹا نہیں سکتے اگرچہ کہ وہ سب اکٹھے بھی ہو جائیں تاہم اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہتے ہیں، تا آنکہ وہ اچھلتی کودتی کھیتی میں داخل ہو جاتی ہے اور اپنی خواہش کو پورا کر لیتی ہے حالانکہ وہ ساری کی ساری چھوٹی انگلی کے برابر نہیں ہوتی لہٰذا بزرگ اور برکت والی ہے یہ ذاتِ خدا جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی رہنے والی ساری مخلوق بخوشی یا بجبر واکراہ سجدہ ریز ہوتی ہے اور ہر شئے عجز وانکسار کا مظاہرہ کرنے کے لئے اس کی بارگاہ میں اپنے چہرے اور رخسارے کو خاک آلود کرتی ہے اور سرتسلیم خم کرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں اتباع واطاعت کا اظہار کرتی ہے۔ انتہائی خوف اور ڈر کے باعث اس کے حکم کی اتباع وفرمانبرداری کا بوجھ سہارے رہتی ہے۔ پرندے ہوا میں اس کے حکم کے لئے مسخر اور تابع فرمان ہیں۔ چرندے زمین میں اس کے حکم کے تابع اور مطیع ہیں۔ ہر پرندے کے پروں کی تعداد کا اس نے احصاء اور شمار کر رکھا ہے۔ ہر حیوان کے سانس لینے کی تعداد کی بھی اس نے گنتی کر رکھی ہے۔ ہر خشک وتر زمین پر قوائم طیور کو قائم کیا اور جس بھی جگہ پر کوئی ہے حسب ضرورت اس کی خوراک وہیں پہنچانے کا اہتمام کر دیا ہے۔ تمام پرندوں کی اقسام وانواع کا اسے علم ہے کہ یہ کوّا ہے اور یہ عقاب، یہ کبوتر ہے اور وہ شتر مرغ، ہر ایک کو دوسرے سے امتیازی نام عطا کیا ہے اور ہر ایک کا جداگانہ نام قرار دیا ہے اور اپنے لطف وکرم سے ہر ایک کے رزق اور غذا کا خود ضامن اور کفیل ہو گیا ہے۔ پانی سے بھرپور بھاری بھرکم بادل ہوا میں پیدا کرتا ہے اور ان سے بکثرت بارش زمین پر نازل کرتا ہے۔ بارش کے تمام قطرات کو اس کا علم حاوی ومحیط ہے اور زمین کو اپنی حکمتِ کاملہ کے طفیل پانی کے نقصانات سے محفوظ رکھتا ہے۔ مردہ زمین کو از سر نو زندگی عطا فرماتا اور اپنے فیض عمیم کے طفیل خاکِ خشک کو سرسبز اور شاداب کر دیتا ہے۔

وجہ چہارم: حضرت صادق آلِ محمد علیہ السلام کی خدمت میں مرغ کے انڈے سے استدلال

احتجاج طبرسی میں مروی ہے:[1]

دَخَلَ أَبُو شَاكِرٍ الدَّيَصَانِيُّ وَ هُوَ زِنْدِيقٌ عَلَى أَبِي عَبْدِ اللهِ عليه السلام فَقَالَ لَهُ: يَا جَعْفَرَ بْنَ مُحَمَّدٍ دُلَّنِي عَلَى مَعْبُودِي فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ عليه السلام: اِجْلِسْ، فَإِذَا غُلَامٌ صَغِيرٌ فِي كَفِّهِ بَيْضَةٌ يَلْعَبُ بِهَا فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ عليه السلام: نَاوِلْنِي يَا غُلَامُ الْبَيْضَةَ، فَنَاوَلَهُ إِيَّاهَا. فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ عليه السلام: يَا دَيَصَانِيُّ هٰذَا حِصْنٌ مَكْنُونٌ لَهُ جِلْدٌ غَلِيظٌ وَ تَحْتَ الْجِلْدِ الْغَلِيظِ جِلْدٌ رَقِيقٌ وَ تَحْتَ الْجِلْدِ الرَّقِيقِ ذَهَبَةٌ مَائِعَةٌ وَ فِضَّةٌ ذَائِبَةٌ فَلَا الذَّهَبَةُ الْمَائِعَةُ تَخْتَلِطُ بِالْفِضَّةِ الذَّائِبَةِ وَ لَا الْفِضَّةُ الذَّائِبَةُ تَخْتَلِطُ بِالذَّهَبَةِ الْمَائِعَةِ فَهِيَ عَلَى حَالِهَا لَا يَخْرُجُ مِنْهَا خَارِجٌ مُصْلِحٌ فَيُخْبِرَ عَنْ إِصْلَاحِهَا وَ لَا يَدْخُلُ إِلَيْهَا دَاخِلٌ مُفْسِدٌ فَيُخْبِرَ عَنْ إِفْسَادِهَا لَا يُدْرٰى لِلذَّكَرِ خُلِقَتْ أَمْ لِلْأُنْثٰى تَنْفَلِقُ عَنْ مِثْلِ أَلْوَانِ الطَّوَاوِيسِ، أَ تَرٰى لَهُ مُدَبِّرًا؟ قَالَ فَأَطْرَقَ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَ أَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُولُهُ وَ أَنَّكَ إِمَامٌ وَ حُجَّةٌ مِنَ اللهِ عَلٰى خَلْقِهِ وَ أَنَا تَائِبٌ مِمَّا كُنْتُ فِيهِ.

حاصل مضمون یہ ہے کہ ابوشاکر دیصانی، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جبکہ وہ ابھی مشرف بہ اسلام نہ ہوا تھا۔ عرض کیا کہ حضور! مجھے میرے معبود کے متعلق راہنمائی فرمائیے، بحق ناطق حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: بیٹھ جائیے۔ اچانک حضرت کی نگاہ اقدس اپنے چھوٹے شہزادے پر پڑی جس کے ہاتھ میں مرغ کا انڈا تھا، جس سے وہ کھیل رہا تھا۔ فرمایا: بچے! یہ انڈا مجھے دیجئے۔ انڈا مل گیا۔ حضرت نے انڈے کی طرف اشارہ کر کے دیصانی سے فرمایا اور بطورِ استعارہ کہا کہ یہ ایک قلعہ ہے جس کے گرد ہر طرف سے حصار قائم کر دیا گیا ہے۔ اندرونی حالت اس کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ اوپر کا چھلکا اس کا سخت ہے جس کے نیچے ملائم کی باریک جھلی ہے جو اپنے ماتحت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس کے نیچے سیال سونا یعنی زردی ہے اور پگھلی ہوئی چاندی یعنی سفیدی ہے۔ نہ وہ سیال سونا پگھلی ہوئی چاندی کے ساتھ مخلوط ہو سکتا ہے اور نہ چاندی سونے سے امتزاج پذیر ہو سکتی ہے۔ بس ان دونوں میں سے ہر ایک کو خداوند عالم نے اپنی قدرت کاملہ سے اسی حالت پر برقرار کر رکھا ہے اور اپنی حکمت عامہ کے تحت باوجود سیلان اور رطوبت کے وصف پر مشتمل ہونے کے ان دونوں کو باہم ممتزج ہونے سے اس طرح روک دیا ہے کہ انڈے کے اِدھر اُدھر حرکت پذیر ہونے کے باوجود وہ آپس میں مخلوط نہیں ہو سکتے اور کوئی اصلاح کنندہ اس کے اندر سے نہیں آیا اور کوئی خراب کنندہ باہر سے اس کے اندر نہیں گیا کہ جو اس کے درست یا خراب ہونے کی خبر دے۔ لہٰذا اس کی اصلاح

---

[1] احتجاج طبرسی، طبع قدیم، صفحہ: ۱۷۹، احتجاجات حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام، اصول الکافی، جلد ۱، صفحہ ۷ ۱۳، کتاب الحجۃ۔

اور درستی اس مدبر خبیر کی تقدیر و تدبیر سے وابستہ ہے کہ جو ہر ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے اور سوائے اسے پیدا کرنے والے کے کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اس انڈے کو نر کیلئے پیدا کیا گیا ہے یا مادہ کے لئے، اور وہ بچہ پیدا ہونے کے وقت ایک ہی طور و طریقہ اور ایک ہی اسلوب و طرز پر خلعتِ وجود کو زیبِ تن کر کے انڈے کے چھلکے کو توڑ کر باہر آ جاتا ہے خاص کر مور کا بچہ کہ وہ مختلف قسم کے رنگوں سے مزین ہوتا ہے۔ اب بتائیے کہ اس بلند پایہ صنعت اور کاریگری کے لئے آپ کے خیال میں کسی صانع حلیم وعلیم اور خالق یا تدبیر کا ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ امام معصوم علیہ السلام کا یہ پُراز حکمت کلام سن کر دیصانی دیر تک سرنگوں کچھ سوچتا رہا۔ چونکہ علمبردارِ ہدایتِ خلق کے اس بیان شافی نے اس کے آئینۂ دل سے زنگ کو کافور کر دیا تھا اور امام معصومؑ کے کلامِ معجز نظام نے نورِ ایمان سے اس کے قلب کو روشن کر دیا تھا لہٰذا بے ساختہ اس کی زبان سے کلمہ طیبہ کی یوں صدا آئی:

اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمدا عبده ورسوله.

اس کا دل عقائد حقہ کا گرویدہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ بے شک آپ خلق خدا پر حجت اور برحق امام و رہنما ہیں اور میں اس حیرت اور گمراہی سے توبہ کرتا ہوں جس میں پہلے مبتلا تھا۔

وجہ پنجم: آیت مبارکہ "وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ" سے استدلال

اللہ جل شانہ نے قرآن پاک میں سورۃ الذاریات میں فرمایا:

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ○ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ (سورۃ الذاریات، آیت: ۲۰-۲۱)

حاصل مضمون حق مقرون وصدق مشحون یہ ہے کہ زمین میں اور خود تمہارے نفوس میں بھی وجودِ صانعِ علیم وخبیر اور خالقِ حکیم وقدیر پر انتہائی واضح طور پر دلالت کرنے والے بکثرت دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ موجود ہیں تو کیا تم بصیرت نہیں رکھتے؟ کیونکہ مقتضائے بصیرت کے مطابق تمہاری رفتار نہیں، بلکہ تمہارا طرزِ رفتار ان لوگوں کا سا ہے جو بے بصیرت اور کورِ باطن ہوں۔ جاننا چاہئے کہ روئے زمین پر جمادات ونباتات، اشجار و اثمار، حیوانات و احجار وغیرہ میں صنعت الٰہیہ کے جو عجائبات ودیعت کئے ہیں ان کا بیان طوالتِ کلام کا مقتضی ہے۔ صرف خلقتِ انسان کے متعلق غور وخوض کرنا مطلب براری کے لئے کافی اور وافی ہے کیونکہ روئے زمین پر جو کچھ ہے ان سب سے بلکہ ساری مخلوقات سے انسان زیادہ شرف اور عظمت رکھنے والا ہے لہٰذا اسی کے کچھ حصہ کی تفصیل کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے اور جو تقریریں معرض بیان میں لائی جائیں گی وہ ائمہ معصومین علیہم السلام ہی کے انوار کا اقتباس اور انہیں کے ارشاداتِ عالیہ سے ماخوذ ہیں۔

لہٰذا واضح باد کہ انسانی خلقت کی ابتداء خاک اور گوندھی ہوئی مٹی سے ہوئی۔ بعد ازاں زن و مرد کے نطفہ سے اسے پیدا کیا گیا کیونکہ مدبرِ علیم، صانعِ حکیم نے حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کو مٹی اور پانی سے پیدا کرنے کے بعد نوعِ انسانی کو

باقی رکھنے کے لئے توالد و تناسل کی بنیاد زن و مرد کے مخلوط نطفہ پر رکھی۔ لہٰذا ابتدائے خلقت میں انسان ایک مٹھی بھر خاک کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد اس کی پیدائش نطفے سے ہوئی کہ جو گونا گوں ذلتوں اور کثافتوں سے متصف اور لوگوں کی نگاہوں میں ایک بے قدر اور ذلیل و خوار چیز ہے۔ پھر جب اللہ جل شانہ نے کہ جو حکیم مطلق اور مدبرِ کل ہے اسے رحمِ مادر میں جاگزین کیا اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف انتقال پذیر کیا تو کبھی وہ خون محض تھا اور کبھی گوشت کا لوتھڑا، اور کسی وقت وہ ایسا جسمِ کامل بن گیا کہ جو ہڈی، گوشت، پوست وغیرہ اجزاء سے انتہائی موزونیت سے اور مناسبت اور طرح طرح کی حکمت و متانت کے ساتھ ترکیب دیا گیا تھا۔ رحمِ مادر کی تاریکیوں میں وہ بہترین صفت کے مواد اور انتہائی خوبصورت شکل و ہیئت پر تالیف پذیر ہوا۔ جب وہ گوشت کے لوتھڑے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا اس وقت وہ عقل و دانش سے بالکل خالی تھا اور غذا حاصل کرنے یا اپنی تکلیف سے خود کو دور کرنے کا کوئی حیلہ وسیلہ اختیار نہیں کر سکا تھا۔ اگر اسے اسی حال پر چھوڑ دیا جاتا تو نہ خود اس میں یہ طاقت تھی نہ کسی دوسرے بشر میں یہ قدرت تھی کہ ظلمت کدۂ رحم میں اس کی اصلاح کر کے اسے اس کی آخری منازل تک پہنچا دے۔ اس حالت میں جب کہ اسے کوئی آنکھ دیکھ نہ سکتی تھی اور کسی ہاتھ کو اس تک رسائی نہ ہو سکتی تھی، اس حالت میں حکیم مطلق نے اپنی حکمتِ کاملہ سے ہڈیاں، گوشت پوست، انتڑیاں وغیرہ تمام وہ اعضاء اسے عطا کر دیئے جو اس کے لئے ضروری اور ناگزیر تھے اور بقدرِ ضرورت غذا کے لئے اسے اس طرح خون حیض پہنچایا جس طرح پانی کے ذریعہ ایک کھیتی کو سیراب کیا جاتا ہے۔ پھر اپنی قدرت کاملہ سے اس کے جسم پر روح کا فیضان کیا اور اس کے واسطے سے اس میں حس و حرکت پیدا کر دی۔

اسی مطلب کی طرف اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے:[1]

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ○ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ○ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۥ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ

---

[1] المومنون آیت: ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴، انسان سے مراد یہاں حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مٹی کے ایک خالص کردہ جوہر سے پیدا کیا، اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○ (سورۂ ص، آیت: ۷۱، ۷۲) کہ اس وقت کا تذکرہ کیجئے جب تیرے رب نے ملائکہ سے کہا کہ میں گوندھی ہوئی مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں جب میں اسے درست کر چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تمہارے اوپر لازم ہے کہ تم اس کے سامنے سجدہ میں گر جاؤ۔ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مع ان کی بیوی حضرت حوا سلام اللہ علیہا کے مٹی سے پیدا کیا، پھر ان کی تمام اولاد کو ماں باپ کے نطفہ سے پیدا کیا۔ صرف ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا۔ چونکہ ابوالبشر حضرت آدم اور ام البشر حضرت حوا علیہما السلام مٹی سے پیدا ہوئے اس لئے انسان خاکی کہلاتے ہیں کیونکہ ہر انسان بالآخر حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کی اولاد میں ہی شمار ہوتا ہے۔ انسان اس اعتبار سے تو خاکی ہے لیکن دوسرے اعتبار سے وہ نور بھی ہے اور وہ انسان کے ایمان، ایقان، علم و عرفان، زہد و تقویٰ اور عملِ صالح کا اعتبار ہے۔ لہٰذا جو انسان مومن و موقن، عالم و عارف و زاہد و متقی ہو اور اعمال صالح اور خصالِ حمیدہ و اوصاف و کمالاتِ پسندیدہ سے متصف ہو وہ جہاں خاکی ہے وہاں نوری بھی ہے، قال اللہ تعالیٰ: اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ (سورہ بقرہ، آیت: ۲۵۷) (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

خَلْقًا اٰخَرَ ۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ (سورہ مومنون، آیت: ۱۲ تا ۱۴)

ترجمہ: ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے ایک خالص جوہر سے پیدا کیا، پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ یعنی "رحم مادر" میں نطفہ بنا کر رکھا، پھر ہم نے نطفے کو خونِ منجمد بنا دیا، پھر اس خونِ منجمد کو گوشت کا لوتھڑا بنا دیا، پھر گوشت کی پوشاک پہنائی، پھر ہم نے اس میں روح ڈال کر اسے ایک اور صورت میں پیدا کر دیا، بے شک بابرکت ہے اللہ تعالیٰ کی ذات جو سب سے بہتر خالق ہے۔

عن الباقر علیہ السلام هو نفخ الروح فيه.

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ "خلقاً آخر" سے مراد اس میں روح کا داخل کرنا ہے۔

توضیح دربارۂ روح:

روح وہ جوہر لطیف ہے کہ عقلاء اور علماء اس کی حقیقت کو معلوم کرنے سے عاجز اور اس کی کنہ کی تحقیق کے متعلق حیران ہو کر رہ گئے ہیں باوجود بکثرت غور وخوض کرنے کے اس کی حقیقت کا نشان تک نہیں پا سکے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے کہا ہے: من عرف نفسه فقد عرف ربه کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا یعنی جسے یہ پتہ چل گیا کہ وہ اپنی حقیقت کو پہچاننے سے عاجز ہے تو وہ یقیناً سمجھ لے گا کہ وہ اپنے رب کی کنہ حقیقت کے معلوم کرنے سے بطریقِ اَولیٰ عاجز ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ جب انسان اپنی ذات کے متعلق پہچان لے گا کہ وہ ایک خالق

(بقیہ حاشیہ۔۱) کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان اختیار کر چکے ہیں، وہ ان کو کفر وشرک اور فسق کی تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے، نیز فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (سورہ حدید، آیت: ۲۸) "اے اظہارِ ایمان کرنے والو! اللہ سے ڈرو اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کما حقہ ایمان لاؤ تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے دو حصے تمہیں عطا کرے گا اور تمہارے لئے ایسا نور پیدا کر دے گا جس کے ذریعہ تم چلتے رہو گے اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور مہربانی کرنے والا ہے۔" نیز فرمایا: اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ۔ (سورۃ انعام، آیت: ۱۲۲) "کیا جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اسے زندہ کر دیا اور اسے ایسا نور عطا کر دیا جس کے ذریعہ وہ چلتا پھرتا ہے اس شخص کی مثل ہو سکتا ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ تاریکیوں میں پھنسا ہوا ہے، ان سے نکل ہی نہیں سکتا۔" معلوم ہوا کہ مومن خاکی ہونے کے باوجود نوری ہے لیکن ایمان وتقویٰ کے چونکہ مختلف مدارج ہیں لہٰذا مومنین کے نور کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ جس قدر کسی کا ایمان وایقان اور زہد وتقویٰ کا درجہ بلند ہے اسی قدر اس کی نورانیت زیادہ ہے۔ ہر نبی اپنی امت سے زیادہ نورانی ہوتا ہے اور محمد وآل محمد علیہم السلام سب انبیاء سے زیادہ نورانیت کے حامل ہیں۔

اسی لئے قرآن پاک میں ان کو نفس نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ خاکی ہونا نوری ہونے کے خلاف نہیں۔ سب انبیاء حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس لئے ان کو خاکی کہا جا سکتا ہے جس طرح کہ دیگر مومنین کو خاکی کہا جا سکتا ہے مگر وہ ایمان وعرفان اور تقویٰ وزہد کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں اس لئے وہ نوری بھی ہیں۔ ہاں حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے جو کافر ہوئے وہ نوری نہیں کہے جا سکتے وہ صرف خاکی ہیں۔

حکیم اور مدبر علیم کا پیدا کیا ہوا ہے تو اپنے پروردگار کی معرفت بھی حاصل کر لے گا کیونکہ آثار موثر پر اور مخلوقات خالقِ مدبر پر دلالت کرتے ہیں۔ پھر ہم نوعِ انسان کی عجائباتِ خلقت کے بیان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

جاننا چاہئے کہ شکم مادر میں انسان کی خلقت پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی، بدن اس کا مستحکم ہو گیا اور گوشت و پوست اس قدر قوت حاصل کر چکا کہ وہ ہوا کو برداشت کر سکے اور اس کی گرمی وسردی اسے ضرر اور نقصان نہ پہنچائے، آنکھیں روشنیوں کو دیکھنے کی طاقت حاصل کر چکیں تو الہام الٰہی کے باعث وہ شکم مادر میں حرکت پذیر ہو گیا اور بڑی طاقت اور سختی کے ساتھ باہر آنے کی طرف متوجہ اور مائل ہو گیا۔ جب رحم مادر کے تنگ و تاریک مقام سے جہانِ دنیا کی وسعتوں اور پہنائیوں میں اس نے قدم رکھا تو نئی غذا کی طرف اسے احتیاج لاحق ہوئی۔ حکیم مطلق اور مدبر کامل و اکمل نے اسی کثیف خون کو شیر مادر کی ایسی لطیف غذا کی صورت میں منقلب کر دیا اور اس کے رنگ اور ذائقہ ہر دو کو بہترین صورت میں تبدیل کر دیا اور اس لطیف اور شیریں غذا کو دو چھوٹے چھوٹے مشکیزوں میں بھر کر سینۂ مادر کے ساتھ آویختہ کر دیا تا کہ جس وقت بھی اسے خواہش ہو اپنی خوراک کو ہر وقت مہیا اور حاضر پائے اور صرف اپنے لبوں کو جنبش دے کر پیٹ بھر لے اور سیر ہو جائے۔ پھر جب تک اس کا بدن نازک، انتڑیاں کمزور و باریک اور اعضاء نرم اور لطیف تھے، طاقتور غذا کی تاب نہ لا سکتے تھے اس وقت تک شیر مادر ہی اس کی غذا رہی اور جب طاقت زیادہ آ گئی اور دوسری غذا کی احتیاج لاحق ہوئی تو تیز دانت اور داڑھیں باری تعالیٰ عز اسمہ' کی قدرت وحکمت سے پیدا ہونا شروع ہو گئیں تا کہ ان کے ذریعہ سخت غذا کو چبا کر نرم کر لے اور اس کا حلق سے نیچے اتار دینا آسان ہو جائے اور اس طرح وہ بالتدریج جوانی اور کمالِ عقل کی منزل تک پہنچ سکے۔ پھر اگر مرد ہے تو ریش مقدس کے بال چہرے کی سطح پر اُگنے شروع ہو گئے جو مردوں کی علامت اور ان کے عزت و وقار کا باعث و موجب ہے اور اس کے ذریعہ وہ بچوں اور عورتوں کی مشابہت سے امتیاز حاصل کر لیتا ہے اور اگر عورت ہے تو اس کا حسین چہرہ بالوں سے خالی اور پاک رہتا ہے تا کہ اس کا حسن اور خوبصورتی باقی رہے اور اس کے طفیل مردوں کو اس کی جانب رغبت اور میلان حاصل ہو اور یہ امر بقائے نسل انسانی کا باعث ہو۔

لہٰذا ایک صاحب عقل و دانش کو غور کرنا چاہئے کہ ان امور میں کس قدر بلند پایہ حکمتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں اور کس طرح ہر چیز کو اس کے مناسب محل پر جگہ عطا کی گئی ہے اور اس کے باوجود کیا ممکن ہے کہ ان بے شمار حکمتوں اور لاتعداد تدابیر پر مشتمل مخلوقات بغیر کسی خالق علیم وصانع حکیم کے پیدا ہو گئی اور وجود پذیر ہو گئی ہوں؟ ذرا غور تو کیجئے کہ اگر شکم مادر میں بچے کو غذا نہ پہنچتی جو کہ بحکمت الٰہیہ خون حیض ہوتا ہے تو بچہ کیا اس طرح خشک نہ ہو جاتا جس طرح بغیر پانی کے گھاس خشک ہو جاتا ہے اور اگر کامل ہونے کی منزلیں طے کرنے کے بعد ولادت کے ذریعہ بچے کو رحم مادر کی تنگ کوٹھری سے باہر نہ لایا جاتا تو وہ ہمیشہ کے لئے زندہ در گور کی طرح وہیں رہ جاتا اور کوئی فائدہ اور ثمرہ اس سے حاصل نہ ہو سکتا۔ اسی طرح بعد از ولادت اگر شیر مادر کی اسی مناسب غذا بچے کے لئے مہیا نہ ہوتی تو بھوک کے باعث مر جاتا۔ علیٰ ہٰذا القیاس

اگر ایسی غذا اسے کھلانے کا اہتمام ہوتا جو اس کے بدن کے موافق اور مناسب نہ ہوتی اور اس کا جسم نازک اس کے ذریعہ صلاح پذیر نہ ہوسکتا تو بھی بچہ موت ہی کا شکار ہو کر رہ جاتا اور اگر بچے کی غذا ہمیشہ کے لئے ماں کا دودھ ہی مقرر کی جاتی تو اس کا بدن طاقت وقوت حاصل نہ کرسکتا اور اس کا انجام بھی ہلاکت ہی ہوتی اور تقاضائے حکمت پورا نہ ہوسکتا۔ علاوہ ازیں بچہ ماں کو دوسرے بچوں کی تربیت اور پرورش کے فرائض انجام دینے میں حائل اور مانع ہوتا۔

نیز اگر بچے کو دانت عطا نہ کئے جاتے تو سخت غذا کا کھانا اس کے لئے دشوار اور مشکل ہو جاتا اور اگر ابتداء خلقت میں ہی بچے کو عقل وفہم عطا کر دیا جاتا اور دفعتہً وہ دنیا کے اس نامعلوم و نادیدہ عجائب گھر میں قدم رکھتا کہ خود اسے بھی اس نے پہلے نہ دیکھا تھا اور اس جیسے کسی اور عالم کو بھی نہ دیکھا تھا کہ جس میں انسانوں، چوپایوں، پرندوں اور آسمان اور زمین وغیرہ کی مختلف صورتیں موجود ہوں تو وہ پریشان ہو جاتا اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہر لمحہ اور ہر روز اس کی حیرت اور پریشانی بڑھتی جاتی اور انتہا تک پہنچ جاتی۔ آپ خیال فرمایئے کہ اگر کسی شخص کو قید کر کے ایک شہر سے دوسرے شہر میں لے جائیں کہ جسے اس نے کبھی دیکھا نہ ہو، اس کے رہنے والوں کے حالات وعادات وغیرہ پر وہ کوئی اطلاع نہ رکھتا ہو، ان کی زبان کو بھی سمجھ نہ سکتا ہو تو یقیناً وہ بڑے اضطراب اور پریشانی میں مبتلا ہو جائے گا حالانکہ ایسے واقعات کثرت سے دیکھے اور سنے گئے ہیں۔

نیز اگر بچے کو عقلمند اور فہم و دانش رکھنے کی حالت میں پیدا کیا جاتا تو اپنے مقام پر وہ اس قدر ذلت اور شرمندگی کا ادراک کرتا کہ جس سے زیادہ ذلت وخواری کا تصور نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ اپنے آپ کو دیکھتا چیتھڑوں میں لپٹا پڑا ہے جہاں چاہتے ہیں اسے رکھ دیتے ہیں اور جدھر چاہتے ہیں اسے اٹھا لے جاتے ہیں، جھولے میں اسے حرکت دیتے رہتے ہیں۔ وہ نہ کلام کرنے کی طاقت رکھتا ہے، نہ چلنے پھرنے کی قوت رکھتا ہے۔ کلام ان کا سمجھ نہیں سکتا۔ عجیب عجیب قسم کی آوازیں اسے سنائی دیتی ہیں لیکن ان کا کوئی معنی اور مطلب وہ نہیں سمجھ سکتا۔ اس قسم کے بکثرت فوائد اور ثمرات اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ مخلوقات میں سے ہر امر میں پنہاں اور ملحوظ و مقصود ہیں کہ انسانی عقولِ قاصرہ ان کے عشرعشیر کا بھی ادراک نہیں کر سکتے۔ بعض دیگر شقوں کے فوائد کو اگر ذکر کیا جائے تو کلام طول پکڑ جائے گا۔ اس مختصر رسالہ میں اتنی مقدار پر ہی اکتفا کرنا بہتر ہے۔ جو شخص امور کی تفصیل پر اطلاع حاصل کرنا چاہے اسے احادیث ائمہ معصومین علیہم السلام خصوصاً حدیث مفضل اور نہج البلاغہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے کیونکہ وہ سرچشمۂ معارف ہے۔

جب آپ کو ان حکم ومصالح کے کچھ حصہ پر اطلاع ہوگئی کہ جو خلاق عالم نے خلقت انسان وغیر انسان، زمین و آسمان وغیرہ میں ودیعت کئے ہیں تو ان سے اس صانع حکیم و خالق علیم کے وجودِ ذی جود پر آپ کے لئے براہین ساطعہ اور دلائل قاطعہ قائم ہو گئے کہ جو مخلوقاتِ عالم کی آلائش سے مبرا و منزہ اور احتیاج و افتقار کے شائبوں سے پاک و پاکیزہ ہے۔ ان دلائل کے طفیل آپ کو یقین حاصل ہو جائے گا کہ خالق عالم کو تمام مخلوقات سے مباینت کلیہ حاصل ہے اور ہر قسم

کے نقص وعیب سے وہ پاک اور مبرا ہے اور آپ کی عقل سلیم یہ فیصلہ کرے گی کہ اس کے علاوہ ہو نہیں سکتا کہ ان اشیاء کے خالق نے ان کے تمام فوائد و اغراض کے جاننے اور ان کے حسن و قبح کی پوری معرفت رکھنے کے ساتھ اپنی قدرت و اختیار سے ان کو پیدا کیا ہے اور یہ حکم لگائے گی کہ جو چیز فہم و ادراک نہ رکھتی ہو یا اختیار و قدرت رکھنے والی نہ ہو ایسا ممکن نہیں ہوسکتا کہ اس سے اس قسم کی عجیب و غریب مصنوعات صادر ہوں جو اس قدر مصالح اور حکمتوں پر مشتمل ہیں۔ حالانکہ اگر کسی انسان کو ہم اس حالت میں پائیں کہ وہ کارِ کتابت یا خیاطت کو انجام دے رہا ہے یا کوئی تحریر ایسی دیکھیں کہ جو مختلف قسم کی خوبیوں اور محاسن پر مشتمل ہے تو اس تحریر کے لکھنے والے اور کپڑے کے سینے والے کی زندگی، اس کی معرفت و قدرت اور اس کا علم و اختیار بلاشک وشبہ قطعیات اور یقینیات میں شمار ہوگا اور یہ امور اس کے ظاہر ترین اوصاف میں سے قرار دیئے جائیں گے حالانکہ اس کے ان صفات کو صرف کتابت اور خیاطت کے ذریعہ معلوم کیا ہے، دیگر اس کے کسی وصف کو نہیں دیکھا تو پھر جب ہم عالم دنیا کی تمام چیز میں زمین وآسمان، انسان وحیوان، شمس وقمر، شجر و ثمر وغیرہ کو دیکھ رہے ہیں، جن چیزوں میں سب سے بڑی دلیل اور سب سے بڑا شاہد خود ہمارے نفوس ہیں اور ہماری حالت کا تغیر و تبدل ہے بعد ازاں ان تمام امور کا بھی ادراک کر رہے ہیں جو ہم حواسِ خمسہ ظاہرہ، باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ اور ذائقہ کے ذریعہ معلوم کرتے ہیں۔ پھر ان امور کا بھی ہم علم حاصل کر رہے ہیں جن کا ادراک ہم عقل کے ذریعہ اور باطنی بینائی کے ذریعہ کرتے رہتے ہیں کہ جن پر تمام علوم کا مدار ہے تو پھر ان تمام دلائل و براہین کے ذریعہ خالق عالم کا وجود اور اس کا علم وقدرت ہم پر کیوں کر ظہور پذیر نہ ہو۔

ایک کاتب کی زندگی اور اس کے علم وقدرت کا پتہ ہم کو صرف اس کے ہاتھ کی حرکت سے چل جاتا ہے تو یہ مصنوعات و مخلوقات غیر متناہیہ ان کے پیدا کرنے والے کے وجود، قدرت اور علم پر کیوں نہیں دلالت کر سکتے؟ کیا ہی خوب کہا ہے، کہنے والے نے:

اثر الاقدام یدل علی المسیر ـ والبعرۃ تدل علی البعیر فسماء ذات ابراج و ارض ذات فجاج لایدلان علی الصانع الخبیر؟

کہ پاؤں کا نشان "چلنے والے کے چلنے" پر دلالت کرتا ہے اور اونٹ کی مینگنی اونٹ کا پتہ بتاتی ہے تو پھر یہ اتنا بڑا برجوں والا آسمان اور اتنی وسیع راستے رکھنے والی زمین ان کے پیدا کرنے والے صانع علیم وخبیر کے وجود پر کیوں نہیں دلالت کر سکتے۔

لیکن چونکہ انسان اپنے بچپنے کی ابتداء سے ان چیزوں کے ساتھ انس اور الفت پیدا کر چکا ہے اس لئے وہ ان عجائبات کی اس دلالت اور گواہی پر آگاہ اور اس کی طرف ملتفت نہیں ہوسکتا جو دلالت ان مخلوقات کی ان کے پیدا کرنے والے حکیم اور مدبر کے وجود اور اس کی قدرت و علم پر ہوتی ہے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ انسان جب اس وقت سے ان

چیزوں کو دیکھنے لگا ہے جبکہ اس کے بچپن کا زمانہ تھا، عقل اس کی پختہ تھی، شب و روز لہو ولعب اور دیگر خواہشات نفسانیہ میں مستغرق رہتا تھا، چنانچہ اسے ان چیزوں سے انس اور الفت پیدا ہوگئی۔ اس لئے ان چیزوں کے دیکھنے سے جو راہنمائی اور رہبری انسان کو حاصل ہوسکتی تھی اس کی طرف انسان کی توجہ نہ رہ گئی۔

یہی وجہ ہے کہ اگر انسان اچانک کسی عجیب حیوان یا کسی عجیب وغریب فعل کو جو خلافِ عادت ہوتا ہے دیکھ لیتا ہے تو بڑا متعجب ہوتا ہے اور بلا اختیار اس کی زبان خالق کی مدح وثنا میں مصروف ہو جاتی ہے اور دل کمالِ خالق کے اعتقاد کے متعلق بڑی سرعت اور تیزی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن چونکہ شب و روز اپنے اعضاء اور دیگر بکثرت حیوانات کے اعضاء و اجزاء کو ملاحظہ کرتا رہتا ہے اس لئے وہ ان کی اس دلالت اور رہبری سے غافل رہتا ہے جو ان کے ذریعہ خالق عالم کے وجود اور دیگر کمالات پر قائم ہوتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ اگر بالفرض کوئی شخص مادرزاد کور یعنی نابینا پیدا ہو اور بلوغ اور سن شعور تک وہ اسی حالت پر رہے پھر دفعۃً اچانک اندھے پن کا پردہ اس کی آنکھوں سے دور ہو جائے اور اس کی نظر زمین، آسمان، انسان، چوپائے، گھاس، پانی، انہار، اشجار، اثمار اور دیگر عجائبات عالم پر پڑے تو اسے خالق عالم کے کمال اور مصنوعات کے عجائبات سے خلاق عالم کے وجود اور علم اور قدرت وغیرہ پر جو دلالت قائم ہوگئی ہے اس کی وجہ سے وہ اس قدر حیران اور پریشان ہوگا کہ فرطِ حیرانی کے باعث اس کے دیوانہ ہو جانے اور عقل کے زائل ہو جانے کا اسے خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

دلیل دوم:

"موجود کے واجب و ممکن کی طرف تقسیم کرنے کے ذریعہ وجودِ واجب الوجود پر استدلال"

دوسری دلیل حکماء کی یہ ہے کہ جسے اکثر متکلمین نے بھی ذکر کیا ہے۔ یہ دلیل متعدد ایسے درست اور صحیح مقدمات پر مبنی ہے جن کا سمجھنا دقت سے خالی نہیں ہے۔ اس مقام پر ہم اس مختصر تقریر پر اکتفا کرتے ہیں جسے علامہ محمد باقر مجلسیؒ نے حق الیقین میں بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر مفہوم جسے انسان تصور کرتا ہے وہ تین صورتوں سے باہر نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ یا بذات خود بغیر کسی دوسرے امر کی طرف نگاہ کرنے اور بدون کسی علت اور سبب کا ملاحظہ کرنے کے خارج میں موجود ہونے کو چاہے گا یا عدم کو چاہے گا یا عدم اور وجود میں سے کسی ایک کو بھی نہیں چاہے گا۔ اگر بذاتِ خود خارج میں موجود ہونے کو چاہے تو اسے واجب الوجود کہتے ہیں اور اگر بذاتِ خود عدم کو چاہے تو اسے ممتنع الوجود کہتے ہیں اور اگر بذات خود وہ نہ وجود کو چاہے اور نہ عدم کو بلکہ اس کی ذات کی طرف نگاہ کرنے کے اعتبار سے اس کا موجود ہونا بھی صحیح ہوسکتا اور موجود نہ ہونا بھی درست ہوسکتا ہو، اگر اس کی علت متحقق ہو جائے تو موجود ہو جاتا ہو ورنہ وہ معدوم ہوتا ہو تو اسے ممکن الوجود کہتے ہیں۔

لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ عالم دنیا میں بلاشک موجودات پائے جاتے ہیں، اگر کہا جائے کہ یہ موجودات سارے کے سارے ممکنات میں ہی منحصر ہیں، واجب الوجود ان میں کوئی ہے ہی نہیں تو یہ محال ہے کیونکہ فرض کیجئے وہ سب ایک مجموعی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ بمنزل شخص واحد ہیں تو جس طرح کہ اس مجموعہ کے افراد بغیر علت کے موجود نہیں ہو سکتے مثلاً زید کی جب تک علت نہ ہو اس کا موجود ہونا محال ہے، اسی طرح ان تمام افراد کا مجموعہ بھی بغیر علت کے موجود نہیں ہوسکتا کیونکہ جس طرح افراد ممکن الوجود ہیں اسی طرح ان افراد کا مجموعہ بھی ممکن الوجود ہے۔ لہٰذا اگر افراد تو بغیر علت کے نہ پائے جاسکیں مگر مجموعہ ان افراد کا بغیر علت کے موجود ہو جائے تو ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے جو کہ بداہۃً باطل ہے، اس لئے ماننا پڑے گا مجموعہ ممکنات کے وجود کی کوئی نہ کوئی علت ضرور ہے۔

پھر وہ علت موجود ہوگی کیونکہ جو چیز خود موجود نہ ہو اس کا دوسری چیز کی علت ہونا بداہۃً محال ہے نیز یہ کہ وہ علت ممکنات کے اس مجموعے سے خارج ہوگی کیونکہ ممکنات جس قدر ہیں ان کا اس مجموعے میں داخل ہونا فرض کیا گیا ہے اور جب علت اس مجموعہ ممکنات سے خارج ہوگئی تو لازم ہے کہ وہ واجب الوجود ہو کیونکہ ممکنات کے مجموعے سے جو موجود خارج ہو وہ واجب الوجود ہی ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ موجوداتِ عالم سارے کے سارے ممکن الوجود نہیں بلکہ ان میں واجب الوجود بھی موجود ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو تمام ممکنات کی علت اور ان سب کو پیدا کرنے والی ہے۔ اور اگر کہا جائے مجموعۂ ممکنات کے جو اجزاء فرض کئے گئے ان میں سے ہر ایک دوسرے کے وجود کی علت ہے اور مجموعۂ ممکنات کی علت ان اجزاء کی علتوں کا مجموعہ ہے تو یہ بھی محال ہے کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ ان اجزاء میں سے ہر ایک کا وجود اس کی علت کے وجود کی شرط کے اعتبار سے واجب ہے، بذاتِ خود کوئی جز واجب نہیں۔ اس لئے تمام علتوں کے مجموعے کا عدم ممکن ہے اور اس امکان عدم کے باعث مجموعہ اجزاء کا عدم بھی ممکن ہے ورنہ مجموعہ کا بلا علت موجود ہونا لازم آئے گا جو کہ ترجیح بلا مرجح ہونے کے باعث باطل ہے، انتہی کلامہ اعلی اللہ مقامہ۔ بعض علماء نے اس دلیل کی تقریر کو اس طرح جاری کیا ہے کہ ممکنات کی علت اگر واجب الوجود ہے تو مطلب حاصل اور اگر فرض کیا جائے کہ ایک ممکن کو دوسرے ممکن نے پیدا کیا ہے اور واجب الوجود کوئی ہے ہی نہیں تو دَور یا تسلسل لازم آئے گا حالانکہ دَور اور تسلسل دونوں باطل ہیں اور مستلزمِ باطل بھی باطل ہوتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ کوئی واجب الوجود ہے جس نے تمام ممکنات کو پیدا کیا ہے اور ابطال دور و تسلسل کے دلائل اور براہین بڑی کتابوں میں تحریر ہیں، جسے خواہش ہو ان کتابوں کی طرف رجوع کرے۔

دلیل سوم:

حدوث عالم کے ذریعہ استدلال

یہ متکلمین کی پیش کردہ دلیل ہے جس کی مختصر تقریر یہ ہے کہ عالم یعنی اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو کچھ بھی موجود ہے وہ اپنی

ذات اور صفاتِ حقیقت میں تغیر پذیر ہے۔ آئے دن اس میں کوئی نہ کوئی تبدیلی اور تغیر رونما ہوتا رہتا ہے اور ہر متغیر حادث ہوتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ عالم قدیم نہیں حادث ہے۔ یعنی وہ نہ ہونے کے بعد وجود پذیر ہوا ہے اور ہر حادث کسی ایسی ہستی کی طرف محتاج ہوتا ہے جو اس کا محدث، موجد اور پیدا کرنے والا ہو۔ لہٰذا ضروری ہے کہ عالم کائنات میں کوئی حوادث کو پیدا کرنے والی ایک قدیم اور ازلی ہستی ہو جو کسی محدث اور موجد کی طرف محتاج نہ ہو بلکہ وہ بذاتِ خود موجود ہو اور ایسی ہستی واجب الوجود ہی ہوسکتی ہے۔ یہ دلیل بہت سے طولانی مباحث رکھتی ہے جن کے در پے ہونا اختصار کے پیش نظر اس مقام کے مناسب نہیں۔

فصل دوم:

اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ

اللہ تعالیٰ کی صفات ثبوتیہ کے بیان میں آٹھ صفات شمار کی جاتی ہیں:

پہلی صفت:

پہلی صفت "وہ قدیم ہے" یعنی ازلی و ابدی اور باقی ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، کیونکہ اگر حادث ہو تو عدم سابق اس کے لئے ماننا پڑے گا حالانکہ سابقاً ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے، لہٰذا کسی طریقہ سے بھی عدم اور نیستی اس کے لئے ممکن نہیں اور قدیم ہونے کا یہی مطلب ہے۔

دوسری صفت:

دوسری صفت وہ تبارک وتعالیٰ قادرِ مختار ہے، کوئی ممکن اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے، ہر شئے کے موجود کرنے اور نہ کرنے کا اسے اختیار حاصل ہے۔ ایسا نہیں کہ وہ ایجادِ اشیاء کے لئے مجبور اور ان کا فاعلِ موجب ہو یعنی تمام اشیاء اس سے اس طرح اضطراراً صادر نہیں ہوتیں جس طرح آگ جلانے اور آفتاب روشن کر دینے میں مجبور اور مضطر ہے۔ لہٰذا اللہ جل شانہ فاعل بالا یجاب نہیں جس طرح کہ فلاسفہ کہتے ہیں اور نہ ہی وہ ممکنات کو واقع کرنے سے عاجز ہے کہ وہ ان کو موجود نہ کر سکتا ہو کیونکہ اضطرار اور عجز دونوں نقص ہیں اور ذاتِ پاکِ پروردگار ہر نقص و عیب سے پاک و مبرا و منزہ ہے۔ لہٰذا اس کی قدرت ہر مقدور کو شامل ہے اور اس کی طاقت و توانائی ہر جہت کے اعتبار سے کامل، تمام اشیاء کو اسی نے اپنی قدرتِ کاملہ سے خلعتِ وجود بخشی اور وہی ہر شے کو خلعتِ وجود سے ملبوس کرتا رہتا ہے۔ اس کی قدرت کے اعتبار سے تمام اشیاء برابر ہیں خواہ کوئی چیز بڑی ہو یا چھوٹی، جلیل ہو یا حقیر، سب مساوی حیثیت سے اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں جیسے کہ امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا:

مَا الْجَلِيْلُ وَاللَّطِيْفُ وَالثَّقِيْلُ وَالْخَفِيْفُ وَالْقَوِيُّ وَالضَّعِيْفُ فِيْ خَلْقِهٖ اِلَّا سَوَاءٌ۔[1]

کہ ہر شئے خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، بھاری بھر کم ہو یا ہلکی پھلکی، قوت و طاقت رکھنے والی ہو یا کمزور و ناتواں اس کی قدرت کے اعتبار سے تمام چیزیں اپنی خلقت میں یکساں اور برابر ہیں، اس کے مقدورات میں سے کم سے کمتر پر بھی اس کا غیر قادر نہیں۔ چنانچہ ارشادِ پروردگار ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ، وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ، ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (سورۃ الحج، آیت: ۷۳)

یعنی وہ لوگ کہ جن کو تم خداوند عالم کے علاوہ اپنا معبود قرار دیتے اور ان سے دعا کرتے ہو وہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگر چہ کہ وہ سب کے سب اس مقصد کے لئے اکٹھے اور مجتمع ہو جائیں اور مکھی باوجود اتنی کمزور ہونے کے اگر ان بتوں سے کوئی چیز چھین لے تو وہ اسے واپس نہیں کر سکتے، طالب اور مطلوب دونوں عاجز اور کمزور ہیں۔ طالب تو اس لئے کہ وہ اپنے مانگنے اور بتوں سے دعا کرنے کے ذریعہ اپنے عاجز ہونے پر خود دلیل قائم کر رہا ہے اور بت جن سے وہ دعا کر رہا ہے وہ کسی بھی چیز پر قادر نہیں۔

اللہ جل شانہ کی قدرت کا تعلق ممتنعات و حالات سے وابستہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محالات میں اس کی قابلیت اور استعداد نہیں۔ لہٰذا یہ عدم وابستگی اس وجہ سے نہیں ہے کہ قادر علی الاطلاق، العیاذ باللہ، عاجز ہے، درج ذیل دو حدیثوں سے اس مطلب پر دلالت ہوتی ہے۔

محمد ابن بابویہ شیخ صدوقؒ نے بسند صحیح کتابِ توحید میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے: ایک مرتبہ ابلیس لعین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا تیرا پروردگار اس پر قادر ہے کہ زمین کو مرغ کے انڈے میں داخل کر دے اس طرح کہ زمین چھوٹی نہ ہو اور انڈہ بڑھنے نہ پائے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ برا ہو تیرا اے شیطان! بے شک خداوند عالم کو عاجز نہیں کہا جا سکتا۔ اس ہستی سے زیادہ قادر ہی کون ہو سکتا ہے جو زمین کو اتنا چھوٹا کر دے کہ انڈے میں داخل ہو جائے اور انڈے کو اس قدر بڑا کر دے کہ زمین اس کے اندر سما جائے۔

ایک روایت میں وارد ہوا ہے کہ کسی نے حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا تیرا خدا اس پر قادر ہے کہ دنیا کو مرغ کے انڈے میں داخل کر دے اور دنیا چھوٹی نہ ہونے پائے اور انڈہ موجودہ حجم سے

❁ توضیحات نورانیہ ❁

(حواشی: فصل دوم)

از۔۔۔۔۔علامہ السید گلاب علی شاہ نقوی (قدس سرہ الشریف)

[1] یہ پورا خطبہ سابقاً گزر چکا ہے، احتجاج طبرسی، طبع قدیم، صفحہ ۱۷ پر ہے، علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں جلد ۳، صفحہ ۲۶ طبع جدید پر اسے نقل کیا ہے۔

بڑا نہ ہونے پائے تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عجز کے ساتھ متصف نہیں ہوسکتا اور تو نے جو سوال کیا ہے اس کا وجود ناممکن اور محال ہے۔ اس میں وجود کی قابلیت اور استعداد نہیں ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ محالات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تعلق پذیر نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عام ہونے کے خلاف نہیں اور اس کے عموم میں کوئی خلل انداز نہیں ہے۔ رہے امورِ قبیحہ وافعالِ شنیعہ تو وہ اگرچہ اس کی قدرت کے تحت داخل ہیں لیکن ان کا اس کی ذات سے صادر ہونا اس کی حکمت کے پیش نظر محال ہے۔

تیسری صفت:

اللہ تعالیٰ عزّ اسمہٗ عالم ہے، اللہ تعالیٰ کو ہر شئے کا علم حاصل ہے اور وہ ہر معلوم کا عالم ہے خواہ وہ شئے کلی[1] ہو یا جزئی، موجود ہو یا معدوم۔ لہٰذا تمام اشیاء کے موجود ہونے سے پہلے بھی وہ ازل سے ان کا علم رکھتا ہے اور اس کا یہ علم اس کے اس علم سے اختلاف نہیں رکھتا جو ان کے وجود کے بعد ہوتا ہے۔ ازل سے وہ ہر اُس شئے کو جانتا ہے جس کو وہ ابد تک پیدا کرے گا۔

شیخ صدوق ؒ نے اپنے اسناد کے ساتھ کتابِ توحید میں حسین بن بشار سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے سوال کیا کہ جو چیز ابھی موجود نہ ہوئی تھی کیا خداوند عالم اسے ازل سے جانتا تھا کہ وہ جب موجود ہوگی تو کیسے ہوگی یا پہلے وہ اس کو نہیں جانتا تھا، اس وقت اسے اس کا علم حاصل ہوا جب وہ حیطۂ وجود میں داخل ہوئی اور منصۂ شہود پر تحقق پذیر ہوئی؟ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کو اس کے موجود ہونے سے پہلے ازل سے جانتا ہے۔ پھر فرمایا: تمام اشیاء کے متعلق اس کا علم ان اشیاء کو پیدا کرنے سے قبل ہمیشہ سے متحقق اور قدیم سے موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ جہل وغیرہ تمام نقائص سے بلند و بالا اور مبرا و منزہ ہے۔ روایت ہٰذا کی عربی عبارت حسب ذیل ہے:

روی الصدوق رحمہ اللہ فی التوحید باسنادہ عن الْحُسَيْنُ بْنُ بَشَّارٍ عَنْ أَبِي الْحَسَنِ عَلِيِّ بْنِ مُوسَى الرِّضَا عليه السلام قَالَ: سَأَلْتُهُ أَ يَعْلَمُ اللهُ الشَّيْءَ الَّذِي لَمْ يَكُنْ أَنْ لَوْ كَانَ كَيْفَ كَانَ يَكُونُ أَوْ لَا يَعْلَمُ إِلَّا مَا يَكُونُ؟ فَقَالَ عليه السلام: إِنَّ اللهَ تَعَالَى هُوَ الْعَالِمُ بِالْأَشْيَاءِ قَبْلَ كَوْنِ الْأَشْيَاءِ قَالَ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ: إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ ما كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ، وَ قَالَ لِأَهْلِ النَّارِ: وَ لَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَ إِنَّهُمْ لَكاذِبُونَ فَقَدْ عَلِمَ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ أَنَّهُ لَوْ رَدَّهُمْ لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَ قَالَ لِلْمَلَائِكَةِ لَمَّا قَالُوا: أَ تَجْعَلُ فِيها مَنْ يُفْسِدُ فِيها وَ يَسْفِكُ الدِّماءَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ. قالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ. فَلَمْ يَزَلِ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ عِلْمُهُ سَابِقًا لِلْأَشْيَاءِ قَدِيمًا قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَهَا فَتَبَارَكَ رَبُّنَا تَعَالَى عُلُوّاً كَبِيراً.

---

(۱) کلی اس لفظ کو کہا جاتا ہے جو عقلاً متعدد چیزوں پر صادق آسکے اور اس کے برعکس جزئی اس لفظ کو کہا جاتا ہے جو عقلاً متعدد چیزوں پر صادق نہ آسکے بلکہ وہ صرف ایک معین شخص یا چیز پر صادق آئے، مثال کلی جیسے انسان، گھوڑا وغیرہ، مثال جزئی جیسے زید، ملتان، لاہور وغیرہ۔

و فی الکافی[1]: سَالِمٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ مُسْلِمٍ عَنْ أَبِيْ جَعْفَرٍ ؑ قَالَ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ كَانَ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ وَلَا شَيْءَ غَيْرُهُ وَلَمْ يَزَلْ عَالِمًا بِمَا يَكُوْنُ فَعِلْمُهُ بِهٖ قَبْلَ كَوْنِهٖ كَعِلْمِهٖ بِهٖ بَعْدَ كَوْنِهٖ.

کافی شریف میں حضرت محمد بن یعقوب کلینیؒ نے اپنے اسناد کے ساتھ محمد بن مسلم سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت امام محمد باقر ؑ کو یوں فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ اس وقت بھی موجود تھا جبکہ اس کے علاوہ کوئی چیز موجود نہ تھی اور وہ ہمیشہ سے تمام ان چیزوں کو جاننے والا تھا جو آئندہ پیدا ہونے والی تھیں اور ہر چیز کے پیدا ہونے سے پہلے خداوند عالم کو اس کا جو علم تھا وہ اور اس کے پیدا ہو جانے کے بعد جو اس کا علم ہے وہ دونوں یکساں ہیں یعنی اس کا علم قدیم ہے خواہ وہ اس کی ذات سے متعلق ہو یا دیگر کائنات سے وابستہ اور اس پاک پروردگار کا علم عین ذات پاک ہے، اس کا علم ایسی صفت نہیں جو اس کی ذاتِ بابرکات سے زائد ہو، ورنہ لازم آئے گا کہ علم ایک ایسی شئے ہے جو ازل سے اس کی ذات کے ساتھ موجود تھی حالانکہ یہ محال ہے کیونکہ اس سے تعدد قدماء لازم آتا ہے جس کا بطلان حتمی ہے۔ لہٰذا اس کا علم کہ جو ایک صفتِ کمال ہے علم حصولی نہیں ہوسکتا کیونکہ علم حصولی صورت اور ذات کے ساتھ قائم ہونے کی احتیاج رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صورت نہیں ہوسکتی اور علم اللہ تعالیٰ کے ذات کے ساتھ قائم ہونے سے اس کے علم کا زائد بر ذات ہونا لازم آتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا اشیاء کے متعلق علم حضوری بھی نہیں کیونکہ علم حضوری عین حضورِ معلومات کا نام ہے اور ظاہر ہے کہ ازل میں جبکہ اشیاء کا وجود ہی نہ تھا اللہ تعالیٰ کو ان کا اس وقت بھی علم تھا لیکن ان کے حاضر ہونے کا اس وقت سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ اشیاء اس وقت موجود ہی نہیں تھیں، حاضر کیسے ہوتیں؟ نیز علم باری تعالیٰ صفاتِ فعل میں سے بھی نہیں ورنہ وہ افعال اور دیگر حوادث کی مانند حادث ہوگا تو پھر لازم آئے گا کہ معاذ اللہ ذاتِ پاکِ پروردگار ازل میں عالم نہیں، جاہل ہو حالانکہ اس ذاتِ پاک کے لئے جہالت کسی بھی وقت ممکن نہیں۔

ازالہ توہم اور کاظمیہ پر تعریض:

یہ وہ وہم فاسد اور باطل ہے کہ کسی شئے کے معدوم ہونے کی حالت میں اس کا علم واقع کی مخالفت ہے، اس لئے علم نہیں کہلائے گا۔ اور وجہ بطلان یہ ہے کہ مخالفت واقع اس کا نام ہے کہ کسی معدوم چیز کو موجود سمجھ لیا جائے برعکس اس کے کسی معدوم چیز کو معدوم ہی سمجھنا، اس کا نام مخالفت واقع نہیں۔

اور جو لوگ اشیاء سے علم خداوند عالم کے وابستہ اور تعلق ہونے کو علم حادث قرار دیتے ہیں اور اسے حضور اشیاء میں منحصر سمجھتے ہیں وہ درحقیقت مرتبہ ذات میں اللہ تعالیٰ کے لئے، العیاذ باللہ، جہالت کو ثابت کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کو ایمان اور اسلام سے کچھ حصہ حاصل نہیں۔ چنانچہ شیخ ابوجعفر طوسیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص کہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی شئے کا علم اس چیز

---

[1] اصول الکافی، کتاب التوحید باب صفات الذات، حدیث: ۲ جلد: ۱، صفحہ: ۱۹۵، طبع تہران ایران۔

کے موجود ہونے کے بعد ہوتا ہے، پہلے اس کو ان چیزوں کا کوئی علم حاصل نہیں ہوتا تو وہ شخص کافر اور دائرہ توحید سے خارج ہے۔ اور علامہ محمد باقر مجلسیؒ بحار الانوار میں فرماتے ہیں کہ "مذہب حق کے ضروریات میں سے یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازلاً وابداً کلیات و جزئیات، تمام اشیاء کا عالم ہے اور اس کے علم حقیقی میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوسکتا۔ علامہ مجلسیؒ نے آگے چل کر کچھ کلام کے بعد فرمایا ہے کہ بعض لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے نہیں بلکہ اشیاء کے موجود اور واقع ہو جانے کے بعد ان کا علم حاصل ہوتا ہے اور اس اعتقاد کو ابوالحسین بصری اور ہشام بن حکم کی طرف نسبت دی ہے اور بعض روایات بھی اس پر دلالت کرتی ہیں مگر ہمارا گمان یہ ہے کہ مذہب حق اختیار کرنے سے پہلے ہشام کا یہ مذہب ہوگا یا نقل کرنے والے کو اشتباہ ہوا ہے۔ قدمائے فلاسفہ نے باری تعالیٰ کے علم کے متعلق بڑا اختلاف کیا ہے۔ یہ سارے مذاہب کفر صریح اور ضروریاتِ عقل و دین کے خلاف ہیں اور براہین قاطعہ ان مذاہب کی نفی اور بطلان پر دلالت کرتی ہیں"۔ (علامہ مجلسیؒ کا کلام ختم ہوا)۔

لہٰذا اللہ جل شانہ کا علم اشیاء سے متعلق ہے۔ وہ ان اشیاء کے حاضر ہونے میں منحصر نہیں ہوسکتا کیونکہ ظاہر ہے کہ جو شخص اس عقیدہ کا معتقد ہے وہ دو صورتوں سے باہر اور دو حالتوں سے خالی نہیں ہوسکتا کیونکہ یا وہ تمام اشیاء کو قدیم جانتا ہوگا یا حادث۔ اگر تمام چیزوں کو وہ قدیم جانتا ہو تو تعددِ قدماء کا قائل ہوجائے گا حالانکہ سوائے خداوند عالم کے اور کوئی قدیم ہو نہیں سکتا اور اگر وہ انہیں حادث سمجھے تو لازم آئے گا کہ تمام اشیاء کے متعلق اللہ تعالیٰ کا علم، معاذ اللہ، حادث ہو اور کسی چیز کو وہ اس کے پیدا ہونے اور موجود ہو جانے سے پہلے نہ جانے اور اس سے جاہل ہو، **تعالی اللہ عن ذلك**، حالانکہ اللہ جل شانہ کی ذاتِ پاک ہر قسم کی جہالت سے مبرا و منزہ اور بلند و بالا ہے۔ وہ ازل سے اپنی ذات کا علم رکھتا ہے اور اپنی ساری مخلوقات کو بھی جانتا پہچانتا ہے۔ اس کا علم ان کے موجود ہونے پر موقوف نہیں۔ کوئی شئے کسی حالت میں بھی اس پر مخفی نہیں ہوسکتی ورنہ وہ اپنی قدرت اور اپنے اختیار کے ساتھ ان کو پیدا ہی کس طرح کرسکتا تھا؟ حالانکہ اس نے ہر شئے کو اپنی قدرت و اختیار سے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اس کی ذاتِ پاک بذاتِ خود تمام اشیاء کے انکشاف کا منشا ہے۔ خود اس کی ذات ہی کے باعث ہر شئے اس کے لئے منکشف اور واضح ہے۔

دفع وہم:

یہ وہم بھی نہ کرنا چاہئے کہ ذاتِ خداوند عالم تمام اشیاء کے مبائن ہے، لہٰذا ان کے لئے منشاء انکشاف کس طرح بن سکتی ہے؟ اور اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات جہاں دیگر تمام اشیاء کے مبائن ہے وہاں کامل بالذات بھی ہے اور موجوداتِ عالم سے دیگر کوئی شئے کامل بالذات نہیں۔ لہٰذا دیگر اشیاء اگر ناقص ہونے کے باعث اپنے غیر کے لئے منشاء انکشاف نہیں بن سکتیں اور وہ حصولِ صورت اور اس کے واسطہ بننے کی طرف محتاج ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ذاتِ خداوند عالم کہ جو ہر جہت سے کامل ہے، وہ بھی اپنے غیر کے لئے منشاء انکشاف نہ ہو سکے حالانکہ وہ غنی مطلق ہے۔

اپنے صفات اور ذات وغیرہ کسی اعتبار سے بھی وہ محتاجِ غیر نہیں۔

مزید برآں یہ کہ ادلۂ عقلیہ ونقلیہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ حق تعالیٰ عزّ اسمہٗ بذاتِ خود ہر چیز کا عالم ہے۔ لہٰذا اگر عقول ناقصہ کو اس کے علم کی کنہ اور کیفیت ہر دو تک رسائی نہیں ہوسکتی تو وہ اس کے علم سے انکار بھی نہیں کر سکتے جس طرح کہ ذاتِ پاکِ پروردگار کی کنہ تک رسائی نہ ہونے کے باعث اس کی ذات کا انکار نہیں کر سکتے اور لوحِ محفوظ کی تحریر وغیرہ حادث چیزوں پر جو علم باری عزّ اسمہٗ کا اطلاق ہوا ہے، جیسا قرآن پاک میں ہے:

قَالَ عِلْمُهَا[1] عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ ۖ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى.

تو یہ اطلاق از قسم مجاز ہے، از قبیل حقیقت نہیں ہوسکتا، جیسے کہ کلام کا اطلاق جو نقوش پر ہوا ہے وہ بھی حقیقت نہیں مجاز ہے۔ مختصر یہ کہ اس کا علم ہر شئے کو حاوی اور محیط ہے یعنی اعم اور اشمل ہے۔ کوئی شئے اس کے احاطہ سے باہر نہیں ہوسکتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے: وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (البقرہ، آیت: ۲۹) کہ وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، خاک کے ذرات، دریا وسمندر کے قطرات، پہاڑوں کے اوزان کی رتیوں، ماشوں، درختوں کے پتوں، بیابانوں کی ریت کے ذرات کی تعداد، جانوروں کے نفوس، لطائف صنائع اور دقائق بدائع، سب چیزیں اس کی ذات پر واضح اور روشن ہیں کیونکہ اسی نے ہر شئے کو اپنے ارادہ واختیار سے اور حکمتِ کاملہ کے مطابق پیدا فرمایا ہے اور یقینی ہے کہ جو ذات کسی چیز کو اپنے ارادہ واختیار سے پیدا کرے اسے اس چیز کا بھی اور اس کے تمام صفات اور آثار کا بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ کلیہ انتہائی طور پر واضح ہے تھوڑا سا غور وفکر کرنے سے ہر عقلمند کو اس کا یقینِ کلی حاصل ہو جاتا ہے۔ اثباتِ صانع عالم کی دلیل میں اس امر کی طرف سابقاً اشارہ کیا جا چکا ہے۔

نیز اللہ جل شانہ کی ذات والا صفات مجرد ہے مادی نہیں اور مجرد کی نسبت اور اس کا تعلق تمام چیزوں سے مساوی طور پر قائم ہوتا ہے اور اس کی قدرت کو بھی ہر شئے سے تعلق حاصل ہے لہٰذا وہ ذاتِ پاک پروردگار ہر شئے کو جاننے والی ہے

---

[1] سورۂ طٰہٰ آیت: ۵۲ کہ ان کے حالات کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے جس کی دلیل لوحِ محفوظ میں بھی موجود ہے۔ میرا پروردگار نہ بھولتا ہے نہ بھٹکتا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں علم خدا کے متعلق فرمایا کہ وہ کتاب یعنی لوحِ محفوظ میں ہے اور ظاہر ہے کہ لوحِ محفوظ میں وہی ہے جو قلم نے لکھا۔ لہٰذا علم کا اطلاق تحریر پر ہوا کہ جو مجاز ہے نہ حقیقت اور ظاہراً یہ مجاز حذف ہے یعنی تحریر علمها الدال عليه في كتاب یعنی ان کے حالات اور اعمال کے متعلق تحریر بھی ایک کتاب یعنی لوحِ محفوظ میں موجود ہے جو خداوند عالم کے علم پر دلالت کرتی ہے کیونکہ لوحِ محفوظ میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ خداوند عالم کے علم ازلی وابدی کے مطابق ہے۔ غرض یہ کہ آیت مذکورہ میں بظاہر مضاف کو حذف کیا گیا اور مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے کیونکہ ان میں دال ومدلول والا علاقہ تھا۔ تحریر دال ہے اور علم باری تعالیٰ مدلول۔ لہٰذا لفظِ تحریر حذف کر کے لفظِ علم کو اس کے مقام پر قائم کر دیا گیا ہے۔ اس آیت میں اسی طرح مجاز حذف ہوگا جس طرح آیت مبارکہ واسئل القرية میں ہے، یعنی واسئل أهل القرية، گاؤں سے پوچھو یعنی گاؤں میں رہنے والے لوگوں سے پوچھو۔ اس میں لفظ اہل جو کہ مضاف ہے اسے حذف کیا گیا اور لفظ قریہ جو کہ مضاف الیہ ہے اسے مضاف کے مقام پر قائم کر دیا گیا کیونکہ ان میں ظرفیت ومظروفیت والا علاقہ موجود تھا۔ نیز جیسے کہ آیت پاک: و جاء ربك یعنی جاء حكم ربك میں مجاز حذف ہے کہ جس وقت تیرا رب یعنی تیرے رب کا حکم آئے گا، نیز یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تسمية الدال باسم المدلول کے طریقہ پر مجازِ مرسل ہے۔

نیز تمام ممکنات اس کے وجود ذی جود کا اثر ہیں۔ لہٰذا تمام چیزوں اور ان کے سارے کمالات کا علم اسی ذاتِ پاک تک انتہاء پذیر ہوتا ہے لہٰذا وہ ہستی کہ تمام علوم کا منبع ہے اور سارے علوم اسی سے حاصل کئے گئے ہیں۔ وہ کسی شئے سے جاہل نہیں ہوسکتی۔ نیز ان کی جہالت نقص ہے اور نقص اس کی ذات کے لئے ممکن نہیں۔ لہٰذا وہ ہر شئے کا علم رکھنے والا ہے، کوئی شئے اس سے مخفی اور مستور نہیں۔

ان مذکورہ بالا تمام دلائل کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان سے اشارہ کیا ہے:

اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ، وَھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (سورۃ الملک، آیت: ۱۴) بھلا جس نے تمام اشیاء کو پیدا کیا ہے وہ ان کو جانتا نہیں؟ حالانکہ وہ بڑا باریک بین اور واقف کار ہے۔ یعنی مجرد ہے اور تمام موجودات کو اپنے لطفِ کامل اور رحمتِ شاملہ سے سرفراز کرنے والا ہے اور سب کا حافظ و خالق اور مربی ہے، تو پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ ان کو نہ جانتا ہو حالانکہ ایک ذرا بھر چیز بھی اس سے مخفی نہیں خواہ وہ آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں ہو۔

چوتھی صفت:

اللہ جل شانہٗ حیّ اور زندہ ہے۔ حیاتِ باری تعالیٰ سے مراد وہ صفت ہے جس کے باعث قدرت اور علم کے ساتھ متصف ہونا متحقق ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم و قدرت چونکہ ثابت ہوچکا ہے اس لئے اس کا حیّ اور زندہ ہونا بھی یقیناً ثابت ہے۔

پانچویں صفت:

اللہ تعالیٰ مدرِک ہے۔ اللہ جل شانہٗ مدرک یعنی سمیع و بصیر ہے۔ صفاتِ انسان میں سے "ادراک" اس علم کا نام ہے جو حواس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، مثلاً چکھنا، مس کرنا، سونگھنا، دیکھنا اور سننا، سَمْع یعنی سننا اسی علم کا نام ہے جو قوتِ سامعہ کے ذریعہ کسی چیز کو جاننے سے حاصل ہوتا ہے اور بَصَر یعنی دیکھنا اس علم کا نام ہے جو قوتِ باصرہ کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے لیکن صفاتِ الٰہیہ میں ادراک سے اور اللہ تعالیٰ کے مدرک ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ ہر اس چیز کا عالم ہے جس کا ہم حواس کے ذریعہ علم حاصل کرتے ہیں مگر وہ ان محسوسات کے عالم ہونے میں حواس کے واسطہ اور وسیلہ کی طرف محتاج نہیں۔ لہٰذا وہ بغیر کانوں کی احتیاج کے تمام آوازوں کا جاننے والا ہے، جو بھی سنی جاسکتی ہیں، خواہ وہ بلند آوازیں ہوں، یا پست، اچھی ہوں یا بری، نیز بغیر آنکھوں کی طرف محتاج ہونے کے وہ اُن تمام چیزوں کا علم رکھنے والا ہے جو دیکھی جاسکتی ہیں۔

یعنی تمام اجسام کے ہر قسم کے رنگ اور شکلوں وغیرہ کو اس کا علم حاوی ہے۔ چونکہ سابقہ سطور میں جو دلائل بیان کئے

جا چکے ہیں ان سے اس ذات علام الغیوب کے علم کا عموم اور اس کے دائرہ کا علی الاطلاق حاوی ہونا واضح ہو چکا ہے اس لئے اس کے مدرک ہونے یعنی سمیع و بصیر وغیرہ ہونے کی صفات پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی نیز علم عام اور مطلق کے ثابت اور معتبر ہونے کے بعد ان مذکورہ صفات کے اثبات کی کوئی اہمیت بھی باقی نہ رہ گئی تھی لیکن چونکہ قرآن پاک اور ارشادات معصومین علیہم السلام ان کے اثبات سے پُر ہیں اور بڑی شدت اور کثرت سے ان میں ان کا ذکر ہے اس لئے ہمارے علماء نے بحث ادراک و سمع و بصر کو مستقل اور جداگانہ طور پر تحریر کرنے کے لئے دو وجوہات ذکر کی ہیں۔

وجہ اوّل:

یہ ہے کہ اس بحث کو مستقل طور پر ذکر کرنے سے حکماء کا ردّ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم حاصل نہیں اور اس کی دلیل وہ اپنے خیال فاسد میں یہ پیش کرتے ہیں کہ جزئیات تغیر پذیر ہوتے ہیں اور تغیر والی چیز کا علم عالم کی ذات اور صفات میں تغیر پیدا کر دینے کا باعث ہوتا ہے اس لئے خداوند عالم جزئیات کا عالم نہیں ہو سکتا ورنہ اس کی ذات اور صفات میں تغیر کا واقع ہو جانا لازم آئے گا جو کہ قرین صواب نہیں۔

مگر فلاسفہ کا یہ گمان باطل ہے کیونکہ تغیر معلوم کی وجہ سے عالم کی ذات وصفات کا متغیر ہونا ضروری نہیں جیسا کہ محقق طوسیؒ نے فصول میں تصریح فرمائی ہے کہ تغیر معلوم کے باعث ذات عالم کسی بھی اعتبار سے متغیر نہیں ہو سکتی، رہی صفت علم کہ جو اللہ تعالیٰ کی صفت حقیقی ہے یعنی ما بہ الانکشاف یعنی جو انکشاف کا باعث ہوتی ہے تو یہ صفت عین ذاتِ باری ہے، اس میں تغیر کا امکان ہی نہیں اور علم کا جو معنی اضافی اور نسبی ہے اس میں تغیر کا واقع ہونا اسی طرح کسی ضرر اور نقص کا باعث نہیں ہے جس طرح کہ صفاتِ فعل میں تغیر کا واقع ہونا کسی نقص کا موجب نہیں ہو سکتا اور بعض اوقات علماء اسے تغیر تعلق سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں علم خداوند عالم متغیر نہیں ہو سکتا بلکہ علم کا تعلق متغیر ہوتا ہے۔ چنانچہ علامہ محمد باقر مجلسیؒ نے بحار الانوار میں فرمایا ہے کہ مذہب شیعہ کے ضروریات میں سے یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے ابد تک ہر شئے کا عالم ہے خواہ وہ کلیات ہوں یا جزئیات اور اس کے علم میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہو سکتا۔

وجہ دوم:

ان صفات کو جداگانہ اور مستقل طور پر تحریر کرنے کی یہ ہے کہ جو اعمال انسان کے لئے موردِ تکلیف ہیں ان میں اکثریت ان اعمال کی ہے جو از قبیلِ مسموعات اور مبصورات ہیں اس وجہ سے صفت سمیع و بصیر کو مستقل طور پر بیان کیا جاتا ہے کیونکہ اس بحث کو گناہوں سے بندوں کو باز رکھنے، سرزنش کرنے اور اطاعت پروردگار کی رغبت دلانے میں زیادہ دخل ہے اور اسے زیادہ قرب حاصل ہے۔

مسئلہ بداء- ان کی طرف سے شیعہ پر بہتان:

جب یہ ثابت اور ظاہر ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمام کلیات و جزئیات کا بھی عالم ہے اور ان کے نتائج و انجامات کا بھی ان کے وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی عالم تھا تو پھر جاننا چاہئے کہ لفظ بداء کا لغوی معنی کسی رائے میں خطاء کے ظاہر ہونے اور اس کے باعث اس میں ندامت اور پشیمانی کے لاحق ہونے کی وجہ سے اس رائے میں تغیر اور تبدیلی واقع ہو جانا اور دوسری رائے کی طرف عدول کر لینا ہوتا ہے اور اس معنی میں بداء خداوند عالم کے لئے محال ہے مگر ان کی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یا تجاہل عارفانہ کرتے ہوئے شیعہ امامیہ اثناء عشریہ کو متہم کرتے ہیں کہ شیعہ اثناء عشریہ خداوند عالم کے متعلق مذکورہ معنی میں بداء کے قائل ہیں حالانکہ شیعہ کا دامن اس داغ سے پاک اور صاف ہے۔

ہاں شیعہ جس معنی میں بداء کے قائل ہیں وہ ہے نسخ تشریعی اور نسخ تکوینی، نسخ تشریعی یعنی اختلاف مصالح اور اختلاف ازمان و اوقات کے باعث احکام شریعت کو تبدیل کرنا اور نسخ تکوینی یعنی عالم کون و ایجاد میں مارنے، زندہ کرنے، معدوم کرنے اور پیدا کرنے کے ذریعہ تبدیلی واقع کرنا، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ (سورۂ رحمٰن، آیت: ۲۹) کہ وہ ہر روز "ہر وقت" ایک نئی شان میں ہوتا ہے جس چیز میں وہ مصلحت نہیں دیکھتا اسے ترک کر دیتا ہے، کبھی موت واقع کرتا ہے، کبھی مریض کر دیتا ہے، کبھی صحت و تندرستی مرحمت فرماتا ہے۔ ہر وقت اپنی مصلحت کے مطابق بندوں کے مصالح کو انجام دینے میں مصروف اور کار فرما رہتا ہے۔ لاریب کہ بداء کا یہ معنی درست ہے اور کسی قسم کا کوئی نقص اور کوئی خرابی اس میں نہیں ہے۔

لوح کی دو قسمیں:

نیز آیات اور بہت سے اخبار معصومین علیہم السلام دلالت کرتے ہیں کہ اللہ جل شانہٗ نے دو لوحیں پیدا فرمائی ہیں جن میں اس نے تمام کائنات اور حوادث کے حالات کو ثبت فرمایا اور تحریر کرا دیا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام لوحِ محفوظ ہے جس میں بحکم خدا جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہو سکتا اور وہ علم الٰہی کے عین مطابق ہے۔

دوسری لوح سے مراد لوح محو و اثبات ہے اس میں بحکم الٰہی مصالح و حکم کے مطابق کچھ چیزیں ثبت کی جاتی ہیں جن سے بعض کو بعض اوقات محو کر دیا جاتا ہے اور دوسری بعض کو ان کے مقام پر ثبت کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ قدرت ہے: يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ (سورۂ رعد، آیت: ۳۹) کہ "اللہ تعالیٰ جس چیز کو چاہے محو کر دیتا اور جسے چاہے ثبت کر دیتا ہے اور اس کے پاس ہے اصل کتاب"۔ مثلاً پہلے کارکنانِ قضا و قدر اس میں لکھتے ہیں کہ زید کی عمر پچاس سال ہوگی یعنی جب تک اس سے کوئی ایسا عمل رونما نہ ہو جو عمر کی زیادتی یا کمی کا سبب ہو۔

اس وقت تک مقتضائے مصلحت یہ ہے کہ اس کی عمر پچاس برس ہوگی پھر جب کوئی ایسا کارِ خیر اس سے صادر ہو جاتا

ہے جو عمر کی زیادتی کا باعث ہوتا ہے جیسے مثلاً صلہ رحمی یا رسولِ مختار کی ذریت پاک و آل اطہار علیہم السلام کا احترام و اکرام اور ان کی حاجت روائی کے ذریعہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رشتہ داری کے لحاظ اور پارسائی کا مظاہرہ کرنا یا مومنین ابرار میں سے مساکین پر تصدق کرنا اس سے رونما ہوجاتا ہے تو پچاس سال کی عمر محو کر دی جاتی اور اس مقام پر مثلاً ساٹھ سال کی عمر ثبت کر دی جاتی ہے اور برعکس اس کے اگر کوئی شخص قطع رحمی کرتا ہے یا مومنین و سادات کے حقوق، اعزاز و اکرام وغیرہ کی پاسداری نہیں کرتا تو بجائے پچاس کے اس کی عمر چالیس سال لکھ دی جاتی ہے۔ دس سال اس کی عمر میں کمی واقع کر دی جاتی ہے۔ یہ تو ہے لوحِ محو و اثبات کی کیفیت لیکن لوحِ محفوظ میں ابتداء سے ہی یہ لکھ دیا گیا ہے کہ زید صلہ رحمی بجالائے گا اور اس وجہ سے اس کی عمر از جانب خداوند عالم ساٹھ سال لکھی جاتی ہے یا عمرو کی عمر اس وجہ سے چالیس سال مقرر کر دی جاتی ہے کہ وہ قطع رحمی یا اس کی مثل کوئی دوسرا بدعمل بجالائے گا، جس طرح کہ ایک حاذق طبیب جب کسی شخص کے مزاج کی حالت پر اطلاع حاصل کر لیتا ہے تو وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس شخص کا مزاج یہ تقاضا کر رہا ہے کہ اس کی عمر ساٹھ سال ہوگی پھر جب زہر پی لینے یا قتل ہوجانے کے باعث اس کی عمر ساٹھ سال سے کم ہوجاتی ہے یا برعکس اس کے ایسی دوا کھانے کے باعث اس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہوجاتی ہے جو اس کے مزاج کو قوت اور طاقت دینے کا باعث ہوتی ہے تو ان ہر دو صورتوں میں اربابِ عقل یہ نہیں کہتے کہ طبیب نے غلط کہا تھا، اس بیان سے واضح ہوگیا کہ بداء سے مراد لوحِ محو و اثبات میں درج کردہ تقدیر کی تبدیلی اور تغیر ہے اور تغیر چونکہ لفظ بداء کے لغوی معنی سے مشابہت رکھتا ہے اس وجہ سے اس پر لفظ بداء کا اطلاق کر دیا گیا ہے لیکن بداء کا اس معنی پر اطلاق کسی خرابی اور اعتراض کا باعث نہیں ہوسکتا بلکہ یہ ہر قسم کے عیب اور نقص سے پاک اور مبرا و منزہ ہے کیونکہ اس اطلاق کے ذریعہ لفظ بداء سے جو معنی مراد لیا جاتا ہے اور مقصود ہوتا ہے وہ شیعہ و سنی ہر دو فریقین کے اس طرح کے مسلمات میں سے ہے کہ اس میں انکار کی گنجائش نہیں۔

لوحِ محو و اثبات کی غرض و غایت:

لوحِ محو و اثبات کی غرض و غایت اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ انبیاء و اوصیاء جب اس لوح کے مندرجات اور اس کی تبدیلیوں کے متعلق بندگانِ خدا کو خبر دیں گے اور ان کو مطلع کریں گے تو ان کو اس کا علم حاصل ہوگا کہ ان کے اعمالِ حسنہ ان کے امور اور معاملات کی اصلاح میں کس قدر تاثیر رکھتے ہیں اور ان کے بداعمال ان کے معاملات کو بگاڑنے اور فاسد کر دینے میں کس قدر اثر انداز ہوتے ہیں تو اس کے باعث وہ عمل خیر اور نیکوکاری کی طرف راغب ہوں گے اور بدکاری اور بداعمالی سے باز رہیں گے۔ اللہ جل شانہ نے فرمایا:

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ، لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ

الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ.[1]

بیضاوی نے اپنی تفسیر میں تحریر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو شہر نینوا کی طرف مبعوث فرمایا۔ اہل نینوا نے ان کی تکذیب کی اور ان کو جھٹلانے پر اصرار کیا تو حضرت یونس علیہ السلام نے ان سے کہا کہ تین دنوں میں عذاب نازل ہو جائے گا اور بعض کا بیان ہے کہ فرمایا چالیس روز میں نازل ہو جائے گا۔ جب عذاب کا وقت قریب آیا تو آسمان سیاہ بادل اور دھوئیں سے پُر ہو گیا اور وہ زمین پر اُتر آیا تا آنکہ رستے تاریک ہو گئے تو اہل نینوا نے توبہ کی اور حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کرنے لگے مگر وہ انہیں نہ پا سکے تو ان کو یقین ہو گیا کہ حضرت یونس علیہ السلام نے سچ کہا تھا اور یہ وہی عذاب ہے جس کا حضرت یونس علیہ السلام نے وعدہ کیا تھا۔ انہوں نے موٹے کپڑے پہن لئے اور اپنی عورتوں اور حیوانات کو صحراء کی طرف لے گئے اور بچوں کو ان کی ماؤں سے الگ کر دیا اور گریہ وزاری کی آوازیں بلند کر کے توبہ کا اظہار کیا اور ایمان کا مظاہرہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو ان کی اس حالت پر رحم آیا اور عذاب کو ان سے برطرف کر دیا (کلام بیضاوی کا ماحصل ختم)۔

ایک حدیث میں وارد ہے کہ ایک روز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قوم سے گذر ہوا جو ایک دلہن کو آراستہ کر کے اس کو شوہر کے گھر کی طرف لے جا رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ یہ فلاں عورت ہے جو فلاں شخص کی لڑکی ہے۔ اس کی اس کے خاوند سے شادی کر دی گئی ہے اور اسے شوہر کے گھر لے جا رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آج اسے خوشی وحشمت سے لے جا رہے ہیں مگر کل اس پر گریہ وبکا کریں گے اور اسے روئیں گے۔ اس قوم میں سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ کس امر کی وجہ سے روئیں گے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ دلہن شب کو مر جائے گی۔ مومنین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی، لیکن منافقین نے کہا کہ شب کا بیشتر حصہ تو گزر گیا ابھی قریب ہی صبح ہونے والی ہے، لہٰذا پیشین گوئی قرین صواب معلوم نہیں ہوتی۔ جب صبح ہوئی تو لوگوں نے دلہن کو اپنی حالت پر صحیح سالم پایا۔ لوگ دوڑے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے کہ حضور: وہ تو زندہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یفعل مایشاء، کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ آیئے دلہن کے پاس جائیں اور حقیقت حال کو اس سے دریافت کریں کہ کون سا عمل اس سے سرزد ہوا ہے جو دفع بلاء کا باعث ہو گیا۔

جب اس کے دروازہ پر پہنچے اور دق الباب کیا تو دولہا باہر آیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے کہا کہ اپنی زوجہ سے

---

[1] سورۂ یونس، آیت: ۹۸، ترجمہ: "جن بستیوں کو ہلاک کیا گیا ان میں سے کوئی بستی نزولِ عذاب سے پہلے ایمان کیوں نہ لے آئی کہ اسے اس کا ایمان لانا نفع پہنچاتا سوائے قوم یونسؑ کے کہ وہ قبل از نزولِ عذاب ایمان لے آئے تھے چنانچہ جب وہ ایمان لے آئے تو ہم نے اس دنیا کی زندگی میں ان سے رسوائی کے عذاب کو برطرف کر دیا اور ان کو ایک مدت تک چین سے زندگی بسر کرنے کا فائدہ پہنچایا"۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے لوحِ محفوظ واثبات میں مندرجہ عذاب سے ان کو مطلع کیا تو بالآخر وہ توبہ کار ہوئے، ایمان لائے، عاجزی وزاری کی تو آیا ہوا عذاب ان سے ٹل گیا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ اعمال انسانیہ کے طفیل احکام الٰہیہ میں تبدیلی اور تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام نے عذاب کے متعلق جو خبر دی تھی وہ لوحِ محو واثبات کے مندرجات سے تھی اور اس خبر کا فائدہ یہ ہوا کہ آیا ہوا عذاب ٹل گیا۔

اجازت طلب کیجئے کہ ہم اس کے پاس آ کر اس سے کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ شوہر نے اپنی زوجہ مذکورہ کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ دلہن نے اپنا سر چہرہ نقاب سے پردہ پوش کر لیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کے گھر تشریف لے آئے۔ دلہن سے دریافت کیا کہ آج رات کون سا عمل تجھ سے صادر ہوا؟ دلہن نے کہا کہ اور تو میں نے کوئی عمل نہیں کیا، ہاں وہی عمل کیا ہے جو سابقاً کیا کرتی تھی۔ شب جمعہ ہمیشہ ایک فقیر میرے دروازے پر آتا تھا، میں اسے کوئی نہ کوئی چیز دے دیا کرتی تھی۔ امشب کہ جو شب جمعہ ہی تھی اور میری عروسی رشادی کی بھی یہی رات تھی، میں اپنے معاملات میں مشغول تھی اس طرح میرے اہل خانہ میں سے بھی ہر شخص اپنی اپنی کارگزاری میں مصروف تھا۔ وہ سائل جب دروازہ پر آیا اور سوال کیا تو کسی شخص نے اسے جواب نہ دیا تا آنکہ اس نے کئی مرتبہ اپنی صدا اور آواز کو بلند کر کے سوال کیا تو اس کی آواز میرے کان میں پڑ گئی تو میں ہر شخص سے اپنے آپ کو چھپائے اور پوشیدہ رکھتے ہوئے اٹھی اور اس سائل کو میں نے حسب معمول کوئی چیز دے دی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ سن کر اس سے فرمایا کہ اپنی جگہ سے اٹھو۔ جب وہ اٹھی تو اس کے کپڑوں کے نیچے ایک سیاہ رنگ کا سانپ پڑا تھا جس نے اپنی دم کو دانتوں میں پکڑ رکھا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اس صدقہ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے اس بلاء کو تجھ سے برطرف کر دیا جو تو نے آج شب کو دیا ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیل پورے بسط کے ساتھ صوارم الالٰہیات میں مرقوم ہے، جسے خواہش ہو اس کی طرف رجوع کرے۔

چھٹی صفت:

اللہ جل شانہٗ مرید اور کارہ ہے۔ واضح باد کہ افعالِ اختیاریہ فاعل مختار کے ارادہ اور اختیار سے صادر ہوتے ہیں اور چونکہ ثابت ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مختار ہے تو لازم ہے کہ اس کے افعال بھی اس کے ارادہ اور اختیار سے صادر ہوں اور مرید کا یہی معنی ہے کہ وہ اپنے افعال اپنے ارادہ و اختیار سے واقع کرتا ہے لیکن بندوں کا جو فعل ان کے اختیار سے صادر ہوتا ہے اس کی صورت اور کیفیت یہ ہوتی ہے کہ پہلے وہ اس کا تصور کرتے ہیں۔ اس کے بعد اگر اس کا فائدہ معلوم ہوتا ہے تو اسے وہ اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں اور اس کی خواہش کرتے ہیں۔

یعنی ان کے دل میں اس کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے اور یہ سب چیزیں فعل کو واقع کرنے کے لئے محرک اور داعی بنتی ہیں، تا آنکہ معاملہ عزم بالجزم تک پہنچتا ہے اور اس کو ارادہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ارادۂ خداوند عالم کے اطلاقات – پہلا اطلاق نفس فعل پر:

ارادۂ خدا کا اطلاق چند معانی پر واقع ہوا ہے، پہلا اطلاق علم مصلحت کہ جو فعل پر ترجیح دینے کا باعث ہوتا ہے جیسا کہ متکلمین امامیہ نے بیان فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ بعض اوقات اس قادر مختار سے افعال کا صادر ہونا اور بعض دیگر

اوقات میں ان افعال کو ترک کر دینا اور ایک وقت میں ایک چیز کو خلعت وجود سے آراستہ کرنا اور دوسرے وقت میں موت اور فنا کے ذریعہ اس خلعت کو اتار لینا یقیناً یہ مصالح کے علم پر مبنی ہے وہ حکیم مطلق ہر چیز کو مصلحت کے مطابق عمل میں لاتا ہے اور جب مصلحت کسی چیز کے اعدام کی مقتضی ہوتی ہے تو اسے معدوم کر دیتا ہے کیونکہ فعل حکیم کبھی حکمت سے خالی نہیں ہوسکتا اور چونکہ اللہ تعالیٰ کا علم عین ذات پاک پروردگار ہے بایں معنی کے تمام اشیاء کو ان کے پیدا کرنے سے بھی پہلے پہچاننے اور ان کا علم حاصل کرنے کے لئے خود اس کی ذاتِ پاک کافی ہے اور ان کے پیدا کرنے کے بعد بھی ان کے علم کے متعلق خود اس کی ذات ہی کافی ہے۔ نیکی بدی وغیرہ کوئی چیز اس کی ذاتِ والا صفات سے مخفی اور مستور نہیں ہے۔ لہٰذا ہر چیز کی مصلحت کو وہ بذاتِ خود جانتا ہے اور اس کا یہی علم ہی اس کے لئے فعل اور ترک کا داعی ہوتا ہے۔ لہٰذا اس پاک پروردگار کا ارادہ ایسی صفت نہیں ہوسکتی کہ جو ظرف اتصاف میں موجود ہو اور جس طرح کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم و قدرت کے متعلق اعتقاد رکھتے ہیں اسی طرح ارادہ بھی ایک ایسی صفتِ پاک پروردگار ہے جو کہ زائد بر ذات باری ہو کیونکہ اُن کا یہ اعتقاد قرین صواب نہیں، لہٰذا ارادۂ خدا سے مراد مصلحت کا علم ہے۔

ارادہ کا دوسرا اطلاق نفس فعل پر:

ارادہ کا اطلاق دوم نفس فعل پر ہوتا ہے جیسا کہ اکثر روایات سے سمجھا جاتا ہے۔ صفوان بن یحییٰ[1] سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابوالحسن علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ ہمیں مطلع فرمایئے کہ ارادۂ خدا کس چیز کا نام ہے اور بندوں کا ارادہ کیا چیز ہے؟ فرمایا کہ مخلوق کا ارادہ وہ امر ہے جو اس کے دل میں خطور کرتا ہے اور جس کے فعل پر بعد ازاں اس کی رائے اس کے ذہن میں قرار پکڑتی ہے اور خدا کا ارادہ پیدا کرنا اور کسی چیز کو وجود میں لانا ہے اور ارادہ کا یہ دوسرے اطلاق والا معنی پہلے معنی کے منافی نہیں کیونکہ پہلا معنی یعنی مصالح و مفاسد کے متعلق علم الٰہی دلائل عقلیہ ونقلیہ کے ساتھ ثابت ہے۔ ائمہ معصومین علیہم السلام نے علم خداوند عالم کے عموم کو شافی بیانات کے ذریعہ واضح فرمایا ہے۔ لہٰذا حضرت امام عالی مقام کی غرض یہ ہے کہ بندوں کا ارادہ ایک ایسا حقیقی وصف ہے جو حادث ہوتا ہے، ان کی ذاتوں اور ان کے افعال کے درمیان واسطہ اور متوسط ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ بندوں کے ارادہ کی مثل ایسا وصف حقیقی نہیں جو حادث ہوتا ہو اور نہ ہی وہ ذاتِ خدا اور اس کے فعل کے درمیان واسطہ ہوتا ہے بلکہ نفس فعل خداوند عالم بمنزل اس کے ارادہ کے ہے اور علماء نے جہاں ارادہ خدا کے قدیم ہونے کی نفی کی ہے وہاں ارادہ سے مراد انہوں نے ایسی صفت لے کر اس کی نفی کی ہے جو صفت زائد بر ذات ہوتی ہے اور یہ باوجودیکہ زائد موجود ہوتی ہے جس کے وہ لوگ قائل ہیں اس علم و ارادہ کی انہوں نے نفی نہیں کی جو ذات باری تعالیٰ کا عین ہے جو کہ شیعہ اثناء عشریہ کا مسلک ہے اور قرین صواب ہے۔

---

[1] اصول الکافی، کتاب التوحید، باب الارادۃ من صفات الفعل و سائر صفات الفعل، حدیث: ۳، جلد: ۱، صفحہ: ۲۰۰ طبع تہران۔

ارادۂ خداوند عالم کا تیسرا اطلاق:

کسی چیز کے فعل یا ترک میں جو بالفعل مصلحت ہوتی ہے اس کے علم پر ارادہ کا اطلاق ہوتا ہے چونکہ اللہ تعالی ازل سے ہر شئے کے حالات کو جانتا ہے اس لئے وہ ہر وقت ان کے تغیرات پر مطلع ہے وجود کے وقت میں وہ ہر چیز کو موجود جانتا ہے اور عدم کے وقت میں وہ اس کے معدوم ہونے سے آگاہ ہے صحت کی حالت میں وہ صحت کو جانتا ہے اور مرض کی حالت میں وہ بیماری کا علم رکھتا ہے، کوئی چیز کسی حال میں بھی اس سے مخفی نہیں اور یہ تعلقات اور اضافات صفات فعل کی طرح فعل کے ساتھ ساتھ حادث اور پیدا ہوتے ہیں لہٰذا یہ علم اللہ تعالیٰ کے علم قدیم کے مغائر اور اس سے جداگانہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ابن حمید[1] نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا کہ آیا اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے مرید ہے یا ایسا نہیں؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ ہمیشہ سے عالم تو ہے لیکن مرید وہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ مراد بھی اس کے ساتھ متحقق اور موجود ہو، درج ذیل آیت مبارکہ کا یہی معنی اور مفاد ہے۔ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ[2]، نیز اس ارشاد پروردگار کا بھی یہی مقصد ہے، اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔[3]

نیز ایک حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا بھی یہی مطلب ہے جس میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کے متعلق بہتری چاہتا ہے تو اس کے دل کے اندر ایک نورانی نکتہ پیدا کرتا ہے اور اس کے کانوں کی کھڑکیاں کھول دیتا ہے کیونکہ جزاء کا شرط پر معلق ہونا ان کی باہم مغایرت اور ان کے حدوث پر دلالت کرتا ہے لہٰذا اس قسم کے نصوص میں ارادہ سے مراد نہ علم قدیم ہے اور نہ نفس فعل و ایجاد بلکہ مصلحت ایجاد کے ساتھ علم کا متعلق ہونا مراد ہے اور چونکہ ایک لفظ کے معانی متعدد ہو سکتے ہیں لہٰذا ارادہ کے ان معانی میں باہم کوئی منافات نہیں ہے اور ارادۂ خدا کے یہ تمام معانی اس وقت کے اعتبار سے ہو سکتے ہیں جب اس کے ارادہ کا تعلق خود خداوند عالم کے افعال سے ہو اور جب اس کے ارادہ کا تعلق بندوں کے افعال سے ہو تو اس کا اطلاق بھی چند وجوہ پر ہوتا ہے۔

---

[1] اصول الکافی جلد:۱ صفحہ:۱۹۹ تا ۲۰۰۔

[2] سورہ ابراہیم، آیت:۱۹ سورۃ فاطر آیت:۱۶، اگر وہ چاہے تو تم کو پردۂ عدم میں لے جائے اور نئی مخلوق "کتم عدم سے وجود میں" لے آئے، اس آیت میں موجود مخلوق کو فنا کرنے اور نئی مخلوق کے پیدا کرنے کو شرط مشیت پر مبنی کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ایسا کرے لہٰذا معلوم ہوا کہ اس مشیت اور ارادہ سے مراد علم قدیم نہیں اور نہ ہی اس سے مراد نفس فعل ہے بلکہ اس سے مراد یہی ہے کہ اگر اس مخلوق کے فنا کرنے اور نئی کے پیدا کرنے میں اسے مصلحت معلوم ہو تو وہ ایسا کر دے گا لہٰذا یہاں ارادہ سے مراد مصلحت ایجاد و اعدام سے علم کا متعلق ہونا ہے۔

[3] سورۃ یٰسین، آیت: ۸۲، اس کی شان تو بس یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو "پیدا کرنا" چاہتا ہے تو وہ اسے حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے، اس آیت میں بھی اذا شرطیہ ظرفیہ کے بعد لفظ "اراد" کو ذکر فرمایا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ اس ارادہ سے بھی مراد علم قدیم نہیں اور نہ ہی نفس فعل مراد ہے بلکہ یہ ہے کہ جب اسے کسی شئے کے پیدا کرنے میں بالفعل مصلحت موجود ہونے کا علم ہوتا ہے البتہ "کن" کہنے سے مراد عین فعل اور نفس ایجاد ہے جیسا کہ تفسیر صافی صفحہ:۳۸۶ میں بحوالہ کتاب العیون مرقوم ہے۔

بندوں کے افعال سے متعلق ارادۂ خدا کے معانی:

اوّل: یہ کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے اطاعت کا ارادہ کرتا ہے ان کی معصیت اور نافرمانی کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ اس سے کراہت کرتا ہے اور اس مقام میں ارادہ سے مراد اس کا امر اور حکم ہے اور کراہت سے مراد گناہوں سے نہی کرنا اور روکنا ومنع کرنا ہے۔

دوم: احادیث میں وارد ہوا ہے کہ عالم میں جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اس کے ارادہ اور مشیت سے واقع ہوتا ہے اور اس کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کے علم کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم نے جس کا احاطہ نہ کیا ہو۔

قال الصادق علیہ السلام: شاء الله ان لایکون شیء الا بعلمه[1] امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے کہ کوئی شئے اس کے علم کے بغیر نہ ہو۔

دوسرے یہ کہ ارادہ اس قسم کے مقام میں عدم منع کے معنوں میں ہوتا ہے کیونکہ اگر خداوند عالم بندوں کو ان کے افعال کے صادر کرنے سے مانع ہوتو پھر کس کی یہ طاقت ہوسکتی ہے کہ وہ خلافِ منشاء خدا کر دے؟

حالانکہ اس کے حکم کا کوئی مقابلہ ہی نہیں کرسکتا اور بعض اوقات اس ارادہ سے مقصود تسہیل[2] وتمکین[3] اور تخلیہ[4] ہوتا ہے اور کسی چیز کو اسی حالت پر باقی رکھنا مقصود ہوتا ہے جس پر وہ پہلے تھی اور یہ تمام معانی آپس میں تو ایک دوسرے کے متقارب ہیں لیکن علم کے متغائر ہیں چنانچہ بکیر بن اعین[5] سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی

---

[1] اصول الکافی جلد:۱، صفحہ: ۲۷۷، ۲۷۸۔

[2] تسہیل "آسان کر دینا"۔

[3] تمکین "قادر کر دینا"۔

[4] تخلیہ "موانع کو دور کر دینا"۔ عن الرضا: کن منه صنع ومایکون به المصنوع، کہ اللہ تعالیٰ سے لفظ "کن" لفظی صورت میں صادر نہیں ہوتا بلکہ اس کی جانب سے "کن" کا صدور نفس فعل ہے اور وہ امر ہے جس کے ذریعہ مصنوع اور مخلوق موجود ہو جاتا ہے نیز بحوالہ کتاب نہج البلاغہ، تفسیر صافی میں ہی بعد کو مرقوم ہے: **انما کلامه سبحانه فعل منه انشاء قال یقول ولا یلفظ و یرید ولا یضمر وقال یرید بلاهمة،** امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا کلام "الفاظ نہیں ہوتے بلکہ وہ "فعل ہوتا ہے جس سے کسی چیز کی پیدائش ہوتی ہے، نیز امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے مگر الفاظ نہیں بولتا یعنی اللہ تعالیٰ کا کہنا لفظوں کے ذریعہ متحقق نہیں ہوتا بلکہ اس کا قول نفس ہوتا ہے اور ارادہ کرتا ہے لیکن قصد کرنے کے ذریعہ نہیں یعنی اس کا ارادہ عین فعل ہوتا ہے یا مصلحت فعل کے علم کا نام ہے، امیر المومنین اور امام علی رضا علیہما السلام کے ان ارشادات سے معلوم ہوا۔ کہ اللہ تعالیٰ جب کسی چیز کو ہو جانے کا حکم دیتا ہے تو اسے لفظ "کن" کہنے کی احتیاج نہیں ہوتی بلکہ اس کا "کن" عین عقل اور نفس ایجاد ہے لہٰذا وہ لوگ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ خداوند عالم جب کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو امیر المومنین علی علیہ السلام اس کی طرف سے "کن" کہتے ہیں۔

[5] اصول الکافی جلد:۱، صفحہ: ۲۰۰، کتاب التوحید "باب الارادہ" **انها من صفات الفعل**، حدیث: ۲۔

خدمت میں عرض کیا کہ علم خدا اور اس کی مشیت، کیا آپس میں مختلف ہیں یا یہ دونوں باہم متحد ہیں تو حضرت نے فرمایا کہ علم عین مشیت نہیں ہے یعنی عین مشیت حادثہ نہیں ہے نیز یہ معنی ارادہ بمعنی عین فعل کے بھی متغائر ہے کیونکہ حضرت نے اسی روایت مذکورہ کے تتمہ میں فرمایا کہ کیا تو یہ خیال نہیں کرتا تو کہتا ہے، سأفعل كذا ان شاء الله کہ انشاء اللہ میں ایسا کروں گا، اور تو یوں نہیں کہتا، سأفعل كذا ان علم الله کہ میں "ان علم اللہ" ایسا کروں گا، پس تیرا "انشاء اللہ" کہنا اس کی دلیل ہے "انه لم يشأ" کہ اس کی مشیت متحقق نہیں ہوئی، فاذا شاء كان الذي شاء كما شاء، جب اللہ تعالیٰ چاہے تو پھر اسی طرح ہوتا ہے جس طرح کہ اس کی مشیت ہوتی ہے، وعلم الله سابق للمشيئة کہ اللہ تعالیٰ کا علم مشیت سے سابق ہے۔ اس بیان سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ اظہار عجز کے لئے اور اپنے تمام امور کو مشیت ایزدی کے سپرد کرنے کے لئے ان حاجات کے متعلق بھی انشاء اللہ کہنا مستحسن ہوتا ہے جو طاعات کے شمار میں نہیں ہوتے۔

سوم مشیت الجائی:

اللہ قرآن مجید میں فرماتا ہے: فَلَوْ شَآءَ لَهَدَا كُمْ اَجْمَعِيْنَ[1] اس آیت میں مشیت الجائی ہے، یعنی اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ لوگ خواہ مخواہ ہدایت پالیں اور راہِ راست پر آجائیں تو طوعاً یا کرہاً بہر حال سب کے سب ایمان لے آتے لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کی آزمائش اور امتحان مقصود ہے تاکہ لوگوں کی نگاہ میں نیک، برے سے ممتاز ہو جائے اور فرمانبردار، نافرمان سے امتیاز حاصل کرے لہٰذا اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت اور اطاعت پر مجبور نہیں کرتا ورنہ اچھے برے کی شناخت نہ رہتی اور ان کا باہمی فرق معلوم نہ ہوسکتا بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو ایسی صورت اور ایسے طریقہ سے راہنمائی کرتا ہے جس پر ان کا اختیار باقی رہ جاتا ہے اس لئے اگر وہ اپنی رضا و رغبت اور ارادہ و اختیار سے راہ راست کو اپناتے ہیں تو نجات حاصل کرتے ہیں اور اگر راہ بد اور گمراہی کو اختیار کرتے ہیں تو ہلاکت اور عذابِ آخرت کا شکار ہوتے ہیں۔

کراہت اور ارادہ کا فرق:

جب یہ واضح ہو چکا تو اب جاننا چاہئے کہ کراہت ارادے کی ضد ہے اور جب ارادہ کے معانی معلوم ہو گئے تو کراہت کے معانی بھی واضح ہو گئے کیونکہ ہر شئے اپنی ضد کے ذریعہ پہچانی جاتی اور ہر شئے کی معرفت اس کی ضد کی پہچان اور معرفت کا موجب ہوتی ہے۔

[1] سورۃ الانعام، آیت: ۱۴۹، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کر دیتا، اس آیت کے الفاظ یہ ہیں: فَلَوْ شَآءَ لَهَدَا كُمْ اَجْمَعِيْنَ۔

ساتویں صفت:

"متکلم" اس کی صفتِ ہفتم یہ ہے کہ وہ متکلم ہے یعنی وہ اس پر قادر ہے کہ جس چیز میں چاہے کلام کو یعنی ایسے حروف وکلمات پر مشتمل اصوات مسموعہ کو پیدا کردے جو معانی[۱] مقصودہ پر دلالت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے کا یہ معنی نہیں کہ کلام لفظی اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے جو کہ ان میں سے فرقۂ حنابلہ یعنی امام احمد بن حنبل کے مریدوں کا مذہب ہے اور ان کا وہم ہے اور کلام نفسی والے مذہب کو اختیار کرنا بھی درست نہیں کہ ان میں سے فرقۂ اشاعرہ کی اکثریت جس کی قائل ہوئی ہے کیونکہ انہوں نے کہا کہ متکلم وہی ہوتا ہے جس کے ساتھ کلام قائم ہو پھر چونکہ حروف و کلمات کا ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہونا انہوں نے بھی درست نہیں سمجھا کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی جسمیت لازم آتی تھی لہٰذا انہوں نے کلام نفسی کا اختراع کرلیا اور کہا کہ **کلامہ لیس من جنس الاصوات و الحروف بل صفۃ ازلیۃ قائمۃ بذات اللہ تعالی**، یعنی اس کا کلام اصوات وحروف کی جنس سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک صفت قدیمہ ہے جو اس کی ذات پاک کے ساتھ قائم ہے اور اس صفت قدیمہ کا نام کلام نفسی ہے جو صفتِ علم اور صفتِ قدرت کے بھی متغائر ہے اور الفاظ وحروف مسموعہ سے بھی الگ اور ان معانی سے بھی جداگانہ ہے جو ان الفاظ وحروف سے سمجھے جاتے ہیں نیز وہ کہتے ہیں کہ یہ حروف اور اصوات اس کلام نفسی پر دلالت کرتے ہیں لیکن ان کی دلالت اس پر اس طرح نہیں ہوتی جس طرح کہ لفظ اپنے معنی پر دلالت کرتا ہے۔

اشاعرہ کا یہ مہمل اور نامعقول کلام ہے جس کا کوئی صحیح مصداق اور ماحصل نہیں بن سکتا کیونکہ کلام کا صحیح مفہوم اور معنی تو یہی الفاظ و اصوات ہی ہیں جو کہ ہر شخص جانتا ہے اور الفاظ کا تصور اور ان کے معنی کا ادراک صفت علم کی طرف راجع ہوتا ہے علاوہ الفاظ کے کلام کا کوئی اور معنی کسی عقلمند کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا اور پھر یہ کہ کسی چیز کا ذات خداوند عالم کے ساتھ قائم ہونا ممکن ہی نہیں محال[۲] ہے۔

---

[۱] اصوات جمع صوت بمعنی آواز، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے کا جو معنی حنابلہ نے تجویز کیا ہے وہ بھی قرین صواب نہیں اور اشاعرہ نے جو معنی اختراع کیا ہے وہ بھی درست نہیں ہوسکتا۔ حنابلہ کا مذہب اس لئے درست نہیں کہ اس سے اللہ جل شانہ کی جسمیت لازم آتی ہے حالانکہ وہ جسم و جسمانیت سے پاک ہے اور اشاعرہ نے جو مذہب اختیار کیا ہے وہ ہے ہی مہمل، اس کا مصداق ہی کسی عقل مند کے ذہن میں نہیں آسکتا لہٰذا خداوند عالم کے متکلم ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ جس چیز میں کلام پیدا کرنا چاہے پیدا کرسکتا ہے اور وہ اس پر قادر ہے۔

[۲] قول محال ہے، کیونکہ اگر فرض کیا جائے کہ کوئی صفت ذات خداوند عالم کے ساتھ قائم ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صفت واجب الوجود ہے یا ممکن الوجود، اگر واجب الوجود ہو تو تعدد و جباء لازم آتا ہے جو صراحۃً شرک ہے لہٰذا اس سے توحید باری کی نفی ہوجاتی ہے **نعوذباللہ من ذلک**، حالانکہ توحید ایسے مسلمات میں سے ہے جو اسلام کا رکن رکین ہے اس لئے معلوم ہوا کہ وہ صفت واجب الوجود نہیں بلکہ محتاج غیر ہوگی لہٰذا اب سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ غیر کون سی ذات ہے جس نے اس کلام نفس والی صفت خدا کو پیدا کیا، آیا خود خدا نے ہی اسے پیدا کیا یا کسی دیگر شخصیت نے، (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

جیسا کہ عنقریب واضح ہو جائے گا اور تکلم یعنی خلق کلام پر قدرت اور اس کا علم صفات ذات میں سے ہو جو صفت علم و قدرت کے بیان کے ضمن میں واضح ہو چکا اور تکلم باین معنی کہ خلق کلام اس پاک پروردگار سے صادر ہو چکا یہ اس کی ذات کے صفات سے نہیں اس کے فعل کی صفات میں سے ہے اور حادث ہے اور بنابر اس کے متکلم ہونے کا معنی خالق کلام بمعنی کلام کا پیدا کرنے والا اور اس کا فاعل ہے اور متکلم کا یہ مشہور و معروف معنی ہے چنانچہ امام اہل سنت فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں اس کا اعتراف کیا ہے جبکہ اس نے کہا: المراد من کون الانسان متکلما بھذہ الحروف مجرد کونه فاعلا لھذا الغرض المخصوص، کہ انسان کے ان حروف کا متکلم ہونے سے مراد محض اس کا اس غرض مخصوص کی وجہ سے فاعل ہونا ہے۔ بنابر اس کے تکلم باری تعالیٰ اس کی فاعلیت اور ایجاد کلام کا نام ہوگا جس طرح کہ علماء امامیہ نے کہا ہے ایسی صفت قدیمہ کا نام نہیں ہو سکتا جو اس کی ذات کے ساتھ زعم اشاعرہ کے مطابق قائم ہے۔

ایجادِ کلام کے معنی میں خداوند عالم کا متکلم ہونا منقولاتِ متواترہ میں سے ہے۔ ارشاد قدرت ہے:

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا (سورۃ النساء، آیت: ۱۶۴) کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے کلام کیا۔

عن امیر المومنین علیه السلام کلّم موسٰی تکلیما بلا جوارح و أدوات و لا شفة ولا

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) اگر کہا جائے کسی دیگر شخصیت نے خدا کی اس صفت کلام نفسی کو پیدا کیا تو یہ بداہۃً محال ہے کیونکہ اس سے خداوند عالم کا اپنی صفت میں محتاج غیر ہونا لازم آتا ہے حالانکہ وہ غنی مطلق اور کامل علی الاطلاق ہے کسی اعتبار سے بھی وہ محتاج غیر نہیں نیز اس صورت میں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ غیر جس نے صفت کلام نفسی کو پیدا کیا ہے وہ واجب الوجود ہے یا ممکن الوجود، اگر شق اول کو اختیار کیا جائے تو پھر وہی تعدد و جباء لازم آتا ہے اور توحید پر زد پڑتی ہے اور اگر اسے ممکن الوجود مانا جائے تو اس کے متعلق سوال پیدا ہوگا کہ اسے کس نے پیدا کیا خود خداوند نے یا کسی اور شخصیت نے، اگر شق ثانی کو اختیار کیا جائے تو پھر آگے یہی سوال چلے گا اور تسلسل لازم آئے گا جو کہ مسلمہ طور پر محال ہے اور شق اول کی صورت میں معنی یہ ہوگا کہ خدا نے کسی اور شخصیت کو پیدا کیا اور اس نے خدا کی صفت کلام نفس کو پیدا کیا تو اس سے لازم آئے گا کہ خدا کی یہ صفت قدیم نہیں حادث ہے حالانکہ یہ اشاعرہ کے مذہب کے خلاف ہے کیونکہ وہ اس صفت کو قدیم مانتے ہیں نیز لازم آئے گا جب تک کلام نفسی والی صفت کو اس غیر اللہ نے پیدا نہیں کیا تھا اس وقت تک خدا متکلم نہ تھا اور تکلم سے عاجز تھا حالانکہ اللہ جل شانہ ہر قسم کے عجز سے مبرا و منزہ ہے۔ اب رہی یہ شق کہ خود خداوند عالم نے آپ ہی اپنی اس صفت یعنی کلام نفسی کو پیدا کیا تو بھی محال ہے کیونکہ خداوند عالم کا ہر فعل ارادہ اور اختیار سے ہوتا ہے جیسا کہ ثابت ہو چکا کہ اس کے صفات میں سے ایک صفت مرید بھی ہے کما قال عز شانه: فعال لما یشاء، کہ وہ جس چیز کو چاہتا ہے اسے کرتا ہے، و یفعل ما یرید کہ جس چیز کا وہ ارادہ کرتا ہے اسے موجود کرتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات فاعل مختار ہے تو مذکورہ شق کی تقدیر پر لازم آئے گا کہ کلام نفسی والی صفت حادث ہو قدیم نہ ہو کیونکہ فاعل مختار کا ہر فعل حادث ہوتا ہے اور سابقاً بیان ہو چکا کہ کلامی نفسی کا حادث ہونا مذہب اشاعرہ کے خلاف ہے کیونکہ وہ اسے قدیم جانتے ہیں علاوہ ازیں یہ عقلاً بھی محال ہے کہ خدا نے اپنی اس صفت کلام نفس کو پیدا کیا ہو کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ جب خدا نے اپنی اس صفت کو پیدا نہ کیا تھا اس وقت وہ متکلم نہ تھا، تکلم سے عاجز تھا پھر جب اپنی اس صفت کو پیدا کیا تو وہ متکلم بنا، حالانکہ خداوند عالم کے جتنے صفات ذات ہیں وہ ازل سے ان کے ساتھ متصف ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ جو کلام نفسی والا ایک لفظ اختراع کیا گیا ہے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اور حق یہ ہے کہ خداوند عالم باین معنی متکلم ہے کہ وہ کلام کا خالق ہے جس چیز میں چاہے کلام پیدا کر دے اور تکلم خدا اس کی ذات والا صفات کے فعل خلق کی ایک جزء ہے اور یہ صفات ذات میں سے نہیں، صفات افعال میں سے ہے۔

لهوات سبحانه و تعالى عن الصفات.[۱]

جناب امیر المومنین علیہ السلام سے اس آیت مبارکہ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى کے متعلق مروی ہے کہ اللہ تعالی نے موسیٰ علیہ السلام سے جو کلام کیا وہ ایسا کلام تھا جو اس کے شایانِ شان تھا کہ جو بغیر اعضاء و جوارح اور بغیر زبان و دہن اور بغیر ہونٹوں اور گلے اور بغیر حلق اور اس میں لٹکے ہوئے گوشت وغیرہ کے تھا کیونکہ اللہ تعالی ایسی صفتوں اور ایسے اوصاف سے پاک اور بلند بالا ہے جو جسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کی صفات مخلوقات کی صفتوں کی مانند ہیں تا کہ اس کے ساتھ کلام قائم ہو سکے بلکہ اس کا تکلم یہی ہے کہ جس جسم میں چاہے وہ کلام اور آواز پیدا کر دے۔ چنانچہ اس نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا تو زیتون کے درختوں میں سے ایک درخت میں حروف اور الفاظ کو پیدا کر دیا کیونکہ اس مقرب یز دانی کے ساتھ اس کلام سبحانی کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ جب آپ اپنی زوجہ کے ساتھ حضرت شعیب علیہ السلام سے رخصت ہو کر شہر مدین سے باہر نکلے تو باد و بادل کی ٹھنڈک اور سردی سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ کوہِ طور کی دائیں جانب آپ کو ایک آگ نظر آئی آپ اس کی طرف چل پڑے تو کیا دیکھا کہ پروردگارِ عالم کی قدرت کاملہ سے ایک سرسبز درخت میں آگ شعلہ زن ہو رہی ہے اور نور ساطع ہو رہا ہے۔ اس کے نزدیک پہنچے تو ایک آواز سنائی دی اور بارگاہِ کبریا سے ان الفاظ میں بڑی شفقت اور مہربانی سے بھرپور کلام بصورتِ خطاب ان کے سننے میں آیا:

يٰمُوْسٰى ○ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ○ (سورة طہ، آیت: ۱۱ تا ۱۳)

کہ اے موسیٰ: میں تیرا پروردگار ہوں لہٰذا تو اپنے ہر دو پاپوش کو اتار دے یا بنا بر اختلاف مفسرین اپنی بیوی اور اولاد کی محبت کو دور کر دے تو اس پاکیزہ وادی میں پہنچ چکا ہے جس کا نام طویٰ ہے، میں نے تجھے منتخب کر لیا اور چن لیا ہے لہٰذا تم اس وحی کو بغور سماعت کرو جو تمہاری طرف کی جاتی ہے۔

اس کے بعد آپ برابر خطاباتِ ربانیہ سے مشرف ہوتے رہتے تھے تا آنکہ ان کی قوم نے ان سے کہا کہ ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کلام ربانی کو اپنے کانوں سے نہیں سنیں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان میں سے ایک جماعت کو منتخب کر کے کوہِ طور پر لے گئے، شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ[۲] نے کتاب توحید میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ایک طولانی حدیث روایت کی ہے، جس میں مرقوم ہے:

فخرج بهم إلى طور سيناء فأقامهم في سفح الجبل و صعد موسى عليه السلام إلى الطور وسأل الله تبارك و تعالى أن يكلمه و يسمعهم كلامه فكلمه الله تعالى ذكره و سمعوا كلامه من فوق و

---

(۱) تفسیر صافی، صفحہ: ۱۲۰۔

(۲) یہی مضمون حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے منقول ہے (تفسیر البرہان، جلد ا، صفحہ: ۳۶۶)۔

أسفل و يمين و شمال و وراء و أمام لأن الله عز و جل أحدثه في الشجرة ثم جعله منبعثا منها حتى سمعوه من جميع الوجوه.

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو کوہ طور سیناء کی طرف لے گئے۔ وہاں دامن کوہ میں ان کو ٹھہرا دیا اور خود پہاڑ کے اوپر تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ اس طرح کلام فرمائے کہ ان کی قوم اسے سن لے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور ان کی قوم نے اسے اس طرح سنا کہ اس کی آواز اوپر نیچے، دائیں بائیں، سامنے اور پیچھے ہر طرف سے ان کو سنائی دے رہی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے درخت میں کلام کو پیدا کر دیا تھا، اس درخت سے آواز بلند ہو رہی تھی جو ہر جانب سے ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھی اور عظمت اور بزرگی کے آثار اس سے ظاہر ہو رہے تھے اور یہ سارے خلاف عادت واقعات تھے جو گواہی دے رہے تھے کہ یہ کلام قادر مطلق خالق علام کی جانب سے ہو رہا ہے جو محتاجِ مکان نہیں اور شہادت دے رہے تھے کہ مخلوق کا کلام نہیں کیونکہ مخلوق کا وجود اور اس کا کلام ہر دو کسی ایک جہت میں ہو سکتے ہیں، ہر شش جہات میں نہیں ہو سکتے۔

واضح باد کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء میں سے صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس شرف سے مخصوص فرمایا کہ ان ہر دو سے لب و دہن سے صادر ہونے والے کلام کی صورت میں خطاب فرمایا کہ جو وحی کا سب سے اعلیٰ مرتبہ اور شریف ترین اور بلند تر درجہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تو کوہِ طور پر کلام ہوا اور ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو تمام انبیاء کے سرتاج اور سب رسولوں کے سردار ہیں، معراج کے وقت اس شرف سے نوازا جبکہ اپنے قرب کا انتہائی درجہ ان کو عطا فرمایا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی افضل اور احسن صورت پر خطاب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فضیلت کا مظاہرہ فرمایا۔

چنانچہ کتاب الاحتجاج للطبرسیؒ میں یہودی کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مکالمہ منقول ہے، جس میں مرقوم ہے:

قالوا موسٰى خير منك قال و لِمَ قالوا لان الله عزوجل كلمه اربعة آلاف كلمة ولم يكلمك بشيء فقال النبي لقد اعطيت انا افضل من ذلك قالوا و ما ذلك قال قول عز و جل سبحان الذي أسرى بعبده، الآية.[1]

یہودی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام آپ سے افضل ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیونکر وہ افضل ہیں؟ انہوں نے کہا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چار ہزار کلمات کے ذریعہ کلام کیا اور آپ سے کوئی کلام نہیں کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس سے افضل کلام سے اللہ تعالیٰ نے مشرف فرمایا۔ انہوں نے کہا کہ وہ کون سا کلام ہے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کلام وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دال ہے: سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی

---

[1] الاحتجاج صفحہ: ۲۷۔

بِعَبْدِهٖ الآیۃ، کہ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو بوقت شب مسجد الحرام سے لے کر مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کے ذریعہ اس شرف کی طرف اشارہ فرمایا جو ان کو معراج میں حاصل ہوا،

فی بعض اخبار المعراج، ثُمَّ قَالَ جَاوَزْنَا مُتَصَاعِدِیْنِ إِلٰى أَعْلٰى عِلِّيِّيْنَ إِلٰى أَنْ قَالَ: ثُمَّ كَلَّمَنِيْ رَبِّيْ وَ كَلَّمْتُهٗ.

معراج کی بعض احادیث میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پھر ہم اوپر کو چڑھتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ اعلیٰ علیین تک پہنچ گئے، تا آنکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: پھر مجھ سے میرے پروردگار نے کلام کیا اور میں نے اس سے کلام کیا۔

مقام غور ہے کہ کجا کوہِ طور اور کجا اعلیٰ علیین اور منتہائے قرب رب العالمین، لہٰذا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جو کلام ربانی وقوع پذیر ہوا اس میں اور جو حبیب خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوا اس میں زمین و آسمان کا فرق ہے بلکہ جو کرامت اور معجزہ اللہ تعالیٰ نے کسی پیغمبر کو عطا فرمایا اس کی مثل بلکہ اس سے بھی بہتر ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرمایا۔

فی الکافی: عَنْ عَلِيِّ بْنِ إِبْرَاهِيمَ عَنْ صَالِحِ بْنِ السِّنْدِيِّ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ بَشِيْرٍ عَنْ سَعْدِ الْإِسْكَافِ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) أُعْطِيتُ السُّوَرَ الطِّوَالَ مَكَانَ التَّوْرَاةِ وَ أُعْطِيتُ الْمِئِيْنَ مَكَانَ الْإِنْجِيْلِ وَ أُعْطِيتُ الْمَثَانِيَ مَكَانَ الزَّبُوْرِ وَ فُضِّلْتُ بِالْمُفَصَّلِ ثَمَانٌ وَ سِتُّوْنَ سُوْرَةً.

بنا بر تحقیق ملا محسن فیض کاشانی کہ جو انہوں نے تفسیر صافی[1] میں تحریر کیا ہے، حاصل معنی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توریت کے بدلے مجھے طولانی سورتیں عطا کی گئی ہیں جو علی الاقرب سات ہیں اور وہ سورہ فاتحہ کے بعد والی سورتیں ہیں، پہلی ان میں سے سورۂ بقرہ ہے اور یہ سات اس صورت میں پوری کی جاتی ہیں جبکہ سورۂ انفال اور برائت کو ایک سورہ شمار کیا جائے کیونکہ یہ دونوں جنگوں کے بیان کے لئے نازل کی گئی ہیں نیز اس وجہ سے کہ ان دونوں کو قرینتین کہا جاتا ہے اور فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل کے بدلے مجھے مئین عطا کی گئی ہیں اور ان سے وہ سورتیں مراد ہیں جو قریب قریب سو آیتوں پر مشتمل ہیں اور وہ بھی سات سورتیں ہیں اور وہ ہیں سورۂ بنی اسرائیل سے لے کر سورۂ مومنون تک اور فرمایا کہ پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور کے بدلے مجھے مثانی عطا کی گئی ہیں اور ان سے مراد وہ سورتیں ہیں جو طوال اور مئین کے علاوہ ہیں اور سورہ ہائے مفصل کے ذریعہ مجھے دیگر انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے اور وہ اڑسٹھ سورتیں ہیں اور ان سے مراد وہ سورتیں ہیں جو سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر آخر قرآن تک واقع ہیں اور اس نام سے ان کو اس لئے موسوم کیا گیا ہے کہ یہ بکثرت قافیوں اور چھوٹی چھوٹی آیات پر مشتمل ہیں اس وجہ سے ان میں

---

[1] تفسیر صافی، صفحہ:۵

فواصل زیادہ ہیں لہٰذا ان کا نام مفصل رکھا گیا ہے اور جن کا نام مثانی ہے ان میں منجملہ وہ سورتیں بھی ہیں جو طوال اور مئین کے درمیان ہیں وہ مثانی طوال کہلاتی ہیں اور جو مئین کے بعد ہیں وہ مثانی مئین کہلاتی ہیں۔

جب یہ وضاحت ہوچکی تو اب معلوم ہونا چاہئے کہ کلام الٰہی چند سورتوں پر واقع ہوا ہے چنانچہ حدیث میں وارد ہوا ہے:

کلام الله لیس بنحو واحد منه ما کلم الله به الرسل و منه ما قذفه فی قلوبهم و منه رؤیا یریها الرسل و منه وحی و تنزیل یتلی ویقرأفهو کلام الله.

یعنی کلام خدا ایک نوع کا نہیں ہے ایک تو وہ کلام خدا ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے بظاہر خطاب فرمایا ہے اور وہ حروف اور اصوات ہیں جنہیں خدا جس چیز میں چاہے پیدا کر دیتا ہے اور ایک قسم اس کی وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کا انبیاء کے دلوں میں القاء کرتا ہے اور اس کی قسموں میں سے ایک قسم سچے خواب ہیں جو انبیاء علیہم السلام دیکھتے تھے اور ایک قسم ان میں سے وہ وحی اور تنزیل ربانی ہے جو تلاوت کی جاتی اور پڑھی جاتی ہے (یہ ہے کلام الٰہی کی تشریح)۔

مخفی نہ رہے کہ کلام کا اصلی معنی جیسا کہ سابقاً اس کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے وہ الفاظ ہیں جو اصوات وحروف مسموعہ سے مولف اور مرکب ہوتے اور معنی مخصوصہ پر دلالت کرتے ہیں اور بعض اوقات کلام کا اطلاق ان نقوش پر بھی کر دیتے ہیں جو لکھے جاتے ہیں اور ان حروف پر بھی کر دیتے ہیں جو حیطۂ تحریر میں لائے جاتے ہیں کیونکہ یہ نقوش وتحریرات حروف و اصوات پر دلالت کرتے ہیں اور بعض اوقات کلام کا اطلاق ان الفاظ کی اور ان نقوش کی حکایت پر بھی کر دیتے ہیں اور بعض اوقات ان کی حکایت کی حکایت پر بھی کر دیتے ہیں اور یونہی اس سلسلہ کو طول دیتے چلے جاتے ہیں۔

بنا بر اس توسیع اور وسعت کے کہ جو کثرت استعمال کی وجہ سے حقیقت شریعہ اور حقیقت عرفیہ کا درجہ حاصل کر گیا ہے کلام الٰہی سے مراد وہ حروف اور نقوش ہیں کہ جن کی نظم اور تالیف از جانب رب العزت ظہور پذیر ہوئی ہے اگرچہ کہ اس کے حروف تلاوت کے وقت فرشتے یا انسان کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اور لکھنے کے وقت زبان قلم سے صادر ہوتے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کا اصل کلام وہ شخصی کلام ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے اصوات اور حروف کو کسی جسم میں یا جس کے نقوش کو کسی لوح میں یا اس کی مثل کسی چیز میں ایجاد فرما دیتا ہے اور پیغمبر اس کو سنتے اور لکھتے ہیں اور اس کا انہیں الہام کیا جاتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ فرشتے کے ذریعہ کسی پیغمبر پر وحی فرماتا ہے اور پیغمبر کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ امت تک پہنچاتا ہے اور افراد امت تلاوت اور کتابت کے ذریعہ اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں لیکن اس عام معنی کے لحاظ سے کلام مجید ایسا کلام ہے جو نوعی تالیف کے ذریعہ مولف ہے آسمانی کتابوں یعنی "توریت، انجیل، زبور اور قرآن مجید" کو اسی عنوان کے تحت کلام اللہ کہا جاتا ہے اور اسی اعتبار سے کلام خدا کو لوح محفوظ میں بھی ثابت قرار دیا جاتا ہے اور جبرائیل امین کی زبان پر آنحضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف جو کلام پاک نازل ہوا اور نسلاً بعد نسل بصورت تواتر نقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا اور تمام زمانوں میں اہل اسلام کی زبانوں پر تلاوت کیا جاتا اور ہر دور میں مصاحف و دفاتر میں لکھا جاتا ہے وہ اسی

اعتبار سے کلام الٰہی کا مصداق ہے اور احکام شریعہ مثلاً بغیر طہارت کے قرآن مجید کو مس کرنے کا عدم جواز اور جنابت کی حالت میں سورہ عزائم یعنی جن سورتوں میں سجدہ ہائے واجب واقع ہوئے ہیں مطلقاً ان کی آیات کے پڑھنے کا حرام ہونا اور یہ سب احکام قرآن کریم کے اسی عام معنی پر مبنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو دیگر تمام آسمانی کتابوں پر یہ فضیلت عطا فرمائی ہے کہ عجیب وغریب تالیف اور اسلوب پر اعجاز کی صورت میں اسے ظاہر فرمایا ہے کہ باوجود مقابلے کا چیلنج کرنے کے مادری زبان عربی رکھنے والے فصحاء عدنان اور بلغاء قحطان اس کی چھوٹی سے چھوٹی سورت کا مقابلہ کرنے سے بھی عاجز ہو گئے جس کی تفصیل مبحث نبوت میں آنحضرتؐ کے معجزات کے بیان میں آجائے گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

حدیث قدسی کی تعریف:

اللہ تعالیٰ کا جو کلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وصف اعجاز سے خالی ہونے کی صورت میں نازل ہوا اور اکثر و بیشتر وہ متواتر نہیں ہے اسے قدسی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

کلام خدا حادث اور مخلوق ہے:

واضح باد کہ کلام الٰہی اپنے تمام گذشتہ معانی کے اعتبار سے حادث اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اور احادیث میں قرآن پاک کے متعلق جو وارد ہوا ہے کہ "محدث غیر مخلوق" تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ موضوع اور اپنی طرف سے اختراع کردہ نہیں لیکن یہاں لفظ مخلوق بمعنی مجعول ہے بے شک اللہ تعالیٰ کا کلام اس شبہ سے بلند و بالا ہے غرض قرآن پاک حادث ہے قدیم نہیں کیونکہ کوئی عقل مند کلام لفظی کو قدیم نہیں کہتا کیونکہ یہ سب کا سب مرکب ہے اور مسلمہ کلیہ ہے کہ ہر مرکب حادث ہوتا ہے اس کی تالیف یکے بعد دیگرے مرتب ہونے والے حروف سے واقع ہوتی ہے لہٰذا اس کے حادث[1] ہونے کی علامات اور دلائل واضح اور ظاہر ہیں۔

---

[1] حادث اسے کہا جاتا ہے جو نہ ہونے کے بعد پیدا ہوا ہو، اسے "مسبوق بالعدم" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے کہ جو معدوم ہونے کے بعد وجود پذیر ہوا ہو اس کے مقابلے کی صفت قدیم ہے لہٰذا قدیم اسے کہا جاتا ہے جو ہمیشہ سے موجود ہو اور ہمیشہ رہنے والا ہو اور قدیم صرف اللہ جل شانہ کی ذات ہے جو ہمیشہ سے بذات خود موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا وہ ازلی و ابدی ہے عدم اس کی ذات کو نہ سابقاً لاحق ہوا نہ بعد کو لاحق ہوگا کیونکہ وہ واجب الوجود ہے عدم اس کی ذات کے لئے ممکن ہی نہیں ہوسکتا اور اس کی ذات پاک کے علاوہ ہر شئے حادث ہے کیونکہ ہر شئے ممکن الوجود ہے یعنی اپنے وجود میں وہ ذات خداوند عالم کی محتاج ہے اسی نے ہر شئے کو پیدا کیا اور ہر چیز کو خلعت وجود بخشی لہٰذا جہاں دیگر تمام چیزیں حادث اور اس کی مخلوق ہیں وہاں قرآن پاک بھی حادث اور اس کی مخلوق ہے کیونکہ وہ ایسا کلام ہے جسے اس پاک پروردگار نے پیدا کیا اور جبرائیل امین کے ذریعہ اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نازل فرمایا مگر فرقہ حنابلہ وغیرہ نے اپنی غلط فہمیوں کے باعث اسے قدیم قرار دے دیا۔

حنابلہ کی تردید:

تعجب ہے کہ ان کے ایک فرقہ والے اپنی انتہائی سفاہت کے باعث قرآن کریم کے قدیم ہونے کے قائل ہو گئے ہیں حالانکہ وہ اس کے حروف کو خود اپنی زبان پر جاری کرتے اور اس کی تحریروں اور نقوش کو اپنے قلم سے صادر کرتے ہیں اور باین ہمہ اس کے حروف ونقوش کو قدیم قرار دیتے ہیں جیسا کہ کتاب ملل والنحل میں مذکور ہے کہ اشاعرہ کے فرقۂ مشبہہ نے اپنے اعتقاد بدتشبیہ پر ایک اور زیادتی کر دی ہے کیونکہ وہ قرآن مجید کے متعلق کہتے ہیں کہ قرآن کے حروف اور اصوات بھی ازلی اور قدیم ہیں اور اس کے نقوش تحریر اور عبارتیں بھی ازلی اور قدیم ہیں کہ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ کچھ دفتین یعنی "جلد قرآن کے دونوں گتوں" کے درمیان ہے وہ کلام خدا ہے جو جبرائیل امین کی زبان کے ذریعہ نازل ہوا ہے اور یہی لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، انتہیٰ؛ اور صاحب مواقف نے تصریح کی ہے کہ قدم قرآن کے قائل حنابلہ ہیں۔ چنانچہ صاحب مواقف لکھتے ہیں:

قالت الحنابلة كلامه حرف و صوت يقومان بذاته و أنه قديم و ان قوما بالغوا فيه حتى قال بعضهم جهلا الجلد و الغلاف قديمان.

کہ حنابلہ اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ کلام خدا حروف اور اصوات ہیں جو ذات خدا کے ساتھ قائم ہوتے ہیں، اور یہ قدیم ہیں اور ایک قوم نے اس کے متعلق اور زیادہ مبالغہ کیا، حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے نادانی کے باعث یہ بھی کہہ دیا کہ چمڑا "جلد کا" اور غلاف بھی قدیم ہیں، انتہیٰ؛ اور شارح مقاصد نے لکھا ہے:

وعن بعضهم ان الجسم الذى كتب به القرآن فانتظم حروفا و رقوما هو بعنيه كلام الله تعالى و قد صار قديما بعد ما كان حادثا.

کہ ان میں سے بعض نے کہا کہ وہ جسم بعینہٖ کلام اللہ ہے جس کے ذریعہ قرآن کو لکھا گیا اور وہ اس کے باعث حروف اور تحریروں وعبارتوں کی صورت اختیار کر گیا اور قرآن حادث ہونے کے بعد پھر قدیم بن گیا۔ حالانکہ اس سے بڑھ کر کوئی لاعلمی نہیں ہو سکتی اور ان سب اوہام کا باعث یہ ہے کہ صفاتِ فعل اور صفاتِ ذات میں ان کو اشتباہ ہو گیا ہے وہ ان کے باہمی فرق کو نہیں سمجھ سکے اور معانی کلام میں امتیاز نہیں کر سکے اور یہ ایک ایسی خرابی اور ایسا فساد ہے جو محتاجِ بیان نہیں کیونکہ یہ "عیاں را چہ حاجتِ بیان" کی مصداق ہے۔

آٹھویں صفت ثبوتیہ.....صادق ہے

اللہ جل شانہ صادق ہے یعنی اس کا کلام سچا ہے جیسے کہ ارشاد پاک ہے:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (النساء، آیت: ۱۲۲)

کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر سچا کون ہوسکتا ہے کیونکہ کذب اور جھوٹ ایک قبیح اور بری چیز ہے اور کسی قبیح اور برائی کا خداوند عالم سے صادر ہونا ممکن نہیں، وہ کسی غیر کے جھوٹ پر بھی راضی نہیں چہ جائیکہ وہ خود اس کا ارتکاب کرے۔ وہ اپنے برحق پیغمبروں کے ہاتھ پر معجزے اسی لئے صادر فرماتا ہے کہ ان کی سچائی اور حقانیت کی تصدیق ہو جائے وہ کسی جھوٹے کے ہاتھ پر معجزہ ہرگز صادر نہیں فرماتا۔ مگر اس ذات پاک پروردگار کا سچا اور صادق ہونا اس مذہب کے مطابق ثابت نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ حسن وقبح اور اچھائی و برائی کے عقلی ہونے کے قائل نہیں ہیں لہٰذا وہ خداوند عالم اور انبیاء کے صدق اور سچائی کو اپنے اصول کے مطابق ثابت نہیں کر سکتے اس کی تفصیل انشاء اللہ بحث عدل میں آ جائے گی۔

واضح باد کہ یہ آخر والی جو دو صفتیں ہیں یعنی "تکلم" بمعنی خلق کلام اور "صدق" کہ جو کلام اور متکلم کے صفات میں سے ہے، ان کو خداوند عالم کی صفات ذات کے شمار میں داخل نہیں کیا جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ اول بحث میں ہم نے متکلم کی ایجاد کلام پر قادر کے ساتھ تفسیر کی ہے تا کہ صفات ذات کی سلک میں منسلک ہو جائے لیکن تکلم بمعنی خلق کلام کا یہاں پر تذکرہ بس طَرْدًا لِلْبَاب ہوسکتا تھا مگر چونکہ عادت علماء بنا بر تغلیب کے جاری ہوئی ہے کہ ان دوصفتوں کو بھی وہ صفات ذات کے تحت بیان کر دیتے ہیں لہٰذا ہم نے بھی علماء کی تاسی اور اقتداء میں ان کو اسی جگہ بیان کر دیا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ ان دوصفتوں کے اس مقام پر ذکر کرنے کی وجہ علماء کے نزدیک یہ ہو کہ چونکہ ان میں سے فرقہ مشبہہ نے کلام لفظی کو اور اشاعرہ نے کلام نفسی کو خداوند عالم کی صفات ذات میں سے قرار دیا ہے لہٰذا ان کی تردید کرنے کی خاطر علماء نے صفت تکلم کا اس مقام میں تذکرہ فرمایا ہو اور پھر صدق چونکہ کلام سے تعلق رکھتا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ کے صادق ہونے کی صفت کو بھی علماء نے تبعاً اسی مقام میں ذکر کر دیا۔

رہی صفات کی تعداد تو اس کے متعلق کلامِ علماء اعلام میں اختلاف ہے لیکن اس سے کوئی منافات لازم نہیں آتی کیونکہ اس تعداد میں کمی اور زیادتی ہوسکتی ہے کیونکہ زیادتی اعتبارات کے باعث صفات میں زیادہ پیدا ہو جاتی ہے جیسے مثلاً ازلیت و ابدیت کو ہم دو صفتیں قرار دیں اور اس طرح سمع اور بصر کو دو صفتیں قرار دیں تو صفات کی تعداد زیادہ ہو جائے گی اور اصول کلیہ کی وحدت کا اگر لحاظ کیا جائے تو صفات میں کمی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ سمع و بصر صفت علم کے تحت داخل ہوسکتی ہیں اور ابدیت و ازلیت وجوبِ وجود اور سرمدیت کے تحت داخل ہوسکتی ہیں لہٰذا اس اعتبار سے صفات کی تعداد کم ہو جائے، واللہ یعلم۔

❁❁❁❁❁

فصل سوم:

صفات سلبیہ کا بیان

پہلی صفت نفی شرک:

صفات سلبیہ میں سے پہلی پہلی صفت کہ جو تمام صفات سلبیہ کا رکنِ اعظم ہے وہ تعدد اور شرک کی نفی ہے کہ اس ذاتِ پاک کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا اور یہی اصل توحید ہے۔ لہٰذا یقین کرنا چاہئے کہ خداوند عالم واحد اور یکتا و یگانہ ہے یعنی سوائے اس کی ذات کے کوئی اور واجب الوجود اور اس کی پیدا کردہ مخلوق ہے نہ خداوند عالم ہونے میں اس کا کوئی شریک ہوسکتا ہے نہ قدیم ہونے میں، نہ ازلی ہونے میں، نہ عموم علم و قدرت میں، نہ جواہر[1] واجسام کے خالق ہونے میں، نہ حیوانات اور انسانوں کا رازق ہونے میں، نہ معبود ہونے میں یعنی عبادت، پرستش اور مسجود ہونے کے استحقاق میں اور نہ دیگر اُن صفات میں اس کا کوئی شریک ہوسکتا ہے جو اس کی ذات پاک سے مختص ہیں، لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ۔

❁ توضیحات نورانیہ ❁

(حواشی: فصل سوم)

از۔۔۔۔۔علامہ السید گلاب علی شاہ نقوی (قدس سرہ الشریف)

[1] جواہر اور اجسام کی خصوصیت اس لئے فرمائی ہے کہ بعض اعراض ایسے بھی ہیں جن کا خالق اور موجد انسان بھی ہوسکتا ہے کیونکہ انسان اپنے افعال اختیاریہ اور ان پر مرتب ہونے والے اثرات کا خود موجود ہے جیسا کہ عنقریب اس کا تذکرہ کلام مصنف میں آجائے گا لیکن اللہ تعالیٰ کے احترام میں علماء لفظِ خالق کا اطلاق "غیر اللہ" پر نہیں کرتے۔ قرآن مجید میں فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ کے الفاظ سے خالقین کا جو تعدد سمجھا جاتا ہے وہ اسی اعتبار سے ہے کہ انسان اپنے افعال کا موجد اور خالق ہے اور اسی وجہ سے آیت کریمہ: اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ الخ (سورہ آل عمران، آیت:۴۹) میں پرندے کی شکل جو عیسیٰ علیہ السلام مٹی سے بناتے تھے اس خلق سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ شکل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فعل کا اثر ہوتی تھی جیسا کہ جو شخص بھی مٹی، لکڑی، موم یا ایسی کسی چیز کو لے کر اس سے پرندے یا دیگر کسی جانور، اونٹ، گھوڑے، ہرن وغیرہ کی شکل بنا دے تو یہ شکل اسی شخص کے فعل کا اثر ہوگا لہٰذا معنوی اعتبار سے وہی شخص اس شکل کا خالق ہوگا ہاں مگر تمام جواہر و اجسام کا بھی اور مخلوق کے افعالِ اختیاریہ کے علاوہ دیگر تمام اعراض کا بھی خالق خدا ہے، اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی ذات پاک کے علاوہ ان چیزوں کے پیدا کرنے پر کوئی قادر ہی نہیں۔

شیخ صدوقؒ نے کتاب توحید میں اپنی اسناد کے ساتھ روایت کی ہے کہ جنگ جمل میں ایک اعرابی عین اس وقت جبکہ معرکۂ کارزار گرم تھا امیر المومنین علیہ السلام کی خدمت میں آ کر کھڑا ہو گیا اور عرض کیا کہ کیا آپ کہتے ہیں کہ خداوند عالم واحد ہے؟

لوگوں نے اسے منع کیا اور کہا کہ اے اعرابی تم دیکھ رہے ہو کہ امیر المومنین علیہ السلام اس وقت پریشان، ان کا قلب مبارک جہاد اور جنگ میں مشغول ہے، یہ سوال کرنے کا وقت نہیں ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ اعرابی جس چیز کے متعلق سوال کر رہا ہے یعنی مسئلہ توحید اور یکتا پرستی ہی تو چیز ہے کہ جس کے متعلق ہم اس قوم یعنی "اہل جمل" کو راہنمائی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور جس کی وجہ سے ہم ان کے ساتھ جنگ کر رہے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اے اعرابی: خدا کو واحد کہنے کی چار صورتیں ہیں، دو صورتوں کے لحاظ سے واحد کہنا صحیح نہیں ہے اور دو اعتبار سے صحیح ہے۔ وہ دو صورتیں کہ جو صحیح نہیں ہیں ان میں سے ایک صورت یہ ہے کہ واحد سے مراد واحد عددی لیا جائے یعنی ایسا ایک جس کا دوسرا بھی ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ ہستی جس کا ثانی ہو ہی نہیں سکتا اسے کس طرح واحد اور اوّل کہا جا سکتا ہے کیونکہ دو تو دو ہوتے ہی اس وقت ہیں جبکہ ایک کے ساتھ ایک اور کو جمع کر دیا جائے۔

مصنف علام فرماتے ہیں کہ مراد اس سے یہ ہے کہ دو خدا نہیں ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ کو ان دو میں سے ایک قرار دیا جائے اور اس لحاظ سے اسے واحد کہا جائے۔

مطلقاً وحدانیت عددیہ کی نفی مرادِ امیر المومنین علیہ السلام نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو امام زین العابدین سید الساجدین علیہ السلام صحیفہ کاملہ کی دعاؤں میں یوں نہ فرماتے: لَكَ يَا اِلٰهِيْ وَحْدَانِيَّةُ الْعَدَدِ کہ اے پروردگار تجھے ہی عدد کی وحدانیت حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ بعد کو امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کیا تو نے غور نہیں کیا کہ نصاریٰ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ یعنی "تین میں سے تیسرا ہے" وہ کافر ہیں اور ان کا کافر قرار دیا جانا اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے تین خدا قرار دیئے ہیں۔

کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا کہ وہ تین خداؤں کے قائل ہیں اور ان تین میں سے خدا کو بھی ایک قرار دیا ہے تو پھر وہ کافر قرار نہ پاتے اس لئے محض عدد کے اثبات سے تو کوئی مانع نہ تھا عدد تو ہر موجود کو لاحق ہو سکتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ.[1]

---

[1] المجادلہ آیت: ۷، جو بھی تین شخص مل کر مشورہ کرتے اور باہم سرگوشی کرتے ہیں تو خدا ان کا چوتھا ہوتا ہے اور اگر پانچ سرگوشی کریں تو خداوند عالم ان کا چھٹا ہوتا ہے یعنی خداوند عالم سے کوئی چیز مخفی نہیں رہ سکتی اس کا علم ہر شخص اور ہر مکان کو حاوی ہے، مصنف علام کا مقصد یہ ہے کہ اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم کو رابع اور سادس کہا گیا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ محض عدد تو ذاتِ خداوند عالم کو بھی لاحق ہو سکتا ہے جس عدد کا ذات پاک پروردگار کو لاحق ہونا محال ہے (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

واحد کی دوسری صورت جس کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی ذات پر جائز نہیں یہ ہے کہ واحد سے مراد جنس واحد ہو، جیسا کہ کہا جائے فلاں شخص آدمیوں میں سے ایک ہے یعنی جنس انسان بمعنی نوع[۱] انسان کا ایک فرد ہے اس معنی کے لحاظ سے بھی اللہ تعالیٰ کو واحد نہیں کہا جاسکتا کیونکہ اس سے خالق کو مخلوق کے ساتھ تشبیہ دینا لازم آتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ مخلوقات کی مشابہت سے بلند و بالا اور پاک و پاکیزہ ہے اور واحد کی وہ دوصورتیں جن کا اطلاق ذاتِ خداوند عالم پر صحیح ہے ان میں سے ایک تو ہے واحد بمعنی یکتا و یگانہ، کہ جس کی موجودات میں کوئی مثل اور شبیہ نہ ہو یعنی لاشریک اور بے مثال اور بے شک اس معنی کے لحاظ سے ہمارا خدا واحد ہے۔

واحد کی دوسری صورت جس کا اطلاق خدا کی ذات پر صحیح ہے، وہ ہے بسیط یعنی یہ کہ وہ واحد بایں معنی ہے کہ منقسم نہیں ہوسکتا، نہ وجودِ خارجی میں منقسم ہوسکتا ہے، نہ عقل میں اور نہ وہم میں۔ یہ ہے شان ہمارے پروردگار عز اسمہ کی۔

توحید کے دلائل عقلیہ

جاننا چاہئے کہ مقصد توحید عقل و نقل ہر دو قسم کے دلائل سے ثابت ہے۔

توحید کی پہلی عقلی دلیل:

پہلی دلیل عقلی کہ جو مشہور و معروف ہے نفی توحید سے اس کی ذات میں ترکیب کا لازم آنا ہے اور دوسری عقلی دلیل تمانع ہے۔ پہلی دلیل کا بیان یہ ہے کہ اگر حقیقت واجب الوجود فردِ واحد میں منحصر نہ ہو بلکہ اس کے متعدد افراد فرض کئے جائیں مثلاً دو فرض کئے جائیں تو لازم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک میں دو دو جزیں ہوں ایک ما بہ الاشتراک اور دوسری ما بہ

(بقیہ حاشیہ۔۱) اس کی صورت یہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک جیسے کئی خدا قرار دیئے جائیں اور ان کے شمار میں اللہ تعالیٰ کو بھی لایا جائے اور اس صورت کا محال ہونا ظاہر ہے کیونکہ شریک باری ناممکن ہے اور صورت مفروضہ میں اسے ممکن الوجود قرار دیا گیا ہے۔

[۱] جنس کی تفسیر نوع سے اس لئے فرمائی ہے کہ لفظ جنس سے مراد امیر المومنین علیہ السلام کے کلام میں جنس منطقی نہیں بلکہ جنس لغوی ہے۔ لفظ جنس کے کلامِ علماء میں دو معنی مراد ہوتے رہتے ہیں، ایک لغوی معنی اور وہ معنی یہ ہے جسے منطقی اصطلاحات کے لحاظ سے نوع کا مصداق قرار دیا جاسکتا ہے اور دوسرا معنی جنس کا منطقی ہے اور اس معنی کے لحاظ سے وہ نوع کی قسیم اور اس کے مباین ہے کیونکہ نوع اور جنس دونوں کلی کی اقسام خمسہ میں سے دو قسمیں ہیں۔ نوع اس کلی کو کہتے ہیں جو ایسی متعدد چیزوں پر بولی جاسکتی ہے جن کی حقیقت اور ماہیت ایک ہو اور وہ اپنے افراد کی عین حقیقت ہوتی ہے جیسے مثلاً انسان اور جنس اس کلی کو کہتے ہیں جو ایسی متعدد چیزوں پر بولی جاتی ہے جن کے حقائق مختلف ہوتے ہیں اور اپنے افراد کی حقیقت کا جز ہوتی ہے جیسے مثلاً حیوان، یہ گھوڑا، گائے، اونٹ اور انسان وغیرہ سب پر بولا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کی حقیقتیں مختلف ہیں اور حیوان ہر ایک کی حقیقت کا جز ہے۔ نوع اور جنس اپنے ان معانی کے اعتبار سے آپس میں متبائن ہیں لہٰذا اس لئے ان معانی کے لحاظ سے تو لفظ نوع جنس کی تفسیر نہیں ہوسکتا، لفظ نوع کا جنس کے لفظ پر عطف تفسیری نہیں کیا جاسکتا لیکن جنس کا لغوی معنی وہ ہوتا ہے جو اصطلاح منطق میں نوع کا ہوتا ہے اس لئے جنس کا یہاں لغوی معنی مراد ہے اور لفظ نوع کے منطقی معنی کے لحاظ سے مصنف نے نوع کا جنس پر عطف تفسیری واقع کیا ہے۔

الامتیاز کیونکہ اثنینیت یعنی دو ہونا یہ امتیاز کا مقتضیٰ ہے اور واجب الوجود میں دونوں کا اشتراک یہ تشارک کو چاہتا ہے اس سے واجب الوجود کے دونوں فردوں میں سے ہر ایک کا دو جزؤں سے مرکب ہونا لازم آئے گا حالانکہ واجب الوجود کی ذات کا مرکب ہونا محال ہے یہ دلیل ایک طولانی بحث کی محتاج ہے جو کہ کتب مبسوط میں اپنے نقض و ابرام کے ساتھ مذکور ہے اس مقام میں اسی قدر اس کا بیان ہم نے مناسب خیال نہیں کیا۔

توحید کی دوسری عقلی دلیل:

دلیل تمانع کا بیان یہ ہے کہ اگر فرض کیا جائے کہ "واجب الوجود" دو ہیں تو ان میں سے ایک کے کسی چیز کو پیدا کرنے کے ارادہ کے وقت دوسرا اسے مانع ہو سکے گا یا نہیں۔ اگر مانع ہوسکتا ہو تو پہلے کا عاجز ہونا لازم آئے گا جو کہ اس کے مرتبہ الوہیت و شان واجب الوجود کے منافی ہے اور اگر مانع نہ ہو سکے تو اس دوسرے کا عاجز ہونا لازم آئے گا لہٰذا وہ مرتبہ الوہیت سے ساقط ہو جائے گا اور اگر کہا جائے کہ دونوں کی مراد واقع ہو جائے گی تو یہ بھی محال ہے کیونکہ اس سے اجتماع نقیضین لازم آتا ہے اور گویا کہ آیت کریمہ:

لَوْ کَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (سورۃ الانبیاء، آیت: ۲۲)

اسی مطلب کی طرف اشارہ ہے کہ اگر زمین آسمان میں کئی خدا ہوتے تو وہ فاسد اور برباد ہو چکے ہوتے۔

علامہ طبرسیؒ نے اس آیت سے یہی معنی مراد ہونے کی تصریح کی ہے لیکن اخوند علیہ الرحمہ نے اس آیت کو اس کے ظاہری معنی پر محمول فرمایا ہے۔

حق الیقین میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ہدایت عقل کے ذریعہ معلوم ہے کہ عالم وجود کا نظم اور موجود کے حالات کا انتظام وحدت معبود کے بغیر میسر نہیں ہوسکتا جبکہ ایک گھر میں دو سردار، ایک شہر میں دو حاکم اور ایک سلطنت میں دو بادشاہ ان کے اوضاع اور حالات کو مختل اور فاسد کر دینے کا باعث ہوتے ہیں تو پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ آسمانوں، زمینوں اور کارخانہ عالم دنیا کی اس وسعت کے باوجود دو خداؤں کے ذریعہ یہ ساری مخلوقات انتظام پذیر ہو کر باقی رہے اور گو کہ اس تقریر کی صحت اور درستی اختلاف طبائع پر مبنی اور موقوف ہے نیز باہمی موافقت اور مصلحت کی رعایت کے احتمال کی نفی بھی اس سے نہیں ہوسکتی لیکن اس سے مزعومہ کفار کا ابطال مقصود ہو سکے گا کیونکہ وہ مختلف طبائع رکھنے والے بہت سے خداؤں کا ادعاء کرتے تھے حالانکہ اختلاف رائے اختلاف طبائع کے لوازم میں سے ہے اور دوسری شقوں کا ابطال دوسرے دلائل سے وابستہ ہے جو اپنے مقام میں واضح کر دیئے گئے ہیں جیسے کہ بعض علماء نے تقریر فرمائی ہے کہ اگر دو خدا فرض کئے جائیں تو لامحالہ علم و قدرت و ارادہ وغیرہ صفاتِ الوہیت سے متصف ہوں گے لہٰذا جب وہ دونوں ایک وقت میں کسی مقدور معین کے ایجاد اور پیدا کرنے کا قصد کریں گے تو معاملہ دو حال سے خالی نہ ہوگا کیونکہ یا وہ دونوں

اس مخلوق کے لئے مستقل علتیں ہوں گی یا شق اول میں مستقل علتوں کا تعدد اور توارد لازم آتا ہے حالانکہ وہ باطل ہے کیونکہ جب ان میں ہر ایک علت مستقلہ ہے تو پھر اس چیز کے وجود کے لئے صرف یہی علت مستقلہ کافی ہوگی لہٰذا دوسری علت کا لغو ہونا لازم آئے گا کیونکہ تحصیلِ حاصل محال ہے نیز جب وہ مخلوق صرف ایک علت کے ذریعہ وقوع پذیر ہوسکتی ہوتو پھر ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے اور وہ بھی محال ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام[1] کے متعلق منقول ہے کہ آپ نے ایک زندیق کے جواب میں فرمایا تھا کہ تیرا یہ قول کہ خدا دو ہیں باطل ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر دو خدا ہوں تو واقعہ تین حالتوں سے خالی نہیں ہوسکتا۔ ایک یہ کہ وہ دونوں قدیم اور صاحب قوت ہوں، دوسرے یہ کہ وہ دونوں ضعیف اور کمزور ہوں، تیسرے یہ کہ ان میں سے کوئی قوی ہو اور دوسرا ضعیف حالانکہ تینوں صورتیں باطل ہیں کیونکہ اگر فرض کیا جائے کہ دونوں قوی ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک انفرادی طور پر تدبیر عالم کوانجام کیوں نہیں دیتا اور دوسرے کو ہٹا کیوں نہیں دیتا کیونکہ قوت کا تقاضا تو یہی ہے کہ دوسرے کو ہٹا کر خود منفرد بالتدبیر ہو جائے اور اگر تیرا گمان ہو کہ ایک قوی ہے اور دوسرا کمزور تو ثابت ہو جائے گا کہ جو قوی ہے خدا صرف وہی ہے اور جو کمزور ہے وہ اپنے اس عجز کی وجہ سے خدا نہیں ہوسکتا جو اس سے ظاہر ہوا ہے اور اس سے واضح ہو گیا کہ دونوں کے کمزور ہونے کی صورت میں ایک بھی خدا نہیں ہوسکتا۔ شق اول میں حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ ایک قوی دوسرے کو ہٹا کیوں نہیں دیتا یہ دلیل تمانع یا ترجیح بلا مرجح کی طرف اشارہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کو دفع کر دینے اور ہٹا دینے پر قادر نہیں ہے تو دونوں کا عاجز ہونا لازم آتا ہے جو شانِ خداوندی کے منافی ہے اور اگر دوسرے کے دفعیہ پر قادر ہو مگر ایک دوسرے کو دفع نہ کرے تو پھر معاملہ دو حال سے خالی نہیں کیونکہ یا تو معاملہ کو اس نے دوسرے کے ذمہ اپنے اختیار سے چھوڑا ہوگا تو اس سے ترجیح بلا مرجح لازم آتی ہے یا یہ صورت مستلزم تعطل و استغناء ہو جائے گی لہٰذا ایک خود معطل اور بیکار ہو جائے گا حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ معطل اور اس کے فیض وجود کا دروازہ مغلق اور مسدود ہو جائے۔ بھلا کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس عظمت، قدرت اور جود کے باوجود معطل ہو کر رہ جائے اور کوئی اسکی ذات کی طرف محتاج نہ ہو۔

اگر کہا جائے کہ ہوسکتا ہے کہ دونوں خدا آپس میں اتفاق کرلیں اور باہمی موافقت کے ذریعہ کبھی یہ کام کرلے اور کبھی وہ کرے تاکہ دونوں کا معطل ہونا لازم نہ آئے تو ہم جواباً کہیں گے کہ تھک جانا، گھبرا جانا، خستہ اور ماندہ پڑ جانا خدا کے لئے ممکن نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ امور معین و مددگار کی طرف احتیاج لازم آنے کے موجب ہوتے ہیں اور راحت و آرام طلب کرنے کے باعث بنتے ہیں حالانکہ یہ سب کچھ شانِ خداوندی کے خلاف ہے لہٰذا عالم میں دو خداؤں کا وجود خدا کے بے فائدہ اور عبث و بیکار ہونے کے باعث بنتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات اس سے بلند بالا ہے۔

---

[1] اصول الکافی ج ۱، صفحہ: ۱۴۰، کتاب التوحید، باب حدوث العالم واثبات المحدث حدیث: ۵۔

لہٰذا کتاب توحید میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے جو کچھ منقول ہے وہ اسی مطلب پر محمول کیا جاتا ہے کہ حضرت علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ:

مَا الدَّلِیْلُ عَلٰی اَنَّ اللّٰہَ وَاحِدٌ؟

اس پر کیا دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ یکتا و یگانہ ہے؟

تو امام علیہ السلام نے فرمایا: اِتِّصَالُ التَّدْبِیْرِ وَ تَمَامُ الصُّنْعِ اس کی دلیل ہے، مسلسل اور دائمی تدبیر اور کارکردگی کا کمال جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: لَوْ کَانَ فِیْھِمَآ اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا.

کہ اگر زمین و آسمان میں کئی خدا ہوتے تو وہ فاسد ہو کر رہ جاتے۔

امیر المومنین امام المتقین علیہ السلام نے ایک اور طریقے سے اس مطلب پر استدلال اور احتجاج فرمایا ہے آپ نے حضرت امام حسن علیہ السلام کو جو وصیت فرمائی تھی اس میں آپ فرماتے ہیں کہ اے میرے فرزند: اگر تیرے پروردگار اللہ جل شانہ کا کوئی شریک یعنی کوئی دوسرا خدا ہوتا تو ضرور تیرے پاس اس کے بھی رسول تشریف لاتے اور اس کی بھی کتابیں نازل ہوتیں اور یقیناً آپ کو اس کی سلطنت اور اس کے ملک و مملکت کے آثار بھی نظر آتے اور اس کے صفات اور افعال کی پہچان اور معرفت بھی آپ کو حاصل ہو جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ دیگر کوئی خدا نہیں ہو سکتا صرف اللہ جل شانہ خدا ہے جو وحدہٗ لاشریک اور بے مثل و بے مثال ہے۔[1]

اخوندؒ فرماتے ہیں[2] کہ امیر المومنین علیہ السلام کا یہ فرمان ذیشان توحید پروردگار کے لئے برہان قاطع اور دلیل ساطع ہے کیونکہ واجب الوجود وہ ہو سکتا ہے جو ہر کمال پر قادر اور فیاض مطلق ہو اور جبکہ ایک خدا، ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اپنی معرفت اور عبادت کی تبلیغ کے لئے ارسال کر کے اپنی مخلوق کی راہنمائی کرتا ہے تو العیاذ باللہ اگر کوئی دوسرا خدا بھی ہوتا تو وہ بھی اپنی معرفت اور عبادت کی خاطر یقیناً کوئی پیغمبر تو ضرور بھیجتا۔ لہٰذا اگر فرض کیا جائے کہ کوئی اور خدا ہے تو یقیناً وہ یا قادر نہیں بلکہ عاجز ہے اور یا حکیم نہیں ہے جاہل ہے۔ ان میں سے کوئی صفت بھی واجب الوجود کے لئے جائز نہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دیگر کوئی خدا نہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔

اور یہ احتمال بالکل غلط اور بیکار ہے کہ ہو سکتا ہے کہ دو خدا ہوں اور ہر ایک ان میں سے الگ الگ عالم میں متصرف اور نافذ الامر ہو اور اس دوسرے کی خبر ہمارے اس عالم میں نہ پہنچی اور منتشر نہ ہوئی ہو اور اس کے پیغمبر اور سفیر اسی کے مملکت اور سلطنت سے مختص ہوں اور اس احتمال کے غلط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر خدا عالم، قادر، دانا، توانا اور حکیم ہوتا ہے۔ اگر احتمال مذکور کی کوئی حقیقت ہوتی تو کیسے ہو سکتا تھا کہ ایک علیم و قدیر اور حکیم خدا اپنے وجودِ ذی جود کو ممکنات سے

---

[1] نہج البلاغہ، ترجمہ مفتی جعفر حسین صاحب (اعلیٰ اللہ مقامہ)، صفحہ: ۶۶۹

[2] تفسیر صافی، صفحہ: ۵۰۲۔

مخفی رکھتا نیز یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ اللہ جل شانہ کہ جو حکیم وعلیم ہے وہ العیاذ باللہ دروغ گوئی اور جھوٹ سے کام لیتے ہوئے اپنے شریک، نظیر اور مثل کی نفی کے متعلق اس قدر مبالغہ اور زبردست اہتمام کرتا جو اہتمام اسلام میں کیا گیا ہے حالانکہ دروغ گوئی اور جھوٹ خدا کی ذات کے لئے روا اور ممکن نہیں،

ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ ۝ (سورہ ص، آیت: ۲۷)

ہرگز ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا، یہ کفار کی بیہودہ باتیں ہیں جن کے باعث وہ ملاعین جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

ان مباحث کی تفصیل نقضاً و ابراماً اکثر کتب کلامیہ میں مذکور ہیں جو شخص ان پر مطلع ہونے کی خواہش رکھتا ہو اسے ان کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ چونکہ مباحث دقیقہ کو حیطۂ تحریر میں لانا اس رسالہ کے لائق نہیں لہٰذا ہم نے ان کے تذکرہ سے پہلوتہی اختیار کی ہے۔

توحید کے دلائل نقلیہ

توحید کے ادلہ نقلیہ انتہائی واضح ہیں کیونکہ توحید نہ صرف آیات و روایات متواترہ کے ذریعہ ثابت ہے بلکہ تمام انبیاء کے اخبار کے ذریعہ اور تمام ادیان حقہ کے نزدیک ضرورۃً بداہۃً محقق اور ثابت ہے چنانچہ اللہ جل شانہ نے فرمایا:

وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (سورۃ ص، آیت: ۶۵)

کہ سوائے اللہ تعالیٰ کے جو یکتا و یگانہ اور ہر شئے پر غالب ہے کوئی لائق عبادت نہیں۔ نیز فرمایا:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ (سورۃ الدخان، آیت: ۸)

کہ سوائے ذات پاک پروردگار کے کوئی لائق عبادت نہیں، وہی زندگی اور موت دینے والا ہے، نیز فرمایا:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (سورۃ البقرہ، آیت: ۲۵۵)

اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی مستحق عبادت نہیں، وہ ازل سے زندہ اور ہمیشہ کے لئے قائم و دائم ہے۔

اور اس مقصد کے اثبات کے لئے صرف سورہ توحید ہی کافی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ (سورۃ الاخلاص)

حضرت صادق آل محمد امام جعفر صادق علیہ السلام[1] سے اس سورہ کے شان نزول کے متعلق مروی ہے کہ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ ہمیں اپنے پروردگار کے نسب سے آگاہ کیجئے تو اس وقت یہ سورہ نازل

---

[1] اصول الکافی، ج ۱، صفحہ: ۱۶۲، کتاب التوحید باب النسبۃ حدیث: ۱۔

ہوئی: قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ

کہ اے محمد مصطفیٰ: ان سے کہہ دیجئے کہ جس خدا کے متعلق تم سوال کرتے ہو وہ یکتا اور یگانہ ہے کوئی اس کا شریک نہیں ہے نہ ہوسکتا ہے،

اَللّٰهُ الصَّمَدُ

کہ وہ مرجع خلائق ہے ہر امر میں سب کے سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں، نیز وہ حوادث اور وصف انفعال کا محل نہیں ہوسکتا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام سے منقول ہے کہ لفظ حمد کی تفسیر اس سورہ کا تتمہ ہے،

لَمْ يَلِدْ

کسی کو اس نے جنا نہیں، لہٰذا کوئی اس سے پیدا نہیں ہوا، کفار مکہ جو کہتے تھے کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں یہ غلط محض ہے، چنانچہ اللہ جل شانہ نے ان کی تردید کے لئے فرمایا:

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِيْنَ (سورۃ الزخرف، آیت:۱۶)

کہ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں سے بیٹیوں کو اختیار کیا اور تم کو بیٹوں کے ساتھ مخصوص کیا کہ جو بیٹیوں کی نسبت زیادہ شرف والے ہوتے ہیں، لیکن ایسا کس طرح ہوسکتا ہے کہ خداوند عالم ادنیٰ چیز خود اختیار کرے اور اعلیٰ تم کو دے اور نصاریٰ نے جو کہا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا فرزند ہے نیز بعض یہود نے کہا کہ حضرت عزیر علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے یہ سب کچھ لغو اور غلط ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کے لئے فرمایا:

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (سورۃ التوبۃ، آیت:۳۰)

یہود نے کہا عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ نے کہا کہ حضرت عیسیٰ خدا کا فرزند ہے، یہ ان کا وہ قول ہے جو وہ اپنے منہ سے کہتے ہیں اور ان لوگوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں جو پہلے سے کفر اختیار کر چکے اللہ تعالیٰ انہیں تباہ کرے وہ کس طرح بہکے پھرتے ہیں۔

وَلَمْ يُوْلَدْ

اور نہ وہ کسی سے متولد ہوا، تا کہ اس کی طرف محتاج ہو اور لازم آئے کہ وہ ذات پاک ماں باپ رکھنے والی ہے اور نصاریٰ کے اعتقاد کے مطابق کہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کے قائل ہیں لازم آتا ہے کہ وہ اپنے غیر سے متولد ہوا اور والدہ رکھنے والا ہو، نعوذ باللہ من ذلك۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

کہ کوئی بھی اس کی مثال، شبیہ اور نظیر نہیں ہے، وہ اپنی ذات میں بھی اور صفات میں بھی کوئی شریک نہیں رکھتا۔

باطل فرقوں کی تردید

جاننا چاہئے کہ توحید کے اس صحیح اور اظہر من الشمس عقیدہ میں چند باطل فرقوں نے مخالفت اختیار کی ہے پہلا فرقہ ثنویہ، مانویہ اور دیگر مجوس ہیں کیونکہ ثنویہ، مانویہ اپنے زعم باطل کے لحاظ سے دو اصل ازلی اور قدیم ثابت کرتے ہیں ایک نور اور دوسرے ظلمت، ان کا گمان ہے کہ یہ دونوں ازلی ہیں اور مجوسی دونوں کو ازلی نہیں کہتے بلکہ نور کو ازلی اور تاریکی کو حادث جانتے ہیں اور اس کے حدوث کے سبب کے متعلق ان میں اختلاف ہے اور مجوس کا ایک شعبہ کیومرثیہ کہلاتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یزدان قدیم ہے اور اس سے مراد نور ہے اور اہرمن حادث اور مخلوق ہے اور اس سے مراد ظلمت و تاریکی ہے۔ ظلمت کی خلقت کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ یزدان نے ایک مرتبہ فکر و اندیشہ کیا کہ اگر کوئی اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا کرے تو وہ کیسے ہوگا۔ یہ ناقص اور ردی فکر تھی جو طبیعتِ نور کے شایان شان نہ تھی لہٰذا اس فکر سے ظلمت پیدا ہوئی اور اس کا نام اہرمن رکھا گیا اور چونکہ ظلمت کی طبیعت میں شر و فتنہ داخل تھا اس لئے اس نے طبیعت میں بھی اور قول و کلام میں بھی نور کی مخالفت کی اور نور پر چڑھائی کر دی چنانچہ لشکر ظلمت اور لشکر نور کے درمیان جنگ واقع ہوئی۔ بالآخر فرشتوں نے ان کے درمیان اس صورت پر مصالحت کرائی کہ سات ہزار سال تک عالم سفلی اہرمن کے ہاتھ میں رہے گا اور اس کے بعد یزدان یعنی نور کے قبضہ میں دے دیا جائے گا۔ اہرمن نے اس کے بعد ان سب کو قتل کر دیا جو اس مصالحت سے پہلے موجود تھے اور کیومرث نامی ایک شخص کو پیدا کر دیا۔

زردشتی بھی مجوس کی ایک صنف ہے وہ اعتراف کرتے ہیں کہ نور اور ظلمت دونوں خدائے وحدہ لاشریک کی مخلوق ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ عالم دنیا نور و ظلمت دونوں کے باہمی امتزاج اور اختلاط سے پیدا ہوا ہے ان کا گمان ہے ساری کائنات ان دو کی طرف منسوب ہے یزدان سے خیر و خوشی پیدا ہوتی ہے اور اہرمن سے شر اور فساد صادر ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ نور اصل ہے اور ظلمت نور کے تابع ہونے میں بمنزل سائے کے وجود کے ہے اس کی طبیعت کے باعث اس کا سایہ پیدا ہوگیا۔ یہ لوگ کیومرث کو پہلا پیغمبر جانتے ہیں۔

مجوس کے بہت کچھ شعبے ہیں جو بے شمار واہی اقوال رکھتے ہیں اور اکثر ان میں سے آتش پرست ہیں، ان کو گبر کہتے ہیں۔ حدیث میں وارد ہوا ہے:

المجوس كان لهم نبي فقتلوه و كتاب فمزقوه،

مجوس کا ایک نبی تھا جسے انہوں نے قتل کر دیا اور ان کی طرف آسمانی کتاب بھی نازل ہوئی تھی جسے انہوں نے پھاڑ ڈالا۔

(۱) ثنویہ کی تردید:

فرقہ ثنویہ کے ردّ کیلئے اللہ جل شانہ کا فرمان کافی ہے:

وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ (سورۃ الانعام، آیت:۱)

کہ اللہ تعالیٰ نے ہر تاریکی اور نور کو پیدا فرمایا،

یہ دونوں خدا کی مخلوق ہیں، خالق اور مدبر نہیں ہیں۔ بعض لوگوں نے ثنویہ کے قول کی دلیل کی ہے کہ نور سے مراد صورت ہے کہ جو کمال ہے اور فعلیت کا درجہ رکھتی ہے اور تاریکی سے مراد مادہ ہے جو کہ ہر شر کا مبداء ہے مگر یہ تاویل قولِ ثنویہ کی وہ تاویل ہے جس پر خود ثنویہ راضی نہیں۔ لہٰذا یہ تاویل غلط اور بے جا ہے۔ بہر حال جو لوگ مادہ اور صورت کو قدیم جانتے ہیں جیسے مثلاً حکماء فلاسفہ تو ان لوگوں نے بھی "وادی" شرک سے باہر قدم نہیں رکھا مثل ثنویہ فلاسفہ بھی بیابانِ شرک میں ہی سرگرداں ہیں لہٰذا ثنویہ کی مراد نور اور ظلمت سے جو بھی ہو بہر حال اہل دین وار بابِ ملت اسلامیہ کے عقیدہ کے منافی ہے۔

حضرت مولانا طبرسیؒ نے اپنی کتاب احتجاج[1] میں تحریر کیا ہے کہ آنحضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ثنویہ پر احتجاج قائم کیا کہ کیا چیز تمہارے لئے اس کا باعث ہوئی کہ تم نے دو خدا قرار دیئے تو کہنے لگے کہ ہم نے عالم دنیا کو دو قسموں پر پایا ایک قسم خیر ہے اور دوسری شر، اور خیر شر کی ضد ہے۔ لہٰذا ہم اس کے قائل ہو گئے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک اپنا جداگانہ فاعل اور علیحدہ خالق رکھتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ برف سے گرمی کے اثر کا ظاہر ہونا محال ہے جیسے کہ آگ سے سردی کے اثر کا ظہور ناممکن ہے۔ لہٰذا اس وجہ سے ہم دو ایسے خالقوں کے قائل ہوئے جو کہ قدیم ہیں، ایک ظلمت کے لئے اور دوسرا نور کے لئے۔

آنحضرت جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اسی عالم دنیا میں سیاہی، سفیدی، سرخی، زردی، سبزی اور کبودی یعنی "نیلے رنگ" کو نہیں پاتے ہو، کیا یہ متضاد رنگ اسی عالم میں موجود نہیں ہیں، ہر ایک ان میں سے دوسرے کی ضد ہے کیونکہ ان میں سے دو رنگ بیک وقت محل واحد میں جمع نہیں ہو سکتے، ثنویہ نے کہا کہ بے شک یہ متضاد رنگ دنیا میں موجود ہیں، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم نے ان رنگوں میں سے ہر رنگ کے لئے ایک جداگانہ اور علیحدہ خالق کیوں نہ قرار دیا تاکہ تم اتنی تعداد میں خداؤں کے قائل ہو جاتے جتنی تعداد میں یہ رنگ موجود ہیں؟ کیسے تم نے یہ جائز قرار دیا کہ ان اضدادِ کثیرہ میں سے دو ضدیں ایک فاعل سے ظہور پذیر ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ کلام حق ترجمان سن کر ثنویہ نے اپنے لب و دہن پر مہر سکوت لگا دی اور بحر شرمندگی میں غوطہ زن ہو گئے۔

---

[1] الاحتجاج للطبرسی، صفحہ:۱۰۔

(۲) فرقہ وثنیہ کا رد:

باطل فرقوں میں سے دوسرا باطل فرقہ وثنیہ یعنی بت پرست ہیں۔ یہ عبادت اور سجدہ میں معبود حقیقی اللہ جل شانہ کے غیر کو شریک کرتے ہیں اور بتوں کو اپنا معبود قرار دیتے ہیں بلکہ یہ انہیں اپنی جائے امید اور حاجت روائی کی جگہ خیال کرتے اور ان کے متعلق توقع رکھتے ہیں کہ یہ بت نفع پہنچا سکتے اور خوف رکھتے ہیں کہ یہ نقصان اور ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ بعض آفتاب اور دیگر ستاروں کی پوجا کرتے ہیں۔ بعض آگ کی پرستش کرتے اور بعض پانی کی اور اکثر ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں جن کو وہ اپنے ہاتھوں سے تراش کر بناتے ہیں۔ احتجاج طبرسیؒ[۱] میں مروی ہے کہ

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیه و آله وسلم): آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ، وَ كَفَرْتُ [بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ] بِكُلِّ مَعْبُوْدٍ سِوَاهُ.

کہ میں اللہ جل شانہ پر ایمان لایا ہوں کہ جو یکتا و یگانہ اور بے مثل و بے مثال ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا اور جبت اور دیگر ہر اُس معبود سے میں انکاری ہوں کہ جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ لوگوں نے بنا لئے ہیں۔

حدیث میں وارد ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا آذر بت تراشا کرتا تھا چنانچہ وہ بت تیار کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیتا کہ ان کو جا کر فروخت کر آئیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اگر چہ بچے تھے مگر وہ بت پرستی سے انکاری تھے۔ چنانچہ وہ بت کے گلے میں رسی باندھ لیتے اور از روئے اہانت ان کو زمین پر گھسیٹتے ہوئے لے چلتے اور پانی کیچڑ اور تلچھٹ وغیرہ میں داخل کر کے ان سے کہتے کھاؤ، پیو، ارے بات کرو، جواب دو کہ کھاتے کیوں نہیں، پیتے کیوں نہیں اور لوگوں میں یوں اعلان کرتے پھرتے کہ کون ہے جو ایسی چیز کو خرید کرے جو اسے نفع تو نہیں پہنچا سکتی لیکن ضرر اور نقصان پہنچا دے گی اور ایسا کہنے سے ان کا مقصد لوگوں کو یہ راہنمائی کرنا ہوتا تھا کہ ایسی چیز خرید کرنے کے لائق نہیں چہ جائیکہ وہ پرستش اور عبادت کرنے کے لائق ہو۔ احتجاج طبرسیؒ[۲] میں منقول ہے کہ جب مشرکین عرب آنحضرت جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مجادلہ اور جھگڑا کرنے کے لئے حاضر ہوئے تھے تو حضرتؐ نے فرمایا کہ تم ان بتوں کی پرستش کیوں کرتے ہو جن کو خود اپنے ہاتھوں سے تراش کر بناتے ہو تو کہنے لگے اس لئے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں کہ یہ اس کے باعث درگاہِ پروردگار میں ہمارے تقرب کا واسطہ اور وسیلہ بنیں۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ کیا یہ بت کہ جو اَز قبیلِ جمادات ہیں ان کو فہم و دانش اور عقل و شعور ہی حاصل نہیں تو کیا یہ بھی حکم ربی کی اطاعت کرنے والے ہو سکتے اور عبادت خدا بجالانے کے باعث درگاہ یزدانی کے مقرب شمار ہو سکتے ہیں کہ تم ان کی تعظیم کو اللہ جل شانہ کے قرب کا وسیلہ خیال

---

[۱] الاحتجاج للطبرسی، صفحہ:۸۔

[۲] الاحتجاج للطبرسی، صفحہ:۱۰۔

کرتے ہو؟ تو وہ عرض گزار ہوئے کہ نہ ایسا تو بتوں سے صادر ہونا ہی ممکن نہیں تو حضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ چاہئے تو یہ تھا کہ بت تمہاری عبادت اور تمہاری پرستش کرتے بشرطیکہ ان کے لئے یہ ممکن ہوتا کیونکہ تم نے اپنے ہاتھوں سے ان کو تراش کر بنایا ہے نہ یہ کہ الٹا تم ان کی عبادت کرو۔ پھر یہ کہ خدا نے ان بتوں کی عبادت کرنے کا حکم نہیں دیا حالانکہ وہ تمہارے تمام امور کے انجامات اور مصالح کا علم رکھنے والا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے اس رازِ حکمت کلام کو جب مشرکین عرب نے سنا تو ان میں اختلاف واقع ہو گیا بعض نے تو کہا کہ مخلوق خدا میں سے بعض افراد اللہ تعالیٰ کے مقرب تھے، خدا ان میں حلول کر آیا تھا لہٰذا ہم ان کی تصویریں بناتے اور ان کی تعظیم کرتے ہیں تاکہ اس کے ضمن میں ان بزرگواروں کی تعظیم ہم سے صادر ہو جائے۔ بعض نے کہا کہ یہ تصویریں ہیں۔ "ہم ان تصویروں کی نہیں" ان مقربین کی تعظیم بجالاتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے سجدہ پر مامور کیا تھا تو ملائکہ نے تو یہ شرف حاصل کیا لیکن ہم اس شرف سے محروم رہ گئے لہٰذا ہم حضرت آدم علیہ السلام کی تصویر بنا کر اسے سجدہ کرتے ہیں تاکہ ہم اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا اسی طرح تقرب حاصل کریں جس طرح کہ ملائکہ نے حضرت آدم علیہ السلام کے سجدہ کے ذریعہ تقرب حاصل کیا تھا اور اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بقول آپ کے آپ کو مکہ میں کعبہ معظّمہ کی جانب رخ کر کے سجدہ کرنے پر مامور کیا تھا لیکن تم نے مکہ کے علاوہ دیگر ہر مقام میں بھی ان مسجدوں، محرابوں میں بھی سجدہ کرنا شروع کر دیا جو تم لوگ اپنے ہاتھوں سے بناتے ہو اور اس تعظیم اور سجدہ سے اصل کعبہ کی تعظیم کا قصد بلکہ معبودِ حقیقی کی تعظیم کا قصد پیش نظر رکھتے ہو۔

آنحضرت ﷺ نے ان تمام گروہوں کے استدلالات کا ایک ایک کر کے بطریق احسن جواب دیا حضرت ﷺ کے کلام عالی مقام کا ماحصل یہ ہے کہ پہلے گروہ کے جواب میں حضرت ﷺ نے استحالہ حلول کو بیان فرمایا اور وضاحت فرمائی کہ کسی چیز میں حلول کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے ناممکن اور محال ہے کیونکہ حلول کرنا تو صرف جسم کے عوارض میں سے ہے، جیسے مثلاً رنگ، بو، ذائقہ، نرم ہونا، سخت اور کھردار ہونا، وزنی اور بھاری ہونا، ہلکا اور خفیف ہونا وغیرہ اور اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالا ہے کہ اسے اپنے مخلوقات سے مشابہت[1] حاصل ہو ورنہ اس کا بھی ایسے حادث ہونا لازم آئے گا

---

[1] اس سے معلوم ہوا کہ ذاتِ خداوند عالم کا بھی کسی چیز میں حلول کرنا محال ہے اور اس کے صفات کا حلول بھی محال ہے کیونکہ اس کے صفات عین ذات ہیں، وہ صفات انضمامیہ کی قسم سے نہیں بلکہ صفات انتزاعیہ کی قسم ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی قدرت کسی چیز میں اس طرح حال نہیں ہو سکتی جس طرح برتن کے پانی میں اس کے نیچے جلنے والی آگ کی گرمی حال ہو کہ پانی کو گرم کر دیتی ہے اور رومال میں رکھے ہوئے پھولوں کی خوشبو رومال میں حل ہو جانے کے باعث اسے خوشبودار کر دیتی ہے کیونکہ اگر صفات باری تعالیٰ کسی چیز میں حال ہوں تو ان کا بو، رنگ وغیرہ کی طرح حادث ہونا لازم آئے گا حالانکہ وہ حادث نہیں ہیں کیونکہ اس کے صفات مخلوق کی صفات سے مشابہت نہیں رکھتے ویسے عالم کی ہر شئے اور کائنات کا ہر ذرہ اس کی صفات کا مظہر ہے لیکن اس کا یہ معنی ہے کہ ہر شئے اس کی صفات کمال پر دلالت کرتی اور اس کے علم و قدرت کی دلیل ہے۔ اس کا یہ معنی نہیں کہ اس کے صفات کسی چیز میں حلول کر جاتے ہیں اور اس طرح وہ شئے اس کے صفات کا مظہر بنتی ہے۔

جیسے کہ مخلوقات حادث ہے اور خالق ومخلوق میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا اور جبکہ اصل حلول ہی باطل ہے تو اس کی فروع بھی یقیناً باطل ہیں۔

دوسرے فرقہ کے جواب میں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم نے بندگانِ خدا میں سے ایک بندے کی صورت کے سامنے اپنی جبینِ نازک مذلت پر رکھ دی تو اس شہنشاہ حقیقی کی تعظیم واجلال کے لئے آپ نے کون سا طریقہ باقی چھوڑا جو مالک الملک اور محسن کل اور ہر شئے کا پیدا کرنے والا ہے۔ کیا تم اس قدر بھی تمیز اور دانش نہیں رکھتے کہ خالق کو مخلوق اور مالک کو مملوک کے ساتھ تعظیم کے طور طریقہ میں مساوی اور برابر نہیں رکھا جا سکتا۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک عظیم الشان اور جلیل القدر بادشاہ ہو اور اس کا ایک غلام ہو اور تم جو اس کی رعایا ہو ان دونوں کی تعظیم یکساں اور مساوی طور پر بجالاؤ، اگر تم ایسا کرو گے تو کیا اپنے آقا کی تعظیم کا فریضہ انجام دینے میں کوتاہی نہ کرو گے؟

اور اس کے شان عالی کے اظہار میں کمی واقع نہ کر بیٹھو گے؟ بے شک یہ طریقہ اختیار کرنا اس ملک دیان محسن حقیقی کے شان میں کوتاہی اور اس کا استخفاف اور توہین ہے۔

تیسرے فرقہ کے جواب میں[1] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پرنور نے ارشاد فرمایا کہ تم نے قیاس باطل کے ذریعہ اپنے اور ہمارے حال کو برابر قرار دے دیا ہے حالانکہ یہ قیاس مع الفارق ہے کیونکہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اپنے پروردگار کے حکم اور اس کے امر سے کرتے ہیں، اپنے دل سے کوئی من گھڑت طریقہ تیار نہیں کر لیتے۔ ہم اپنے خالق کو سجدہ کرتے ہیں اور اپنا رخ اسی طرف کرتے ہیں جس طرف کا وہ حکم کرتا ہے اور اسی طور وطریقہ پر عمل کرتے ہیں جس کا وہ امر کرتا ہے۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ کعبہ کی طرف سجدہ کرو تو ہم نے اس کے حکم کی اطاعت اور تعمیل کی اور اس نے حکم فرمایا کہ دیگر علاقہ جات میں مسجدیں اور محراب بنا کر ان میں بسوئے کعبہ رخ کر کے سجدہ کیا کرو تو ہم اس کا حکم بجالائے۔ ہم نے کسی چیز کو اپنی طرف سے اختراع اور ایجاد نہیں کیا ہے۔ خداوند عالم نے فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا، اس کی مورتی اور اس کی صورت بنا کر اس کی طرف سجدہ کرنے کا حکم تو خدا نے نہیں دیا تھا۔ لہٰذا قیاس[2] فاسد کے ذریعہ اس کی مورتی اور صورت کو تم نے کیوں اپنا مسجود بنا لیا۔ کیا اگر کوئی شخص تمہیں اذن دے کہ فلاں مکان میں فلاں

---

[1] الاحتجاج للطبرسی، صفحہ: ۱۱۔

[2] اس سے معلوم ہوا کسی بزرگ، نبی، ولی یا امام وپیشوا کو سجدہ کرنا بھی جائز نہیں اور کسی بزرگ کے مزار یا دیگر کسی متبرک مقام کو بھی سجدہ کرنا جائز نہیں کیونکہ سجدہ اسی چیز کی طرف جائز ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہو اور خدا نے ہمیں صرف کعبہ کی طرف رخ کر کے سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ لہٰذا ہم کعبہ کو قبلہ بنا سکتے ہیں۔ دیگر کسی چیز کو کعبہ پر قیاس کر کے قبلہ نہیں بنا سکتے۔ علیٰ ھذا القیاس حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ کرنے کا فرشتوں کو حکم ہوا تھا ہمیں نہیں ہوا کہ ہم اب حضرت آدم علیہ السلام کی مورتی یا ان کی قبر کو قبلہ بنائیں یا کسی دیگر بزرگ، نبی یا امام یا ولی کی مورتی یا ان کے مزار کو قبلہ قرار دیں۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو یہ قیاس مع الفارق اور ان بت پرست کفار کی اقتداء ہوگی جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس قیاس باطل سے روکا تھا بلکہ شخص مذکور ان کفار سے بدتر ہوگا کیونکہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان تعلیمات پر مطلع ہونے کے باوجود اپنی ضد پر اصرار ہے۔

روز تم داخل ہو جاؤ تو کیا ایسا جائز ہوسکتا ہے کہ اسی مکان میں تم کسی اور دن کو داخل ہونے کی جرأت کرو، یا اس کے کسی اور مکان میں داخل ہو جاؤ جس مکان میں داخل ہونے کی اس نے اجازت نہیں دی، یا کوئی شخص تمہیں کوئی چیز مثلاً کپڑا، گھوڑا یا غلام عطا کرے تو کیا تمہارے لئے یہ جائز ہوسکتا ہے کہ تم اس معین شئے کے بدلے اس کے مال میں سے اس کی مثل کوئی دوسری شئے اٹھالو۔

انہوں نے عرض کیا کہ ایسا تو نہیں کیا جا سکتا، تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پھر یہ بتایئے کہ خداوند عالم اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس کے ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف نہ کیا جائے یا اس کی مخلوق اس امر کی زیادہ حقدار ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پھر تم کیوں چند مورتیوں کو سجدہ کرتے ہو؟ خدا نے کب تمہیں ان کے سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے؟ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ کلام بلاغت نظام سن کر سب خاموش ہو گئے۔ پھر کہا کہ اس کے جواب کے لئے ہم مہلت چاہتے ہیں مگر چند دنوں کے بعد وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئے اور مشرف بہ ایمان ہو گئے۔

(۳) فرقہ نصاریٰ کی تردید:

تیسرا باطل فرقہ نصاریٰ ہیں جو تین خداؤں کے قائل ہیں، ایک اللہ تعالیٰ کہ جسے وہ باپ کا نام دیتے ہیں، دوسرے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہ اسے خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں، تیسرے روح القدس اور بعض جگہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا، مریمؑ اور عیسیٰ علیہ السلام ان تینوں کو خدا جانتے ہیں اور ان دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی وہ اختیار کریں بہر صورت وہ باوجود اس کے اپنے آپ کو موحد شمار کرتے ہیں وہ متضاد عقائد اور متناقض کلمات کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ اس جہت سے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا جانتے ہیں وہ عیسیٰ علیہ السلام کے قدیم ہونے کے قائل ہو جاتے ہیں اور اس لحاظ سے کہ وہ ان کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہیں وہ ان کے حادث ہونے کے قائل بنتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [1] نے نصاریٰ کے جواب میں فرمایا تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ قدیم خدا حادث ہو گیا ہے تو تم ایک امر محال کے قائل ہو گئے ہو کیونکہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ قدیم حادث ہو جائے؟ اور اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ حادث یعنی عیسیٰ علیہ السلام قدیم بن گئے تو یہ بھی محال ہے کہ حادث قدیم بن جائے نیز اسی طرح تثلیث میں توحید اور توحید میں تثلیث والا عقیدہ بھی ان کا متناقض اور متضاد ہے جس کا بطلان کسی عقلمند پر مخفی نہیں ہے کیونکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو شخص تین خداؤں کا قائل ہو وہ خدا کو واحد اور یکتا جانتا ہو اور اس طرح جو صرف ایک خدا کا قائل ہو وہ تین خداؤں کا اعتقاد کیسے رکھ سکتا ہے، ارشادِ قدرت ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ (سورۃ النساء، آیت:۱۷۱)

یعنی اے اہل کتاب یہ مت کہو کہ خدا تین ہیں، اس قول باطل سے باز آ جاؤ اور اس اعتقاد کو اختیار کرو جو تمہارے لئے بہتر ہے، سوائے اس کے نہیں کہ اللہ جل شانہ ہی لائق پرستش اور مستحق عبادت ہے جو کہ یکتا و یگانہ اور وحدہٗ لا شریک ہے اور اس کی ذات اس سے پاک اور بلند و بالا ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔

بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ نجران کے نصاریٰ جب سید انس و جان آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں مناظرہ کرنے کے لئے حاضر ہوئے تو عرض کیا کہ ہم نے انجیل میں اس نبی کے متعلق کہ جو عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے گا، یہ لکھا ہوا دیکھا ہے کہ وہ نبی آخر الزمان ہوگا جو عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کرے گا اور آپ ان کو برا کہتے ہیں اور ان کے حق میں دشنام دہی سے کام لیتے ہیں کیونکہ وہ خدا ہے اور خدا کا بیٹا ہے، آپ اسے بندہ قرار دیتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو برا نہیں کہتا اور ان کے حق میں دشنام طرازی نہیں کرتا۔ میں عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کی تصدیق کرتا ہوں لیکن میں کہتا ہوں کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا رسول اور خدا کا بندہ تھا۔ وہ بذات خود اپنے نفع[1] نقصان، حیات و موت اور مرنے کے بعد پھر قبر سے زندہ ہونے پر قادر نہ تھا۔ نصاریٰ نے بزعم خود عیسیٰ علیہ السلام کے خدا ہونے پر استدلال کرتے ہوئے کہا کہ کیا کسی بندے سے وہ کام ہو سکتے ہیں جو عیسیٰ علیہ السلام سے ظہور پذیر ہوئے۔ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے، نابینوں کو بینائی عطا کرتے تھے، مبروص کو شفا دے دیتے تھے، امور غیب کی خبریں دیتے تھے اور یہ وہ کام ہیں جو یا خدا سے ہو سکتے ہیں یا خدا کے بیٹے سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ معجزات جو تم نے ذکر کئے ہیں بے شک برادرم عیسیٰ علیہ السلام اس خدا کی قدرت[2] اور اذن سے ظاہر فرماتے اور عمل میں لاتے تھے جو یکتا و

---

(۱) نفع نقصان سے مراد وہ امور ہیں جو انسان کی قدرت سے باہر ہوتے ہیں مثلاً تندرست ہونا، بیمار ہونا وغیرہ۔

(۲) خدا کی قدرت اور اذن کے لفظ سے معلوم ہوا کہ معجزہ معجز نما کی قدرت سے نہیں، خدا کی قدرت سے واقع ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ معجز نما کا نہیں خدا کا فعل ہوتا ہے جسے وہ اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت معجز نما کے ہاتھ پر ظاہر فرماتا ہے جس سے جہاں معجز نما کے دعویٰ نبوت یا امامت کی تصدیق ہوتی ہے وہاں معجز نما کی شان کی عظمت اور بلندی پر بھی دلالت ہوتی ہے اور معجزہ کے قدرت خدا کے ذریعہ واقع ہونے اور فعل خدا ہونے پر بکثرت آیات قرآنیہ اور احادیث معصومین علیہم السلام دلالت کرتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد قدرت ہے: وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يَا مُوسَىٰ ﴿١٧﴾ قَالَ هِيَ عَصَايَ أَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلَىٰ غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَآرِبُ أُخْرَىٰ ﴿١٨﴾ قَالَ أَلْقِهَا يَا مُوسَىٰ ﴿١٩﴾ فَأَلْقَاهَا فَإِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعَىٰ ﴿٢٠﴾ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ ﴿٢١﴾ (سورہ طٰہٰ، آیت: ۱۷ تا ۲۱) اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا فرمایا تھا کہ ان کی لاٹھی اژدھا بن جاتی تھی اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا ہے کہ آواز قدرت آئی کہ "اے موسیٰ! تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا چیز ہے؟ حضرت موسیٰ نے فرمایا یہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر سہارا لے کر چلتا ہوں اور اس کے ذریعہ اپنی بکریوں کے لئے درختوں کے پتے جھاڑتا ہوں اور اس سے میری دیگر ضرورتیں بھی وابستہ ہوتی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! اسے زمین پر پھینک دو چنانچہ حضرت موسیٰ نے وہ لاٹھی زمین پر پھینک دی تو اچانک وہ ایسا سانپ بن گیا جو زمین پر دوڑ رہا تھا۔ خداوند عالم نے فرمایا کہ اے موسیٰ! اسے پکڑ لو اور ڈرو مت، ہم اسے عنقریب اس کی پہلی شکل پر لوٹا دیں گے۔" ان آیات میں متعدد الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ لاٹھی کا سانپ بن جانا موسیٰ علیہ السلام کی قدرت سے نہ تھا بلکہ وہ قدرت خدا کا کرشمہ تھا۔ پہلا لفظ "اذا" فجائیہ ہے جو کسی چیز کے ناگہانی اور غیر متوقع صورت میں واقع ہونے پر دلالت کرتا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

یگانہ اور بے مثل و بے مثال ہے جیسے دیگر انبیا بھی اپنے معجزات خداوند عالم کی قدرت اور اذن سے عمل میں لاتے تھے مگر باوجود اس کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کا مطیع اور فرمانبردار بندہ تھا اور وہ اس چیز کو اپنے لئے عیب اور عار کا باعث نہیں سمجھتے تھے۔ اور بے شک عیسیٰ علیہ السلام ایسا جسم رکھتے تھے جو گوشت، پوست اور خون ہڈیوں وغیرہ سے مرکب تھا۔ انہیں بھوک لگتی تھی، تکان لاحق ہوتی تھی، کوئی نہ کوئی چیز کھانے کی انہیں احتیاج ہوتی تھی لیکن خداوند عالم ان سب صفات سے پاک، مبرا و منزہ ہے، لیس کمثلہ شیء۔

بعض روایات میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے اس مناظرہ میں منقول ہے جو حضرتؑ نے جاثلیق نصرانی سے کیا تھا آپ نے فرمایا: اے نصرانی! قسم بخدا ہم اس عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے قائل ہیں جو آنحضرت نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرنے والے تھے اور تمہارے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں ہم سوائے اس کے اور کوئی اعتراض اور کوئی طعنہ نہیں کرتے کہ وہ عبادت خدا، صوم وصلوٰۃ میں کمی کرتے تھے، بس حضرت علیہ السلام کا یہ فرمان تھا کہ جاثلیق غصے سے آگ بگولا ہوگیا اور کہنے لگا کہ تم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ایک ایسی چیز کی نسبت کیسے کر دی کہ جو اس کی شان کے لائق ہرگز نہیں۔ وہ تو ہمیشہ دن کو روزہ رکھتے اور شب کو عبادتِ خدا نماز میں بسر کر دیتے تھے۔

جب نصرانی کی زبان سے حضرتؑ نے یہ اقرار لے لیا تو فرمایا کہ اگر ایسا تھا تو پھر بتایئے کہ عیسیٰ علیہ السلام جبکہ بندۂ خدا نہ تھے تو پھر عبادت کس کی کرتے تھے؟ اور کس طرح اور کیوں انہوں نے اپنا معبود قرار دے رکھا تھا اور کس لئے اپنے آپ کو مشقت اور تکان میں ڈالے رہتے تھے؟ بس جاثلیق مبہوت ہوکر خاموش ہوگیا، کوئی جواب اس سے نہ بن سکا۔

(بقیہ حاشیہ۔۲) کو یہ علم ہی نہ تھا کہ یہ لاٹھی سانپ بن جائے گی، اس لئے لاٹھی کا سانپ بن جانا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قدرت سے نہیں خدا کی قدرت سے واقع ہوتا تھا۔ دوسرا لفظ "لاتخف" ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سانپ کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ چنانچہ دوسری آیات میں اس کی صراحت موجود ہے، ارشاد قدرت ہے: فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ ۚ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ ۣ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ ۝ (القصص، آیت:۳۱) کہ "جب موسیٰ علیہ السلام نے اس طرح دوڑتا ہوا دیکھا کہ گویا وہ اژدھا ہے تو پشت پھیر دی اور پیچھے کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا تو اللہ جل شانہ کی طرف سے ندا آئی کہ اے موسیٰ! اژدہا کی طرف آگے بڑھو اور ڈرو مت، بے شک تو امان پانے والوں اور محفوظ رہنے والوں میں سے ہوگا۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اس سانپ کو دیکھ کر ڈر جانا اس کی دلیل ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قدرت سے سانپ نہیں بنا تھا اور نہ ہی ان کو اس کا علم تھا کہ یہ عصا سانپ بن جائے گا ورنہ انہیں ڈر لاحق نہ ہوتا۔ اب ظاہر ہے کہ وہ عصا قدرتِ خدا سے سانپ بن گیا تھا۔ تیسرا لفظ ہے سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى، اللہ تعالیٰ نے اس کی پہلی حالت پر لوٹانے کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے کہ ہم اسے اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے، اس لئے معلوم ہوا کہ عصا کا سانپ کی شکل اختیار کرنا بھی خداوند عالم کی قدرت سے واقع ہوا تھا اور واپس عصا کی شکل پر لوٹنا بھی خداوند عالم کی ہی قدرت سے واقع ہوا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہ ہی لاٹھی کو سانپ بنایا تھا اور نہ وہ اسے پھر عصا کی شکل پر لوٹا سکتے تھے، ورنہ قدرت کو یہ کہنے کی ضرورت نہ ہوتی کہ ہم اسے پہلی شکل پر لوٹا دیں گے۔ ان سب دلائل سے معلوم ہوا کہ معجزہ قدرت خدا سے واقع ہوتا ہے معجزنما کی قدرت سے واقع نہیں ہوتا۔

(۲-۱) نیز ارشاد قدرت ہے: وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۚ (الانعام، آیت:۳۵) اے نبی اگر ان کا روگرداں ہوجانا آپ کو ناگوار اور شاق ہے تو پھر اگر تم..... (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

نیز نصاریٰ نجران کے مناظرہ میں وارد ہوا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا اگر تم عیسیٰ علیہ السلام کو بندہ کہتے ہو تو بتائیے کہ کون سا بندہ بغیر باپ کے پیدا ہوا ہے تا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اس کی طرح بندہ مانا جائے۔ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ آدم علیہ السلام کا وجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے کیونکہ وہ ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، جس طرح وہ چاہتا ہے اپنی مخلوق کو وجود میں لاتا اور پیدا فرماتا ہے۔ اس کی قدرت کے سامنے کوئی چیز دشوار نہیں، چنانچہ ارشاد قدرت ہے:

اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ (سورۃ آل عمران، آیت:۵۹)

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی مثال حضرت آدم کی ایسی ہے کہ حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کردیا۔"

احتجاج طبرسی صفحہ ۹ کی روایت میں وارد ہوا ہے کہ ایک نصرانی نے دلیل عقلی کے ساتھ تمسک کرتے ہوئے کہا کہ کتابِ آسمانی میں وارد ہوا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

اَذۡھَبُ اِلٰی اَبِیۡ

کہ میں اپنے باپ کی طرف جاتا ہوں، تو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا: اگر تم اس کتاب پر اعتقاد رکھتے ہو تو اس کتاب میں تو یوں موجود ہے۔

اَذۡھَبُ اِلٰی اَبِیۡ وَ اَبِیۡکُمۡ.

کہ میں اپنے اور تمہارے باپ کی طرف جاتا ہوں، لہٰذا تمہیں چاہئے کہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہی نہیں بلکہ تمام

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) ان کو معجزہ لا دکھانے پر قدرت رکھتے ہو تو زمین میں کوئی سرنگ تلاش کر کے یا آسمان میں پہنچنے کے لئے سیڑھی لگا کر ان کو کوئی معجزہ لا دکھاؤ۔ تفسیر صافی صفحہ ۴۰۶ بحوالہ تفسیر قمی اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا ایک ارشاد نقل کرتے ہیں کہ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ حارث بن نوفل بن عبد مناف اسلام لے آئیں، اس لئے آپ نے اسے دعوت دی اور بڑی کوشش کی لیکن اس پر بدبختی غالب آگئی اور وہ مشرف بہ اسلام نہ ہوا، فشق ذلك على رسول الله فأنزل الله هذه الآية، اس کا اسلام نہ لانا حضرت کو بہت ناگوار گزرا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ صاحب تفسیر صافی آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اس مطلب کو ادا کرنا مقصود الٰہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی قوم کے ایمان لانے کی بہت خواہش رکھتے تھے، وانه لو قدر على ذلك لفعل ولكنه لم يقدر، اور اس آیت میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر معجزہ لا دینے پر قادر ہوتے تو لا دکھاتے لیکن وہ قدرت نہ رکھتے تھے۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ معجزہ فعل خدا ہوتا ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی جب اس پر قدرت نہ رکھتے تھے تو دوسرا کوئی نبی یا ولی تو بطریق اولیٰ قدرت نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا معجزہ، معجز نما کا فعل نہیں ہو سکتا۔

(۲-۲) نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: اِنَّمَا الۡاٰیٰتُ عِنۡدَ اللّٰہِ (الانعام، آیت:۱۰۹) سوائے اس کے نہیں کہ سب معجزات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔ اس آیت کو سابقہ آیت کے ساتھ ملانے سے یہ مطلب اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ سوائے خدا کے معجزہ پر کسی کو قدرت حاصل نہیں کیونکہ "انما" کلمۂ حصر ہے جو صراحۃً اس مطلب پر دلالت کرتا ہے کہ ہر معجزہ قدرت خدا سے واقع ہوتا ہے۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

بندوں کو خدا کے بیٹے کہا کرو اور جب تم ایسا نہیں کہہ سکتے تو اسی سے معلوم ہوا کہ باپ یعنی "اب" کا لفظ اس مقام پر رب اور تربیت کنندہ کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے دیگر کسی معنی میں استعمال نہیں ہوا۔

نیز مروی ہے کہ بعض نصرانی اپنے قول کی تاویل کے در پے ہوئے اور کہا کہ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام درحقیقت خدا کا بیٹا تھا بلکہ خدا نے ان کو بیٹا اس وجہ سے فرمایا کہ خدا کو ان کی عزت و اکرام اور اعزاز و احترام مقصود تھا اور یہ معنی عام شائع ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ محاورات میں تو یہ بھی شائع ہے کہ جس شخص کی کوئی تعظیم کرنا چاہتا ہو اسے شیخ، بزرگ، سید اور آقا بھی کہتے ہیں اور ان الفاظ میں احترام کی زیادتی ملحوظ ہوتی ہے۔ لہٰذا تمہارے نزدیک جائز ہونا چاہئے کہ خداوند عالم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شیخ، سید اور اپنا آقا بھی کہتا رہے۔ مختصر یہ کہ خداوند عالم کی شان میں ان الفاظ کا استعمال جائز نہیں ہے جو خالق کی مخلوق کے ساتھ ایسی تشبیہ پر مشتمل ہوں جو نقائص جسمانی کی طرف مشعر ہوں:

تعالی اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا.

اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت بلند ہے جو یہ ظالم کہتے ہیں۔

ارشاد قدرت ہے:

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۔ (سورۃ النساء، آیت: ۱۷۱)

کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کے متعلق وہی کچھ کہو جو حق ہو یعنی پیغمبر خدا کی شان میں

(بقیہ حاشیہ۔ ۲)

(۲۔۳) نیز فرمان الٰہی ہے: قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (سورہ بنی اسرائیل، آیت: ۸۸) اے نبی کہہ دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جن اس قرآن کی مثل لانے کے لئے جمع ہو جائیں تو بھی اس کی مثل نہیں لاسکیں گے اگر چہ کہ اس کے متعلق وہ ایک دوسرے کی مدد ہی کرتے رہیں۔

قرآن پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا زندہ معجزہ ہے اور یہ کلام خدا ہے، کلام رسول نہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ازخود نہیں بنالیا تھا بلکہ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت مذکورہ اس امر کے لئے نص ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمیت تمام انسان قرآن کریم کی مثل کلام بنا لینے پر قادر ہی نہیں، اس لئے اس آیت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ معجزہ فعل خدا ہوتا ہے۔

(۲۔۴) نیز ارشاد پروردگار ہے: قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَاۤ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآىِٕدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (المائدہ، آیت: ۱۱۴) اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین نے آپ سے کہا تھا کہ کیا تیرا رب اس پر قادر ہے کہ آسمان سے ہم پر ایک دسترخوان نازل کرے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو ایسی فرمائشیں کرنے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ حواریین نے کہا ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اس دسترخوان سے کچھ کھائیں تا کہ ہمارے دل مطمئن ہو جائیں اور ہمیں یقین ہو جائے کہ آپ اپنے رسالت کے دعویٰ میں سچے ہیں، نیز ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اس کے متعلق گواہ ہو جائیں۔ تو اللہ تعالیٰ کو خطاب کرتے ہوئے مذکورہ بالا آیت کے الفاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اس طرح غلو نہ کرو کہ اسے خدا یا خدا کا بیٹا قرار دے دو۔

نیز ارشاد قدرت ہے:

لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰہِ وَلَا الْمَلٰٓئِکَۃُ الْمُقَرَّبُوْنَ. (سورۃ النساء آیت: ۱۷۲)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے کو اپنے لئے نہ عیسیٰ ناگوار اور مکروہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی ملائکہ مقربین اس سے انکار کرتے ہیں۔

نیز فرمایا:

وَمَنْ یَّسْتَنْکِفْ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَیَسْتَکْبِرْ فَسَیَحْشُرُھُمْ اِلَیْہِ جَمِیْعًا (سورۃ النساء آیت: ۱۷۲)

کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت سے نفرت اور تکبر کرے گا عنقریب ان سب کو اللہ تعالیٰ اپنے دربار میں سزا دینے کے لئے جمع کرے گا۔

نیز یوم قیامت کی حالت کا بیان کرتے ہوئے اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے:

وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ۔ (سورۃ المائدہ، آیت:۱۱۹)

حاصل معنی یہ کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت اُمتِ حضرت عیسیٰ کو عتاب کرنے کے لئے فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ اللہ کی بجائے مجھے اور میری والدہ کو معبود قرار دے لیجئے۔

(بقیہ حاشیہ۔۲) کہ پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک دسترخوان نازل کر جو ہمارے اوّلین و آخرین کے لئے عید ہوگی اور تیری طرف سے معجزہ ہوگا اور جو میرے سچا ہونے کی دلیل ہوگی اور بے شک تو تمام رزق دینے والوں سے افضل رازق ہے۔ چنانچہ وہ دسترخوان نازل ہوا اور کئی دنوں تک نازل ہوتا رہا، بالآخر ضدی کفار نے اسے جادو قرار دیا تو ان پر عذاب نازل ہوا، لفظ "آیَۃً مِّنْکَ" نص ہے کہ وہ دسترخوان معجزہ تھا اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کی قدرت سے نہیں، قدرت خدا سے پیدا شدہ نازل ہوتا تھا کیونکہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے پیدا کرنے پر قادر ہوتے تو پھر انہیں دعا مانگنے کی ضرورت لاحق نہ ہوتی۔

(۲-۵) تفسیر قمی میں آیت غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کے تحت حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی ایک طولانی حدیث منقول ہے جس میں امام علیہ السلام نے تصریح فرمائی کہ معجزہ ایسی شخصیت کا فعل نہیں ہوسکتا جس کو کسی اعتبار سے احتیاج لاحق ہو اور جو اپنے افعال اور صفات میں مخلوق کے ساتھ مشابہت اور شرکت رکھتا ہو بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو احتیاج اور ایسی مشابہت سے پاکیزہ ہے۔ نیز کتاب الاحتجاج للطبری صفحہ ۲۴۴ میں بھی یہی روایت منقول ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص امیر المومنین علی علیہ السلام کو عبودیت سے بڑھائے گا وہ "مغضوب علیھم" سے ہوگا یعنی ان لوگوں میں سے ہوگا جن پر خدا کا غضب نازل ہوگا نیز "الضالین" یعنی گمراہوں سے ہوگا۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمیں عبودیت سے نہ بڑھاؤ یعنی الوہیت کے اوصاف ہمارے لئے ثابت نہ کرو بعد ازاں جو چاہو سو کہو، ہمارے فضائل کی انتہا کو نہیں پہنچ سکو گے اور غلو نہیں کرنے پاؤ گے اور دیکھو ایسے غلو سے ہمیشہ بچے رہو جیسے کہ نصاریٰ نے غلو کیا، فانی بری ء من الغالین، کیونکہ غالیوں سے میں بیزار ہوں۔ اتنے تک حاضرین میں سے ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ ہمارے لئے اپنے پروردگار اللہ جل شانہ کی شان بیان کیجئے کیونکہ ہمارے ہاں جو لوگ رہتے ہیں ان میں اس کے متعلق اختلاف رونما ہو چکا ہے (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (سورۃ المائدہ، آیت:۱۱۶)

حضرت عیسیٰ جواباً عرض کریں گے کہ مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں وہ کچھ کہتا جو کہنے کا مجھے حق حاصل نہ تھا۔ اگر میں نے یہ کہا ہوتا تو پروردگار تجھے اس کا ضرور علم ہوتا، تو تو اُسے بھی جانتا ہے جو میرے دل میں تھا اور میں اسے نہیں جانتا جو تیرے علم میں گزرا، تو ہر غیب کا خوب جاننے والا ہے۔

لہٰذا نصاریٰ جس نقص وعیب و گناہ کا ارتکاب کرتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے بری اور بیزار ہیں اور اس جماعت کی حماقت اور جہالت کا یہ حال ہے کہ وہ اس صلیب کی تصویر کی پرستش کرتے ہیں جس پر ان کے زعم ناقص کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا گیا تھا اور اس کی تصویر کو اپنے گلے میں لٹکائے رہتے ہیں۔

منقول ہے کہ ابن شیم نے ایک نصرانی سے پوچھا کہ صلیب کو تو نے گلے میں کیوں لٹکا رکھا ہے؟ اس نے جواب دیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جس صلیب پر سولی چڑھایا گیا تھا یہ اس کی شبیہ ہے۔ ابن شیم نے کہا کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے محبت رکھتے تھے کہ ان کی تصویر بنائی جائے؟ نصرانی نے کہا کہ نہیں، پھر ابن شیم نے کہا کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام گدھے پر سوار ہوا کرتے تھے؟ اور اس پر سوار ہو کر اپنے مقصد کو جایا کرتے تھے؟ نصرانی نے کہا کہ جی ہاں۔ ابن شیم نے کہا کہ آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے اس گدھے کی بقاء چاہتے تھے جس پر سوار ہو کر حضرت اپنے کام کار کے لئے منزلِ مقصود تک جاتے تھے؟ نصرانی نے کہا کہ جی ہاں۔ ابن شیم نے کہا کہ کیا عیسیٰ علیہ السلام اس سے محبت رکھتے تھے کہ ان کا گدھا زندہ باقی رہے تا آنکہ آپ اس پر سوار ہو کر منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ نصرانی نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ تو ابن شیم نے کہا کہ تم

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) چنانچہ امام علی رضا علیہ السلام نے بطریق احسن اللہ تعالیٰ کی شان بیان فرمائی، عظمت خدا کا تذکرہ فرمایا اور ایسے تمام اوصاف سے اس کی ذات کو مبرا اور منزہ قرار دیا جو اس کی ذات والا صفات کے شایانِ شان نہیں۔

سوال کنندہ عرض گذار ہوا کہ مولیٰ ہمارے علاقے میں ہمارے ساتھ کچھ لوگ ایسے رہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ صفات جو آپ نے اللہ تعالیٰ کی بیان کی ہیں یہ سب علی علیہ السلام کے لئے ثابت ہیں اور علی علیہ السلام ہی تو اللہ تعالیٰ ہے جو کہ رب العالمین ہے اور ساتھ ہی یہ لوگ آپ کی ولایت کا بھی دم بھرتے ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ امام علی رضا علیہ السلام نے جب یہ بات سنی تو حضرت علیہ السلام کے شانے مبارک کانپنے لگ گئے اور پسینہ پسینہ ہو گئے پھر فرمایا: پاک ہے وہ ذات پروردگار اس سے جو یہ کافرین وظالمین کہتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ حضرت علی علیہ السلام کیا کھانا کھانے والوں میں سے نہ تھے اور پانی پینے والے، نکاح کرنے والے اور حدث صادر کرنے والے اشخاص میں سے نہیں تھے اور باوجود اس کے آپ نماز کے بڑے پابند تھے اور دربار خدا میں بڑی عاجزی وزاری کرنے والے تھے اور ذلت و عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے دربار میں جھکنے اور فروتنی کرنے والے تھے کیا جس کی یہ صفات ہوں وہ معبود ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا شخص مستحق عبادت معبود ہو سکتا ہے تو پھر تم میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو معبود اور لائق پرستش نہ ہو کیونکہ تم میں ہر شخص امیر المومنین علیہ السلام کے ساتھ ان صفات میں شرکت رکھتا ہے کہ جو صفات ہر اس شخص کے حادث ہونے پر دلالت کرتے ہیں جو ان کے ساتھ متصف ہو۔

اس شخص نے کہا کہ اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ لوگ کہتے ہیں کہ علی علیہ السلام نے جب ایسے معجزات ظاہر کئے جن پر اللہ کے علاوہ کوئی شخص (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

لوگوں نے اس چیز کو ترک کر دیا جس کی بقاء کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی میں چاہتے تھے اور اس چیز کو تم نے اپنی گردن میں ڈال لیا جس چیز پر حضرت بادلِ نخواستہ سوار ہوئے تھے اور اس سے کراہت رکھتے اور اسے نہیں چاہتے تھے یعنی تم نے گدھے کو چھوڑ دیا اور صلیب کی صورت کو گلے میں ڈال لیا حالانکہ عقل کا تقاضہ یہ تھا کہ گدھے کی صورت کو تم گردن میں لٹکاتے اور صلیب کی صورت کو تم اپنے سے دور رکھتے، قریب تک نہ آنے دیتے اور جب تم نے اس کے خلاف طریقہ اختیار کیا تو سمجھ لو کہ تم دانستہ جہالت کے راستہ پر چل رہے ہو۔

(۴) ردِ اقوال صوفیہ بوجوہ عقلیہ ونقلیہ:

چوتھا باطل فرقہ صوفیہ کا ہے جو کہ متعدد فرقے ہیں اور ان کی بہت سی شاخیں ہیں لیکن ان کے محققین وحدتِ وجود کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ سوائے خدا کے اور کوئی موجود ہی نہیں ہے جو کچھ ہے وہ اسی کا مظہر ہے وہ دریا اور اس کی موجوں اور مٹی اور کوزے کی مثالیں پیش کرتے ہیں، یعنی وہ کہتے ہیں کہ موج دریا بھی دریا ہی کا مظہر ہے اور کوزہ بھی مٹی کی ایک شکل ہے۔ اسی طرح ہر موجود خداوند عالم ہی کا مظہر ہے اور اسی کے وجود کی ایک صورت ہے اور ان کا یہ گمان باطل ہے کہ موحد حقیقی ہم ہی ہیں اس طرح کہ ہم خدا کے سوا کسی کو موجود ہی نہیں سمجھتے حالانکہ ان کا یہ واہی خیال اور گمان اس کو مستلزم ہے کہ وہ ہر چیز کو خدا کہیں کیونکہ وہ واجب الوجود پر ممکن کا حمل اتحادِ وجود کے باعث جائز سمجھتے ہیں اور اس تقدیر پر مصادیق واجب کی کثرت کی کوئی انتہا نہ ہوگی اور یہ توحید کیسے ہوسکتی ہے؟ جبکہ جو فرقے دو خداؤں کے قائل ہیں جیسے مثلاً ثنویہ وہ بھی کافر ہیں تو پھر ان لوگوں کی حالت انتہائی قابل افسوس ہے کہ یہ ہر چیز کو خدا جانتے ہیں اور عوام کو

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) قادر نہیں ہوسکتا تو اس سے ثابت ہوا کہ وہ مستحق عبادت اور لائق پرستش معبود ہے اور جب وہ حادثین اور عاجزین کے صفات میں مخلوق کے سامنے ظاہر ہوا تو اس سے اس نے قصداً لوگوں کو التباس اور امتحان میں ڈالا تاکہ وہ اس کی معرفت حاصل کریں اور ان کا ایمان اختیاری ہو۔ اس پر حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا! اول ما ههنا کہ پہلی بنیادی غلطی ہی ان کی یہی ہے کہ انہوں نے معجزہ اس شخصیت کا فعل قرار دیا جس میں حادثین و عاجزین اور صاحبانِ احتیاج کے صفات پائے جاتے ہیں۔ اگر ان کی دلیل کو انہیں کے خلاف قائم کیا جائے تو وہ کوئی فرق ہی نہیں کرسکیں گے اور کوئی صحیح جواب ہی نہ دے سکیں گے یعنی اگر ان سے کہا جائے: لما ظهر منه الفقر والفاقة دلّ علی ان من هذه صفته و شارکه فيها الضعفاء المحتاجون لا يكون المعجزات فعله کہ جب امیر المومنین علیہ السلام سے فقر و فاقہ اور احتیاج کا اظہار ہوا تو اس چیز نے دلالت قائم کر دی کہ معجزات ایسے شخص کا فعل نہیں ہوسکتے جس کی یہ صفت اور ایسی شان ہو جن میں ضعفاء اور محتاجین اس کے ساتھ شریک ہوں۔

فعلم بهذا أن الذي ظهر من المعجزات انما كانت فعل القادر الذي لا يشبه المخلوقين لا فعل المحتاج المشارك الضعفاء في صفات الضعف: لہٰذا معلوم ہوا کہ امیر المومنین علیہ السلام سے جو معجزات ظاہر ہوئے وہ بس اس فاعل مختار قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ کا فعل ہیں جو مخلوق کے ساتھ بالکل مشابہت نہیں رکھتا۔ یہ اس شخص کا فعل نہیں ہوسکتے جو صاحب احتیاج ہو اور صفات ضعف میں ضعیفوں کے ساتھ اشتراک رکھنے والا ہو۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے اس فرمان عالی شان سے بھی مثل روزِ روشن واضح ہوگیا کہ معجزات فعل خداوندی ہیں کیونکہ آپ نے غیر مبہم الفاظ میں فرمایا کہ معجزہ اس کا فعل ہو ہی نہیں سکتا جسے کھانے پینے، نکاح کرنے وغیرہ کی احتیاج لاحق ہوتی ہو اور جو مخلوق کے ساتھ کسی جہت سے مشابہت رکھتا ہو۔

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

مغالطہ دینے اور تمام مخلوقات پر حقیقت کو مشتبہ رکھنے کے لئے علماء دین کے خوف کی وجہ سے اپنے ان مضامین کفر آئین کو اپنی عبارتوں میں اشاروں کے ذریعہ ادا کرتے ہیں اور اس ذریعہ سے اپنے عیب کو پردہ پوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور مومنین بایقین کی گرفت کے وقت واہی اور رکیک تاویلات کا ارتکاب کرتے ہیں بلکہ اپنی شان کی بلندی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی شخص ہمارے کلام کو سمجھ نہیں سکتا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو علم باطن کا عالم قرار دیتے اور علماء دین کو علم ظاہری کا عالم کہتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ علماء دین کو ہمارے بیان کی دقائق اور باریکیوں تک رسائی نہیں ہوسکتی حتیٰ کہ انتہائی بے حیائی کے باعث علماء دین کو قشرین کا نام دیتے ہیں۔ مطلب ان کا یہ ہوتا ہے کہ علماء دین کی نگاہ صرف پوست اور چھلکے تک پہنچ سکتی ہے کلام کے مغز تک نہیں پہنچ سکتی اور کہتے ہیں کہ ہمارا طور وطریق طورِ عقل سے جداگانہ ہے۔

لیکن برتن میں جو کچھ ہوتا ہے، وہی اس سے ظاہر بھی ہوتا ہے لہٰذا اہل بصیرت پر حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی بلکہ ان کی ایک جماعت نے اپنے چہرے سے پردۂ حیا کو اٹھا کر ان مطالب کی تصریح کر دی ہے چنانچہ قدوۃ المحققین، اسوۃ المجتہدین جناب علامہ فہامہ والد ماجد نور اللہ مرقدہ و بَرَّدَ اللّٰہُ مَضْجَعَہٗ نے کتاب ذوالفقار میں نقل فرمایا ہے کہ اس مذہب والوں کے اعتقاد کا ماحصل یہ ہے کہ تمام عالم اور ساری دنیا عین ذاتِ خدا ہے، فرق صرف اعتباری ہے۔ اللہ تعالیٰ العیاذ باللہ کبھی اپنے آپ کو ابلیس کی شکل میں ظاہر کرتا ہے اور کبھی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں اور کبھی کتے اور خنزیر کی شکل میں اور کبھی انسان کی صورت میں، کبھی وہ خداوند عالم کو دریا سے تشبیہ دیتے ہیں اور عالم دنیا کو موجوں سے اور کبھی خدا کو

(بقیہ حاشیہ۔۲) بہر حال معجزہ کا قدرتِ خدا سے صادر ہونا اور اس وجہ سے اس کا فعل خدا ہونا ایک مسلم امر ہے جس کے دلائل قرآن وحدیث میں اس کثرت سے ہیں کہ اس وقت قلم و قرطاس کو یارائے احصاء نہیں۔ جس قدر آیات و احادیث نقل کر دیئے گئے ہیں وہ اس مقصد کے اثبات کیلئے کافی ہیں بلکہ کافی سے زائد ہیں، لہٰذا زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں۔

"ازالۂ وھم"

بعض آیات اور احادیث میں معجزہ کا اسناد معجز نما کی طرف بھی واقع ہوا ہے جس سے بعض کم سواد صاحبان کو یہ وہم ہوتا ہے کہ معجزہ نبی یا امام کا فعل ہوتا ہے حالانکہ یہ اسناد حقیقتاً نہیں مجازاً واقع ہوا ہے۔ اس لئے درحقیقت معجزہ فعل خدا ہوتا ہے خواہ اس کا اسناد معجز نما ہی کی طرف کیوں نہ ہو مثلاً ارشادِ پروردگار ہے کہ: اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ (آل عمران، آیت: ۴۹) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہو رہا ہے کہ وہ کہے گا کہ میں تمہارے لئے مٹی سے شکل پرندہ کی مثل "ایک مورتی" بناؤں گا پھر اس میں پھونکوں گا تو وہ اذن خدا سے پرندہ ہو جائے گا اور میں اذنِ پروردگار سے اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفاء دوں گا اور مردوں کو زندہ کروں گا۔ اس آیت میں شفاء دینے اور مردوں کے زندہ کرنے کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی طرف منسوب کیا ہے مگر یہ اسناد مجازاً ہے کیونکہ مریضوں کی شفاء اور مردوں کا زندہ ہونا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا اور برکت سے منجانب حق تحقق پذیر ہوتا تھا اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس شفاء و احیاء سے بہت بڑا رابطہ اور تعلق حاصل تھا اس لئے ان دونوں افعال کو مجازاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی طرف منسوب فرمایا اور ایسا مجاز کلامِ عرب میں بلکہ ہر زبان میں عموماً واقع ہوتا رہتا ہے کہا جاتا ہے "جری النہر" نہر جاری (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

مٹی سے اور مخلوق کو کوزے سے اور کبھی اللہ جل شانہ کو سیاہی سے تشبیہ دیتے ہیں اور مخلوقات کو حروف سے اور تشریح یوں کرتے ہیں کہ دریا عین امواج ہے اور مٹی عین کوزہ اور سیاہی عین حروف ہیں فرق صرف اعتباری ہے اسی طرح خدا عین مخلوقات ہے اس مضمون کے انہوں نے اشعار بھی نظم کئے ہیں، ناچ، گانے، حال اور وجد کو کمالِ معرفت و عبادت سمجھتے ہیں۔ ان کے بزرگوں کے اشعار میں سے یہ اشعار بھی ہیں۔

بامریدان آن فقیر محتشم بایزید آمد که نک یزدان منم

گفت مستانه عیان آن ذوفنون لا اله الا انا ها فاعبدون

کہ باحشمت فقیر بایزید اپنے مریدوں کے ساتھ آیا اور کہا کہ زبان یزدان میں ہوں، اس صاحب فنون مستانے نے واضح طور پر کہا کہ میرے سوا دیگر کوئی لائق عبادت نہیں ہے لہٰذا آؤ میری عبادت کرو۔

صاحب کتاب فتائح یہذی کہتا ہے کہ حضرت سید شریف قدس سرہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم علم کلام اور صوفی نے باہم مناظرہ کیا۔ متکلم نے کہا کہ میں اس خدا سے بیزار ہوں کہ جو کتے اور بلی میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ صوفی نے کہا کہ میں اس خدا سے بیزار ہوں کہ جو کتے اور بلی میں ظہور نہیں کرتا۔

مولف کتاب آقا سید حسین اعلی اللہ مقامہ فرماتے ہیں کہ ماضی قریب میں مشائخ صوفیہ میں سے ابن ملجم ملعون کے ہمنام عبدالرحمٰن نامی ایک شیخ کے پاس بعض ثقہ اور قابل اعتماد احباب کو جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ شیخ صوفی خالق کے عین مخلوق ہونے کا قائل اور اس کی تصریح کرنے میں ذرہ بھر پرواہ نہ کرتا تھا۔ وہ مسجد میں چراغ جلائے بیٹھا تھا، اتفاقاً ایک

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) ہوگئی حالانکہ نہر جاری نہیں ہوتی بلکہ نہر میں پانی جاری ہوتا ہے لیکن چونکہ نہر کو پانی سے ظرفیت کا رابطہ اور علاقہ حاصل ہے اس لئے جریان کو مجازاً نہر کی طرف مسند کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے "بنی الامیر المدینۃ" امیر نے شہر بنایا حالانکہ شہر کو امیر نہیں بناتا بلکہ مزدوروں اور معماروں کا عملہ بناتا ہے لیکن امیر کے حکم سے وہ عملہ اپنی کارگزاری کو انجام دیتا ہے اس لئے کہ امیر سبب امر ہوتا ہے، لہٰذا اس کی طرف مجازاً بناء کا اسناد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح آیت مذکورہ میں ابراء اور احیاء کا اسناد بھی عیسیٰ علیہ السلام کی طرف مجازاً کیا گیا ہے کیونکہ ان کی دعا کے باعث اللہ تعالیٰ ان مریضوں کو شفاء اور مردوں کو زندگی عطا کرتا تھا اور نہ وہ حقیقت ابراء و احیاء عیسیٰ علیہ السلام کی قدرت سے نہیں۔ خدا کی قدرت سے واقع ہوتے تھے اس لئے وہ خدا کے افعال تھے۔ چنانچہ علماء کرام نے تصریح کی ہے کہ ابراء و احیاء کا اسناد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف مجازاً واقع ہوا ہے، ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان للشیخ ابی علی الفضل بن الحسن الطبرسیؒ ج۱، صفحہ ۴۴۵، إنما أضاف الإحياء إلى نفسه على وجه المجاز والتوسع لأن الله كان يحيي الموتى عند دعائه، کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے احیاء کو اپنے نفس کی طرف بس مجاز کے طریقہ اور وسیع کی صورت ہی سے اسناد کیا ہے اور نیز اس وجہ سے اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو ان کی دعا کے وقت زندہ کرتا تھا۔

نیز تفسیر التبیان شیخ ابی جعفر محمد بن حسن الطوسی شیخ الطائفہ ج۱، صفحہ ۲۱۷، قوله سبحانه وَأُحْيِ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ، على وجه المجاز أضافه إلى نفسه و حقيقته أدعوا الله بإحياء الموتى فيحيون بإذنه، کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: وَأُحْيِ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ، کو مجاز کے طریقہ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی طرف مسند کیا ہے اور درحقیقت آپ کا مطلب یہ کہنا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ سے مردوں کے زندہ کرنے کی دعا کروں گا تو اللہ تعالیٰ ان کو زندہ کر دے گا اور وہ باذن خدا زندہ ہو جائیں گے۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

کتا مسجد میں داخل ہوا۔ اس شیخ نے کتے کو نہ مارا نہ روکا، آنے دیا۔ کتا چراغ کے پاس پہنچا اور اسے نیچے گرا کر بجھا دیا۔ بس اب کیا تھا شیخ صوفی نے اپنی معرفت اصطلاحیہ کے کمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے شور مچا دیا اور کہا کہ سبحان اللہ، خود گھر کے چراغ نے خود کو بجھا دیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ اس لغو اور بیہودہ کلام سے خدا کی پناہ۔

نیز کتاب ذوالفقار میں اس گروہ کے لغویات کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان واہیات کے منجملہ بایزید کے وہ کلمات ہیں جو اس نے منصور حلاج کے حق میں کہے ہیں کہ "تو ہی وہ ذات اور وہ پاک خدا ہے کہ جس نے بت وصورت کو ایک ہی راہ میں شکستہ کر دیا ہے۔"

اور ان کے ہی منجملہ شیخ فرید الدین عطار کے ابیات ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ خود خدا ہی پیغمبر بنا اور پیغام بنا دیا اور خود ہی کافر بنا اور انکار کیا، خود ہی ہر گناہ کی سازش کرتا ہے اور خود ہی پھر توبہ اور استغفار کرتا ہے۔

شیخ محی الدین کہ جو قائلین وحدۃ الوجود کا رہبر اور پیشوا ہے اس نے باوجود اس کفر اور زندیقیت کا ارتکاب کرنے کے کتاب فصوص میں اپنے آپ کو تمام انبیاء سے افضل اور اولیاء کا خاتم قرار دیا ہے۔ وہ کبھی تو حضرت نوح علیہ السلام کو خطا کار قرار دیتا ہے اور کبھی فرعون کو طاہر ومطہر اور پاک و پاکیزہ شمار کرتا اور فلاں حضرت اور متوکل ملعون کو ظاہر و باطن کا قطب قرار دیتا ہے حالانکہ وہ خاندان اہل بیت اطہار علیہم السلام کا دشمن تھا۔ اس نے اپنے کارکنوں کو حکم دیا تھا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی قبر پاک کا نشان تک مٹا دیں اور اس جگہ ہل چلا کر کھیتی کاشت کر دیں۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کہ جو ان کا پیر دستگیر ہے اس نے اپنی کتاب غنیۃ الطالبین میں لکھا ہے کہ روزِ عاشور عید کرنا چاہئے اور کہا کہ جس طرح فلاں حضرت کی وفات

(بقیہ حاشیہ۔۲) نیز تفسیر آلاء الرحمٰن شیخ محمد جواد البلاغی النجفی ج ۱، صفحہ ۲۸۵، وانما نسب الابراء والاحیاء الیه لانه السبب ببرکته و دعائه فی ظهور هذا المعجز من الله علی یده، سوائے اس کے نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ابراء واحیاء کو اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ان کے ہاتھ پر اس معجزہ کے ظاہر ہونے کا اپنی دعاء اور برکت کے باعث سبب تھے۔ ان حوالہ جات سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ احیاء اور ابراء کا فاعل خداوند عالم تھا، عیسیٰ علیہ السلام کا یہ فعل نہیں تھا بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کا فعل تو دعا کرنا تھا۔ خداوند عالم ان کی دعا کے باعث شفاء بھی دیتا اور زندہ بھی کر دیتا تھا۔ چنانچہ احادیث ائمہ علیہم السلام میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف دعا کرتے تھے اور شفاء اور احیاء قدرتِ خدا سے واقع ہوتا تھا۔ چنانچہ ملاحظہ ہو تفسیر صافی، صفحہ ۸۱ بحوالہ الکافی شیخ کلینی و تفسیر عیاشی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کسی ایسے شخص کو مرنے کے بعد زندہ کیا تھا جس نے زندہ ہو کر پھر کچھ کھایا بھی ہو، یعنی اسے رزق بھی دیا گیا ہو اور اس کی پھر اولاد بھی ہوئی ہو، تو فرمایا کہ ہاں عیسیٰ علیہ السلام کا ایک دوست تھا جو کہ محض قربۃً الی اللہ اس کا دوست اور بھائی بنا ہوا تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام جب اس کے پاس سے گزرتے تو اس کے گھر اتر پڑتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک عرصے تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس سے غائب رہے اور پھر ان کا اس کے پاس سے گذر ہوا تو اس کے گھر تشریف لے گئے تاکہ اس سے سلام دعا کریں۔ اتنے تک اس کی والدہ باہر آئی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے اس کے فرزند کے متعلق دریافت کیا تو جواباً اس نے کہا کہ یا رسولِ خدا وہ تو مر گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تو چاہتی ہے کہ اسے دیکھے۔ کہا کہ جی ہاں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں کل اسے باذن خدا زندہ کر دوں گا۔ دوسرے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے اور اس کی والدہ سے فرمایا کہ میرے ساتھ اس کی قبر کی طرف چلو۔ چنانچہ دونوں چل پڑے حتیٰ کہ اس کی قبر پر پہنچے۔ فوقف عیسیٰ ثم دعا الله فانفرج (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

سوموار کی عید کے برطرف ہونے کا باعث نہیں ہوئی حالانکہ وہ امام حسین علیہ السلام سے افضل ہے اسی طرح امام حسین علیہ السلام کی وفات سے عاشور کی عید برطرف نہ ہوگی۔ اس گروہ کے اس قسم کے غلط اور خلاف حق اقوال اور باطل عقائد بکثرت اور بے شمار ہیں۔ اس مقام پر غرض اصلی وحدت وجود کا بیان تھا، دیگر امور طرداً للباب ذکر ہو گئے۔

وحدت الوجود کے عقیدۂ فاسدہ کا بطلان عقل اور شرع شریف ہر دو کے لحاظ سے کلی طور پر ظاہر ہے کیونکہ یہ سب کچھ کفر صریح اور الحاد ہے اور اس کو مستلزم ہے کہ عذاب وثواب، جنت وجہنم، بعثت انبیاء، مرسلین کو مبعوث کرنا، آسمانی کتابوں کا نازل کرنا، شریعتوں اور ادیان کا مقرر کرنا نیز جنگ، جہاد اور دیگر عبادات شاقہ وغیرہ سب کچھ غلط، بیجا، عبث، بے سود اور حماقت کا حکم رکھتے ہوں اور یہی وجہ ہے کہ اہل تصوف کی مذمت میں بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر کر دینا اس مقام پر مناسب ہے چنانچہ ان احادیث کے منجملہ وہ حدیث ہے جو حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

لا يقول بالتصوف احد الّا لخدعة او ضلالة او حماقة

کہ کوئی شخص تصوف کا عقیدہ نہیں رکھتا مگر وہی رکھتا ہے جو یا تو دھوکہ اور فریب کاری سے کام لینا چاہتا ہے یا وہ گمراہی میں مبتلا ہوتا ہے یا حماقت کا شکار ہوتا ہے۔

وہ حدیث بھی ان احادیث میں سے ہی ہے جسے شیخ جلیل بہاؤالدین محمد عاملیؒ نے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے اس کا حاصل مضمون یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیام قیامت سے پہلے میری امت میں ایک جماعت پیدا

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) القبر و خرج ابنها حيا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس کی قبر کے پاس ٹھہر گئے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو اس کی قبر شگافتہ ہوگئی اور اس عورت کا فرزند زندہ ہو کر باہر آ گیا، انتهى بقدر الحاجة۔ یہی روایت ملاحظہ ہو تفسیر البرہان ج ۱، صفحہ ۱۷۵-۱۷۶ نیز تفسیر مجمع البیان ج ۱، صفحہ ۴۴۵، دعاء کے الفاظ تفصیلاً منقول ہیں اور اس میں اس کی والدہ کی بجائے اس کی بہن کا تذکرہ ہے۔

نیز تفسیر مجمع البیان میں ایک لڑکی کا زندہ کرنا بھی منقول ہے۔ لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا کہ آپ اس لڑکی کو زندہ کر دیں گے، وہ کل مر گئی ہے۔ فدعا الله فعاشت و بقيت وولدت، تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو وہ زندہ ہوگئی، کافی عرصہ تک زندہ رہی اور اس نے اولاد بھی جنی۔

نیز اس تفسیر میں حضرت سام بن نوح علیہ السلام کے زندہ کرنے کا بھی ذکر ہے۔ چنانچہ لکھا ہے: وسام بن نوح دعا عليه باسم الله الاعظم کہ سام بن نوح علیہ السلام کے متعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اسم اعظم کے ذریعہ دعاء کی تو آپ اپنی قبر سے زندہ ہو کر باہر آ گئے جبکہ آپ کے نصف سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ انتهى بقدر الحاجة۔

ان سب روایات اور علماء کے تصریحات سے معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ اور اندھوں کو بینا اور برص کے مریضوں کو شفایاب کر دیتا تھا، لہٰذا معجزہ فعل خدا ہوتا ہے، فعل معجز نما نہیں ہوتا۔

"ایک غلط فہمی کا ازالہ"

اصول الکافی، کتاب الحجۃ باب مولد ابی جعفر علیہ السلام، حدیث ۳، بسند حسن مرقوم ہے: عن أبي بصير قال دخلت على أبي جعفر علیہ السلام (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ہوگی جس کا نام صوفی ہوگا وہ درحقیقت میری امت سے نہیں ہوں گے بلکہ وہ یہود میں سے شمار ہوں گے، وہ کفار سے برے، بدتر اور اہل جہنم میں سے ہوں گے۔

نیز ایک حدیث حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے جس کا حاصل مضمون یہ ہے کہ ایک شخص نے حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ زمانِ حاضر میں ایک قوم پیدا ہوگئی ہے کہ لوگ جن کا نام صوفی رکھے ہوئے ہیں، حضور ان کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ حضرت نے فرمایا: لاریب کہ یہ لوگ ہم اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمن ہیں۔ جو شخص ان کی طرف مائل ہو اور ان سے محبت و رغبت رکھتا ہو وہ بھی ان میں سے ہی شمار ہوگا اور وہ ان کے ساتھ ہی محشور ہوگا۔ بہت ہی جلد ایک اور قوم پیدا ہوگی جو ہماری محبت اور دوستی کا ادعاء کریں گے اور باوجود اس کے وہ صوفیوں کی طرف مائل ہوں گے۔ لباس اور گفتار میں وہ ان کی مشابہت حاصل کریں گے اور اپنے آپ کو صوفیوں کے القاب سے ملقب کریں گے اور ان کے ایسے اقوال کی وہ تاویل کریں گے جو عین کفر اور زندیقیت ہوں گے۔ لہٰذا وہ ہم میں سے نہیں ہوں گے، ہم ان سے بیزار ہیں۔ جو شخص ان سے نفرت اور انکار کرے اور ان کے اقوال کی تردید کرے اس کا ثواب ایسے شخص کی مانند ہے جس نے آنحضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد کرنے کا شرف حاصل کیا ہو۔ ان صوفیوں کے جھوٹے اقوال اور ان کے خرافات یہ بھی ہیں کہ وہ کشف اور شہود کا ادّعاء کرتے ہیں اور جس قسم کے خیالات فاسدہ ان کے دل میں آتے ہیں کہتے رہتے ہیں اور ان خیالات کو وہ کشف سے تعبیر کرتے ہیں باوجودیکہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ کشف شیطانی بھی ہوتا ہے اور رحمانی بھی۔ حالانکہ وہ کشف رحمانی کی پہچان کے لئے کوئی پختہ ضابطہ نہیں

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) فَقُلْتُ لَهُ اَنْتُمْ وَرَثَةُ رَسُولِ اللهِ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) قَالَ نَعَمْ. قُلْتُ: رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) وَارِثُ الْأَنْبِيَاءِ عَلِمَ كُلَّ مَا عَلِمُوا. قَالَ لِي: نَعَمْ. قُلْتُ: فَأَنْتُمْ تَقْدِرُونَ عَلَى اَنْ تُحْيُوا الْمَوْتَىٰ وَ تُبْرِءُوا الْأَكْمَهَ وَ الْأَبْرَصَ. قَالَ: نَعَمْ بِإِذْنِ اللهِ، ثُمَّ قَالَ لِيَ ادْنُ مِنِّي يَا أَبَا مُحَمَّدٍ فَدَنَوْتُ مِنْهُ فَمَسَحَ عَلَى وَجْهِي وَ عَلَى عَيْنَيَّ فَأَبْصَرْتُ الشَّمْسَ وَ السَّمَاءَ وَ الْأَرْضَ وَ الْبُيُوتَ وَ كُلَّ شَيْءٍ فِي الْبَلَدِ ثُمَّ قَالَ لِي: اَتُحِبُّ اَنْ تَكُونَ هٰكَذَا وَ لَكَ مَا لِلنَّاسِ وَ عَلَيْكَ مَا عَلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَوْ تَعُودَ كَمَا كُنْتَ وَلَكَ الْجَنَّةُ خَالِصًا. قُلْتُ: أَعُودُ كَمَا كُنْتُ فَمَسَحَ عَلَى عَيْنَيَّ فَعُدْتُ كَمَا كُنْتُ. قَالَ فَحَدَّثْتُ ابْنَ اَبِي عُمَيْرٍ بِهٰذَا فَقَالَ اَشْهَدُ اَنَّ هٰذَا حَقٌّ كَمَا اَنَّ النَّهَارَ حَقٌّ۔

حضرت ابوبصیر سے مروی ہے کہ میں ایک مرتبہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کیا آپ ائمہ معصومین علیہم السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث ہیں؟ فرمایا کہ ہاں، ہم ان کے وارث ہیں۔ میں نے پھر عرض کیا کہ کیا جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انبیاء کے وارث تھے یعنی جو کچھ انبیاء جانتے تھے اس سب کا علم آنحضرت جناب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل تھا۔ فرمایا کہ ہاں حاصل تھا۔ تو میں عرض گزار ہوا کہ کیا آپ دیگر انبیاء کی طرح مردوں کو زندہ کرنے اور اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفا دینے پر قادر ہیں تو فرمایا کہ ہاں باذن خدا اس چیز پر قدرت رکھتے ہیں یعنی دیگر انبیاء کی طرح خداوند عالم سے دعا کر کے مردوں کو زندہ اور اندھوں اور برص والوں کو شفایاب کرا سکتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ اے ابومحمد! میرے قریب آجاؤ۔ چنانچہ حکم پاتے ہی حضرت کے قریب پہنچا تو حضور پرنور نے اپنا دست میرے چہرے اور دونوں آنکھوں پر پھیرا تو میں بینا ہوگیا۔ چنانچہ سورج، آسمان، زمین، اور مکانات وغیرہ سب چیزیں میں نے دیکھ لیں جو کہ اس شہر میں موجود تھیں۔ پھر امام علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ اسی طرح بینائی کے ساتھ رہے اور بروز قیامت تیرا حساب وکتاب دیگر لوگوں (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

رکھتے۔ کشف شیطانی اور رحمانی کے امتیاز کا دارومدار اپنی عقل ناقص پر قائم کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جو کشف سامنے سے اور دائیں جانب سے نمودار ہو وہ فرشتے کی طرف سے ہوتا ہے اور جو پیچھے اور بائیں جانب سے ظاہر ہو وہ شیطان سے ہوتا ہے حالانکہ شیطان تو ہر جانب سے آسکتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں شیطان ہی کی حکایت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۔ (سورۃ الاعراف، آیت: ۱۷)

ابلیس نے کہا کہ پھر میں ان بنی آدم کے سامنے سے، ان کے پیچھے، ان کے دائیں جانب سے اور بائیں جانب غرض ہر طرف سے ان پر حملہ کروں گا۔

امیرالمومنین علیہ السلام کا حسن بصری سے مکالمہ

مروی ہے کہ جنگ جمل یعنی جنگ شتر کے بعد امیرالمومنین علیہ السلام کا حسن بصری کے پاس سے گزر ہوا کہ جو صوفیوں کا پیر تھا۔ وہ اس وقت وضو کر رہا تھا۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ وضو اچھی طرح کامل طور پر بجالاؤ، کہنے لگا تو نے بہت سے ایسے لوگوں کو قتل کر دیا ہے جو شہادتین یعنی شہادت توحید و شہادت نبوت ادا کرتے اور کامل وضو اور نماز پنجگانہ بجا لاتے تھے اور مجھے نصیحت کرتے ہو۔ امیرالمومنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جو کچھ کیا ہے تو نے اسے دیکھا ہے، اگر میں باطل پر تھا تو پھر ہمارے دشمن کی امداد کرنے سے تو نے کیوں انحراف کیا؟ عرض کیا کہ یا امیرالمومنین علیہ السلام میں سچ کہتا ہوں کہ اس جنگ کے روزِ اول میں باہر نکلا تھا اور میں نے غسل بھی کیا اور حنوط بھی کر لیا اور ہتھیار بھی اپنے بدن پر

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) کی طرح ہو یا یہ چاہتا ہے کہ تو اپنی پہلی نابینائی کی حالت پر لوٹ جائے اور بلاحساب تجھے جنت ملے۔ میں نے عرض کیا: مجھے اپنی پہلی حالت پر لوٹ جانا پسند ہے۔ چنانچہ حضرتؑ نے میری آنکھوں پر ہاتھ پھیرا تو پھر میں اسی طرح نابینا ہو گیا، جیسے کہ پہلے تھا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے ابن ابی عمیر سے یہ حدیث بیان کی تو اس نے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ واقعہ اسی طرح صحیح اور حق ہے کہ جس طرح یہ موجودہ دن حق ہے۔
اس حدیث سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ ائمہ علیہم السلام مردوں کو زندہ کرنے اور اندھوں اور برص کے مریضوں کو شفاء دینے پر قادر تھے کیونکہ سائل نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سوال کیا تھا کہ انتم تقدرون علی أن تحیوا الموتی الخ، کیا آپ مردوں کو زندہ کرنے اور اندھے اور مبروص کو شفاء دینے پر قادر ہیں تو امامؑ نے جواباً فرمایا کہ ہاں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ ائمہ علیہم السلام ان معجزات پر قادر تھے اس لئے ثابت ہوا کہ معجزہ قدرت معجزنما سے واقع ہوتا ہے اور اسی کی قدرت کا فعل ہوتا ہے، فعل خدا نہیں ہوتا حالانکہ ان لوگوں کا یہ استدلال غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ سائل کا یہ سوال مطلقاً قدرت رکھنے کے متعلق نہیں تھا بلکہ اس طریقہ پر قدرت رکھنے اور معجزہ دکھانے کے متعلق تھا جس طریقہ پر حضرت عیسیٰ معجزہ دکھاتے یعنی مردوں کو زندہ کرتے اور اندھوں اور برص والوں کو شفا دیتے تھے کیونکہ سائل نے اس سوال سے پہلے جو سوال کئے ہیں وہ اس کی دلیل ہیں اور یہ اس لئے کہ پہلے سائل نے سوال کیا کہ کیا آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث ہیں؟ پھر جواب اثبات میں ملا تو اس پر پھر یہ سوال کیا کہ کیا آپ مردوں کو زندہ اور اندھوں اور برص والوں کو شفایاب کر سکتے ہیں یا نہیں؟ تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ سائل کا مقصد اسی طریقہ پر زندہ کرنا اور شفا دینے کے متعلق سوال کرنا تھا جس طریقہ پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہ معجزات دکھاتے تھے اور سابقاً احادیث کے ذریعہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے دربار سے دعا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ اور اندھوں اور برص والوں کو شفا دے دیتا تھا، لہٰذا (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

باندھ لئے درآنحالیکہ میں اس میں ذرا بھر شک نہ رکھتا تھا کہ ام المومنین کی امداد سے انحراف کفر ہے۔ میں چل پڑا تا آنکہ جب میں مقام حدیبیہ پر پہنچا تو ایک آواز میرے کان میں پڑی کہ اسے حسن! کہاں جا رہے ہو، واپس لوٹو کہ قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں ہوں گے۔ چنانچہ میں واپس اپنے گھر لوٹ آیا مگر میں خوفزدہ ہونے کی حالت میں تھا پھر جب دوسرا دن ہوا تو پھر میرے دل میں خیال آیا کہ ام المومنین کی مدد کرنا ضروری اور لازم ہے اور اس سے انحراف کفر ہے چنانچہ پھر حسب روز اول تیار ہو کر چل پڑا حتیٰ کہ اسی مقام پر پہنچا جس پر اگلے دن پہنچا تھا تو وہی آواز میں نے اپنے سر کے پیچھے سے سنی۔ امیر المومنین ؑ نے فرمایا کہ یہ تو سچ کہتا ہے۔ اچھا یہ تو بتا کہ آیا تو نے پہچانا تھا کہ وہ آواز کس کی تھی۔ کہا کہ نہیں معلوم۔ امیر المومنین ؑ نے فرمایا کہ وہ ندا دہندہ تیرا بھائی ابلیس تھا اور اس نے ٹھیک کہا کیونکہ ان کے گروہ میں سے قاتل بھی اور مقتول بھی دونوں جہنمی ہیں، انتهى ما حصل الرواية۔

ان صوفیوں کی عادت ہے کہ وہ آیات و روایات متشابہ سے تمسک کرتے ہیں اور بمفاد آیت مبارکہ:[1]

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ

(سورۃ آل عمران، آیت: ۷)

ان آیات و روایات متشابہ کی اپنی خواہش کے مطابق تفسیر کرتے ہیں حالانکہ وہ آیات و روایات کسی طریقہ سے بھی ان کے فاسد مدعی پر دلالت نہیں کرتیں جیسے کہ ارشاد پروردگار ہے:

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات، آیت: ۲۱، ۲۲)۔

یہ صوفی لوگ گمان کرتے ہیں کہ اس آیت کا معنی اس طرح ہے کہ وجود حق تمہارے نفسوں میں ہے، کیا تم بصیرت

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) حضرت امام محمد باقر ؑ کا جواب بھی اسی صورت سے متعلق ہے اس لئے حضرت باقر العلوم ؑ کے ارشاد پاک کا مطلب یہی ہے کہ ہم اس طرح یہ معجزات دکھا سکتے ہیں جس طرح حضرت عیسیٰ ؑ دکھاتے تھے یعنی ہم اللہ تعالیٰ کے دربار کی طرف رجوع کر کے دعا کرتے ہیں تو خداوند عالم ہمارے ہاتھ پر بھی اسی طرح یہ معجزات صادر فرما دیتا ہے جس طرح حضرت عیسیٰ ؑ وغیرہ کے ہاتھوں پر ظاہر فرماتا تھا چنانچہ حضرت امام محمد باقر ؑ کا اس کی آنکھوں اور منہ پر ہاتھ پھیرنا یہ اللہ تعالیٰ کے دربار کی طرف رجوع کرنے اور اس سے دعا کرنے کی صورت پر ہی مشتمل تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ علیم بذات الصدور ہے۔ امام ؑ نے دربارِ خداوندی کی طرف رجوع کر کے جب یہ ارادہ کیا کہ ابوبصیر بینا ہو جائے تو یہی امام ؑ کی دعا تھی جو اللہ تعالیٰ نے منظور فرمائی اور اسے بینا کر دیا۔ لہٰذا یہ حقیقت اپنے مقام پر باقی ہے کہ معجزہ فعل خدا ہوتا ہے جو کہ معجز نما کے ہاتھوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ امام عالی مقام نے باذن اللہ فرما کر اس مطلب کو ادا کر دیا تھا کہ صورتِ اعجاز کو جب اذن خدا ہوتا ہے تو وہ ظہور پذیر ہوتی ہے اور اذن خدا ہی تو ارادۂ خدا ہے چنانچہ فرمایا: اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ (سورہ یٰسین، آیت: ۸۲) اور اس حدیث کا جو معنی ان استدلال کنندہ صاحبان نے سمجھ کر استدلال کیا ہے وہ قرین صواب نہیں کیونکہ اگر یہ معنی مراد ہو تو اس حدیث اور سابقہ ان آیات اور احادیث کے مابین تناقض اور منافات قائم ہو جائے گی جن سے ثابت ہوتا ہے کہ معجزہ فعل خدا ہوتا ہے، فعل معجز نما نہیں ہوتا حالانکہ آیات و احادیث میں تناقض ہرگز نہیں ہو سکتا۔

[1] سورۃ آل عمران، آیت ۷، کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ فتنہ فساد پھیلانے اور اپنی خواہش کے مطابات تاویل کرنے کی غرض سے ان آیات کی اتباع کرتے ہیں جو کہ متشابہات ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ اور راسخین فی العلم کے علاوہ کسی کو تاویل متشابہات کا علم حاصل نہیں۔

نہیں رکھتے؟ یعنی اللہ تعالیٰ العیاذ باللہ خود تم میں سے ہر ایک کی ذات میں موجود ہے۔ کیا تم دیکھ نہیں سکتے اور اطلاع حاصل نہیں کر سکتے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ معنی شیطان نے ان کے دلوں میں ڈالا ہے ورنہ اس کا صحیح معنی کہ جو کسی صاحب فہم سے پوشیدہ نہیں ہے یہ ہے کہ اس کے وجود کی علامات خود تمہارے نفوس میں موجود ہیں، کیا تم ان کو دیکھ نہیں سکتے؟ اور اپنے خالق کے وجود کا علم حاصل نہیں کر سکتے؟ یہ ہے اس کا صحیح معنی جیسا کہ اس آیت کا سیاق و سباق اسی مطلب پر دلالت کرنے کی شہادت دیتا ہے۔ نیز صوفی لوگ حدیث:

لو علم ابوذر ما فی قلب سلمان لقتله،

کو اس معنی پر حمل کرتے ہیں کہ حضرت سلمانؓ کے دل میں پناہ بخدا وہی صوفیوں والے فاسد عقائد تھے کہ اگر وہ ظاہر ہو جاتے تو حضرت ابوذرؓ اسے قتل کر دیتے، لیکن صوفیوں کا یہ استدلال غلط ہے کیونکہ اگر اس قسم کے اجمال کے ساتھ استدلال جائز ہو تو ہر فرقۂ باطل اس سے استدلال کرنے لگے گا اور کہہ سکے گا کہ حضرت سلمانؓ کے دل میں ہمارے اعتقادات مستور تھے، صوفی اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے اعتقادات حضرت سلمانؓ کو وحدۃ الوجود کی طرف کھینچیں گے اور اہل غلو ان کے اعتقادات کو امیر المومنین علیہ السلام کی الوہیت پر محمول کریں گے اور مفوضہ ان کو ائمہ معصومین علیہم السلام کے خالق و رزاق ہونے پر حمل کریں گے حالانکہ یہ سب کچھ باطل ہے۔ لہٰذا ان احادیث سے صوفیہ کا تمسک کیسے جائز ہو سکتا ہے؟ حالانکہ متشابہات خواہ آیات ہوں خواہ احادیث، ان کی تفسیر اپنی رائے اور خواہش کے مطابق اصلاً جائز نہیں۔ کسی حدیث کا معنی ان اصول اور اعتقادات کے مطابق طے کرنا ضروری ہوتا ہے جو قرآن کریم اور احادیث معصومین علیہم السلام اور دلائل عقلیہ سے صحیح طور پر ثابت ہیں، ان کے خلاف طے کرنا ہرگز جائز نہیں۔

مخفی نہ رہے کہ مجملات و متشابہات کی تفسیر میں بے جا جسارت جائز نہیں، کیونکہ مجمل اور متشابہ کے مختلف احتمالات ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک احتمال کا یقین نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ کہ فی الواقع وہ احتمال صحیح ہی کیوں نہ ہو کیونکہ ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنے کلمات سے جو مراد لی ہوگی اسے وہ خود ہی جانتے ہیں کہ جو ان کے کہنے والے ہیں اور ایسے مقامات میں بلا دلیل کسی معنی کو اختیار کرنے اور اسے حتمی قرار دینے کی نسبت عدم علم کا اعتراف کر لینا اسلم اور زیادہ مناسب ہے اور خلاف واقعہ معنی کو اختیار کرنے کا جرم انتہائی فحش اور قبیح تر معاملہ ہے۔

ہم تجویز کے طریقہ پر خصم کے استدلال کو باطل کرنے کے چند احتمالات کا ذکر کرتے ہیں تا کہ بمفاد:

اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال[1] خصم کا استدلال هَبَآءً مَّنْثُوْرًا [2] ہو کر رہ جائے اور جب صرف امکان اور احتمال کا یہ حکم ہے کہ اس سے استدلال باطل ہو جاتا ہے تو پھر جب متعدد قوی احتمالات پائے جائیں تو اس

---

(۱) جبکہ مدلول خصم کے خلاف کا احتمال بھی ہو سکتا ہو تو استدلال خصم باطل قرار دیا جاتا ہے۔

(۲) هباء منثورا۔ اڑتے ہوئے غبار کے ذرات۔

صورت میں طرف مقابل کا حکم ذراتِ غبار کی طرح فضا میں اڑتا ہوا نظر آئے گا۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ اس حدیث میں جب کہ چند احتمال اس کے اجمال کے باعث راہ پا سکتے ہیں تو انہوں نے پھر کہاں سے یہ علم حاصل کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد وہی فاسد معنی تھا جسے انہوں نے تجویز کیا ہے۔ ایسا کیوں نہیں جائز کہ حدیث کا معنی یہ ہو کہ جب حضرت ابوذرؓ کو حضرت سلمانؓ کے کمالات اور اس کے بلند پایہ مقامات "منازل" پر اطلاع ہو جاتی تو وہ ان کے متحمل نہ ہو سکتے اور آپس کی محبت و مودت حسد و عناد سے تبدیل ہو جاتی اور قتل و فساد تک نوبت پہنچ جاتی۔ بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ بعض انبیاء کو جب اہل بیت علیہم السلام کے مدارج کی اطلاع حاصل ہوئی تو برداشت نہ کر سکے۔ لہٰذا اگر حضرت ابوذرؓ، حضرت سلمانؓ کے مدارج کو معلوم کر کے برداشت نہ کر سکیں تو یہ کوئی بعید نہیں، یا یہ کہ اگر حضرت ابوذرؓ کو حضرت سلمانؓ کے علم اور اس کے بلند پایہ مقام اور کرامتوں کا علم ہو جاتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ گمان کرتے کہ یہ کرامتیں اور اس پایہ کا علم نبی اور وصی کے غیر کو حاصل ہی نہیں ہو سکتا لہٰذا حضرت سلمانؓ اپنے اس ادعاء میں متصنع اور جعل ساز ہے اور یہ خلافِ عادت امور جن کو وہ اپنی کرامتیں شمار کرتا ہے جادو کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے اور جادوگر کا قتل کرنا جائز اور اس کی خونریزی حلال ہے یا یہ کہ حضرت سلمانؓ ائمہ اطہار علیہم السلام کے ایسے مناقب جلیلہ و مراتب نبیلہ کو جانتے اور ان کی معرفت رکھتے تھے کہ ہر شخص ان کمالات و فضائل کے علم و معرفت کو برداشت نہیں کر سکتا اور اسی طرح وہ چاہ ہلاکت و ضلالت میں گر کر تباہ ہو جاتا ہے جس طرح کہ ایک جماعت ان کے بلند مرتبہ مدارج اور جلیل القدر کمالات و فضائل پر اور ان کے خلاف عادت کرامات و معجزات پر اطلاع پا کر حسد اور بغض کے باعث ہلاک اور تباہ ہو گئے جیسے کہ ابلیس لعین ہلاک اور برباد ہو گیا جبکہ اللہ جل شانہ نے اسے حضرت آدم صفی اللہ علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم فرمایا تو اس نے حکم رب العالمین کے مقابلہ میں تکبر اور انکار کو اختیار کیا اور یہ چیز اس کی ہلاکت کا باعث ہوئی اور کچھ لوگ ان نفوسِ قدسیہ کے فضائل و معجزات پر مطلع ہو کر حد سے متجاوز ہو گئے اور ان کی الوہیت، خالقیت اور دیگر اس قسم کے صفات کے معتقد ہو جانے کے باعث ہلاک ہو گئے اور اسی خطرہ کے پیش نظر آنحضرت سرکار رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں پر امیر المومنین علیہ السلام کے کئی ایک فضائل کو ظاہر نہیں فرماتے تھے جیسے کہ سورہ والعادیات کے شانِ نزول میں جو روایت وارد ہوئی ہے اس میں منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب امیر المومنین علیہ السلام سے فرمایا کہ اگر مجھے اپنی امت کے متعلق یہ ڈر نہ ہوتا کہ میری امت کے کچھ لوگ تیرے متعلق وہی کہنے لگیں گے جو قوم نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے متعلق کہا تھا تو میں آج تیری شان میں ایسی چیز کو بیان کرتا کہ جس کے باعث تو جس گروہ کے پاس سے گزرتا وہ تیرے قدموں کے نیچے سے خاک اٹھا کر اس سے تبرک حاصل کرتے۔

لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ڈر تھا کہ جس طرح نصاریٰ نے جب دیکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اذنِ خداوند عالم سے بعض مردے زندہ کر دکھائے تو وہ ان کی الوہیت کے قائل ہو گئے اسی طرح میری امت سے بھی امیر المومنین علی ابن

ابی طالب علیہ السلام کے متعلق ایسی ہی صورت کا مظاہرہ ہونے لگے گا لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیرالمومنین علیہ السلام کی ایسی فضیلت کو بیان نہ فرمایا لیکن شیطان نے لوگوں کو پھر بھی نہ چھوڑا۔ لہٰذا امیرالمومنین علیہ السلام کے متعلق بھی لوگوں نے جو کچھ کہا وہ قولِ نصاریٰ کی طرح انتہائی بے جا ہے اور یہی وجہ ہے کہ امیرالمومنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

يَهْلِكُ فِيَّ اثْنَانِ مُحِبٌّ مُفْرِطٌ وَ مُبْغِضٌ مُفَرِّطٌ.

کہ میری وجہ سے دو قسم کے لوگ ہلاک ہو جائیں گے اور میرا اس میں ذرا بھی قصور نہیں ہوگا۔ ان دو قسم کے لوگوں میں سے ایک تو وہ شخص ہے جو میرے ساتھ حد سے زیادہ محبت رکھتا ہے اور مجھے حد سے بڑھاتا ہے اور دوسرا وہ شخص ہے جو مجھ سے بغض و عناد رکھتا اور میری شان میں کوتاہی سے کام لیتا ہے اسی وجہ سے احادیث میں وارد ہوا کہ ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کا معاملہ نہایت سخت اور دشوار ترین ہے اس کا متحمل یا تو نبی مرسل ہو سکتا ہے یا ملک مقرب یا وہ مومن کہ اللہ تعالیٰ نے جس کے دل کے ایمان کے لئے امتحان لیا ہو کیونکہ حسب فرمانِ باری تعالیٰ عز اسمہ:

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ.

عمل کرنا انتہائی دشوار ہے حتیٰ کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شَيَّبَتْنِيْ سُوْرَةُ هُوْد کہ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا۔ فَمَا ظَنُّكَ بِسَائِرِ الْخَلْقِ۔ یعنی جب جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا ہے تو پھر کہئے کہ بقیہ مخلوق کے متعلق آپ کا کیا خیال ہو سکتا ہے۔

لہٰذا کیا تعجب ہے کہ اگر حضرت ابوذرؓ ائمہ علیہم السلام کے مراتب عالیہ اور کرامت رفیعہ پر مطلع ہو جاتے تو راہِ استقامت سے بہک کر دوسری طرف قدم رکھ دیتے، اسی لئے حضرت سلمانؓ اَسرارِ مکنونہ کو حضرت ابوذرؓ کے سامنے ظاہر کرنے سے گریز فرماتے تھے کیونکہ ان کے ظاہر کرنے سے ابوذرؓ کے واجب القتل ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا اس تاویل کے مطابق لفظ "لقتله" کی ضمیر مفعول خود حضرت ابوذرؓ کی طرف راجع ہوگی۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح سابقہ احتمالات میں ضمیر مفعول حضرت سلمانؓ کی طرف راجع ہوتی ہے اسی طرح اس تاویل میں بھی حضرت سلمانؓ ہی کی طرف راجع ہو اور حضرت سلمانؓ کے ان اسرار کو مخفی رکھنے کا سبب یہ ہو کہ وہ اسرارِ اہل بیت علیہم السلام کے مخصوص مناقب ہوں اور حضرت سلمانؓ حسب ارشاد پاک: السلمان منا اهل البيت اور ان مناقب و فضائل کی معرفت سے خصوصیت رکھتے تھے اور حضرت ابوذرؓ ان کی کنہ اور حقیقت کو معلوم نہیں کر سکتے تھے لہٰذا اگر حضرت سلمانؓ ان کو مطلع کر دیتے تو ہو سکتا تھا حضرت ابوذرؓ اسے غلو خیال کر کے حضرت سلمانؓ کو قتل کر دیتے۔

علامہ طبرسیؒ نے احتجاج میں نقل کیا ہے کہ حضرت سلمانؓ فرمایا کرتے تھے کہ میں جو فضائل علی بن ابی طالب علیہ السلام کے جانتا ہوں اگر ان میں سے بعض تمہارے سامنے بیان کر دوں تو بعض لوگ کہیں گے کہ سلمان مجنون اور دیوانہ ہے اور بعض کہیں گے کہ خداوندا! سلمان کے قاتل کو بخش دے، انتہیٰ۔ حالانکہ حضرت سلمان جو کچھ جانتے تھے یہ ہرگز نہیں

ہوسکتا کہ وہ مسئلہ وحدۃ الوجود ہو یا غلو کا مضمون ہو اگر چہ فرقہ صوفیہ اسے بزعم خود وحدۃ الوجود والی توحید پر محمول کرتے ہیں اور غالی لوگ اسے غلو کے مضمون پر محمول کرتے ہیں جیسے بعض غالیوں نے گذشتہ حدیث : لَقُلْتُ فِيكَ الْيَوْمَ مَقَالًا کو غلو پر ہی محمول کیا ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ نے امیر المومنین علیہ السلام کی اس فضیلت کو اس لئے مخفی رکھا کہ وہ لوگ اپنے فہم فاسد کے باعث غلو میں نہ پڑ جائیں یعنی ان کو غلو سے محفوظ رکھنے کے لئے اس فضیلت کو پردۂ اخفاء میں رکھا، نہ یہ کہ وہ عین غلو اور ان کا باطل عقیدہ تھا، جسے چھپایا گیا یعنی جس چیز کو پردہ پوش رکھا گیا وہ غلو نہ تھا بلکہ حق تھا مگر ایسا حق تھا کہ جس کے باعث نارسا عقلوں کے غلو میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

مختصر یہ کہ جن اعتقادات کا فاسد ہونا ادلۂ عقلیہ ونقلیہ کے ذریعہ ثابت ہے جیسے مثلاً وحدۃ الوجود اور عالم دنیا کے پیدا کرنے اور اس کی تدبیر کے انجام دینے کو غیر اللہ کی طرف نسبت دینا وہ مذکورہ بالا احادیث سے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتے اور حضرت سلمانؓ وابوذرؓ والی حدیث کے بعض دیگر محمل بھی ہو سکتے ہیں جن کو ہم نے خوفِ تطویل کے باعث ترک کر دیا ہے۔

غرض صوفیہ کا عقیدہ ایک ایسا امر ہے کہ جس کے بطلان پر بکثرت احادیث دلالت کرتی ہیں لہٰذا ان مبہم احادیث سے ان کا عقیدہ کس طرح مراد ہوسکتا ہے؟ جو احادیث صوفیہ کے اس اعتقاد کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں ان میں سے ایک حدیث وہ ہے جسے شیخ جلیل محمد بن یعقوب کلینیؒ نے کافی میں بیان کیا ہے: إِنَّ اللهَ خِلْوٌ مِنْ خَلْقِهِ وَ خَلْقَهُ خِلْوٌ مِنْهُ، یعنی حق تعالیٰ اپنی مخلوق سے جداگانہ شخصیت رکھتا ہے اور مخلوقات اس سے خالی اور جداگانہ ہے یعنی خالق اور مخلوق باہم جداگانہ اور مباینت کلی رکھتے ہیں اور ایک دوسرے میں سما نہیں سکتے۔ نیز ان ہی احادیث میں سے یونس بن عبدالرحمٰن کا وہ خط ہے جو اس نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی طرف لکھا اور حضرت نے اس کا جواب بھیجا تھا، چنانچہ تحریر ہے:

قَالَ يُونُسُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ كَتَبْتُ إِلٰى أَبِي الْحَسَنِ الرِّضَا (علیه السلام) سَأَلْتُهُ عَنْ آدَمَ هَلْ كَانَ فِيهِ مِنْ جَوْهَرِيَّةِ الرَّبِّ شَيْءٌ فَكَتَبَ إِلَيَّ جَوَابَ كِتَابِي: لَيْسَ صَاحِبُ هٰذِهِ الْمَسْأَلَةِ عَلٰى شَيْءٍ مِنَ السُّنَّةِ، زِنْدِيقٌ.

یونس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں خط ارسال کر کے ان سے سوال کیا کہ آیا حضرت آدم علیہ السلام میں ربوبیت کی حقیقت کا کوئی جوہر تھا تو آنحضرت علیہ السلام نے جواب میں لکھا کہ اس عقیدہ کا معتقد نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کے طریقہ اور ان کے دین پر نہیں ہے بلکہ وہ زندیق ہے۔

مذہب صوفیہ کے بطلان پر دلالت کرنے والی احادیث میں سے ہی ہے امیر المومنین علیہ السلام کا وہ ارشاد جو آپ نے اپنے ایک خطبہ میں صادر فرمایا کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْأَحَدِ الصَّمَدِ الْمُتَفَرِّدِ الَّذِيْ لَا مِنْ شَيْءٍ كَانَ وَ لَا مِنْ شَيْءٍ خَلَقَ مَا كَانَ قُدْرَةٌ بَانَ بِهَا مِنَ الْأَشْيَاءِ وَ بَانَتِ الْأَشْيَاءُ مِنْهُ.

یعنی ہر حمد و ثناء اس خداوند عالم وحدہٗ لاشریک بے مثل و بے مثال کا حق ہے جو تمام مخلوقات کا مرجع ہے جو نہ کسی شئے سے پیدا ہوا ہے اور نہ ہی اس نے کائنات کو کسی شئے سے پیدا کیا ہے یعنی عالم کائنات کو پیدا کرنے میں وہ مادہ اور مدت کی احتیاج نہیں رکھتا۔ اس نے ساری کائنات کو اپنی اس قدرت کاملہ سے پیدا کیا جس میں وہ تمام کائنات سے مباینت اور امتیاز رکھتا ہے اور ساری کائنات اس کی ذات والا صفات سے مباینت رکھتی ہے۔

اس مضمون کی بکثرت روایات وارد ہوئی ہیں لیکن جو مقدار ان احادیث کی ہم نے نقل کر دی ہے وہ صوفیہ کے عقیدۂ فاسدہ کے بطلان کے لئے کافی اور وافی ہے کیونکہ جب اللہ تعالی اور اس کی مخلوقات باہم افتراق اور مباینت کلی رکھتے ہیں تو پھر صوفیہ کا وحدت الوجود والا عقیدہ کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟ ذرا دیکھئے تو کہ صوفیہ کا پیر ابن عربی کہتا ہے:

ففی الخلق عین الحق ان کنت ذا عینٍ و فی الحق عین الخلق ان کنت ذا عقل.

کہ اگر تو چشم بینا رکھنے والا ہے تو مخلوق میں تجھے عین حق تعالی دکھائی دے گا اور اگر عقل رکھنے والا ہے تو عین حق تعالیٰ میں تجھے عین مخلوقات نظر آئے گی۔

و ان کنت ذا عین و عقل فما تری سوی عین شیء واحد فیہ بالشکل.

اور اگر تو چشم بینا اور عقل دونوں رکھنے والا ہے تو تو اس میں سوائے ایک ہی چیز کے اور کچھ نہیں دیکھے گا، جو کہ معین شکل کے ساتھ موجود ہے۔

ابن عربی کا یہ کلام مختل النظام صراحۃً روایاتِ مذکورہ اور دیگر بہت سی احادیث کے خلاف ہے۔ سبحان اللہ! کس قدر مقام تعجب ہے کہ حضرت ائمہ معصومین علیہم السلام جو تمام لوگوں سے زیادہ عقلمند ہیں وہ تو فرماتے ہیں کہ مخلوقات خداوند عالم کے متبائن ہے اور خداوند عالم مخلوقات سے جداگانہ اور اختلاف رکھنے والی ہستی ہے لیکن یہ بے عقل، اللہ جل شانہ حق تعالیٰ کو مخلوقات میں ثابت کر رہا ہے اور اسی طرح مخلوقات کے اللہ تعالیٰ میں ہونے کا ادعاء کر رہا ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ اور پھر طرہ یہ ہے کہ اس خیال کو عین عقلمندی ہی شمار کر رہا ہے حالانکہ اس سے بڑھ کر کوئی جہالت اور حماقت ہو ہی نہیں سکتی اور باوجود اس کے لوگ اسے اپنا پیشوا قرار دیتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی مضحکہ خیز اور تعجب انگیز معاملہ ہے۔

(۵) فلاسفہ کا ردّ:

پانچواں باطل فرقہ فلاسفہ ہیں۔ ان میں سے اکثر غیر اللہ کو قدیم اور ازلی ہونے کے وصف میں اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھتے ہیں۔ واضح باد کہ فرقہ امامیہ کا اتفاق ہے کہ عالم دنیا حادث ہے اور قدیم ہونا خداوند عالم کا خاصہ ہے اور وہ ذات پاک اس وصف میں منفرد اور یکتا ہے لیکن فلاسفہ کا گمانِ باطل یہ ہے کہ عقول عشرہ افلاک، نفوس فلکیہ، کواکب، افلاک کے حرکات،

ستارے، زمانہ بلکہ اربعہ عناصر، ارکانِ ہیولی اور مادہ یہ سب چیزیں قدیم ہیں حالانکہ یہ کفر ہے کیونکہ اللہ تعالی کے علاوہ ہر شئے حادث ہے اس لئے کہ ازل سے اللہ تعالی کی ذات پاک تو موجود ہے لیکن سب سے پہلے صرف وہی ذات پاک موجود تھی اس کے ساتھ دیگر کوئی شئے موجود نہیں تھی۔ پھر اسی پاک پروردگار نے ہر شئے کو پیدا کیا۔ لہٰذا اس کی ذات پاک کے علاوہ ہر شئے مصنوع، پیدا شدہ اور حادث ہے جیسے کہ تمام اجسام اور جسمانیات کے متعلق عقل دال ہے اور تمام کائنات کے متعلق نقل یعنی قرآن وحدیث شاہد ہے اور جو لوگ فلاسفہ کے متعلق حسن ظن رکھتے ہیں وہ اصول دینیہ و اصول فلسفہ کے ساتھ منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا نصوصِ قرآنیہ اور احادیث معصومیہ میں جس حدوث پر دلالت قائم ہوتی ہے اس کی وہ حدوثِ ذاتی کے ساتھ تاویل کرتے ہیں اور حدوث ذاتی سے مراد عقلی اعتبار سے معلول کا علت سے متاخر ہونا لیتے ہیں اگر چہ کہ علت و معلول دونوں ازلی اور قدیم ہی کیوں نہ ہوں حالانکہ یہ تاویل علیل اکثر نصوص میں جاری نہیں ہوسکتی باوجود اس کے اس تاویل کی ضرورت بھی لاحق نہیں نیز انہوں نے عالم دنیا کے قدیم ہونے پر کوئی صحیح دلیل قائم نہیں کی محض توہم[1] کی وجہ سے اللہ تعالی کی قدرت اور اختیار سے انکار کر کے وہ عالم کے قدیم ہونے کے قائل ہو گئے ہیں کہ اللہ تعالی فاعل موجب ہے اور انہوں نے ادلہ نقلیہ اور دلائل دینیہ ضروریہ کو بلا وجہ نظر انداز کر دیا ہے۔

قال اللہ تعالی: إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ (سورۃ یونس، آیت: ۳)

اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ تمہارا رب وہ اللہ جل شانہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے۔

نیز فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ (سورۃ السجدہ، آیت: ۴)

اللہ تعالی ہی وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور ان تمام چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں چھ

---

[1] فلاسفہ کا یہ توہم کہ اللہ جل شانہ فاعل موجب ہے باطل ہے کیونکہ ان کے پاس اس کے فاعل موجب ہونے کی کوئی دلیل نہیں اور حق یہ ہے کہ وہ ذات پاک فاعل مختار ہے کیونکہ عقلاً اس کا فاعل بالارادہ و اختیار ہونا محال نہیں اور فاعل موجب ہونا محال ہے اور نقلاً اس کے فاعل مختار ہونے کے دلائل حد احصاء سے باہر ہیں، چنانچہ ارشاد قدرت ہے: إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (سورہ ہود، آیت: ۱۰۷) کہ تیرا رب جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اسے ہی کرنے والا ہے، نیز فرمایا: وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ○ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ○ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ○ (سورۃ البروج، آیت: ۱۴ تا ۱۶) کہ وہ بڑا بخشنے والا، محبت کرنے والا، عرش کا مالک اور صاحب مجد و بزرگی ہے، جس کو چاہتا ہے اسے کرتا ہے، نیز فرمایا: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (سورۃ البقرہ آیت: ۲۵۳) لیکن اللہ تعالی جو چاہتا ہے اسے کرتا ہے، نیز فرمایا: قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (سورۃ آل عمران، آیت: ۴۰) خدا نے فرمایا کہ اسی طرح اللہ تعالی جو چاہتا ہے کرتا ہے، نیز فرمایا: يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ (سورۃ النساء، آیت: ۲۶) اللہ تعالی چاہتا ہے کہ تمہارے لئے وضاحت کر دے اور تمہیں ان نیک لوگوں کے طریقہ پر چلا دے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور تمہاری توبہ قبول فرمادے نیز فرمایا: وَاللّٰهُ يُرِيْدُ أَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ (سورۃ النساء، آیت: ۲۷) اور اللہ تعالی چاہتا ہے کہ تمہاری توبہ قبول کرے، نیز فرمایا: يُرِيْدُ اللّٰهُ أَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ (سورۃ النساء، آیت: ۲۸) اللہ تعالی چاہتا ہے کہ تم سے تخفیف کرے، نیز فرمایا: وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ (سورۃ ابراہیم، آیت: ۲۷) اور اللہ تعالی جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

دنوں میں پیدا کیا۔

وقال الصادق علیه السلام: هُوَ الْأَوَّلُ قَبْلَ كُلِّ شَيْءٍ.

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ پاک پروردگار اوّل ہے جو ہر شئے کے موجود ہونے سے پہلے موجود تھا۔

وقال أبو جعفر الثانی علیه السلام فی حدیث طویل مروی فی الاحتجاج: مَعَاذَ اللهِ أَنْ يَكُونَ مَعَهُ شَيْءٌ غَيْرُهُ بَلْ كَانَ اللهُ تَعَالَى ذِكْرُهُ وَلَا خَلْقَ.

حضرت ابوجعفر الثانی علیہ السلام نے ایک طولانی حدیث میں جو کہ کتاب احتجاج طبری میں مروی ہے فرمایا کہ اس عقیدہ سے خدا کی پناہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ازل سے کوئی دوسری چیز موجود تھی بلکہ ازل میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی موجود تھی اور کوئی مخلوق موجود نہ تھی۔

کتاب مہج الدعوات میں امیر المومنین علیہ السلام کی جو دعا منقول ہے اس میں یہ الفاظ موجود ہیں:

أَنْتَ اللهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ كُنْتَ إِذْ لَمْ تَكُنْ سَمَاءٌ مَبْنِيَّةٌ وَلَا أَرْضٌ مَدْحِيَّةٌ وَلَا شَمْسٌ مُضِيئَةٌ وَ لَا لَيْلٌ مُظْلِمٌ وَلَا نَهَارٌ مُضِيءٌ وَلَا بَحْرٌ لُجِّيٌّ وَلَا جَبَلٌ رَاسٍ وَلَا نَجْمٌ سَارٍ وَلَا قَمَرٌ مُنِيرٌ وَلَا رِيحٌ تَهُبُّ وَلَا سَحَابٌ يَسْكُبُ وَلَا بَرْقٌ يَلْمَعُ وَلَا رَعْدٌ يُسَبِّحُ وَلَا رُوحٌ تَنَفَّسُ وَلَا طَائِرٌ تَطِيرُ وَلَا نَارٌ تَتَوَقَّدُ وَلَا مَاءٌ يَطَّرِدُ كُنْتَ قَبْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَ كَوَّنْتَ كُلَّ شَيْءٍ وَ قَدَرْتَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ وَ ابْتَدَعْتَ كُلَّ شَيْءٍ.

تو ہی ہے بے مثل و بے مثال خدا ہے، سوائے تیرے کوئی مستحق عبادت نہیں تو اس وقت بھی موجود تھا جبکہ نہ ابھی آسمان کا نیلگوں شامیانہ تنا گیا تھا اور نہ زمین کا فرش خاکی بچھایا گیا تھا، نہ یہ ضوء پاش آفتاب پیدا ہوا تھا، نہ تاریک رات کا وجود متحقق ہوا تھا اور نہ ہی یہ روشن دن وجود پذیر ہوا تھا، نہ یہ ٹھاٹھیں مارنے والا

(بقیہ حاشیہ۔۱) نیز فرمایا: إِنَّ اللهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (سورۃ الحج، آیت: ۱۴) بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے، نیز فرمایا: اَللهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ (سورۃ الروم، آیت: ۳۷) اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے رزق وسیع کر دیتا ہے اور جس کے لئے چاہے تنگ کر دیتا ہے، نیز فرمایا: إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ أَيُّهَا النَّاسُ وَيَأْتِ بِآخَرِينَ، وَكَانَ اللهُ عَلَى ذَلِكَ قَدِيرًا (سورۃ النساء، آیت: ۱۳۳) اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اے لوگو تمہیں اگلے جہان کی طرف لے جائے اور دوسروں کو لے آئے اور اللہ تعالیٰ ازل سے اس پر قادر ہے، نیز فرمایا: إِنَّ اللهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (سورۃ المائدہ، آیت: ۱) اللہ تعالیٰ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے اس کا حکم دیتا ہے، نیز فرمایا: مَا يُرِيدُ اللهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ (سورۃ المائدہ، آیت: ۶) اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کسی قسم کی تنگی کرے لیکن اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت کو تم پر تمام اور کامل کردے۔

ان تمام آیات سے مثل روز روشن واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے لہٰذا وہ فاعل مختار ہے فاعل موجب نہیں۔ خوف تطویل کے باعث دیگر آیات اور احادیث کو نقل کرنا چھوڑ دیا ہے ورنہ ان کی فہرست بہت لمبی ہے نیز یہ کہ فاعل موجب ہونا نقص ہے اور وہ ذات والا شان ہر نقص سے پاک ہے۔

سمندر، نہ زمین میں راسخ شدہ پہاڑ، نہ چلتے ہوئے ستارے، نہ ہی نورانی چاند، نہ چلتی ہوئی ہوا، نہ برستا ہوا بادل، نہ چمکتی ہوئی بجلی، نہ جلتی ہوئی آگ، نہ جاری اور بہنے والا پانی، غرض کچھ نہ تھا مگر تو موجود تھا، تو ہر شئے سے قبل موجودِ ازلی ہے اور تو نے ہر شئے کو پیدا کیا۔

جناب امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے ایک طولانی خطبہ میں ارشاد فرمایا جو کہ نہج البلاغہ میں موجود ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْمَعْرُوفِ مِنْ غَيْرِ رُؤْيَةٍ وَ الْخَالِقِ مِنْ غَيْرِ رَوِيَّةٍ الَّذِي لَمْ يَزَلْ قَائِماً دَائِماً إِذْ لَا سَمَاءٌ ذَاتُ أَبْرَاجٍ وَلَا حُجُبٌ ذَاتُ إِرْتَاجٍ وَلَا لَيْلٌ دَاجٍ وَلَا بَحْرٌ سَاجٍ وَلَا جَبَلٌ ذُو فِجَاجٍ وَلَا فَجٌّ ذُو اعْوِجَاجٍ وَلَا أَرْضٌ ذَاتُ مِهَادٍ وَلَا خَلْقٌ ذُو اعْتِمَادٍ ذٰلِكَ مُبْتَدِعُ الْخَلْقِ وَ وَارِثُهُ وَ إِلٰهُ الْخَلْقِ وَ رَازِقُهُ۔

یعنی وہ خدا کہ بغیر دیکھنے کے جس کی معرفت اور شناخت حاصل ہے اور جو کہ بغیر سوچ بچار کی طرف محتاج ہونے کے پیدا کرنے والا ہے وہ خدا کہ جو ہمیشہ سے قائم و دائم ہے وہ اس وقت سے موجود ہے جبکہ نہ برجوں والا یہ آسمان موجود تھا اور نہ ہی دروازوں والے حجابات موجود، نہ تاریک رات، نہ ساکن سمندر، نہ دروں والے پہاڑ، نہ ٹیڑھے رستے، نہ بچھائی ہوئی زمین، نہ دیگر ایسی قوی مخلوق جس پر سہارا لیا جاسکتا ہے غرض یہ سب چیزیں موجود نہ تھیں مگر خدا موجود تھا یہی ساری مخلوقات کو پیدا کرنے والا اور اس کا وارث و مالک ہے اور تمام مخلوق کا معبود اور اس کا رازق ہے۔

یہ سب نصوص صراحۃً دلالت کرتے ہیں کہ عالم دنیا خارج میں موجود ہونے سے پہلے معدوم تھا اور جو چیز مسبوق بالعدم ہو وہ قدیم نہیں حادث ہوتی ہے اور حدوث ذاتی اس پر اصلاً منطبق نہیں ہوسکتا اور صادق نہیں آسکتا کیونکہ حدوث ذاتی معلول کے اپنی علت سے ذہن میں متاخر ہونے کا نام ہے خارج میں یہ علت اور معلول دونوں مقارن ہوتے ہیں۔ خارج میں حادث بحدوث ذاتی اپنی علت سے منفک نہیں ہوسکتا اور جب عالم دنیا اپنی علت یعنی ذات باری سے بایں معنی منفک اور جدا ہوگیا کہ ایک وقت عالم دنیا موجود نہ تھا مگر خداوند عالم ازل سے موجود ہے تو پھر معلوم ہوا کہ عالم دنیا حدوث ذاتی کے اعتبار سے حادث نہیں بلکہ وہ مسبوق بالعدم ہونے کے معنی میں حادث ہے۔

استحالۂ انقطاع فیض کے توہم کا ازالہ

بعض ایسے فلاسفہ نے کہ جو بہ تکلف فلسفی کہلانا چاہتے ہیں حدوث عالم پر یہ استحالہ وارد کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فیاض مطلق اور مبداء فیض ہے جس سے اس کے فیض کا منقطع ہو جانا محال ہے اور اگر عالم دنیا کو حادث فرض کیا جائے تو لازم آتا ہے کہ مبداء فیضان منقطع ہوجائے حالانکہ یہ باطل ہے اس لئے عالم دنیا حادث نہیں قدیم ہے۔

حضرت مصنف علامہ اعلی اللہ مقامہ فرماتے ہیں کہ انقطاع فیض کو محال سمجھنا ایسا توہم ہے جو عقل سے دور ہے کیونکہ

اللہ تعالیٰ جل شانہ کا فیض حکمت اور مصلحت جس چیز پر فیضان ہوتا ہے اس کے امکان پر مبنی ہے لہٰذا عالم دنیا کی ازلیت کے ناممکن ہونے کی تقدیر پر انقطاع فیض سے کوئی نقص لازم نہیں آتا، اسی طرح عدم تحقق مصلحت کی صورت میں بھی فیضان کا انقطاع کسی نقص کا باعث نہیں ہوسکتا حالانکہ فلاسفہ خود انقطاع فیض کے بہت سی صورتوں میں قائل ہیں کیونکہ وہ قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے صرف ایک چیز عقل اوّل[1] کے علاوہ کوئی چیز صادر نہیں ہوسکتی۔

لہٰذا بنا بر مذہب فلاسفہ اللہ تعالیٰ نے جب عقل اوّل کو پیدا کر دیا تو اب اس کا فیض منقطع ہو گیا کیونکہ اب وہ بلاواسطہ عقل اوّل کچھ نہیں کرسکتا نیز اس عالم دنیا کے علاوہ خدا کے لئے ممکن نہیں کہ کوئی دوسرا عالم پیدا کرے لہٰذا فلاسفہ اللہ تعالیٰ کے بلاواسطہ فیض کو عقل اوّل میں اور عقل اوّل کے واسطہ سے اس کے فیض کو اس ایک عالم جسمانی میں منحصر قرار دیتے ہیں نیز وہ قائل ہیں کہ فلک الافلاک کے پیچھے نہ خلا ہے، نہ ملاء حالانکہ ان کا یہ نظریہ ارتفاع نقیضین کا حکم رکھتا ہے لہٰذا وہ عقول عشرہ اور افلاک کے علاوہ فیض الٰہی کو منقطع بلا متنع سمجھتے ہیں اور اس قسم کے انقطاع اور امتناع کو وہ تسلیم کر لیتے ہیں ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تو پھر ازل میں فیض کے منقطع ہونے کو کیوں بعید قرار دیتے اور اس سے کیوں انکار کرتے ہیں؟ مختصر یہ کہ فلاسفہ کے متعلق بلاوجہ حسن ظن قائم کر کے عالم دنیا کے حادث ہونے اور اللہ جل شانہ کے فاعل مختار ہونے کے دلائل سے دست برداری اختیار نہیں کی جاسکتی۔

اخوندؒ رسالۂ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں کہ ہمارے اکثر اہل زمانہ اپنے ناقص عقول پر اعتماد کر کے اہل بیت علیہم السلام کے ارشادات اور احادیث سے دست کش ہو گئے ہیں ان میں سے ایک گروہ حکماء یعنی فلاسفہ کے مسلک کا گرویدہ ہو گیا ہے حالانکہ فلاسفہ خود گمراہ ہیں اور دیگر لوگوں کو گمراہ کرنے والے ہیں اور کسی نبی کی نبوت کا اقرار نہیں کرتے اور آسمانی کتب پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس گروہ نے اپنے عقول ناقصہ پر اعتماد اور بھروسہ کرلیا ہے اور فلاسفہ کو اپنا پیشوا بنالیا ہے لہٰذا وہ صحیح اور صریح احادیث کی بھی تاویلیں کرتے ہیں۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ فلاسفہ کے شبہات کو قوی دلائل خیال کرتے ہیں کیونکہ ان کو یونانی کافروں کے متعلق حسن ظن قائم ہو گیا ہے حالانکہ وہ صحیح اعتقاد اور درست دین و مذہب ہر گز نہیں رکھتے اور پھر ان کے باہمی اختلاف ہی کو دیکھو کوئی مشائی ہے اور کوئی اشراقی اور بہت کم ایسا ہوگا کہ ایک کا قول دوسرے سے موافقت رکھتا ہو، انتہیٰ، **ملخص ماقال اخوند علیه الرحمة.**

حضرت علامہ حلیؒ نے کتاب نہایۃ المرام فی علم الکلام میں حکماء کے پراگندہ اقوال اور مختلف کلمات بکثرت نقل کئے

---

[1] عقل اول فلاسفہ کی اصطلاح میں اس مخلوق مجرد کا نام ہے جسے اجسام کے ساتھ تدبیر و تصرف کا نہیں، تاثیر کا علاقہ حاصل ہوتا ہے اور عقول ان کے ہاں دس ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کہ جو واجب الوجود ہے وہ ہر لحاظ سے واحد اور بسیط ہے اور پھر ان کا ایک مسلمہ قاعدہ ہے **الواحد لا یصدر عنه الا الواحد،** کہ جو ہر لحاظ سے بسیط اور واحد ہو اس سے دو چیزیں صادر نہیں ہوسکتیں لہٰذا اللہ تعالیٰ صرف ایک ہی چیز کو پیدا کرسکتا تھا اس سے زائد اس سے صادر ہی نہ ہوسکتی تھیں اس لئے اس وحدہٗ لاشریک نے صرف عقل اوّل کو پیدا کیا اور پھر عقل اوّل نے عقل ثانی اور فلک اوّل کو پیدا کر دیا اور عقل ثانی نے (اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو)

ہیں چنانچہ اس کتاب کی وہ عبارت کتاب مستطاب عماد الاسلام میں پوری کی پوری منقول ہے اور اس کا عقل ونقل ہر دو کے خلاف ہونا واضح ہے لہٰذا جسے دیکھنے کا شوق ہو وہ عماد الاسلام کی طرف رجوع کرے۔

افاضل مدققین کی ایک جماعت کہ جو بیماریٔ تصوف میں مبتلا ہوگئی ہے ان کی گمراہی اور ضلالت کا سب سے بڑا سبب ان کا اصولِ فلاسفہ میں مستغرق ہو جانا اور حکمائے اشراقین ومشائین کے کلمات واقوال کے ساتھ انس اور الفت حاصل کر لینا ہے جو کہ ایک ناقد بصیر اور باخبر حقیقت پر مخفی اور مستور نہیں ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے کہہ دیا کہ تصوف اور حکمت اشراقیہ کے درمیان سوائے اس کے کوئی امتیاز اور اختلاف نہیں کہ صوفی وہ ہوتا ہے جو ظاہراً شریعت کے تابع ہو اور اگر وہ اتباع شریعت نہ کرے تو حکیم اشراقی ہوتا ہے اور تمام مکاتب فکر میں ہمیشہ ایک گروہ اصول دین کو اصول فلسفہ سے تطبیق دینے کا خواہاں رہتا ہے اور لوگوں کو صراط مستقیم سے منحرف کرتا رہتا ہے۔

ان کے فرقۂ اشاعرہ کو تعدد قدماء[1] کے قائل ہونے میں حکماء اور نصاریٰ کے اس فرقہ کی اقتداء اور اتباع حاصل ہے جو تین خداؤں کے قائل ہیں حضرت علامہ حلیؒ نے اہل سنت کے امام فخر الدین رازی کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: نصاریٰ اس وجہ سے کافر قرار دیئے گئے ہیں کہ وہ تین قدماء کے قائل ہیں اور ہمارے علماء نو (۹) قدماء کو ثابت کرتے ہیں ایک ذات خدا اور آٹھ اس کی صفتیں، جن کو وہ ذات خداوند عالم پر زائد خیال کرتے ہیں۔

یہ ہے ان کی حالت کہ سفینۂ نجات اہل بیت رسول علیہم السلام کی اتباع سے انحراف کرنے اور اہل کفر وصاحبان بدعت کی اتباع کرنے کے باعث گمراہی اور ضلالت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ۔۱) عقل ثالث اور فلک ثانی کو پیدا کیا اور عقل ثالث نے عقل رابع اور فلک ثالث کو اور عقل رابع نے عقل خامس اور فلک رابع کو پیدا کیا حتیٰ کہ یونہی سلسلہ چلتا ہوا عقل تاسع تک نوبت پہنچی تو اس نے عقل عاشر اور فلک تاسع کو پیدا کر دیا اور اس عقل عاشر نے ہیولیٰ عنصریہ اور صورۃ نوعیہ کو پیدا کر دیا انتھی **ملخصًا**، فلاسفہ کے یہ نظریات کمزور اور واہی دلائل پر مبنی ہیں لہٰذا غلط اور باطل ہیں۔

(۱) تعدد قدماء کا نظریہ عقلاً ونقلاً باطل ہے قدیم صرف ذات خداوند عالم ہے دیگر کوئی موجود قدیم نہیں ہوسکتا کیونکہ اگر دو قدیم فرض کئے جائیں تو وہ تین حال سے خالی نہیں ہو سکتے اس لئے کہ وہ دونوں یا واجب الوجود ہوں گے یا دونوں ممکن الوجود ہوں گے اور یا ایک واجب اور دوسرا ممکن اگر دونوں واجب الوجود ہوں تو یہ صراحۃً شرک اور توحید باری تعالیٰ کے منافی ہے حالانکہ وحدت واجب الوجود کے خود فلاسفہ بھی قائل ہیں اور اگر دونوں یا کوئی ایک ممکن الوجود ہو تو جو ممکن الوجود ہے وہ اپنے وجود میں ذات باری عز اسمہ کی طرف محتاج ہوگا کہ جو واجب الوجود ہے اور سابقاً ثابت ہو چکا کہ ذات باری تعالیٰ جل شانہ فاعل موجب نہیں فاعل مختار ہے اور یہ مسلم ہے کہ قادر مختار کا ہر فعل حادث ہوتا ہے کیونکہ اس کا ہر فعل ارادہ کے بعد واقع ہوتا ہے لہٰذا ہر ممکن الوجود کا حادث ہونا ضروری ہے اس لئے کوئی ممکن الوجود قدیم نہیں ہوسکتا۔ قدیم صرف ایک ہی ذات باری تعالیٰ ہے جو واجب الوجود ہے تفصیل بالا سے یہ امر بخوبی واضح ہوگیا ہے کہ حکماء نصاریٰ اور ان کے فرقہ اشاعرہ تینوں کا یہ عقیدہ باطل ہے کہ قدماء متعدد ہو سکتے ہیں اگرچہ کہ اس تعدد قدماء کی تفصیل میں وہ باہم اختلاف رکھتے ہیں۔

(۶) قولِ غلاۃ اور (۷) مفوضہ کی تردید

چھٹا باطل فرقہ غالیوں کا ہے جیسے کہ مثلاً نصیری، سبائیہ اور باطنیہ، ان غالیوں کی شاخیں بہت کچھ ہیں۔ ساتواں باطل فرقہ مفوضہ کا ہے یہ چھوٹے غالی یعنی درجہ دوم کے غالی ہیں کیونکہ غالیوں کا سرکردہ فرقہ سبائیہ ہے جن کا سب سے بڑا لیڈر عبداللہ بن سبا تھا یہ لوگ امیرالمومنین علیہ السلام کو خدا جانتے ہیں غالیوں کا اصل طریقہ یہودیت اور نصرانیت سے ماخوذ ہے عبداللہ بن سبا پہلے یہودی تھا بعد ازاں بظاہر ایمان لے آیا اس کے بعد پھر اس نے کفر کی طرف رجوع کر لیا اور اس زعم باطل کا اظہار کیا کہ العیاذ باللہ جناب امیرالمومنین علیہ السلام خدا ہیں اور میں اس کی طرف سے پیغمبر ہوں امیرالمومنین علیہ السلام نے اسے طلب کر کے اس سے پوچھا کہ تو کیا بکتا ہے؟ اس نے اپنا اعتقاد فاسد بیان کیا کہ میرے دل میں یہ چیز آ گئی ہے کہ تو خدا ہے اور میں تیرا پیغمبر ہوں حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ پھٹکار ہو تجھ پر یہ شیطان نے تیرا مذاق اڑایا ہے تیری والدہ تیرے ماتم میں بیٹھے اپنے اس اعتقاد بد سے توبہ کر، اس نے توبہ سے انکار کیا حضرت علیہ السلام نے اسے تین دن تک قید خانے میں بند رکھا مگر وہ اس کے بعد بھی توبہ پر راضی نہ ہوا حضرت علیہ السلام نے اسے قید سے باہر لا کر آگ میں جلا دیا۔

مفوضہ عبداللہ بن سبا کے بیٹے کی اتباع میں ہیں جو غلو میں اپنے باپ سے ایک درجہ نیچے اُتر آیا اور اس کا قائل ہوا کہ خلق اور رزق کا معاملہ ائمہ علیہم السلام کو تفویض کر دیا گیا ہے لیکن مفوضہ بھی درحقیقت غالیوں کی ایک شاخ ہے کیونکہ غلو کی تعریف ان پر صادق آتی ہے اور یہ اس لئے کہ غلو کی تعریف ہے کسی دینی معاملہ میں حد سے تجاوز کرنا اور اس تعریف کے مفوضہ پر صادق آنے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا اور یہی وجہ ہے کہ صاحب الملل والنحل وغیرہ نے ان کو غالیوں کے شمار میں رکھا ہے لیکن بعض اوقات علماء غالیوں کو اس فرقہ سے مختص قرار دیتے ہیں جو ائمہ علیہم السلام کی الوہیت کے قائل ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ افراد غلو میں سے فردِ اظہر انہیں الوہیت ائمہ علیہم السلام کے قائلین میں متحقق ہے اس بنا پر مفوضہ غالیوں کی قسم نہیں بلکہ یہ ان کے قسیم ہوں گے اور یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں مفوضہ کا ذکر غالیوں کے مقابلہ میں واقع ہوا ہے۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے منقول[1] ہے کہ غالی کافر ہیں اور مفوضہ مشرک ہیں۔ جو شخص ان کے ساتھ ہم نشینی اختیار کرے ان کے ساتھ اختلاط اور میل جول رکھے یا ان کے ساتھ کوئی چیز کھائے یا پیئے یا ان کے ساتھ کوئی رابطہ و

---

[1] کتاب الدمعۃ الساکبۃ (کہنہ) ج ۳، صفحہ: ۶۰ بحوالہ کتاب العیون نیز کتاب عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج ۲ صفحہ ۱۵۸ پر یہ روایت مرقوم ہے الدمعۃ الساکبۃ میں اصل عربی الفاظ یہ ہیں: وفیہ ایضا باسنادہ عن أبی ھاشم الجعفری قال سألت أبا الحسن الرضا عن الغلاۃ و المفوضۃ فقال الغلاۃ کفار و المفوضۃ مشرکون، من جالسھم أو خالطھم أو أکلھم أو شاربھم أو واصلھم أو زوجھم أو تزوج منھم أو آمنھم أو ائتمنھم علی أمانۃ أو صدق حدیثھم أو أعانھم بشطر کلمۃ خرج من ولایۃ اللہ عز و جل و ولایۃ رسول اللہ (ص) و ولایتنا أھل البیت (ع)، کتاب منہاج البراعۃ شرح نہج البلاغہ، ج ۲، صفحہ ۱۰۹ میں بھی بحوالہ عیون اخبار الرضا علیہ السلام یہی روایت منقول ہے۔

تعلق قائم کرے یا ان کے ساتھ رشتہ نکاح قائم کرے یا ان کو کسی امانت کا امین بنائے یا ان کی امانت اپنے پاس رکھے یا ان کی بات کی تصدیق کرے یا ان کی اعانت کرے اگرچہ کہ ایک کلمہ کے ذریعہ یا ایک کلمے کے کسی حصے کے ذریعہ ہوتو وہ اللہ تعالیٰ کی دوستی اور ولایت اور رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واہل بیت علیہم السلام کی ولایت اور دوستی سے خارج ہو جاتا ہے۔

شیخ جلیل ابن بابویہ قمی شیخ صدوق ؒ نے اپنے اعتقادیہ میں زرارہ سے روایت[1] کی ہے کہ میں نے حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ عبداللہ بن سبا کی اولاد میں سے ایک شخص تفویض کا قائل ہو گیا ہے، فرمایا کہ تفویض کیا چیز ہے؟ میں نے عرض کیا کہ وہ کہتا ہے کہ خداوند عالم نے محمد مصطفیٰ وعلی مرتضیٰ علیہما السلام کو پیدا کیا پھر عالم دنیا کا معاملہ ان کے سپرد کر دیا لہٰذا ان دو بزرگواروں نے عالم دنیا کو پیدا کیا، مخلوق کو رزق دیا، وہی زندہ کرتے ہیں اور وہی موت دیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جھوٹا ہے یہ دشمن خدا۔ فرمایا کہ جب تم واپس جاؤ گے تو اس کے سامنے سورہ رعد کی یہ آیت پڑھے گا:

أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۚ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (سورۃ الرعد، آیت:۱۶)

کہ کیا انہوں نے اللہ کے ایسے شریک بنا لئے ہیں جنہوں نے مخلوق خدا کی طرح مخلوق پیدا کی ہے جس کے باعث مخلوقات ان پر مشتبہ ہوگئی، کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کا خالق ہے اور وہ یکتا، یگانہ اور ہر شئے پر غالب اور قادر ہے۔

چنانچہ میں جب واپس لوٹ کر اس کے پاس گیا اور اس سے وہ سب کچھ بیان کیا جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا تھا تو ایسا خاموش ہو گیا کہ گویا میں نے اس کے منہ میں پتھر ٹھونس دیا، یا یہ کہ وہ گونگا ہو گیا ہے۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی بعض دعاؤں میں یہ الفاظ وارد ہیں[2]:

---

[1] کتاب مرآۃ العقول شرح اصول الکافی ج ۱، صفحہ ۱۹۳ میں یہ روایت درج ذیل عربی الفاظ میں مرقوم ہے جو بحوالہ اعتقادیہ شیخ صدوق نقل کی گئی ہے: وروی عن زرارۃ أنه قال قلت للصادق (ع) إن رجلا من ولد عبد الله بن سبإ يقول بالتفويض فقال و ما التفويض قلت إن الله تبارك و تعالى خلق محمدا و عليا صلوات الله عليهما ففوض إليهما فخلقا ورزقا و أماتا و أحييا فقال (ع) كذب عدو الله إذا انصرفت إليه فاتل عليه هذه الآية التي في سورة الرعد: أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۚ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿١٦﴾ فانصرفت إلى الرجل فأخبرته فكأني ألقمته حجرا أو قال فكأنما خرس. نیز دیکھو کتاب منہاج البراعۃ شرح نہج البلاغہ ج ۲ صفحہ:۱۰۸۔

[2] کتاب مرآۃ العقول ج ۱ صفحہ: ۱۹۳ میں یہ عبارت بھی منقول ہے اور اس کے ساتھ پہلے متصل یہ الفاظ بھی بحوالہ اعتقادیہ شیخ صدوق علیہ الرحمہ منقول ہیں: اعتقادنا في الغلاة و المفوضة أنهم كفار بالله تعالى جل جلاله، و أنهم أشرّ من اليهود و النصارى و المجوس و القدرية و الحرورية و من جميع أهل البدع و الأهواء المضلّة. (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اَللّٰهُمَّ لَا تَلِيقُ الرُّبُوبِيَّةُ إِلَّا بِكَ وَ لَا تَصْلُحُ الْإِلٰهِيَّةُ إِلَّا لَكَ فَالْعَنِ النَّصَارٰى الَّذِينَ صَغَّرُوا عَظَمَتَكَ وَ الْعَنِ الْمُضَاهِيِينَ لِقَوْلِهِمْ مِنْ بَرِيَّتِكَ. اَللّٰهُمَّ إِنَّا عَبِيدُكَ وَ أَبْنَاءُ عَبِيدِكَ لَا نَمْلِكُ لِأَنْفُسِنَا نَفْعاً وَ لَا ضَرّاً وَ لَا مَوْتاً وَ حَيَاةً وَ لَا نُشُوراً. اَللّٰهُمَّ مَنْ زَعَمَ أَنَّا أَرْبَابٌ فَنَحْنُ مِنْهُ بِرَاءٌ وَ مَنْ زَعَمَ أَنَّ إِلَيْنَا الْخَلْقَ وَ عَلَيْنَا الرِّزْقَ فَنَحْنُ بِرَاءٌ مِنْهُ كَبَرَاءَةِ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ (ع) مِنَ النَّصَارٰى. اَللّٰهُمَّ إِنَّا لَمْ نَدْعُهُمْ إِلٰى مَا يَزْعُمُونَ فَلَا تُؤَاخِذْنَا بِمَا يَقُولُونَ وَ اغْفِرْ لَنَا مَا يَدَّعُونَ وَ لَا تَدَعْ عَلَى الْأَرْضِ مِنْهُمْ دَيَّاراً إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَ لَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِراً كَفَّاراً.

یعنی اے پروردگارا! رب اور خدا ہونا صرف تیری ہی ذات کو لائق ہے دیگر کسی کو لائق نہیں لہٰذا نصاریٰ کو اپنی رحمت سے دور رکھ اور انہیں لعنت کا نشانہ بنا کیونکہ انہوں نے تیری شان میں سبکی کا ارتکاب کیا اور ان پر بھی لعنت کر اور ان کو اپنی رحمت سے دور رکھ جو تجھے اپنے کلام میں اجسام کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں کہ جو اجسام تیری ہی مخلوق ہے۔ اے پروردگار ہم تیرے بندے ہیں اور تیرے بندوں کی اولاد ہیں ہم اپنے نفع وضرر، موت وحیات اور بعد از موت پھر زندہ ہونے کے مالک نہیں ہیں، خداوندا! جو شخص یہ گمان کرے کہ ہم پروردگار اور رب ہیں ہم اس کے اس اعتقاد سے بیزار ہیں اور جو شخص یہ گمان کرے کہ عالم دنیا کو پیدا کرنا ہماری طرف سپرد کر دیا گیا ہے اور رزق دینے کی ذمہ داری ہم پر لگا

(بقیہ حاشیہ۔۱) و انه ما صغر الله جل جلاله تصغيرهم شيء الى قوله رحمه الله. و كان الرضا عليه السلام يقول في دعائه: اللهم انى برىء اليك من الحول و القوة و لا حول و لا قوة الا بك. اللهم انى برىء اليك من الذين ادعوا لنا ما ليس لنا بحق. اللهم انى ابرء اليك من الذين قالوا فينا ما لم نقله في انفسنا. اللهم لك الخلق و منك الرزق و اياك نعبد و اياك نستعين. اللهم انت خالقنا و خالق آبائنا الاولين و آبائنا الآخرين. اللهم لا تليق الربوبية... الخ.

نیز دیکھو یہ روایت کتاب منہاج البراعۃ شرح نہج البلاغہ ج ۲ صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸، اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ شیخ صدوق ؒ فرماتے ہیں: ہمارا اعتقاد غالیوں اور مفوضہ کے متعلق یہ ہے کہ وہ ملاعین کافر باللہ ہیں، وہ یہودیوں سے بھی بدتر ہیں اور نصاریٰ، مجوس قدریہ یعنی معتزلہ اور حروریہ یعنی خارجیوں سے بھی بدتر ہیں اور تمام بدعتی اور گمراہ کن مذہب رکھنے والے فرقوں سے بھی وہ برے اور بدتر ہیں اللہ تعالیٰ جل شانہ کی عظمت کو جس طرح انہوں نے گرایا اور شان خداوند عالم کی جس قدر انہوں نے تحقیر اور توہین کی ایسی کسی نے نہیں کی۔ اپنے کلام کو جاری رکھتے ہوئے شیخ صدوق ؒ نے بعد کو فرمایا کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام اپنی دعاء میں فرمایا کرتے تھے کہ اے پروردگار میں اس قوت اور طاقت سے بری اور بیزار ہوں جو تیری جانب سے نہ ہو کیونکہ کوئی طاقت اور قوت ایسی نہیں ہوسکتی جو تیرے ذریعہ حاصل نہ ہو۔ اے پروردگار میں تیرے دربار میں ان لوگوں سے بری اور بیزار ہوں جو ہمارے لئے ان اوصاف اور کمالات کا ادعاء کرتے ہیں جن سے متصف ہونا ہماری شان اور ہمارا حق نہیں۔ اے پروردگار میں ان لوگوں سے بیزاری اور تیری پناہ حاصل کرتا ہوں جنہوں نے ہماری شان میں اور ہمارے متعلق وہ کچھ کہہ دیا جو ہم نے خود اپنے متعلق نہیں کہا۔ اے پروردگار پیدا کرنا تیرے لئے ہی خاص ہے اور رزق تیری ہی جانب سے حاصل ہوتا ہے۔ اے پروردگار ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اے پروردگار تو ہمارا بھی خالق ہے اور ہمارے آباء اولین و آباء آخرین کا بھی خالق ہے۔ اس کے بعد وہ عبارت منقول ہے جو متن کتاب میں مصنف علامہ اعلی اللہ مقامہ نے نقل فرمائی ہے۔

دی گئی ہے ہم اسی طرح اس سے بری اور بیزار ہیں جس طرح کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہا السلام نے اپنی امت نصاریٰ کے اعتقاد بد سے بیزاری اختیار کی تھی، اے پروردگار! جو کچھ یہ گمان کرتے ہیں ہم نے اس کی انہیں ہرگز دعوت نہیں دی، لہٰذا جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کا ہم سے مواخذہ نہ ہو اور جو کچھ گمان باطل وہ رکھتے ہیں ہم اس سے تیری معافی چاہتے ہیں، اے پروردگار! زمین پر ان کافروں کا کوئی گھرانہ باقی نہ رکھ کیونکہ اگر تو انہیں باقی چھوڑے گا تو تیرے بندوں کو وہ گمراہ کر دیں گے اور جو اولاد وہ پیدا کریں گے وہ کافر اور فاجر ہی ہوں گے۔

اس قسم کی بکثرت[1] روایات جو حد احصاء وشمار سے باہر ہیں واقعات لیل ونہار میں ائمہ اطہار علیہم السلام سے وارد ہوئی

---

(۱) بے شک مفوضہ کی مذمت اور ان کے مسلک کے بطلان کے بارے میں بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں۔ سب کا احصاء تو قاصر کی طاقت سے باہر ہے مگر چند ایک کو سپرد قرطاس کیا جاتا ہے تاکہ طالبانِ حق کے لئے انجلاء کا باعث ہو۔

(۱-۱) کتاب منہاج البراعۃ شرح نہج البلاغہ ج ۲، صفحہ ۱۰۹، بحوالہ العیون اخبار الرضا علیہ السلام، عَنِ الرِّضَا (ع) فِيْ حَدِيْثٍ قَالَ مَنْ زَعَمَ أَنَّ اللهَ يَفْعَلُ أَفْعَالَنَا ثُمَّ يُعَذِّبُنَا عَلَيْهَا فَقَدْ قَالَ بِالْجَبْرِ وَ مَنْ زَعَمَ أَنَّ اللهَ عَزَّ وَ جَلَّ فَوَّضَ أَمْرَ الْخَلْقِ وَ الرِّزْقِ إِلَى حُجَجِهِ (ع) فَقَدْ قَالَ بِالتَّفْوِيضِ وَ الْقَائِلُ بِالْجَبْرِ كَافِرٌ وَ الْقَائِلُ بِالتَّفْوِيضِ مُشْرِكٌ، نیز کتاب مراۃ العقول ج ۱، صفحہ ۱۹۲

ماحصل یہ ہے کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص یہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ خود ہمارے افعال کو کرتا ہے یعنی ہم کچھ نہیں کرتے وہی سب کچھ کرتا ہے اور پھر ہمیں ان افعال کے باعث عذاب دے گا تو یہ شخص جبر کا قائل ہے اور جو شخص یہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے اور رزق دینے کو ائمہ علیہم السلام کے سپرد کر دیا ہے تو وہ تفویض کا قائل ہے۔ پھر فرمایا کہ جبر کا قائل کافر ہے اور تفویض کا قائل مشرک۔ مقیاس الہدایۃ ملحق بہ رجال مامقانی ج ۳، صفحہ ۸۸-۸۹۔

(۱-۲) منہاج البراعۃ ج ۲، صفحہ: ۱۰۹، بحوالہ بحار الانوار، رجال کشی سے منقول ہے: عن عبد الله بن شريك عن أبيه قال بينا علي عليه السلام عن امرأة له من عنزة و هي أم عمرو إذ أتاه قنبر فقال إن عشرة نفر بالباب يزعمون أنك ربهم فقال أدخلهم قال فدخلوا عليه فقال لهم ما تقولون فقالوا إنك ربنا و أنت الذي خلقتنا و أنت الذي رزقتنا فقال ويلكم لا تفعلوا إنما أنا مخلوق مثلكم فأبوا أن يفعلوا فقال لهم ويلكم ربي و ربكم الله ويلكم توبوا و ارجعوا فقالوا لا نرجع عن مقالتنا أنت ربنا ترزقنا و أنت خلقتنا فقال يا قنبر ائتني بالفعلة فخرج قنبر فأتاه بعشرة رجال مع الزبل و المرور فأمر أن يحفروا لهم في الأرض فلما حفروا خدا أمر بالحطب و النار فطرح فيه حتى صار نارا تتوقد قال لهم توبوا قالوا لا نرجع فقذف بعضهم ثم قذف بقيتهم في النار. قال عليه الصلوة والسلام أني اذا رأيت شيئا منكر اوقدت ناري و دعوت قنبرا. ماحصل اینکہ عبداللہ بن شریک نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام اپنی ایک زوجہ کے پاس تشریف فرما تھے اور وہ بی بی ام عمرو تھیں کہ اتنے میں قنبر امیر المومنین علیہ السلام کا غلام حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ دس آدمی دروازے پر کھڑے ہیں جو کہتے ہیں کہ "العیاذ باللہ" آپ ان کے رب ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: ان کو اندر لے آؤ۔ وہ اندر آ گئے۔ آپ علیہ السلام نے ان سے فرمایا: تم کیا کہتے ہو؟! کہنے لگے: تو ہمارا رب ہے، تو نے ہی ہمیں پیدا کیا، تو نے ہی ہمیں رزق دیا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: تم پر پھٹکار ہو، ایسا مت کہو۔ میں تو تمہاری مثل مخلوق ہوں۔ انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا تو امام علیہ السلام نے فرمایا: تم پر پھٹکار، میرا رب اور تمہارا رب اللہ ہے، پھٹکار کے لائق لوگو، توبہ کرو اور اس خیال سے واپس آؤ، تو انہوں نے کہا ہم اپنے قول سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ تو ہی ہمارا رب ہے، تو ہی ہمیں رزق دیتا ہے اور تو نے ہی ہمیں خلق کیا۔ حضرتؑ نے قنبر سے فرمایا کہ جایئے مزدوروں کا عملہ بلا لایئے۔ قنبر باہر چلے گئے..... (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

ہیں مگر مقام افسوس ہے کہ اس زمانہ ماضی قریب میں بعض مدعیان فضیلت کہ غالباً ان مدعیان فضیلت سے مراد شیخ احمد احسائی اور اس کی اتباع یعنی شیخیہ ہیں، نے عنوانات کو تھوڑا سا اختلافی رنگ دے کر غلات اور مفوضہ کے طریقہ باطلہ کی تجدید کرنے کا ارتکاب کیا ہے۔ وہ اصول دین کو اصول فلسفہ کے ساتھ تطبیق دینے کی خواہش رکھتے ہیں اور غلات اور

(بقیہ حاشیہ۔۱) اور دس آدمی آپ کی خدمت میں لے آئے جنہوں نے کھدائی کے لئے ٹوکریاں اور اوزار اٹھا رکھے تھے۔ حضرت علیہ السلام نے ان کو حکم دیا کہ زمین میں ایک گڑھا کھودیے۔ جب انہوں نے خندق سی کھودڈالی تو حضرت علیہ السلام نے فرمایا اس میں لکڑیاں ڈال کر آگ جلائی جائے چنانچہ آگ جلا دی گئی حتیٰ کہ جب خوب دہکنے لگی تو حضرت علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اپنے اس اعتقاد سے توبہ کرو۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنے اعتقاد سے ہرگز نہیں ہٹ سکتے۔ جب انہوں نے ضد کی تو حضرت علیہ السلام نے پہلے ان میں سے بعض کو اس آگ میں جھونک دیا، اس کے بعد بقیہ کو بھی ان کی ہٹ دھرمی کے باعث اس آگ کا ایندھن بنا دیا پھر فرمایا کہ جب بھی میں کوئی ایسا خلاف شرع امر دیکھوں گا تو قنبر کو بلا کر اسی طرح آگ کا اہتمام کروں گا۔

(۱۔۳) منہاج البراعۃ ج ۲ صفحہ ۱۰۹، بحوالہ کتاب الاحتجاج للطبرسی و کتاب عیون اخبار الرضا علیہ السلام: أبو الحسن علی بن أحمد الدلال القمی قال اختلف جماعة من الشيعة في أن الله عز وجل فوض إلى الأئمة أن يخلقوا و يرزقوا فقال قوم هذا محال لا يجوز على الله تعالى لأن الأجسام لا يقدر على خلقها غير الله عز و جل وقال آخرون بل الله أقدر الأئمة على ذلك و فوض إليهم فخلقوا و رزقوا و تنازعوا في ذلك نزاعا شديدا فقال قائل ما بالكم لا ترجعون إلى أبي جعفر محمد بن عثمان فتسألوه عن ذلك ليوضح لكم الحق فيه فإنه الطريق إلى صاحب الأمر فرضيت الجماعة بأبي جعفر و سلمت و أجابت إلى قوله فكتبوا المسألة و أنفذوها إليه فخرج إليهم من جهته توقيع نسخته إن الله تعالى هو الذي خلق الأجسام و قسم الأرزاق لأنه ليس بجسم ولا حال في جسم ليس كمثله شيء وهو السميع البصير و أما الأئمة عليهم السلام فإنهم يسألون الله تعالى فيخلق و يسألونه فيرزق إيجابا لمسألتهم وإعظاما لحقهم. (مرآۃ العقول ج۱، صفحہ: ۱۹۲، الاحتجاج للطبرسی صفحہ: ۲۶۷) علی بن احمد قمی دلال سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیعہ کی ایک جماعت میں اس کے متعلق اختلاف واقع ہوگیا کہ آیا اللہ تعالیٰ نے عالم دنیا کے پیدا کرنے اور رزق دینے کے معاملہ کو ائمہ علیہم السلام کے سپرد کر دیا ہے یا نہیں؟ ایک گروہ نے کہا کہ یہ محال ہے ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ پیدا کرنے کا معاملہ کسی کے سپرد کرے کیونکہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی ہستی اجسام کے پیدا کرنے پر قادر ہی نہیں ہوسکتی۔ دوسرے گروہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ائمہ علیہم السلام کو اس پر قادر کر دیا ہے اور پھر یہ معاملہ ان کے سپرد کر دیا ہے لہٰذا انہوں نے ہی "سب کچھ" پیدا کیا ہے اور انہوں نے ہی "سب کو" رزق دیا ہے۔ اس بارے میں ہر دو گروہوں نے باہم بڑا سخت جھگڑا اور تنازع قائم کر دیا تو کسی سمجھ دار نے ان سے کہا کہ تم اس مسئلہ کے متعلق حضرت صاحب الامر (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے وکیل جناب ابوجعفر محمد ابن عثمانؒ کی طرف کیوں رجوع نہیں کرتے؟ ان سے سوال کیجئے تاکہ وہ جو حق ہو اُسے واضح کر دیں کیونکہ وہ ہی تو حضرت صاحب الامر امام زمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت تک رسائی کا واسطہ اور وسیلہ ہیں۔ چنانچہ وہ پوری جماعت حضرت ابوجعفر محمد بن عثمانؒ کے فیصلے پر راضی ہوگئی اور ان کے ارشاد کو تسلیم اور قبول کرنے پر سب نے اتفاق کا اظہار کر دیا۔ لہٰذا یہ مسئلہ تحریر کیا اور حضرت ابوجعفر کی معرفت حضرت امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی خدمت میں اسے ارسال کر دیا تو حضور صاحب زمانہ علیہ السلام کے دستخط مبارک اور مہر سے مصدقہ جواب آگیا جس کے الفاظ یہ تھے: "صرف اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات پاک ہے جس نے تمام جسموں کو پیدا کیا اور تمام رزقوں کو تقسیم کیا ہے کیونکہ وہ نہ جسم ہے، نہ ہی جسم میں حلول کرنے والا ہے۔ اس کی مثل کوئی شئے نہیں اور وہ سمیع و بصیر ہے، رہا شان ائمہ علیہم السلام کا بیان تو ان کی عظمت اور جلالتِ قدر کی یہ شان ہے کہ وہ جب اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو پیدا کرنے یا کسی کو رزق دینے کا سوال اور دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو رد نہیں کرتا بلکہ ان کے حق کی عظمت اور شان کی بلندی کے باعث ان کی دعا کو شرف قبولیت سے مشرف کرتا اور مطلوبہ چیز کو پیدا کر دیتا اور جس کے رزق کی دعا ہوتی ہے اس کو عطا کرتا ہے۔" (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

مفوضہ کے اقوال اور ان کی روایات کی تصحیح اور تاویل کے درپے رہتے ہیں اور باوجود اس کے وہ اپنے آپ کو ان کے اقوال سے بری اور بیزار قرار دیتے ہیں حالانکہ ان کے ان اقوال ہی کی مثل اقوال کو اپنی زبان پر جاری رکھتے ہیں جو کفر اور زندیقیت پر ظاہراً دلالت کرتے ہیں اور انہیں اقوال کو انہوں نے اپنا اوڑھنا، بچھونا اور لباس ظاہر و باطن بنا رکھا ہے۔ کبھی کہتے ہیں علی علیہ السلام نفس اللہ ہے، کبھی کہتے ہیں معرفت امام عین معرفت خدا ہے حالانکہ واجب الوجود اور ممکن

(بقیہ حاشیہ۔۱)

حدیث نمبر ۱ سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مفوضہ مشرک ہیں اور حدیث نمبر ۲ سے یہ ثمرہ حاصل ہوتا ہے کہ مفوضہ کی دنیا میں بھی سزا یہ ہے کہ ان کو آگ میں جلا دیا جائے۔ حدیث نمبر ۳ سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ کوئی جسم یا جسمانی طاقت جو کہ جسم میں حال ہوتی ہے کسی جسم کو پیدا نہیں کرسکتی اس لئے سوائے خدا کے اور کوئی ہستی کسی جسم کو پیدا کرنے پر قادر ہی نہیں ہوسکتی تو پھر پیدا کرنے کے معاملہ کو ائمہ علیہم السلام کے سپرد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کیونکہ کوئی کام اسی شخص کے سپرد کیا جاسکتا ہے جو اس کے کرنے پر قادر ہو اور جب کرنے کی قدرت ہی حاصل نہ ہو تو پھر اس کام کا سپرد کرنا عبث، بے سود، اور بے مقصد ہو کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا مفوضہ کا یہ عقیدہ باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عالم دنیا کو ائمہ علیہم السلام کے واسطے سے پیدا کیا ہے بلکہ حق یہ ہے کہ ہر جسم کو پیدا کرنے والی خود خدا کی ذات ہے کیونکہ ان اللہ ھو الذی خلق الاجسام کے جملہ میں "ھو" ضمیر فصل ہے جو حصر کا فائدہ دیتی ہے۔

اور لفظ "الاجسام" پر لام استغراق داخل ہے کیونکہ اجسام جسم کی جمع ہے اور جمع پر جب لام داخل ہو اور وہ عہد کا نہ ہوسکے تو وہ مسلم طور پر استغراق کا فائدہ دیتا ہے لہٰذا جملہ مذکورہ کا صراحۃً معنی یہ ہے کہ بس خداوند عالم کی ذات ہی وہ ذات پاک ہے جس نے ہر ہر جسم کو پیدا کیا ہے۔ پھر "لأنه ليس بجسم ولا حال فی جسم" کے الفاظ کے ذریعہ اس حکم کی علت بیان کی گئی ہے کہ صرف خداوند عالم ہی ہر ہر جسم کو پیدا کرنے والا ہے اور اس تعلیل سے صراحۃً یہ مطلب سمجھ آتا ہے کہ جو جسم رکھنے والی ہستی ہے جسم کو پیدا نہیں کرسکتی، علیٰ ہذا القیاس کوئی جسمانی طاقت جسم کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہوسکتی لہٰذا ممکن ہی نہیں کہ جسمانی طاقت سے کوئی جسم پیدا ہوا۔

اور "و قسم الارزاق" میں جس تقسیم کا تذکرہ ہے وہ تقسیم ازلی ہے کیونکہ ازل سے اللہ تعالیٰ کو یہ علم حاصل ہے کہ ہر شخص اپنے رزق میں کیا کیا چیز اور کتنی مقدار حاصل کرے گا اور اسی علم ازلی کے مطابق ہر شخص کو دنیا میں رزق عطا کیا جاتا ہے جو ہر شخص کی قسمت میں ہے۔ اس تقسیم سے دنیا میں ہر شخص تک رزق کو پہنچانا مراد نہیں کیونکہ مشاہدہ گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کے رزق کو اس تک پہنچانے کا ایسا کوئی اہتمام و انتظام نہیں فرمایا کہ کوئی خدا کا فرستادہ ہر شخص کا رزق اس تک پہنچا دیا کرے بلکہ ہر انسان شرعاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور اور مکلف ہے کہ وہ حلال طریقہ پر رزق کو کمانے کی کوشش کرے۔ ساتھ ہی مامور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں اپنے رزق اور اس کی وسعت وغیرہ کے لئے دعا کرے۔ تصدق، صلہ رحمی، نماز پنجگانہ کی پابندی، نماز تہجد وغیرہ اعمال صالحہ بجالائے کیونکہ کسب معاش کی کوشش، نماز کے بعد تعقیبات کا بجالانا دیگر عمل صالح وغیرہ منجانب اللہ رزق کے حاصل ہونے کے اسباب ہیں۔ ان اسباب ظاہرہ کے طفیل حصول رزق کے مخفی اسباب بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کی مہربانی کے ساتھ حاصل اور میسر آجاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا علم چونکہ حاوی ہے کیونکہ اسے ہر شئے کا علم حاصل ہے اس لئے ہر شخص کو اس کی قسمت ازلی کے مطابق جس سبب سے رزق حاصل ہونا ہوتا ہے حاصل ہوجاتا ہے۔

اما الائمة فانهم یسئلون الله الخ کے الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ ائمہ علیہم السلام ہماری دعاؤں کی قبولیت کا وسیلہ ہیں جب ہم ان کو اپنی دعا کی استجابت کے لئے وسیلہ بنائیں اور وہ مقتضائے مصلحت کے مطابق دربار رب العزت میں سفارش اور شفاعت کردیں تو اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کو قبول کر لیتا ہے اور ہماری حاجات پوری کردیتا ہے لیکن مفوضہ کا یہ اعتقاد درست نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے اور رزق دینے کا معاملہ ائمہ علیہم السلام کے سپرد کردیا ہے بس اب وہی نفوس مقدسہ اس ذمہ داری کو اپنی صوابدید کے مطابق مستقل طور پر یا خداوند عالم کے وقتاً فوقتاً پہنچنے والے حکم کے مطابق انجام دیتے رہے اور انجام دیتے رہتے ہیں۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

الوجود کی معرفت میں اتحاد نہیں ہوسکتا، اگر ہوسکتا ہے تو اس صورت کہ واجب الوجود اور ممکن الوجود ہر دو کی ذوات میں اتحاد فرض کیا جائے۔

حالانکہ واجب الوجود کہ جو مخلوقات اور ممکنات کا ہم جنس ہونے سے پاک و پاکیزہ اور بلند و بالا ہے اس کی ذات اور ممکن الوجود کی ذات میں اتحاد حقیقت کے اعتبار سے ہرگز نہیں ہوسکتا اور مجاز کے لحاظ سے بھی اس اتحاد کا حکم لگانا علی الاطلاق جائز نہیں اور بعض متشابہات پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے اور کبھی یہ لوگ فعل خدا کو ایک ایسا خاص جو ہر

(بقیہ حاشیہ۔۱)

(۱۔۴) منہاج البراعۃ شرح نہج البلاغۃ ج ۲، صفحہ ۱۰۲، بحوالہ عیون اخبار الرضاؑ، ج ۲، ص ۱۵۸:

حدثنا محمد بن علي ماجيلويه (ره) قال حدثنا علي بن إبراهيم بن هاشم عن أبيه عن ياسر الخادم قال قلت للرضا (ع) ما تقول في التفويض؟ فقال: إن الله تبارك و تعالى فوض إلى نبيه (ص) أمر دينه فقال وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ، وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا، فأما الخلق و الرزق فلا ثم قال (ع): إن الله عز وجل يقول: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ، هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ، سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (سورۃ الروم، آیت: ۴۰)۔

بسند مذکور یاسر خادم سے روایت ہے کہ میں نے حضرت امام رضاؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ تفویض کے متعلق کیا فرماتے ہیں تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا معاملہ تو اپنے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ کے سپرد کر دیا تھا چنانچہ ارشاد باری ہے: وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ الخ (سورۃ الحشر، آیت: ۷) کہ رسول خدا ﷺ جو چیزیں تمہیں عطا کریں وہ لے لو اور جس چیز سے منع فرمادیں اس سے رک جاؤ، لیکن پیدا کرنے اور رزق دینے کا معاملہ کسی کے سپرد نہیں کیا۔ پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے چنانچہ وہ خود فرماتا ہے: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ الخ (سورۃ الروم، آیت: ۴۰) کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر اس نے تمہیں رزق عطا کیا پھر وہ تم کو موت دے گا اور پھر وہی موت کے بعد تمہیں زندہ کرے گا، کیا تمہارے تجویز کردہ شریکوں میں سے کوئی بھی ایسا ہے جو یہ مذکورہ کام کرسکتا ہو اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے پاک و پاکیزہ اور بلند تر ہے جسے وہ شریک کرتے ہیں۔

آیت مبارکہ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ الخ کے ساتھ حضرت امام علی رضاؑ کا استدلال کرنا اس کی دلیل ہے کہ مفوضہ کا یہ عقیدہ ائمہ معصومینؑ کے ارشادات و قرآن مجید ہر دو کے خلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے اور رزق دینے وغیرہ کے معاملہ کو ائمہؑ کے سپرد کر دیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیات میں انسانوں کے پیدا کرنے کا اسناد اپنی ذات کی طرف قائم کیا ہے اور اصل اسناد میں حقیقت ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ تمام اجسام و ارواح و اعراض (افعال عباد کے علاوہ) کا پیدا کرنے والا خود خداوند عالم ہے۔ یہ کام اس نے کسی کے سپرد نہیں کیا۔ قرآن مجید میں جس قدر آیات خلق واقع ہوئی ہیں سب سے یہی مضمون ثابت ہوتا ہے چنانچہ ملاحظہ ہو۔

(۱۔۵) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۠ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ البقرہ، آیت: ۲۱۔۲۲) اے لوگو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ان تمام لوگوں کو بھی پیدا کیا ہے جو تم سے پہلے گزر چکے تا کہ تم متقی بن جاؤ یعنی اس رب کی عبادت کرو جس نے زمین کو تمہارے لئے فرش بنا دیا اور آسمان کو بمنزل چھت بنایا اور آسمان کی جانب سے پانی نازل کیا جس کے ذریعے تمہارے رزق کے لئے بعض پھل پیدا کئے لہٰذا یہ علم رکھتے ہوئے تم اس کے ہمسر اور شریک مت بناؤ۔ اس آیت پاک میں اس رب کی عبادت کا حکم ہے جس نے انسانوں کو پیدا کیا نیز زمین اور آسمان کو بھی پیدا کیا اور پھر اس نے بارش نازل فرما کر... (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

مانتے ہیں کہ جسے خلق عالم اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطہ قرار دیتے ہیں اور اس کا نام قدرۃ اللہ اور ارادۃ اللہ رکھتے ہیں اور کبھی دین کے ائمہ علیہم السلام کو پیدا کرنے اور رزق دینے کا واسطہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں خداوند ان کے ذریعہ اور ان کے واسطے سے خالق ہے بلکہ ائمہ علیہم السلام کو ہی خالق ورزاق جانتے ہیں اگرچہ کہ عدم استقلال کی تاویل علیل ہی کے ساتھ اور کبھی ائمہ علیہم السلام کو مخلوقات کے لئے علل اربعہ قرار دیتے ہیں اور یہ عقیدہ شیخ احمد احسائی کا ہے چنانچہ ان ذوات قدسیہ کو وہ پیدا کرنے کا فاعل اور مخلوقات کا مادہ اور کائنات کی صورت اور غایت کہتے ہیں حالانکہ مخلوقات کا مادہ بھی اور

(بقیہ حاشیہ۔۱) اس کے ذریعہ پھل اُگائے لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کا معاملہ ائمہ علیہم السلام کے سپرد کر دیا ہوتا تو پھر ہمیں ائمہ علیہم السلام کی عبادت کرنا چاہئے تھی کیونکہ ہمارے پیدا کرنے والے پھر ائمہ علیہم السلام ہوتے اس لئے اس آیت کے روسے ہمیں ان کی عبادت کرنے کا حکم تھا اور وہ اس لائق تھے کہ ہم ان کی عبادت کریں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ کلمہ توحید کا ادا کرنا اور اس کے معنی پر ایمان رکھنا درست اور صحیح نہ ہوتا کیونکہ استحقاق عبادت میں خدا کے ساتھ ائمہ علیہم السلام بھی شریک ہوجاتے اور اول اسلام وایمان میں توحید کا شمار غلط ہو جاتا گویا شجرۂ اسلام جڑ سے اکھڑ کر ختم ہو جاتا اور یہی وجہ ہے کہ مفوضہ پر ائمہ علیہم السلام نے مشرک ہونے کا حکم صادر فرمایا ہے کیونکہ ان کا یہ عقیدۂ فاسدہ مستلزم شرک ہے اور عبادتِ غیر اللہ کے جواز کا باعث بنتا ہے۔

اس سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے تفویض خواہ استقلالی ہو خواہ غیر استقلالی ہر دو صورتیں باطل اور مستلزم شرک ہیں یعنی خواہ تفویض بایں معنی فرض کی جائے کہ اللہ تعالیٰ نے خلق ورزق وغیرہ کے معاملات کو ائمہ علیہم السلام کے سپرد کر کے ان معاملات میں ان کو اختیار کلی دے دیا ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق جیسے مناسب سمجھیں خلق ورزق وامانت واحیاء وغیرہ کو انجام دیتے رہیں اسے تفویض استقلالی کہا جاتا ہے اور خواہ تفویض کا یہ معنی مراد لیا جائے کہ خلق ورزق وغیرہ پر خدا نے ائمہ علیہم السلام کو قادر تو کر دیا اور اس کام پر ان کی ذمہ داری بھی لگا دی لیکن وہ ان کاموں کو انجام دینے میں حکم خدا کے محتاج اور منتظر رہے ہیں۔ خداوند عالم جب اپنی مصلحت اور حکمت کے مطابق ان کو کسی چیز کے پیدا کرنے یا مارنے، جلانے وغیرہ کا حکم دیتا ہے تو وہ تعمیل حکم کرتے ہوئے اس کام کو انجام دیتے ہیں، اس کو تفویض غیر استقلالی کہتے ہیں۔

بہرحال تفویض کی دونوں صورتوں میں سے جو صورت بھی فرض کی جائے بندوں کے خالق حقیقۃً ائمہ علیہم السلام ہی قرار پاتے ہیں لہٰذا بنابر تقدیر تفویض آیت مبارکہ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ کا معنی یہی بنتا ہے کہ لوگوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ائمہ علیہم السلام کی عبادت کریں کیونکہ وہی ان کے بھی اور ان سے ماقبل گزر جانے والے لوگوں کے بھی اس تقدیر پر خالق بنتے ہیں اور وہی زمین وآسمان کو پیدا کرنے والے اور بارش برسا کر پھلوں کو پیدا کرنے والے قرار پاتے ہیں غرض تفویض کی کسی ایک صورت کو صحیح تسلیم کرنے سے تمام ان آیات قرآنیہ کا مضمون غلط ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ لائق عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات قرار پاتی ہے جیسے مثلاً: اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وغیرہ نیز ان تمام آیتوں کا مضمون بھی غلط ہو جاتا ہے جن سے اجسام وارواح کے پیدا کرنے کا اسناد بطور حقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف کیا گیا ہے حالانکہ قرآن پاک سارے کا سارا صحیح مضامین پر مشتمل ہے اور توحید اسلام کا رکن اعظم اور اصل اصیل ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ مفوضہ کا مزعومہ باطل اور تفویض استقلالی وغیر استقلالی ہر دو کا نظریہ قرین صواب نہیں خلاف واقع ہے۔ اسلام نے توحید کی تعلیم پر بہت بڑا زور دیا ہے اور ہر وقت اس کے ذہن نشین رہنے کے لئے اس قدر اہتمام کیا ہے کہ روزانہ اذان میں، اقامت میں، نماز کے تشہد میں اس کے ادا کرنے کو لازم قرار دیا ہے۔

مصنف علامہ اعلی اللہ مقامہ نے متن کتاب میں جن آیات کو تحریر فرمایا ہے ان کے علاوہ بھی قرآن مجید ایسی آیات سے پُر ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے تمام اجسام، ارواح اور سوائے افعال عباد کے دیگر اعراض کو پیدا کرنے والا اپنی ذات پاک ہی کو قرار دیا ہے۔

(۱۔۶) چنانچہ ارشاد ہے: وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ (سورۃ البقرہ، آیت:۲۲۸) کہ مطلقہ عورتوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اسے چھپائے رکھنے کی کوشش کریں جو بچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ رحم مادر میں بچے کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔

(۱۔۷) نیز ارشاد پروردگار ہے: يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (سورۃ النساء، آیت:۱) (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

صورت بھی ان ہی ذوات قدسیہ کو قرار دینے کی بناء پر ائمہ کا باقی مخلوقات کے ساتھ اتحاد لازم آتا ہے جو کہ بداہتۃً باطل ہے اور بعض اوقات فضول گوئی کرتے ہیں کہ العیاذ باللہ امام ہر شئے کے وجود میں اسی طرح داخل ہوجاتا اور حلول کرجاتا ہے جیسے ابلیس ہر شئے میں داخل ہوجاتا ہے اور اس میں سرایت کرجاتا ہے ان کے اس فضول گوئی کے بطلان اور فاسد ہونے سے اگر قطع نظر بھی کرلی جائے تاہم انہوں نے اس تشبیہ میں جو بے ادبی اور بدتہذیبی اختیار کی ہے وہ ان کی

(بقیہ حاشیہ۔۱) اے لوگو! اپنے اس رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک نفس یعنی آدم سے پیدا کیا۔ معلوم ہوا کہ تمام انسانوں کو پیدا کرنے والی اللہ تعالیٰ ہی کی پاک ذات ہے۔

(۱۔۸) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ○ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ (سورۃ الانعام، آیت:۱۔۲) تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور نور اور تاریکیوں کو خلق فرمایا پھر بھی جو لوگ کافر ہیں وہ اپنے رب کا ہمسر تجویز کرتے ہیں وہی تو وہ ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔

(۱۔۹) وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَیَوْمَ یَقُوْلُ كُنْ فَیَكُوْنُ (سورۃ الانعام، آیت:۷۳) وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا اور جس دن پھر اشیاء کو حکم دے گا کہ پیدا ہوجاؤ تو مٹ جانے کے بعد پھر فوراً پیدا ہوجائیں گے۔

(۱۔۱۰) بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰی یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ○ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ (سورۃ الانعام، آیت:۱۰۱، ۱۰۲) وہ تمام آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے اس نے ہر چیز کو پیدا کیا وہ ہر شئے کا جاننے والا ہے۔ یہی اللہ ہے جو تمہارا رب ہے، اس کے علاوہ کوئی لائق عبادت نہیں ہوسکتا۔ وہ ہر شئے کا خالق ہے اس لئے تم اس کی عبادت کرو۔

(۱۔۱۱) اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (سورۃ الاعراف، آیت:۵۴) بے شک تمہارا رب وہ اللہ تعالیٰ ہے جس نے زمین اور آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کیا، نیز یہی آیت ملاحظہ ہو سورہ یونس آیت:۳۔

(۱۔۱۲) هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِیَسْكُنَ اِلَیْهَا (سورۃ الاعراف، آیت:۱۸۹) وہی تو ہے جس نے تم سب کو ایک نفس "آدم" سے پیدا کیا اور اس کی بچی ہوئی مٹی سے اس کی زوجہ "حوا" کو پیدا کیا تاکہ وہ ان کے ساتھ رہ کر سکون حاصل کریں۔

(۱۔۱۳) وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (سورہ ہود، آیت:۷) وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔

(۱۔۱۴) اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ○ (سورہ ابراہیم، آیت:۱۹) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو حق یعنی مصلحت کے ساتھ پیدا کیا۔

(۱۔۱۵) اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (سورۃ ابراہیم، آیت:۳۲) اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور جس نے آسمان کی جانب سے پانی نازل کیا اور پھر اس کے ذریعہ بعض پھل تمہارا رزق بنانے کے لئے پیدا کئے۔

(۱۔۱۶) خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ (سورۃ النحل، آیت:۳۔۴) آسمانوں اور زمین کو مصلحت کے ساتھ اسی نے پیدا کیا مشرک لوگ جو پیدا کرنے میں غیر اللہ کو شریک کرتے ہیں وہ اس اشتراک سے پاک اور بلند بالا ہے۔ اس نے ہی انسان کو نطفے سے پیدا کیا۔

(۱۔۱۷) وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ○ (سورہ النحل آیت:۷۸) اللہ تعالیٰ نے ہی تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے اس حال میں نکالا کہ کسی چیز کا علم نہیں رکھتے تھے۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

خباثت کے لئے کافی سے زیادہ ثبوت ہے اور کبھی کہتے ہیں آنحضرت ﷺ کا جسم لطیف و روحانی کبھی ملائکہ کی طرح لطیف ہو جاتا تھا اور کبھی کثیف بن جاتا تھا اور ان کی ساری تمثیلات غالیوں اور مفوضہ کے کلام سے ماخوذ ہیں کہ جو خداوند عالم کو ایسا روحانی جانتے ہیں جو ائمہ کے اجسام طاہرہ سے متلبس اور ان میں حلول کر جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ ایک روحانی چیز کا جسمانی چیز میں ظاہر ہونا قابل انکار نہیں بلکہ جانب خیر وشر دونوں صورتوں میں ممکن ہے، جانب خیر کی مثال حضرت جبرائیل امین کا وحیۂ قلبی کے جسم میں ظاہر ہونا ہے اور جانب شر کی مثال جنوں کا دیگر انسانوں کے بدنوں

(بقیہ حاشیہ۔۱) اور اسی نے تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنا دیئے تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو۔

(۱۔۱۸) اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ (سورہ بنی اسرائیل، آیت:۹۹) کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ ان کی مثل اور پیدا کر دے۔

(۱۔۱۹) وَهُوَالَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (سورۃ الانبیاء، آیت: ۳۳) وہی اللہ تو ہے جس نے شب و روز اور آفتاب و ماہتاب کو پیدا فرمایا۔

(۱۔۲۰) وَهُوَالَّذِيْٓ اَنْشَاَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ، قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ○ وَهُوَالَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ○ وَهُوَالَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَلَهُ اخْتِلَافُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ○ (سورۃ المومنون، آیت:۷۸ تا۸۰) اور وہی تو خدا ہے جس نے تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل پیدا کئے مگر تم بہت کم شکریہ ادا کرتے ہو اور وہی تو ہے جس نے خود تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس کی طرف ہی تمہارا حشر ہوگا اور وہی تو ہے جو زندہ بھی کرتا ہے اور موت بھی دیتا ہے اور شب و روز کا اختلاف بھی تو اسی کا بنایا ہوا ہے کیا تم عقل نہیں رکھتے۔

(۱۔۲۱) وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ (سورۃ النور، آیت:۴۵) اللہ تعالیٰ نے ہی زمین پر چلنے والے ہر جانور کو پانی سے پیدا فرمایا۔

(۱۔۲۲) اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا○ (سورۃ الفرقان، آیت: ۲) اور وہی اللہ تبارک و تعالیٰ ہی تو ہے جس کو تمام آسمانوں اور زمین کی شاہی حاصل ہے اور ممکن نہیں کہ وہ کسی کو اپنا فرزند بنائے اور ہو نہیں سکتا کہ اس شاہی اور سلطنت میں اس کا کوئی شریک ہو، اسی نے ہر شئے کو پیدا کیا اور اسے ایسے مناسب انداز سے بنایا جیسے بنانے کا حق تھا۔

(۱۔۲۳) وَهُوَالَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ (سورۃ الفرقان، آیت:۴۸) اور وہی تو ہے جس نے ہواؤں کو اپنی رحمت (بارش) سے پہلے خوشخبری کے طور پر چلایا۔

(۱۔۲۴) وَهُوَالَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ، وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا○ وَهُوَالَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا (سورۃ الفرقان، آیت: ۵۳، ۵۴) اور وہی خدا تو ہے جس نے دو سمندروں کو چلایا جن میں سے ایک معین شیریں اور میٹھا اور دوسرا معین کھاری اور بدمزہ ہے اور اسی خدا نے ان دونوں سمندروں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط فاصل پیدا کر دیا اور وہی تو اللہ جل شانہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا اور پھر اسے خاندان اور سسرال والا بنایا۔

(۱۔۲۵) اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً، فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ، مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ○ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ○ (سورۃ النمل، آیت: ۶۰، ۶۱) کیا تمہارے خودساختہ شریک افضل ہیں یا وہ خدا پاک افضل ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمان کی جانب سے پانی نازل کیا پھر اس کے ذریعہ پر رونق اور خوشنما باغات پیدا کئے تمہیں تو اتنا بھی ممکن نہ تھا کہ ان باغات کا کوئی درخت ہی پیدا کر دو تو کیا تم "اللہ" کے ساتھ ان چیزوں کے دوسرے خالق تجویز کر کے اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود بنانے کی فکر میں ہو بلکہ ایسا کرنے والے حقیقتاً ایسی قوم ہیں جو اللہ تعالیٰ کا ہمسر اور شریک بناتے ہیں۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

انشاءاللہ اپنے محل پر آجائے گا۔ یہ سب کچھ باطل سفسطہ اور واضح مغالطہ ہے ان کے ردّ کے لئے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (سورۃ الکہف، آیت:۱۱۰) اے نبی کہہ دیجئے کہ میں تمہاری ہی مثل انسان ہوں، نیز ارشادِ پروردگار: وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (سورۃ الانعام، آیت:۹) یعنی اگر ہم نبی کو فرشتہ بناتے تو بھی ہم اسے مرد ہی کی شکل میں بنا کر بھیجتے اور پھر جس اشتباہ میں وہ اب پڑے ہیں اسی شبہ

(بقیہ حاشیہ۔۱) پھر کہا کہ یا وہ ہستی افضل ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس کے اندر دریا بنائے اور اس میں بھاری بھرکم پہاڑ پیدا کئے اور دو سمندروں کے درمیان ان کے باہم اختلاط پذیر ہونے سے روکنے والی ایک حد فاصل پیدا کی تو کیا تم دوسرے خالق تجویز کر کے اللہ کے ساتھ معبود بنانا چاہتے ہو حالانکہ ایسا ہرگز ممکن نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں اکثر جہالت اور لاعلمی کا شکار ہیں۔

(۱۔۲۶) خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (سورۃ العنکبوت، آیت:۴۴) اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو مصلحت کے مطابق پیدا فرمایا، یہی آیت ملاحظہ ہو سورۃ الجاثیہ، آیت:۲۲۔

(۱۔۲۷) مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى (سورۃ الروم، آیت:۸) اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام اشیاء کو بس مصلحت کے مطابق اور ایک مقررہ مدت تک کے لئے پیدا کیا ہے۔

(۱۔۲۸) وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا (سورۃ الروم، آیت:۲۱) قدرت و علم خداوند عالم کے دلائل سے یہ چیز بھی ہے کہ اس نے تمہارے ہی نفوس اور تمہاری ہی نوع سے تمہاری بیویاں پیدا کی ہیں تا کہ تم ان کے ساتھ آرام اور چین وسکون سے رہو۔

(۱۔۲۹) خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۭ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (سورۃ لقمان، آیت:۱۰، ۱۱) اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے پیدا فرمایا جنہیں تم دیکھ سکو اور زمین میں بھاری بھاری پہاڑ پیدا کر دیئے تا کہ تمہیں لے کر کشتی کی طرح پانی میں تیرنے نہ لگے اور زمین میں ہر قسم کے جاندار پیدا کر کے پھیلا دیئے اور آسمانوں کی جانب سے ہم نے ہی پانی برسایا اس کے ذریعہ زمین میں ہر قسم کے عمدہ پھلوں کے جوڑے پیدا کئے یہ ہے خداوند عالم کی مخلوق اب مجھے دکھاؤ کہ اللہ کے علاوہ جو تم نے خالق تجویز کر رکھے ہیں انہوں نے کس چیز کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ یہ ظالم لوگ جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ اشیاء عالم کے دیگر خالق تجویز کئے پھرتے ہیں یہ کھلی گمراہی کا شکار ہو چکے ہیں۔

(۱۔۳۰) سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (سورۃ یٰسین، آیت:۳۶) پاک ہے اللہ تعالیٰ کی ذات جس نے ہر قسم کے تمام جوڑے پیدا کئے یعنی ان چیزوں سے بھی جنہیں زمین اگاتی ہے اور خود تمہارے نفوس میں سے بھی اور دیگر ان چیزوں میں سے بھی جن کا تمہیں علم نہیں ہے۔

(۱۔۳۱) قُلْ اَىِٕنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورہ فصلت، آیت:۹) کیا تم اس اللہ تعالیٰ جل شانہ کی ذات کا انکار اور کفر کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کر دیا اور کیا تم ایسے وحدہٗ لاشریک خدا کے ہمسر اور شریک بناتے ہو وہی زمین اور دیگر تمام اشیاء عالم کو پیدا کرنے والا ہی رب العالمین ہے۔

(۱۔۳۲) وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۝ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (سورۃ الزخرف، آیت:۹، ۱۰) اور اگر تم ان سے سوال کرو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور کہیں گے کہ انہیں اس ذات پاک پروردگار نے پیدا کیا ہے جو ہر شئے پر غالب، قدرت رکھنے والا اور علیم ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے فرش بنایا اور اس میں تمہارے لئے رستے بنائے تا کہ تم منزل مقصود کی طرف ہدایت پاسکو۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

یعنی اگر ہم نبی کو فرشتہ بناتے تو بھی ہم اسے مرد ہی کی شکل میں بنا کر بھیجتے اور پھر جس اشتباہ میں وہ اب پڑے ہیں اسی شبہ میں ہم خود ان کو ڈال دیتے، نیز ارشاد پروردگار: اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَالْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (سورۃ الرعد، آیت:۱۶) اللہ تعالیٰ ہر شئے کو پیدا کرنے والا ہے اور وہ یکتا و یگانہ بے مثل و بے مثال اور ہر چیز پر غالب اور قادر ہے، نیز ارشاد قدرت ہے: وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ (سورۃ الفرقان، آیت:۳) اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسرے ایسے معبود بنا لئے ہیں جو کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود مخلوق ہیں۔

(بقیہ حاشیہ۔۱)

(۱۔۳۳) اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى، بَلٰٓى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ○ (سورۃ الاحقاف، آیت:۳۳) کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ وہ اللہ جل شانہ جس نے تمام آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور ان کے پیدا کرنے سے اسے کوئی تھکاوٹ تک لاحق نہیں ہوئی اور وہ اس پر قادر ہے کہ مرنے کے بعد پھر مردوں کو زندہ کر دے، ہاں بے شک وہ ایسا کر سکتا ہے کیونکہ وہ ہر شئے پر قادر ہے۔

(۱۔۳۴) وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ○ (سورۃ الرحمٰن، آیت:۱۵) اور اللہ تعالیٰ نے جنوں کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا ہے۔

(۱۔۳۵) هُوَالَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ (سورۃ التغابن، آیت:۲) وہی تو وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر بعض تم میں سے کافر بن گئے اور بعض مومن بنے۔

(۱۔۳۶) اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (سورۃ الطلاق، آیت:۱۲) اللہ وہ ہے جس نے سات آسمانوں کو پیدا کیا اور زمینیں بھی انہیں آسمانوں کی مثل سات پیدا کیں۔

(۱۔۳۷) الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا، وَهُوَالْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ○ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا، (الملک، آیت:۲،۳) وہ اللہ جل شانہ صاحب برکت ہے جس نے موت اور زندگی دونوں کو اس لئے پیدا کیا تمہارا امتحان لے اور آزمائے کہ تم میں سب سے اچھا عمل کرنے والا کون ہے اور وہ صاحب عزت و غلبہ اور مغفرت عطا کرنے والا ہے، اس نے ساتوں آسمان پیدا کئے جو اوپر نیچے منطبق ہیں۔

(۱۔۳۸) اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا○ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا○ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا○ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا○ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا○ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا○ (سورۂ نوح، آیت:۱۵۔۲۰) کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان جو باہم آپس میں اوپر تلے منطبق ہیں کیسے پیدا کر دیئے ہیں اور چاند کو ان میں نور اور سورج کو چراغ بنایا ہے۔ اللہ نے ہی تم کو زمین سے پیدا کیا پھر وہ تمہیں اس میں لوٹائے گا پھر تمہیں وہ نکال لے گا، اللہ نے ہی تمہارے لئے زمین کا فرش بنایا تا کہ تم اس کے وسیع راستوں پر آسانی سے چل پھر سکو۔

(۱۔۳۹) سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى○ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى○ (سورۃ الاعلیٰ، آیت:۱،۲) اپنے اس پروردگار کے نام کی تسبیح کیجئے جس نے ہر شئے کو پیدا کیا اور نہایت موزوں طریقہ پر اسے ٹھیک پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

(۱۔۴۰) اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ○ (سورۃ العلق، آیت:۱۔۲) ایسے پروردگار کے نام کی برکت سے پڑھئے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، انسان کو اس نے خونِ منجمد سے پیدا کیا۔

ان تمام آیات کے مضمون کا خلاصہ اور ماحصل یہی ہے کہ ہر شئے کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ ہر آیت میں جس بھی چیز کی پیدائش کو اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے اس کے پیدا کرنے کا اسناد اپنی ذات کی طرف کیا ہے اور سابقاً بیان ہو چکا کہ اصل اسناد میں حقیقت ہوتی ہے، مجاز خلاف اصل ہے جو محتاج دلیل اور قرینہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ان تمام آیات سے یہ مسئلہ اظہر من الشمس ہو رہا ہے کہ عالم دنیا کی ہر شئے کو خود اللہ تعالیٰ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق عطا کیا پھر وہ تمہیں موت دے گا پھر موت کے بعد وہ تمہیں زندہ کرے گا، نیز فرمان: اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ (سورۃ الحج، آیت: ۷۳) تم لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن بتوں سے دعائیں مانگتے ہو وہ ایک مکھی تک بھی ہرگز پیدا نہیں کر سکتے اگرچہ کہ سارے کے سارے اسکے لئے اکٹھے ہو جائیں۔ نیز یہ ارشاد پروردگار کافی ہے: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا (سورۃ السجدہ، آیت: ۴) اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان کی تمام

(بقیہ حاشیہ۔۱) نے پیدا فرمایا ہے۔ نبی ﷺ یا ائمہ علیہم السلام کے سپرد کر کے ان سے پیدا نہیں کرایا کیونکہ پورے قرآن میں ایک آیت بھی ایسی وارد نہیں ہوئی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کا معاملہ ائمہ علیہم السلام کے سپرد کیا ہے اور وہ کلی اختیارات حاصل ہونے کے باعث یا حکم ربی نازل ہونے کی صورت میں ہر چیز کو پیدا کرتے رہتے ہیں۔

حالانکہ برعکس اس کے یہ کہ ہر چیز کا خالق خداوند عالم ہے اس کے متعلق جس قدر آیات نقل کر دی ہیں ان سے زیادہ رہ گئی ہیں۔ مزید آیات کو سپرد قرطاس کرنے سے پہلوتہی کر لی گئی ہے۔ غرض سارا قرآن اس مسئلہ کی زندہ دلیل ہے کہ ہر شئے کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور اسی وجہ سے اس مسئلہ کو علماء کرام نے ضروریات دین میں شمار کیا ہے اور اس کے منکر کو خارج از دین قرار دیا ہے جیسا کہ مصنف علامہ قدس سرہ نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے۔

اور وجہ ظاہر ہے کیونکہ اس کا منکر وہی ہو سکتا ہے جس کو حقانیت قرآن پاک پر ایمان نہ ہو اور پھر جسے قرآن پاک پر ایمان نہ ہو اسے اہل بیت رسول علیہم السلام پر بھی ایمان حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ حدیث ثقلین اور دیگر نصوص شاہد ہیں کہ اہل بیت رسول علیہم السلام اور قرآن پاک آپس میں جدا نہیں ہو سکتے حتیٰ کہ دونوں حوض کوثر پر رسول مقبول ﷺ کے پاس اکٹھے وارد ہوں گے اور ظاہر ہے کہ جسے قرآن اور اہل بیت علیہم السلام پر ایمان نہیں اسے رسول پاک ﷺ اور خدا پر بھی ایمان حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے وہ ملعون کافر اور مشرک ہے اور آتش جہنم کا ایندھن ہے۔ ائمہ ہدیٰ علیہم السلام نے اس عقیدہ کو اپنانے والے فرقۂ مفوضہ کو علی الاطلاق مشرک قرار دیا ہے جیسے کہ سابقاً ائمہ علیہم السلام کے ارشاد نقل کئے جا چکے ہیں اور ائمہ علیہم السلام نے تصریح فرمائی ہے کہ تمام مخلوقات عالم کو اللہ تعالیٰ نے بذات خود اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے چنانچہ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

(۱۔۴۱) فطر الخلائق بقدرتہ، "نہج البلاغہ، پہلا خطبہ" کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو اپنی قدرت سے پیدا کیا ہے۔

لہٰذا یہ عقیدہ ائمہ علیہم السلام کی تعلیمات کے بھی خلاف ہے کہ خدا نے ائمہ علیہم السلام کو عالم دنیا کی اشیاء کو پیدا کرنے پر قادر کر دیا اور پھر انہیں حکم دے دیا کہ آپ پیدا کیجئے تو انہوں نے عالم دنیا کو پیدا کر دیا یہی وہ مفوضہ ہیں جن پر ائمہ علیہم السلام نے شرک و کفر کے فتوے صادر فرمائے ان سے تبرا اور بیزاری اختیار کرنے کی تعلیم دی اور علمائے شیعہ کو حکم فرمایا کہ ان کے اعتقاد بد سے شیعوں کو روشناس کراتے رہیں تا کہ شیعیان علی علیہ السلام و محبان آل رسول علیہم السلام کہیں دھوکے سے ان ملاعین کے دام تزویر میں نہ پھنس جائیں کیونکہ یہ خبیث گروہ اپنے آپ کو شیعہ کہلاتا ہے اس لئے نافہم شیعہ ان کے پھندے کا شکار ہو سکتے ہیں چنانچہ ملاحظہ ہو۔

(۱۔۴۲) کتاب الاحتجاج للطبرسی علیہ الرحمہ، صفحہ: ۲۴۲، ۲۴۳ و کتاب الدمعۃ الساکبۃ، ج ۳، صفحہ: ۵۹

و قد روی عن أبی الحسن الرضا (ع) من ذم الغلاة و المفوضة و تكفيرهم وتضليلهم و البراءة منهم وممن والاهم وذكر علة ما دعاهم إلى ذلك الاعتقاد الفاسد الباطل ما تقدم ذكر طرف منه في هذا الكتاب. و كذلك روی عن آبائه و أبنائه (ع) في حقهم و الأمر بلعنهم و البراءة منهم وإشاعة حالهم و الكشف عن سوء اعتقادهم كي لا يغتر بمقالتهم ضعفاء الشيعة ولا يعتقد من خالف هذه الطائفة أن الشيعة الإمامية بأسرهم على ذلك نعوذ منه و ممن اعتقده و ذهب إليه. علامہ طبرسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ غلاۃ اور مفوضہ کی مذمت، ان کو کافر اور گمراہ قرار دینے، ان سے تبراء بیزاری کرنے اور جس چیز نے انہیں ان کے اس اعتقاد فاسد و باطل کو اختیار کرنے کی دعوت دی ہے اس کے بارے میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

چیزوں کو پیدا کیا ہے۔

حضرت صادق آل محمد علیہ السلام نے عبداللہ بن سبا کی اولاد کے اس شخص کو دشمن خدا اور جھوٹا قرار دیا جس کے متعلق زرارہ نے حضرت سے یہ بیان کیا تھا کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف محمد مصطفیٰ اور علی مرتضیٰ علیہما السلام کو پیدا کیا اور پھر ہر چیز کو پیدا کرنے وغیرہ امور کو ان دونوں بزرگواروں کے تفویض اور سپرد کر دیا لہٰذا ان دونوں ہستیوں نے ہر شئے کو پیدا کیا اور انہوں نے ہی ہر ایک کو رزق عطا کیا اور انہوں نے ہی ہر میت پر موت طاری کی اور انہوں نے ہر زندہ کو زندگی بخشی، حضرت صادق آل محمد علیہ السلام نے جواباً اسے دشمن خدا اور جھوٹا قرار دے کر زرارہ سے کہا کہ جب تم واپس اس کے پاس جاؤ تو سورۂ رعد کی یہ آیت اس کے سامنے پڑھ دینا، جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ (سورہ رعد، آیت:۱۶)

(بقیہ حاشیہ۔۱) جو ارشادات مروی ہیں ان کا ایک حصہ اسی کتاب الاحتجاج میں سابقاً گذر چکا ہے اسی طرح حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے آباؤ اجداد اور آپ کی اولاد علیہم السلام سے بھی ان غلاۃ اور مفوضہ کے متعلق احادیث مروی ہیں جن میں ان پر لعنت کرنے، ان سے تبرا اور بیزاری اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ ان کے اعتقاد بد کو مخلوقات پر واضح کیا جائے اور ان کی حالت بد کو منظر عام پر ظاہر کیا جائے تاکہ ضعفاء شیعہ ان کے اعتقاد کے بارے میں دھوکہ میں نہ رہیں اور ان کے معتقدات کو صحیح نہ سمجھ بیٹھیں نیز مخالفین مذہب حق یہ نہ سمجھ لیں کہ سارے شیعوں کا یہی اعتقاد ہے جو یہ غلاۃ اور مفوضہ ظاہر کرتے ہیں۔ پھر حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں اس اعتقاد سے بھی اور اس اعتقاد کو اپنانے والوں اور اس کی طرف جانے والوں سے بھی، مفوضہ ملاعین کا مذہب قرآن کریم اور تعلیمات ائمہ معصومین علیہم السلام کا ایسے مخالف ہے کہ ذرہ بھر واقفیت رکھنے والا اس میں شک نہیں کر سکتا کیونکہ ائمہ علیہم السلام کی تعلیم یہ ہے کہ سارے عالم کو پیدا کرنے والا صرف خدا ہے دیگر کوئی عالم دنیا کی کسی شئے کو پیدا کرنے والا نہیں مگر یہ ملاعین کہتے ہیں خدا صرف محمد و آل محمد علیہم السلام کا خالق ہے دیگر تمام دنیا کے پیدا کرنے والے ائمہ علیہم السلام ہیں۔ اس بارے میں ائمہ علیہم السلام کے مزید ارشاد ملاحظہ ہو۔

(۱۔۴۳) عیون اخبار الرضا علیہ السلام ج ا صفحہ ۴۲: ویقول فی دعائہ: يَا مَنْ لَا شَبِيْهَ لَهٗ وَ لَا مِثَالَ، اَنْتَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَ لَا خَالِقَ اِلَّا اَنْتَ تُفْنِي الْمَخْلُوْقِيْنَ وَ تَبْقٰى اَنْتَ الخ۔ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک پیشگوئی میں حضرت امام محمد تقی علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا کہ میرا وہ فرزند اپنی دعاء میں اللہ تعالیٰ کو ان الفاظ سے خطاب فرمایا کرے گا کہ اے وہ ہستی جس کا نہ کوئی مثل ہے نہ شبیہ، تو ہی وہ اللہ جل شانہ ہے جس کے علاوہ کوئی لائق عبادت نہیں ہوسکتا اور تو ہی وہ ہستی ہے جس کے علاوہ کوئی خالق نہیں ہوسکتا، تو ساری مخلوق کو فنا کرنے والا ہے اور تو خود ہمیشہ کے لئے باقی ہے۔

(۱۔۴۴) مفاتیح الجنان دعاء جوشن کبیر، فصل ۱۱ میں ارشاد ہے: یا خالق کل مخلوق، یا رازق کل مرزوق، اے ہر مخلوق کو پیدا کرنے والے اللہ اور ہر مرزوق کو رزق دینے والے اللہ۔ نیز مفاتیح الجنان یہی دعا جوشن کبیر فصل ۹۱ میں ارشاد ہے: يَا مَنْ لَا يَخْلُقُ الْخَلْقَ اِلَّا هُوَ، کہ اے وہ ہستی جس کے علاوہ کوئی کسی مخلوق کو پیدا نہیں کر سکتا اور جس کے علاوہ کوئی کسی کے رزق کو وسیع نہیں کر سکتا اور وہ ہستی جس کے علاوہ کوئی مردوں کو زندہ نہیں کر سکتا۔ نیز مفاتیح الجنان یہی دعا جوشن کبیر فصل ۹۵ میں ارشاد ہے: يَا مُحْيِيَ كُلِّ شَيْءٍ وَمُمِيْتَهٗ يَا خَالِقَ كُلِّ شَيْءٍ وَ وَارِثَهٗ، کہ اے وہ ہستی جو ہر شئے کو زندہ کرنے والی اور ہر مرنے والے کو مارنے والی اور موت دینے والی اور جو ہر شئے کو پیدا کرنے والی اور اس کی مالک ہے۔ یہ کلیات اور یہ مشتمل بر حصر جملے شاہد صدق ہیں کہ خالق، رازق، محی اور ممیت اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، دوسری کوئی ہستی ان افعال پر قادر نہیں ہوسکتی۔ ان تمام نصوص کے ہوتے ہوئے کون صاحب ایمان یہ عقیدہ رکھ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف محمد و آل محمد علیہم السلام کو پیدا کیا ہے اور دیگر سارے عالم کو محمد و آل محمد علیہم السلام نے بالاستقلال یا بغیر استقلال پیدا کیا ہے۔ نصوص دیگر بھی ایسے موجود ہیں جو مذکورہ بالا نصوص کی تائید کرتے ہیں لیکن جس قدر نقل کر دیے ہیں ان پر مطلع ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص راہ راست کو اختیار نہیں کرے گا تو اس بدبخت ازلی سے پھر کسی طرح صراط مستقیم پر آنے کی توقع نہیں ہوسکتی۔

کہ کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایسے شریک بنائے ہیں جنہوں نے مخلوق خدا کی مثل مخلوق پیدا کی ہے اور اس وجہ سے ان کیلئے مخلوقات میں اشتباہ واقع ہوگیا ہے، اے نبی کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کا خالق ہے اور یکتا و یگانہ اور ہر شئے پر قادر اور غالب ہے اور ردّ مفوضہ کے متعلق محمد بن عرفہ کی روایت عنقریب آرہی ہے ان توضیحات کے ذریعہ یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ غیر خداوند عالم نہ دنیا کا خالق ہوسکتا ہے نہ کلی مدبر، خواہ اس کا خالق ہونا بالاستقلال فرض کیا جائے اور خواہ اس طریقہ سے کہ خدا نے اسے قادر کر کے اس کام کو اس کے سپرد کر دیا ہے اور یہ سب کچھ ضروریات دین میں سے ہے اور اس کا منکر دین سے خارج ہے۔ لہٰذا خداوند عالم کے علاوہ کسی دیگر شخصیت کے متعلق علی الاطلاق یوں کہنا جائز نہیں کہ وہ خالق اور رازق ہے اور نہ ہی یہ کہنا جائز ہے کہ وہ شخصیت فعل خلق و رزق کے صادر ہونے کا واسطہ ہے بایں معنی کہ اس شخصیت کے علاوہ جو کچھ پیدا ہوا ہے وہ اس شخصیت اور اس واسطۂ خاصہ کے توسط سے پیدا ہوا یعنی اللہ تعالیٰ نے اس واسطہ اور اس شخصیت سے دیگر تمام اشیاء کو پیدا کرایا ہے لہٰذا فلاسفہ کا یہ عقیدہ بھی شرک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مخلوقات پر وجود کے فیضان کا واسطہ عقل اول ہے بلکہ عقول عشرہ واسطہ ہیں۔ نیز زیر بحث یعنی شیخیہ گروہ کا یہ عقیدہ بھی شرک ہے کہ فعل اللہ اور قدرۃ اللہ اور عقل کلی یعنی نبی اور امام ان کی اپنی ذوات مقدسہ کے علاوہ دیگر عالم دنیا کے پیدا کرنے کا واسطہ ہیں (کیونکہ یہ لوگ فعل اللہ، قدرۃ اللہ اور عقل کلی کے الفاظ سے نبی اور امام کی ذات مراد لیتے ہیں، مترجم)۔ اس گروہ نے اپنے اس عقیدہ کی جو دلیل پیش کی ہے وہ عجیب واہی اور ناقص مضمون پر مشتمل ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جب عالم دنیا کی بنیاد اپنی حکمت کاملہ کے مطابق اسباب پر قائم کی ہے تو اس میں کوئی بعید نہیں کہ وہ اپنی مخلوقات میں سے چند اشخاص منتخب کر لے اور ان کو اپنے تمام فیوض کا محل اور کل خیرات کا واسطہ اور سب تاثیرات کا مظہر بنا دے اور یہ عالم دنیا کی تمام اشیاء میں اذن خداوند عالم کے ساتھ تصرف تام کریں اور کلی تصرف کرنے پر وہ قادر ہوں۔

ان کا یہ استدلال بالکل بود اور واہی ہے کیونکہ یہ ایک خیالی احتمال انہوں نے پیش کیا ہے جس پر اصل دین کی بنیاد ہرگز قائم نہیں ہوسکتی کیونکہ اصول دین کے لئے قطعی دلیل کارآمد ہوسکتی ہے وہمی اور خیالی احتمالات فائدہ بخش نہیں ہوسکتے اگر نگاہ ظاہری میں ایسا رفع استبعاد کافی ہوتا تو ظاہر بین حضرات ان وسائط کے سجدہ کرنے بلکہ مطلقاً ان کی عبادت کرنے کو بھی جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ ان ظاہر بینوں کی نگاہ میں اس امر میں کوئی بُعد نہیں ہوسکتا تھا کہ خداوند عالم سید البشر اور ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کے سجدہ اور عبادت کو جائز قرار دیتا کیونکہ یہ نفوس مقدسہ نوع بشر کی سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والی ہستیاں ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب سے افضل اور ان کے بعد ائمہ اثنا عشر علیہم السلام سب سے افضل ہیں بالخصوص، جبکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا سجدہ کرنے پر ملائکہ کو مامور کیا تھا اور ائمہ علیہم السلام تو حضرت آدم علیہ السلام سے بھی افضل ہیں لہٰذا ان کے سجدہ کرنے کا تو بطریق اولیٰ حکم ہونا چاہئے۔

حالانکہ شریعت اسلام میں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے کسی دوسری شخصیت کو معبود برحق قرار دینا کفر وشرک کی سب سے بڑی اور بنیادی قسم ہے اور یہی حال ہے خلق ورزق کی تفویض کا کہ ائمہ علیہم السلام نے اس کے قائل کو دشمن خدا کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور نصوص میں ان کے مشرک[1] ہونے کی تصریح فرمائی گئی ہے اور تفویض ائمہ کی یہ دور از کار تاویل کرنا کہ اس سے مراد استقلال والی صورت کی تفویض ہے یہ اسی طرح بیکار ہے اور لائق سماعت نہیں جس طرح کہ قریش، نصاریٰ اور یہود کے مشرکین کی تاویل بے سود ہے اور قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ صاحبان ذرا غور وفکر اور سوچ بچار کریں تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ عدم استقلال جس کی تفسیر وہ اس طرح کرتے ہیں کہ ائمہ جو کہ واسطہ ہیں وہ اپنے خالق کی طرف محتاج ہوتے ہیں جو بالذات ہے اور باقی مخلوق ان وسائط یعنی ائمہ علیہم السلام کی طرف محتاج ہیں یہ عدم استقلال

---

[1] سابقاً نصوص نقل کیے جا چکے ہیں جن میں مفوضہ کے مشرک ہونے کی تصریح موجود ہے۔ اب قابل غور امر یہ ہے کہ ان کے اس مذہب باطل سے شرک لازم کس طرح آتا ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کلمہ "لا الہ الا اللہ" تمام اہل اسلام کے نزدیک مسلم طور پر کلمۂ توحید ہے جو صراحۃً توحید فی العبادت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی وہ ہستی ہے جو لائق عبادت ہے دیگر کوئی شخصیت ایسی نہیں اور نہ ہی ہوسکتی ہے کہ جسے معبود ہونے کا ذرہ بھر بھی استحقاق حاصل ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا کمال ہے جو استحقاق معبودیت کا سبب ہے جس کے باعث اللہ تعالیٰ کو یہ استحقاق حاصل ہے اور دیگر کسی شخصیت کو وہ کمال نہ حاصل ہے اور نہ ہوسکتا ہے اور اسی کمال کے حاصل نہ ہوسکنے کے باعث اللہ تعالیٰ کے علاوہ دیگر کوئی ہستی معبودیت کا استحقاق نہیں رکھ سکتی۔

تو آیات قرآنیہ اور ارشادات معصومین علیہم السلام اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ کمال جس کے باعث اللہ تعالیٰ کو یہ استحقاق حاصل ہے وہ ہے عالم دنیا و مافیہا کا خالق ہونا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد پاک: يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (سورۃ البقرہ، آیت:۲۱) سے اسی مطلب پر دلالت ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس رب نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تم سے پہلے گزر جانے والوں کو بھی پیدا کیا ہے اس کی عبادت کرو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا پیدا کرنا ہی اس کا سبب ہے کہ مخلوق اس کی عبادت کرے۔ نیز فرمایا: خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ (سورۃ الانعام، آیت: ۱۰۲) کہ وہ ہر شئے کو پیدا کرنے والا ہے اس لئے اس کی عبادت کرو فالسببیۃ صراحۃً اس مطلب پر دلالت کرتی ہے کہ اس کا ہر چیز کیلئے خالق ہونا اس کا سبب ہے کہ لوگ اس کی عبادت کریں، نیز چونکہ وہ ہر شئے کا خالق ہے اس لئے وہ تمام ان چیزوں کا خالق ہے جو دنیا میں نعمت شمار ہوتی ہے لہٰذا وہ منعم حقیقی ہے بغیر کسی طمع ولالچ اور بغیر کسی غرض وحاجت کے وہ ہر نعمت کا عطا کرنے والا ہے چنانچہ فرمایا: يَاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○ (سورۃ الفاطر، آیت: ۳) کہ اے لوگو! اللہ نے جو تمہیں نعمتیں دی ہیں ان کو یاد رکھو، کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی پیدا کرنے والا ہوسکتا ہے جو تمہیں زمین وآسمان سے رزق دینے والا ہو، اس لئے عبادت کے لئے اس کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے جو کہ ہر قسم کی نعمتوں کو پیدا کرکے بندوں کو عطا کرنے والا ہے لہٰذا وہی خالق اور وہی منعم حقیقی ہے۔ اس طرح اس کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے جو کہ اس کی عبادت کے ذریعہ متحقق ہوسکتا ہے کیونکہ خالق اور رازق کا تذکرہ فرما کر یہ فرمایا کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہوسکتا اور ساتھ یہ حکم دیا کہ اس کی نعمتوں کو یاد رکھو، یہ اس کی دلیل ہے کہ اس کی عبادت کا استحقاق اسے اسی سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ خالق ورازق اور منعم حقیقی ہے۔ جب یہ ثابت ہوا کہ اس کا خالق ورازق اور منعم حقیقی ہونا ہی استحقاق عبادت کی علت اور سبب ہے اور علت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ اس کا معلول اس سے منفک نہیں ہوسکتا تو اس لئے اگر کوئی دیگر ہستی خالق ورازق اور منعم حقیقی ہو تو اسے بھی یقیناً استحقاق عبادت حاصل ہو جائے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو خالق قرار دینا گویا اس کو مستحق عبادت قرار دینا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا استحقاق عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص نہیں رہ جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جتنی شخصیتوں کو خالق مانا جائیگا (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

بعینہٖ انہی مفوضہ والی تفویض ہے جو ائمہ علیہم السلام کو بایں معنی مستقل قرار دیتے ہیں کہ انہیں اپنے خالق کی طرف بھی احتیاج نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے چند صفات اور طاعات کو اپنی ذات کبریا کے لئے ایسا مخصوص قرار دیا ہے کہ ان میں کسی ہستی کی شرکت کو جائز قرار نہیں دیا ہے خواہ وہ ہستی مقرب بارگاہ ایزدی ہو اور خواہ غیر مقرب ہو تو پھر ائمہ علیہم السلام کو کس طرح عالم دنیا کا خالق، رازق، پیدا کرنے والا، بنانے والا اور مدبر کل قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ یہی تو وہ صفات ہیں جو ذات باری تعالیٰ جلت عظمتہ کے ساتھ خاص ہیں حالانکہ ائمہ علیہم السلام خود ہمیشہ اپنی عبودت اور عجز کے معترف رہے۔

(بقیہ حاشیہ۔۱) وہ سب کی سب استحقاق عبادت میں خداوند عالم کے ساتھ شریک ہو جائیں گی اور شرک محقق ہو جائے گا اور کلمہ توحید لا الہ الا اللہ کی حقانیت پرزد واقع ہو جائے گی۔

مفوضہ چونکہ آنحضرت نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کو یا ان کے ساتھ دیگر ائمہ علیہم السلام کو بھی خالق عالم قرار دیتے ہیں اس لئے وہ با الفاظ دیگر ان نفوس مقدسہ کو مستحق عبادت قرار دیتے اور لائق عبادت جانتے ہیں لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان برگزیدہ ہستیوں کو استحقاق عبادت میں شریک کرتے ہیں۔ اس وجہ سے ائمہ علیہم السلام نے مفوضہ پر مشرک ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا کیونکہ ان کا یہ عقیدہ مستلزم مشرک ہے، ان کا یہ عقیدہ اس امر کا مقتضی ہے کہ مستحق عبادت کے بیان میں صرف یوں نہیں کہنا چاہئے لا الہ الا اللہ، بلکہ یوں کہنا چاہئے لا الہ الا اللہ و محمد و علی اور جو لوگ ائمہ علیہم السلام کو خالق عالم جانتے ہیں ان کے عقیدہ کے مطابق یوں کہنا چاہئے لا الہ الا اللہ و محمد و علی و اولادہ المعصومین کہ لائق عبادت اللہ، محمد مصطفیٰ، علی مرتضیٰ علیہما السلام اور ان کے گیارہ معصوم فرزندان علیہم السلام کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ غرض ان ملاعین کا عقیدہ مستلزم شرک فی العبادۃ ہے بلکہ مستلزم شرک فی الافعال بھی ہے کیونکہ خلق عالم، مخلوقات کے رزق کو پیدا کر دینا، موت طاری کرنا، زندگی عطا کرنا یہ خدا کے افعال ہیں جن میں وہ وحدہٗ لاشریک ہے مگر یہ بداعتقاد، خدا کے ساتھ ائمہ علیہم السلام کو بھی ان افعال میں شریک کرتے ہیں کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ان نفوس قدسیہ کو پیدا کر کے انہیں تمام افعال پر قادر کیا ہے اور پھر انہیں کے واسطے سے یہ سارے افعال دنیا میں واقع کرا رہا ہے بلکہ ان کا یہ قول مستلزم شرک فی الصفات بھی ہے کیونکہ عالم دنیا کو خلق کرنا اور دیگر افعال مذکورہ خداوند عالم کی قدرت سے صادر ہوتے ہیں جو عین ذات باری ہے مگر یہ مفوضہ ملاعین ان افعال کو معصومین علیہم السلام کے لئے ثابت کرنے کے ذریعہ گویا ان کے لئے خداوند عالم کی قدرت کی مثل قدرت ثابت کرتے ہیں یعنی وہ ان کے لئے ایسی قدرت ثابت کرتے ہیں جس کے ذریعہ انہوں نے عالم دنیا کو پیدا کیا لہٰذا ان کا یہ عقیدہ اس کا مقتضی ہے کہ ائمہ علیہم السلام بھی ایسی قدرت رکھتے ہیں جیسی قدرت خدا رکھتا ہے اس لئے ان کا یہ عقیدہ شرک فی الصفات کو بھی مستلزم ہے۔

اس توضیح سے بخوبی سمجھ آجاتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام نے مفوضہ پر مشرک ہونے کا فتویٰ کیوں لگایا ہے۔ پھر واضح باد کہ شرک کی اسی طرح چار قسمیں ہیں جس طرح کہ توحید کی چار قسمیں ہیں:

(۱) شرک فی الذات (۲) شرک فی الصفات (۳) شرک فی الافعال (۴) شرک فی العبادۃ

ان کے مقابلہ میں توحید کی یہ چار قسمیں ہیں:

(۱) توحید فی الذات (۲) توحید فی الصفات (۳) توحید فی الافعال (۴) توحید فی العبادۃ

مفوضہ کا عقیدہ باللہ شرک موخر الذکر تینوں قسموں کو مستلزم ہے۔ اعاذنا اللہ و جمیع المومنین من ذلک۔

پھر مصنف علامہ قدس سرہ نے جو فرمایا کہ تفویض عدم استقلالی بھی اگر بہ نظر عمیق دیکھا جائے تو تفویض استقلالی ہی بن جاتی ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں رہتا، الخ۔ اس کی وجہ یہ ہے تفویض استقلالی کا عقیدہ ہو یا عدم استقلالی کا، ہر دو میں شرک کی مذکورہ تینوں قسموں کو مستلزم ہیں کیونکہ استلزام شرک کا دار و مدار ائمہ علیہم السلام کو خالق عالم ماننے پر ہے اور تفویض استقلالی ہو یا غیر استقلالی، ہر دو میں ائمہ علیہم السلام کو خالق مانا جاتا ہے (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زیر بحث جماعت نے محض تفویض پر اکتفا نہیں کی بلکہ انہوں نے اپنے زعم باطل کے اعتبار سے یہ ادّعاء کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے افعال میں واسطہ کی ضرورت اور احتیاج ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے:

الخلق والتأثیر لیس من شان الله القدیر، وان کلما صدق علیه سم شئی حادث من ای عالم کان بواسطة المشیئة لان الذات لا تحدث شیئا الا بالفعل، إلی قولهم فوجب فی خلق الاشیاء من توسط الفعل لامتناع تعلق القدرة بالمحال.

کہ پیدا کرنا اور اثر ایجاد کو صادر فرمانا یہ اللہ تعالیٰ کی شان سے ہو ہی نہیں سکتا کہ جو اللہ تعالیٰ صاحب قدرت[1] ہے اور ہر وہ شئے جس پر حادث کا لفظ صادق آئے خواہ وہ جس عالم میں ہو وہ مشیت کے واسطے سے صادر ہوگی کیونکہ ذات خداوند عالم کسی چیز کو فعل کے واسطہ کے بغیر پیدا ہی نہیں[2] کرسکتی؟ لفظ مشیت اور فعل سے مراد ان کے نزدیک ائمہ علیہم السلام ہیں جیسا کہ سابقاً گذر چکا، مترجم۔

(بقیہ حاشیہ۔۱) فرق صرف اتنا ہے کہ استقلالی والے کہتے ہیں کہ ائمہ علیہم السلام کو خداوند عالم نے خلق عالم پر قادر کرنے کے بعد مختار کل بنادیا ہے اور تمام اختیارات ان کو سونپ دیئے ہیں، جس طرح مناسب سمجھیں پیدا کریں اور جس وقت چاہیں، جس مقام پر چاہیں، جسے چاہیں پیدا کریں لیکن غیر استقلالی والے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خلق عالم پر ائمہ علیہم السلام کو قادر فرما کر عالم دنیا کے پیدا کرنے پر ائمہ علیہم السلام کی ذمہ داری تو لگائی ہے لیکن ہمہ تن ان کو خود مختار نہیں کیا بلکہ اپنے حکم کا پابند بنایا ہے لہٰذا وہ حکم خدا کے محتاج رہتے ہیں۔ جب حکم خدا ہوتا ہے اور جس طرح کا ہوتا ہے اسی کے مطابق ائمہ علیہم السلام پیدا فرماتے ہیں اور اسی کے مطابق عالم دنیا کی ہر طرح کی کارگزاری کو انجام دیتے ہیں خدا کا کام صرف حکم کرنا ہے ائمہ علیہم السلام کا کام ہر امر کو عملی حیثیت سے انجام پذیر کرنا ہے۔

غرض تفویض استقلالی وغیر استقلالی میں فرق صرف حکم خدا کی طرف محتاج ہونے اور نہ ہونے کے لحاظ سے ہے۔ رہا ائمہ علیہم السلام کا خالق عالم ہونا یہ تفویض کی ہر دو قسموں میں مشترکہ حیثیت سے لازم آتا ہے کیونکہ استلزام شرک کی بنیاد ائمہ علیہم السلام کو خالق عالم ماننے پر ہے جیسا کہ ثابت کیا جاچکا ہے۔ یہ وہ وجہ ہے جس کے باعث مصنف علامہ نے فرمایا کہ تفویض غیر استقلالی بعینہٖ تفویض استقلالی ہی ہے اور چونکہ کوئی عقلمند یہ تصور نہیں کرسکتا کہ ائمہ علیہم السلام وجود میں تو محتاج خدا ہیں لیکن پیدا کرنے کی قدرت میں وہ مستقل ہیں یعنی محتاج نہیں لہٰذا تفویض استقلالی کو اس معنی پر محمول کرنا ہرگز درست نہیں ہوسکتا (مترجم)۔

(۱) ان جہلاء کے اسی کلام میں تناقض ہے مگر ان کو اپنی جہالت کے باعث پتہ ہی نہیں چل سکا، تناقض اس لئے ہے کہ ادھر وہ اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات کو لفظ "قدیر" سے متصف کرتے ہیں جس کا معنی یہ ہے کہ وہ قادر مطلق ہے اور جو قادر مطلق ہو خلق وتاثیر یقیناً اس کی شان سے ہے لہٰذا یہ جہلاء اللہ تعالیٰ کو قدیر کہہ کر تو اعتراف کررہے ہیں کہ خلق وتاثیر سے وہ بذاتہ متصف ہوسکتا ہے اور پھر فیصلہ یہ دے رہے ہیں کہ خلق اور تاثیر اس کی شان سے نہیں ہے لہٰذا ایک ہی جملہ میں جس چیز کی نفی کررہے ہیں اسی کا اثبات بھی کررہے ہیں یہ ہے تناقض جس کا انہیں پتہ ہی نہیں چل سکا اور ایسے جاہل جن کو اپنے کلام کا مطلب سمجھ نہ آئے وہ اگر خداوند عالم کو واسطہ کا محتاج بنا ڈالیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ایسے جاہلوں سے حقیقت فہمی کی توقع ہی نہیں ہوسکتی۔

(۲) یہ تصور کہ اللہ تعالیٰ عالم دنیا وغیرہ موجودات کو پیدا کرنے میں واسطہ کا محتاج ہے بغیر احتیاج واسطہ وہ کسی چیز کو پیدا ہی نہیں کرسکتا عقلاً ونقلاً باطل ہے قرآن کریم، احادیث معصومین علیہم السلام اور عقل سلیم اس کے بطلان کے لئے شاہد صدق ہیں قرآن کریم اور احادیث میں اللہ تعالیٰ کا غنی مطلق اور ہر ممکن پر علی الاطلاق قادر ہونا مثل روز روشن ثابت ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی طرف محتاج قرار دینا قرآن پاک، اللہ تعالیٰ، رسول خدا اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی مخالفت اور نافرمانی ہے۔ ارشاد قدرت ہے:

(۲۔۱) وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ (سورۃ البقرہ، آیت: ۲۶۳) کہ اللہ غنی مطلق ہے ہر احتیاج سے بلند وبالا اور حلیم ہے۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

تا آنکہ ان لوگوں نے یوں کہہ دیا کہ اشیاء عالم کو پیدا کرنے کے لئے واجب ہے کہ فعل یعنی ائمہ علیہم السلام کا واسطہ ہو کیونکہ قدرت کا تعلق محال کے ساتھ قائم نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے مغالطہ دینے کے لئے فعل کا مصدری معنی مراد نہیں لیا

(بقیہ حاشیہ۔۲)

(۲۔۲) وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (سورۃ البقرہ، آیت: ۲۶۷) یقین کیجئے کہ بلا شک وشبہ اللہ تعالیٰ غنی مطلق، ہر احتیاج سے پاک و پاکیزہ اور لائق حمد وثناء ہے۔

(۲۔۳) وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (سورۃ آل عمران، آیت: ۹۷) جو شخص کفران اختیار کرے تو اس سے خداوند عالم کا کوئی نقصان نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں وہ تمام عالمین سے بے نیاز ہے۔

(۲۔۴) وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ (سورۃ الانعام، آیت: ۱۳۳) تیرا رب ہر احتیاج سے پاک اور ہر چیز سے بے نیاز ہے جو کہ مہربان اور رحیم ہے۔

(۲۔۵) قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ، هُوَ الْغَنِيُّ (سورۃ یونس، آیت: ۶۸) انہوں نے کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے بیٹا بنا لیا ہے یہ بالکل بکواس ہے کیونکہ وہ تمام نقائص سے پاک و پاکیزہ ہے اور ہر طرح سے وہ بے نیاز اور غنی ہے۔

(۲۔۶) وَقَالَ مُوْسٰۤى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ، فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○ (سورۃ ابراہیم، آیت: ۸) موسیٰ نے فرمایا کہ اگر تم بھی اور جتنی مخلوقات زمین میں موجود ہے وہ بھی سب کے سب کفران کرو۔ تو بھی اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا کیونکہ وہ ہر شخص سے بے نیاز اور ہر احتیاج سے پاک ہے اور لائق حمد وثناء ہے۔

(۲۔۷) لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ، وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ○ (سورۃ الحج، آیت: ۶۴) کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے وہ بھی، جو کچھ زمین میں ہے وہ بھی، اسی کا پیدا کردہ اور اس کی ملکیت ہے اور بے شک اللہ تعالیٰ ہر شئے سے بے نیاز اور لائق حمد ہے۔

(۲۔۸) وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ○ (سورۃ النمل، آیت: ۴۰) اور جو کفران کرے تو بھی وہ اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں کر سکتا کیونکہ بے شک میرا رب ہر شخص اور ہر چیز سے بے نیاز اور غنی ہے اور مہربان ہے۔

(۲۔۹) وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ، اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (سورۃ العنکبوت، آیت: ۶) جو شخص جہاد کرے گا وہ اپنے ہی فائدہ کے لئے کرے گا اللہ تعالیٰ کسی کے جہاد اور امداد کا محتاج نہیں، وہ تمام عالمین سے بے نیاز اور غنی ہے۔

(۲۔۱۰) لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ، اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ○ (سورۃ لقمان، آیت: ۲۶) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ ہی کا ہے۔ بے شک اللہ بے نیاز ہے اور لائق حمد وثنا ہے۔

(۲۔۱۱) يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ، وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ○ (سورۃ الفاطر، آیت: ۱۵) کہ اے لوگو! تم سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف محتاج ہو اور اللہ تعالیٰ ہر طرح غنی ہے اور لائق حمد ہے۔

(۲۔۱۲) اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ (سورۃ الزمر، آیت: ۷) اگر تم سب کے سب کفران کرو تو بھی خدا کا کچھ نہیں بگڑ سکتا کیونکہ اللہ تعالیٰ تم سے بے نیاز اور غنی و بے احتیاج ہے۔

(۲۔۱۳) وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (سورۂ محمد، آیت: ۳۸) اللہ تعالیٰ ہر شخص سے بے نیاز ہے اور تم سب کے سب اس کی طرف محتاج ہو۔

(۲۔۱۴) وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (سورۃ الحدید، آیت: ۲۴) جو شخص روگردانی کرے تو کیا ہوگا اللہ تعالیٰ ہر شخص کی احتیاج سے غنی ہے اور لائق حمد وثناء ہے، نیز ملاحظہ ہو سورۃ الممتحنہ، آیت: ۶۔

(۲۔۱۵) اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ (سورۃ الاخلاص، آیت: ۲) اللہ تعالیٰ کسی کا محتاج نہیں ہر ایک سے بے نیاز ہے اور اس سے کوئی بے نیاز نہیں سب اس کی طرف احتیاج رکھتے ہیں۔

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

بلکہ فعل اللہ سے ایک امر جوہری مراد لیا ہے اور اس امر جوہری کے وجود کو تمام وجودات سے قوی تر جانتے اور اسے عالم کائنات میں مؤثر مانتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ مشیت خدا کی ذات نفس ذات کی طرف نگاہ کی جائے تو وہ ایک ایسی شئے ہے جو متحقق اور بالاصالت اس طرح ثابت ہے کہ کوئی دوسری شئے اس کی مثل ثابت نہیں وہ اپنے خارجی وجود اور ثبوت میں تمام اشیاء سے اعلیٰ اور اثبت ہے اور وہ ایسی کیوں نہ ہو جبکہ وہ تمام ذاتوں کو خارج میں ذات بنانے والی اور ہر شئے کو شئے بنانے والی ہے حالانکہ تمام عقلاء کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ ہر مؤثر کا اس شئے سے قوی تر ہونا ضروری ہے جس میں وہ اثر کرتا ہے لہٰذا فعل خدا کا ایسا ذہنی امر ہونا کیسے مقصود ہو سکتا ہے جو ایک اعتباری اور خارج میں تحقق نہ رکھنے والی شئے ہو حالانکہ اس کے آثار زمین، آسمان، جن، انسان کی ایسی چیزیں ہوں جو واقع میں ثابت اور متحقق ہیں۔

یہیں سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ ان لوگوں کے نزدیک عالم دنیا میں مؤثر اور اس کا مدبر غیر اللہ ہے خداوند عالم صرف واسطے کو پیدا کر کے فارغ ہو گیا ہے لہٰذا ان لوگوں نے گویا اللہ تعالیٰ کے ارشاد پاک: كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ سے چشم پوشی کر لی ہے۔

ان لوگوں نے جو تصریح کر دی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بغیر وسائط کے واسطہ کے کسی شئے کا صادر ہونا محال ہے یعنی واسطہ کے توسط کے بغیر اللہ تعالیٰ کوئی چیز پیدا ہی نہیں کر سکتا، اس تصریح پر مطلع ہونے کے بعد اس میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ انہوں نے جو اپنے بعض فارسی رسالوں میں حقیقت حال کو مخفی رکھنے کی بنا پر لکھا ہے وہ تدلیس اور تلبیس ہے

(بقیہ حاشیہ۔ ۲)

(۲۔۱۶) إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (سورۃ البقرہ، آیت: ۲۰) بے شک اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے، اس آیت کے مضمون کو قرآن پاک میں جا بجا ادا کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو سورۃ البقرہ آیت: ۱۰۶، ۱۸۴، ۲۵۹، ۲۸۴، سورۃ آل عمران آیت: ۲۶، ۱۶۵۔ دیگر بہت سے مقامات میں بھی اس آیت کا مضمون وارد ہے خوفِ طوالت کے باعث اسی پر اکتفاء کرتے ہیں۔

غرض قرآن کریم سے مثل الشمس فی نصف النہار واضح اور روشن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر قادر ہے اور اسے کسی کی احتیاج نہیں لہٰذا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ عالم دنیا وغیرہ موجودات کو پیدا کرنے میں واسطے کا محتاج ہے بغیر واسطے کے پیدا ہی نہیں کر سکتا قرآن مجید کا انکار ہے اور قرآن پاک کی اس قدر آیات نقل کر دینے کے بعد اب احادیث کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔

رہا یہ امر کہ اللہ تعالیٰ کا خلق عالم میں واسطہ کا محتاج ہونا عقلاً بھی باطل ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کے واسطہ ہونے کی طرف اللہ تعالیٰ کے محتاج ہونے کا انہوں نے دعویٰ کیا ہے وہ شئے واجب الوجود تو ہو نہیں سکتی ورنہ اللہ جل شانہ کی توحید باطل ہو جائے گی اس لئے وہ ممکن الوجود ہوگی اور اس کا خالق اللہ جل شانہ ہوگا اور ضروری ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے بغیر واسطہ کے پیدا کیا ہو ورنہ واسطہ کا تسلسل لازم آئے گا جو کہ باطل ہے اور پھر خدا واسطے کو بغیر واسطہ کے پیدا کرنے پر قادر ہے۔ وہ دیگر اشیاء کو بھی بغیر واسطہ کے پیدا کر سکتا ہے لہٰذا دیگر اشیاء کے لئے واسطہ کی احتیاج باطل ہے۔ پس ثابت ہوا کہ خلق عالم کے لئے اللہ تعالیٰ کا واسطہ کی طرف محتاج ہونا عقلاً ونقلاً باطل ہے۔

یعنی انہوں نے جو بعض فارسی رسالوں میں اظہار کیا ہے کہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ نے ائمہ کو حکمت[۱] کے تقاضہ کے مطابق واسطہ بنایا ہے اس وجہ سے واسطہ نہیں بنایا کہ اللہ تعالیٰ مجبور تھا اور اس واسطے کے بغیر کسی چیز کو پیدا ہی نہیں کرسکتا تھا ان کا یہ قول کتمانِ حقیقت پر مبنی ہے اصل ان کا مذہب یہی ہے کہ خداوند عالم واسطہ کے بغیر کوئی چیز پیدا ہی نہیں کرسکتا کیونکہ ان کے الفاظ "فوجب فی خلق الاشیاء من توسط الفعل" سے فعل کا واسطہ ہونا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اشیاء کو پیدا کرنے کے لئے فعل کا واسطہ ہونا ضروری اور واجب ہے لہٰذا ان کے اعتقاد کا ماحصل یہی بنتا ہے کہ اس جوہر کے بغیر خداوند عالم کسی چیز کو پیدا نہیں کرسکتا جو ان کے ہاں فعل اللہ کے نام سے موسوم ہے اور یہ کہ خداوند عالم کو کسی طرح قادر علی الاطلاق نہیں کہا جاسکتا اور اس سے بڑھ کر کوئی مجبوری نہیں ہوسکتی کہ خداوند عالم صرف ایک فعل کو پیدا کرے اور دیگر کسی شئے کو پیدا نہ کرسکے اور برعکس اس کے فعل اللہ اور مشیئۃ اللہ جو چاہے کرے اور جس چیز کو چاہے پیدا کردے مگر خدا صرف فعل اللہ و مشیئۃ اللہ کو پیدا کر کے بیکار ہو جائے اچھا وہ لوگ یہ تو فرمادیں کہ اس فرق کی وجہ کیا ہے اور اس تفرقہ کا سبب کیا ہے[۲] کہ اگر اللہ تعالیٰ کو اس امر یعنی فعل کے علاوہ دیگر کسی غیر اللہ کی طرف محتاج فرض کیا جائے تو پھر حتماً خداوند عالم کو اس احتیاج سے بلند و بالا اور برتر تسلیم کرنا لازم ہے اور اس سے اس کو پاکیزہ قرار دینا ضروری ہے لیکن جب اس امر کی طرف محتاج ہونے کے یہ لوگ خود قائل ہیں اس کے باعث قدرت وعظمت خداوند عالم میں کسی قسم کا کوئی نقص اور کوئی رخنہ کیوں لازم نہیں آتا آخر اس تفرقہ کی وجہ کیا ہے؟ مختصر یہ کہ ان لوگوں کے کلمات گرے ہوئے، لغو اور ساقط ہیں اور چند ایسے احمق لوگ جو کلام کے حقائق اور دقائق تک رسائی حاصل نہیں کرسکتے وہ ان لوگوں کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔

خلاصہ: حق یہ ہے کہ بندوں کے افعال اختیاری کے علاوہ کہ جو حرکت اور سکون میں منحصر ہیں دیگر تمام موجودات یعنی اجسام، جسمانیات اور نفوس و ارواح کو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی پیدا نہیں کرسکتا۔ یہ اشیاء اللہ کے غیر سے صادر نہیں ہوسکتیں۔ ائمہ علیہم السلام اور دیگر تمام ممکنات نہ بذات خود اجسام و دیگر جواہر کے پیدا کرنے پر قدرت رکھتے

---

[۱] ان کا یہ قول بھی باطل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنا حکمت خلق اشیاء کے لئے واسطہ قائم کیا ہے کیونکہ اگر کوئی حکمت ہوتی تو قرآن کریم اور احادیث معصومین علیہم السلام میں خلق اشیاء عالم کا اسناد خداوند عالم کی طرف نہیں واسطہ کی طرف ہونا لازم تھا کیونکہ خلق عالم کا حقیقی فاعل اس تقدیر پر خداوند عالم نہ تھا بلکہ حقیقی فاعل وہ واسطہ تھا جس نے براہِ راست اشیاء کو پیدا کیا کیونکہ وہ واسطہ فاعل مختار ہے لہٰذا خلق اشیاء کا اسناد خدا کی طرف قرینہ مجازیت کے بغیر جائز نہ ہوتا حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے کیونکہ خلق اشیاء عالم کا اسناد پورے قرآن پاک میں واسطہ کی طرف واقع ہی نہیں ہوا۔ جہاں بھی اشیاء عالم کے خلق کرنے کا تذکرہ آیا ہے وہیں خداوند عالم کی طرف اسناد کیا گیا ہے پھر یہ کہ کہیں بھی اس اسناد کے مجاز ہونے کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا اور سابقاً بارہا ذکر ہو چکا ہے کہ اصل اسناد میں حقیقت ہوتی ہے لہٰذا لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خلق اشیاء کا اللہ تعالیٰ کی طرف اسناد حقیقت ہے مجاز نہیں۔ لہٰذا یہ خیال ایک فرضی اور خلاف واقع ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اور خلق عالم کے درمیان واسطہ قائم کیا ہے اور اس واسطے کا قیام حکمت پر مبنی ہے۔

[۲] اس سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے کسی بھی قسم کی احتیاج شانِ واجب الوجود کے منافی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کو خلق عالم میں واسطہ کا محتاج قرار دیتے ہو اور اس احتیاج کو شان خلاق عالم اللہ جل شانہ کے خلاف قرار نہیں دیتے؟

ہیں اور نہ ہی یہ درست ہے کہ خداوندعالم نے ان نفوس مقدسہ صلوات اللہ علیہم کو قادر کر کے ان چیزوں کے پیدا کرنے اور رزق دینے کو ان کے سپرد کر دیا ہے، نہ یہ عقلاً ثابت ہوسکتا نہ شرعا اور اپنی طرف سے من گھڑت طور پر کسی اختراعی چیز کو ان ذوات قدسیہ کی صفت قرار دینا جائز نہیں خصوصاً جب کہ ان لوگوں کے عقیدۂ باطلہ کے خلاف اجماع قطعی اور نصوص محکمہ [۱] قائم ہیں اور بالفرض اگر کوئی شاذ [۲] روایت یا خبر واحد ایسے عقیدہ کا وہم ڈالنے والی واقع بھی ہو تو وہ اس وجہ سے مطروح قرار دی جائے گی یا اس کی تاویل کی جائے گی، کیونکہ وہ آیات و احادیث محکمات کے معارض ہے اور مجملات و متشابہات غیر مبینہ بلکہ مطلقاً اخبار آحاد اصول اعتقاد میں محل اعتماد نہیں ہوسکتیں۔ لہٰذا حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی اس روایت کی طرف اسناد اور اس پر اعتقاد کی بنیاد رکھنا بے جا ہے، خلق له المشیئة بنفسها ثم خلق الاشیاء بالمشیئة، کہ اللہ تعالیٰ نے مشیت کو بنفسہا بغیر کسی واسطہ کے پیدا کیا اور بعد کو دیگر تمام چیزوں کو مشیت اور ارادہ کے واسطہ سے پیدا فرمایا، انتهی محصله۔

اس روایت کے ظاہری مفہوم پر ان کے عقیدہ باطلہ کی بنیاد رکھنا اس لئے جائز نہیں کہ حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کی غرض ان کے اس فرمان سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلق عالم کا نظام اس طرح قرار دیا ہے کہ ہر شئے ارادہ کے ذریعہ پیدا

---

[۱] نصوص محکمہ سے مراد وہ آیات اور احادیث ہیں جو متشابہات کے مقابلہ میں ہوتی ہیں اور متشابہات وہ ہوتی ہیں جن کے مطالب اور معانی کے متعلق متعدد احتمالات راہ پاسکتے ہوں۔ بنابریں محکمات سے مراد وہ آیات و احادیث ہوں گی جن کا معنی مراد معین اور حتمی ہو، اس کے معنی مراد کے متعلق مختلف احتمالات پیدا نہ ہوسکتے ہوں۔

[۲] شاذ روایت سے مراد یہاں پر شاذ کی وہ قسم ہے جس کا نام علماء اصول حدیث و روایت کے نزدیک "شاذ مردود" ہے۔ واضح باد کہ صاحب مقباس الہدایہ کتاب ہذا کے صفحہ ۴۲ پر لکھتے ہیں کہ اہل روایت وحدیث کے ہاں جو کچھ اظہر و اشہر ہے اس کی بنا پر "الشاذ ما رواه الثقة مخالفا لما رواه جماعة و لم یکن له الا اسناد واحد" شاذ وہ حدیث ہے جسے ثقہ راوی نے روایت کیا ہو مگر وہ ایسی حدیث کے خلاف ہو جسے ایک جماعت نے روایت کیا ہو نیز شاذ کے لئے شرط ہے کہ اس کا ایک ہی اسناد ہو اور وہ حدیث جسے شاذ کے مقابلہ میں ایک جماعت روایت کرتی ہے اسے "محفوظ" کہتے ہیں۔

صاحب مقباس الہدایہ اس کے بعد لکھتے ہیں: ان کان راوی المحفوظ احفظ و اضبط و اعدل من راوی الشاذ سی ذلك الشاذ بالشاذ المردود لشذوذه و رجوحیته لفقده للاوصاف الثلاثة (انتهی بقدر الحاجة)، کہ اگر محفوظ حدیث کا راوی شاذ کے راوی کی نسبت قوت حفظ، ضبط اور عدالت میں زیادتی رکھنے والا ہو یعنی اس کی نسبت وہ احفظ، اضبط اور اعدل ہو تو اس شاذ کا نام مردود رکھا جاتا ہے کیونکہ ایک تو یہ راوی اس روایت میں منفرد ہوتا ہے اور محفوظ کے اسناد متعدد ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ محفوظ کے راوی میں تین ایسی صفات پائی جاتی ہیں جو شاذ کے راوی میں مفقود ہوتی ہیں لہٰذا روایت شاذ مرجوح ہو جاتی ہے اس لئے مردود کہلاتی ہے۔

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہو گیا کہ یہاں روایت شاذ سے مراد شاذ مردود ہے جس پر مصنف علامہ اعلی اللہ مقامہ کے یہ الفاظ دال ہیں: بس مطروح خواهد بود یا ماؤل لمعارضته بالمحکمات، معلوم ہوا کہ اس شاذ سے وہ شاذ مراد ہے جو آیات و احادیث محکمات کے معارض ہو اور ظاہر ہے کہ روایت بھی محکمات میں وہی شمار ہوگی جس کا راوی شاذ کی نسبت احفظ، اضبط اور اعدل ہو اور آیات محکمات کی سند تو ہے ہی قطعی اس میں تو کلام کی گنجائش ہی نہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ اس شاذ سے مراد شاذ مردود ہے۔

کی ہے اور ارادہ کے معنی کا علم اسے پہلے حاصل تھا۔ حضرت کی غرض اس فرمان سے یہ ہرگز نہیں کہ مشیت اور ارادہ ایک مستقل وجود رکھنے والی چیز ہے کہ جو خالق وحدہ لاشریک اور اس کی مخلوقات کے درمیان آلہ اور واسطہ ہے جس کا نام مشیت اللہ اور قدرۃ اللہ ہے جیسے کہ یہ لوگ وہم کرتے ہیں۔ یہ ہے غرض حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کی اور اس طرح کیسے نہ ہو جبکہ محمد بن عرفہ کی اس روایت میں وارد ہوا ہے جو اس نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء عالم کو قدرت کے واسطے سے پیدا کیا ہے یا بغیر قدرت کے؟ تو حضرت نے فرمایا کہ گویا تو نے قدرت خدا کو ایک ایسی چیز قرار دے رکھا ہے جو ذات خداوند عالم سے علیحدہ ایک مستقل[1] وجود سے موجود ہے اور اس کو تو نے ایسا آلہ اور واسطہ قرار دے رکھا ہے کہ جس کے واسطے سے اللہ تعالیٰ نے دیگر اشیاء کو پیدا کیا ہے فرمایا کہ یہ شرک ہے لہٰذا ایسا کہنا ہرگز جائز نہیں؟ انتھی محصل الروایۃ۔

تردید استدلال بروایت "نزلونا عن الربوبیۃ الخ"

اسی طرح اس روایت سے تمسک کرنا بھی سراسر بے جا ہے "نزلونا عن الربوبیۃ و قولوافینا ماشئتم"، کہ ہمیں درجۂ ربوبیت سے پست رکھو، بعد ازاں جو چاہو ہمارے متعلق کہتے رہو۔ اس روایت سے استدلال اولاً تو اس

---

[1] صفات خداوند عالم ذات خداوند عالم سے الگ مستقل وجود سے موجود نہیں بلکہ صفات خداوند عالم عین ذات باری تعالیٰ ہیں بایں معنی کہ ذات پاک پروردگار ان صفات کے انتزاع کا منشاء ہے۔ اس ذات پاک سے یہ صفات منتزع ہوتی ہیں اور یہ صفات انتزاعیہ ہیں، صفاتِ انضمامیہ نہیں کہ جو ظرف اتصاف میں وجود موصوف سے الگ اور مستقل وجود رکھتی ہیں کیونکہ اگر فرض کیا جائے کہ وہ صفات انضمامیہ ہیں جو کہ مستقل وجود سے موجود ہیں تو خداوند عالم جل شانہ کا العیاذ باللہ جہل و عجز لازم آتا ہے جو کہ محال اور باطل ہے تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا، وجہ التزام یہ ہے کہ اس صورت مفروضہ کی تقدیر پر یہ صفات ممکنۃ الوجود ہوں گی کیونکہ واجبۃ الوجود تو ہو نہیں سکتی ورنہ واجب الوجود اللہ جل شانہ کی توحید پر زد پڑتی اور معاذ اللہ توحید باطل ہو جاتی جس کا استحالہ اظہر من الشمس ہے اور جب ان صفات کا ممکنۃ الوجود ہونا ضروری ہے تو پھر لازم ہے کہ یہ حادث ہوں کیونکہ یہ قدیم ہرگز نہیں ہو سکتیں اور یہ اس لئے کہ ان کا موجود سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی دیگر ہستی نہیں ہو سکتی ورنہ اللہ تعالیٰ کی اپنی صفات میں غیر کی طرف احتیاج لازم آتی ہے جو کسی طرح ممکن نہیں، ورنہ وہی توحید کا بطلان لازم آتا ہے اور جب ضروری ہوا کہ ان کا موجد غیر اللہ نہیں ہو سکتا تو ثابت ہوا کہ قدیم نہیں ہو سکتی، حادث ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے اور فاعل مختار کا محل ارادہ اور اختیار کے بعد ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو فعل ارادہ اور اختیار کے بعد واقع ہو وہ حادث ہوتا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ اس تقدیر پر صفات خدا حادث ہوں گی اور حادث وہ ہوتا ہے جو نہ ہونے کے بعد پیدا ہوا ہو، لہٰذا لازم آئے گا کہ صفات خداوند عالم علم و قدرت مثلاً ایک وقت میں موجود اور متحقق نہ ہوں اور جب العیاذ باللہ علم خداوند عالم مفقود ہو گا اس وقت اللہ تعالیٰ کا جہل لازم آئے گا اور جب اس کی قدرت متحقق نہ ہو گی تو اس کا عجز لازم آئے جس کا بطلان اظہر من الشمس فی نصف النہار ہے کیونکہ عاجز کسی چیز کو پیدا ہی نہیں کر سکتا تو پھر اس نے قدرت کو کیسے پیدا کر دیا؟ اور اسی طرح علم کیسے پیدا کر دیا؟ لہٰذا ثابت ہوا کہ خداوند عالم کی قدرت مثل اس کی دیگر صفات کے ایسا مستقل وجود رکھنے والی چیز نہیں جو ذات خداوند عالم سے الگ ہو بلکہ وہ ایک صفت انتزاعیہ ہے اور جب وہ مستقل وجود رکھنے والی چیز ہی نہیں تو یہ تصور ہی نہیں ہو سکتا کہ قدرت خدا خلق عالم اور خداوند عالم کے مابین واسطہ ہے واسطہ بننے کا تصور اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ قدرت خدا مثل ذات خدا واجب الوجود ہو جو کہ شرک صریح ہے اور توحید کا بطلان ہے جیسے کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے اس عقیدہ کے شرک ہونے کی تصریح فرمائی۔

لئے غلط ہے کہ یہ روایت اخبارِ آحاد میں سے ہے لہٰذا اصولِ اعتقاد میں استدلال کے قابل نہیں اور ثانیاً اس لئے غلط ہے کہ مراد رب سے مالک، خالق اور رازق ہے، لہٰذا ربوبیت سے مراد خالق اور رازق ہونا ہے جیسا کہ تفسیر حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام میں وارد ہے۔ لہٰذا ائمہ علیہم السلام کی طرف خلق و رزق کی نسبت اور انہیں خالق و رازق قرار دینا درجۂ ربوبیت سے پست رکھنے کے منافی ہے کیونکہ جب انہیں خالق و رازق کہہ دیا تو رب معبود قرار دے دیا اور ثالثاً اس روایت سے استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ برتقدیر تسلیم بھی اس حدیث سے استدلال اس کے عموم سے تمسک کرنے کا ذریعہ ہوسکتا ہے حالانکہ یہ اپنے عموم پر باقی نہیں کیونکہ قاعدہ:

ما من عام الا و قد خص[1] اس کی تخصیص پر دلالت کرتا ہے جس طرح کہ حدیث پاک: **من قال لا اله الا الله دخل الجنة**[2] کا عموم تمام اسلامی فرقوں کی نجات کا باعث نہیں ہوسکتا اسی طرح اس حدیث کے عموم سے بھی استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ غرض حدیث: **نزلونا عن الربوبية**، اپنے عموم پر باقی نہیں، مخصص ہے اور مخصص کیسے نہ ہو جبکہ ائمہ علیہم السلام کو ان صفات سے خالی سمجھنا واجب ہے جو ربوبیت کے ساتھ مختص ہیں جیسے قدیم ہونا نیز ان کو نبوت سے بھی خالی قرار دینا واجب ہے کیونکہ اس حدیث کا عموم تو چاہتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام کو نبوت سے بھی متصف کیا جا سکے حالانکہ ایسا ہرگز جائز نہیں۔ لہٰذا اس حدیث میں: **قولوا ماشئتم** کے الفاظ سے مراد ائمہ علیہم السلام کی ایسی مدح و ثنا ہے جو اصول شریعہ کے موافق ہو، یہ ہرگز مراد نہیں کہ اپنی طرف سے اور من گھڑت طور پر جو امور واقعیہ یا غیر واقعیہ ائمہ علیہم السلام کی طرف منسوب کرتے رہیں وہ سب کچھ جائز سمجھا جائے۔

فرقہ مفوضہ کی تردید میں ابوالحسن دلال کی روایت

ابوالحسن احمد بن دلال نے روایت کی ہے۔ سابقاً اس روایت کا اصل عربی متن کتاب منہاج البراعۃ، جلد ۲ صفحہ ۱۰۹ و مرآۃ العقول، شرح اصول الکافی جلد ا صفحہ ۱۹۲، الاحتجاج علامہ طبرسی صفحہ ۲۶۷ اور کتاب عیون اخبار رضا علیہ السلام کے

---

[1] یعنی کوئی عام ایسا نہیں جو خاص نہ ہو گیا ہو، ہر عام کا کوئی نہ کوئی مخصص ایسا پایا جاتا ہے جو اس کے بعض افراد سے مختص ہو جانے کا موجب ہوتا ہے۔

[2] اس حدیث پاک کا ظاہر مفہوم عام یہ ہے کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کا قائل ہو گا وہ ضرور جنت میں داخل ہو گا لیکن مفہوم عام مراد اور مقصود نہیں کیونکہ اس سے تمام اسلامی فرقوں کا جنتی ہونا لازم آتا ہے جو کہ قطعاً صحیح نہیں، دوسری احادیث مسلمہ کے یہ مفہوم منافی ہے جیسے کہ مثلاً رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے ۷۳ فرقے ہوں گے جن میں سے صرف ایک جنتی ہو گا باقی سب جہنمی ہوں گے۔ یہ حدیث ان احادیث میں سے ہے جو حدیث "من قال لا اله الا الله دخل الجنة" کے مخصصات ہیں بلکہ یہ حدیث لا اله الا الله الخ تو دلالت کرتی ہے کہ ہر وہ شخص جنتی ہے جو توحید کا قائل ہو خواہ وہ آنحضرت نبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا ہی منکر کیوں نہ ہو لہٰذا اس حدیث کے عموم کے اعتبار سے تو یہود، نصاریٰ، مجوس اور اہل ہنود کے بھی وہ تمام فرقے جنتی ہو جاتے ہیں جو توحید پروردگار کے قائل ہیں حالانکہ یہ یقیناً باطل ہے اس لئے معلوم ہوا کہ حدیث من قال لا اله الا الله دخل الجنة اپنے عموم پر باقی نہیں بلکہ مخصوص بالبعض ہے۔ اسی طرح حدیث "نزلونا عن الربوبية" بھی برتقدیر تسلیم مخصوص بالبعض ہے اپنے عموم پر باقی نہیں۔

حوالے سے درج کی جا چکی ہے۔ نیز ملاحظہ ہو سفینۃ البحار جلد ۲، صفحہ ۲۷۶ (لیکن اصل عبارت میں ابوالحسن احمد بن دلال کی بجائے یوں لکھا ہے: عن علی بن احمد الدلال القمی یعنی علی بن احمد دلال قمی نے روایت کی ہے، مترجم)، کہ شیعہ فرقوں کی ایک جماعت نے اس بارے میں اختلاف کیا کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے اور رزق دینے کے معاملات کو ائمہ علیہم السلام کے سپرد کر دیا ہے یا نہ، ایک جماعت نے کہا کہ یہ محال ہے کیونکہ خالق اَنام اللہ جل شانہ کے علاوہ اجسام کے پیدا کرنے پر کوئی بھی قدرت نہیں رکھتا اور بعض نے کہا کہ حق تعالیٰ نے ان کو ان امور پر قادر کر دیا ہے اور یہ امور ان کو تفویض کر دیئے ہیں لہٰذا ائمہ علیہم السلام ہی نے سارے عالم کو پیدا کیا ہے اور انہوں نے ہی رزق دیا ہے۔ اس مسئلہ میں ان کا اختلاف اور جھگڑا طول پکڑ گیا تو مومنین میں سے ایک سمجھ دار نے ان سے کہا کہ تم اس خصوصی مسئلہ کے متعلق حضرت محمد بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کیوں نہیں کرتے کہ جو حضرت صاحب الامر علیہ السلام کے وکیل ہیں؟

چنانچہ حضرت محمد بن عثمانؒ کی طرف رجوع کرنے کے متعلق سب راضی ہو گئے اور اس مسئلہ کو لکھ کر انہوں نے محمد بن عثمانؒ کی معرفت حضرت صاحب الامر علیہ وعلیٰ آبائہ الکرام آلاف الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں بھیج دیا تو حضور صاحب الزمان علیہ السلام کی توقیع رفیع الشان یعنی جناب کا فرمان واجب الاذعان محمد بن عثمانؒ کے ذریعہ برآمد ہوا جو ان الفاظ[1] پر مشتمل تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جو ہر ہر جسم کو پیدا کرنے والی اور ہر ہر رزق کو تقسیم کرنے والی ہے کیونکہ وہ نہ جسم

---

(۱) اس توقیع مبارک میں پہلا جملہ بزبان عربی یہ ہے: ان اللہ ھو الذی خلق الاجسام و قسم الارزاق، اس جملہ میں لفظ "ھو" ضمیر فصل ہے جو حصر پر دلالت کرتی ہے لفظ "الاجسام" اور "الارزاق" میں لام استغراق کا ہے لہٰذا اس جملہ کا معنی یہ بنتا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جس نے ہر ہر جسم کو پیدا کیا ہے اور ہر ہر رزق کو تقسیم کیا ہے جس سے یہ مطلب بخوبی واضح ہے کوئی دیگر ہستی ایسی نہیں ہے جس نے کسی جسم کو پیدا کیا ہو یا کسی رزق کو تقسیم کیا ہو صرف اللہ تعالیٰ کی وہ ذات ہے جو ان دونوں افعال کی فاعل ہے خلق اجسام کی فاعل بھی وہی ہے اور تقسیم ارزاق کی فاعل بھی وہی ہے اور خداوند عالم کے مقسم رزق ہونے کا یہ معنی نہیں کہ جس طرح ایک تبرک اور نیاز تقسیم کرنے والا مسجد یا امام بارگاہ میں یا کسی دوسرے مقام میں تبرک تقسیم کرتا ہے اور ہر شخص کا حصہ اس تک پہنچاتا اور اسے دیتا جاتا ہے اسی طرح خداوند عالم ہر شخص کے رزق کو اس طرح تقسیم کرتا ہے کہ ہر بندے کو اپنے مقام پر بیٹھے بیٹھے بغیر کوئی تکلیف کرنے کے اللہ تعالیٰ اسے اس کا رزق پہنچا دیتا ہے کیونکہ یہ معنی نہ صرف مشاہدہ کے خلاف ہے بلکہ آیات اور احادیث کے بھی مخالف ہے۔ آیات اور احادیث سے جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ارزاقِ عباد کو پیدا کرتا ہے اور بندوں کو اس نے مامور کیا ہے کہ وہ جائز طریقہ پر رزق حاصل کریں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے علم ازلی سے جانتا ہے کتنی مقدار کس کا رزق ہوگا اور وہ اسے کس کس طریقہ سے حاصل کرے گا اور علم باری تعالیٰ چونکہ صحیح ہے اس لئے ہر شخص کا جو رزق علم الٰہی میں آچکا ہے اتنا ہی وہ حاصل کرے گا، اسی کا نام ہر شخص کی قسمت ہے اور یہی اللہ کی طرف سے رزق کی تقسیم ازلی ہے۔ ارشاد قدرت ہے: نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (سورۃ الزخرف، آیت: ۳۲) کہ ہم نے بندوں کے درمیان ان کی روزی کو تقسیم کیا ہے اور یہی وہ تقسیم ارزاق ہے جس کا تذکرہ حضرت صاحب الامر (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی مذکورہ بالا توقیع میں ان الفاظ کے ساتھ وارد ہے: ان اللہ ھو الذی خلق الاجسام و قسم الارزاق کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ ہستی ہے جس نے ہر ہر جسم کو پیدا کیا اور ہر ہر رزق کو تقسیم کیا ہے یعنی ہر شخص کی جو قسمت ازل سے بنی ہے اس کے مطابق وہ دنیا میں اپنا رزق حاصل کرتا ہے البتہ حلال یا حرام طریقہ اختیار کرنا بندے کے اپنے اختیار میں ہے۔ جو حلال طریقہ سے اپنے رزق مقسوم کو حاصل کرتا ہے وہ خدا کا فرمانبردار ہے جو حرام طریقے سے حاصل کرتا ہے وہ خداوند عالم کا نافرمان قرار پاتا ہے اور ساتھ ہی جتنی مقدار وہ حرام کی حاصل کر لیتا ہے اتنی اس کی رزق حلال سے بند ہو جاتی ہے۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

رکھنے والی ہستی ہے نہ جسم میں حلول کرنے والی، اس کی مثل کوئی شئے نہیں، وہ سمیع اور بصیر ہے لیکن ائمہ علیہم السلام خداوند عالم سے سوال کرتے ہیں تو وہ پیدا کر دیتا ہے اور اگر اس سے رزق عطا کرنے کا سوال کرتے ہیں تو وہ روزی عطا کر دیتا ہے کیونکہ اسے ان کی شان کی عظمت مقصود ہوتی ہے اس لئے وہ ان کی دعا کو ردّ نہیں کرتا، شرف قبولیت سے مشرف فرماتا ہے یعنی ائمہ علیہم السلام بندوں کی دعاؤں کی قبولیت کا وسیلہ ہیں اور یہ امر بے شک ایسا حق ہے کہ جو لائق اتباع ہے لہٰذا خلق و رزق کی تفویض کا مضمون بالکل من گھڑت اور مصنوعی ہے۔ ہاں اظہار معجزہ کے لئے خاص خاص مقامات پر اللہ تعالیٰ ائمہ علیہم السلام کے دستہائے مبارکہ پر کچھ ایسے امور ظاہر فرماتا رہتا ہے جو عالم دنیا کی عادت مستمرہ اور طریقہ جاریہ کے خلاف ہوتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ۔۱) پھر انسان کے اعمال کو انسان کے رزق کے کم وبیش ہو جانے میں دخل ہوتا ہے۔ بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں جن کے باعث رزق تنگ ہو جاتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کے باعث رزق وسیع ہو جاتا ہے جیسے مثلاً تصدق فی سبیل اللہ وسعت رزق کا باعث ہوتا ہے اور نماز مغربین کے درمیان سونا رزق کی کمی کا باعث ہوتا ہے (کتاب سفینۃ البحار، ج ۲ صفحہ: ۶۲۴)۔

بحوالہ مکارم الاخلاق حضرت صادق آل محمد علیہم السلام کی ایک حدیث منقول ہے جس میں یہ جملہ موجود ہے: **والنوم بعد العصر حمق و بین العشائین یحرم الرزق** کہ نماز عصر کے بعد سونا حماقت ہے اور مغربین کے درمیان نیند کرنا رزق سے محروم ہونے کا باعث ہوتا ہے۔

نیز سفینۃ البحار، ج ۲، صفحہ: ۶۲۴ بحوالہ بصائر الدرجات تحریر ہے: **عن أبي حمزة قال: كُنْتُ عِنْدَ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ وَ عَصَافِيْرُ عَلَى الْحَائِطِ قُبَالَتَهٗ يَصِحْنَ فَقَالَ يَا اَبَا حَمْزَةَ اَ تَدْرِي مَا يَقُلْنَ قَالَ يَتَحَدَّثْنَ اَنَّ لَهُنَّ وَقْتٌ يَسْئَلْنَ فِيهِ قُوتَهُنَّ يَا اَبَا حَمْزَةَ لَا تَنَامَنَّ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ فَإِنِّي أَكْرَهُهَا لَكَ إِنَّ اللهَ يُقَسِّمُ فِي ذٰلِكَ الْوَقْتِ اَرْزَاقَ الْعِبَادِ وَ عَلٰى اَيْدِيْنَا يُجْرِيْهَا۔**

ابوحمزہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کی خدمت میں موجود تھا اور آپ کے سامنے ایک دیوار تھی جس پر کچھ چڑیاں بیٹھی چوں چوں کر رہی تھیں اور انہوں نے شور مچا رکھا تھا تو حضرت علیہ السلام نے مجھ سے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ چڑیاں کیا کہہ رہی ہیں؟ پھر فرمایا کہ آپس میں باتیں کرتی ہوئی کہہ رہی ہیں کہ ان کے لئے خاص ایسا وقت مقرر ہے جس میں وہ اپنی خوراک کے متعلق اللہ تعالیٰ سے سوال کرتی ہیں، اے ابوحمزہ! طلوع شمس سے پہلے تم ہرگز سویا نہ کرو اس وقت کی نیند کو میں تمہارے لئے مکروہ سمجھتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ اس وقت میں بندوں کے رزق کو تقسیم کرتا ہے اور اس وقت وہ ہم بندوں کی دعاؤں کو بہت جلد قبول کرتا ہے اور اس وقت رزق کے متعلق دعا اس قدر سریع الاجابہ ہوتی ہے کہ گویا اس وقت کی دعا کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ رزق کو ہمارے ہاتھوں پر جاری کر دیتا ہے۔

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک سونا نہیں چاہئے بلکہ دعاء اور تعقیبات میں انسان کو مشغول رہنا چاہئے۔ اس کے باعث انسان کے رزق میں اضافہ ہوتا ہے کیونکہ اس وقت رزق کے متعلق دعا بہت جلد شرف قبولیت حاصل کرتی ہے اور اس کا اثر اس قدر جلدی مرتب ہوتا ہے اور اسباب رزق اس کثرت سے فوری طور پر مہیا ہو جاتے ہیں کہ گویا بندوں کے ہاتھوں پر رزق جاری ہو جاتا ہے۔

"ازالہ غلط فہمی"

اس حدیث میں "**وعلی ایدینا یجریھا**" کے الفاظ سے بعض صاحبان نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بندوں کے رزق ائمہ معصومین علیہم السلام کے دستہائے مبارکہ سے جاری کئے جاتے ہیں حالانکہ اس جملہ کا یہ معنی مراد لینا قرین صواب نہیں۔ ان صاحبان نے اپنے اس عقیدہ باطلہ کی طرف اس جملہ کو کھینچنے کی کوشش کی ہے کہ بندوں کا رزق پہلے ائمہ علیہم السلام کے ہاتھوں میں آتا ہے اور پھر ائمہ علیہم السلام ہر شخص کا رزق اس تک پہنچاتے ہیں۔ یہ درحقیقت تفویض رزق کی (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

معجزہ فعل خدا ہوتا ہے

معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ پیغمبر یا امام کی تصدیق کے لئے ان کے ہاتھوں پر صادر فرماتا ہے جیسا کہ علمائے علم کلام نے تصریح فرمائی ہے اور حضرت امام علی رضا علیہ التحیۃ والثناء نے اس پر نص کیا ہے، چنانچہ آپ نے غالیوں کی ردّ کرتے ہوئے فرمایا: فَقَالَ: لَمَّا ظَهَرَ مِنْهُ الْفَقْرُ وَ الْفَاقَةُ دَلَّ عَلٰی اَنَّ مَنْ هٰذِهٖ صِفَاتُهٗ وَ شَارَكَهٗ فِيْهِمَا الضُّعَفَاءُ الْمُحْتَاجُونَ، لَا تَكُونُ الْمُعْجِزَاتُ فِعْلَهٗ، فَعُلِمَ بِهٰذَا اَنَّ الَّذِيْ ظَهَرَ مِنْهُ

(بقیہ حاشیہ۔۱) ترجمانی ہے جو کہ نہ عقلاً ثابت ہے نہ نقلاً، عقلاً اس لئے ثابت نہیں کہ یہ ادعا مشاہدہ کے خلاف ہے۔ کہاں سارے انسان ائمہ علیہم السلام کے ہاتھوں سے اپنا رزق حاصل کرتے ہیں ہر شخص تو اپنے رزق کو اپنے کسب وغیرہ کے ذریعہ حاصل کرتا ہے عقلاء زمانہ اس وہمی خیال کو کیسے قبول کریں گے کہ ہر شخص کو امام زمان (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) اپنے ہاتھوں سے آکر اس کا رزق پہنچا جاتے ہیں یا ہر آدمی دونوں وقت ان کی خدمت میں پہنچ کر اپنا رزق ان کے ہاتھوں سے حاصل کر آتا ہے۔ عقلاء زمانہ کے سامنے اگر اس نظریہ کو پیش کیا جائے تو وہ اسے ایک مجذوب کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں دیں گے حالانکہ مذہب شیعہ اتنا پختہ اور محکم مذہب ہے کہ اس کا ہر نظریہ اور ہر عقیدہ صحیح عقل کے مطابق ہے اور عقل کی کسوٹی پر اس طرح پورا اترتا ہے کہ کوئی عقلمند اسے ردّ نہیں کرسکتا۔

اور نقلاً یہ مفہوم اس لئے غلط ہے کہ یہ تمام آیات واحادیث کے خلاف ہے کیونکہ آیات واحادیث کا خلاصہ جیسے کہ سابقاً تحریر ہو چکا ہے اللہ تعالیٰ نے رزق کو دنیا میں پیدا کیا ہے بندوں کو اس کے حاصل کرنے پر قادر کیا ہے اور مامور کیا ہے کہ وہ حلال طریقے پر طلب رزق کر کے اسے حاصل کریں اور پھر چونکہ ہر مؤثر کے اثر کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت پر مبنی کیا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے بعض اعمال کو اسبابِ رزق کے میسر آنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان اعمال میں سے ایک عمل صبح کی نماز کے بعد دعا اور تعقیبات بھی ہیں۔

حدیث زیر بحث میں حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام نے ابوحمزہ کو بعد از نماز صبح تعقیبات میں مصروف رہنے کی تعلیم دی ہے اور یہ فرمایا کہ اس وقت کی دعا کا اور تعقیبات کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بندوں کے لئے رزق کے دروازے کھل جاتے ہیں، اسبابِ رزق بکثرت مہیا ہو جاتے ہیں اور یہ خداوند عالم کا لطف اور مہربانی ہے کہ اس نے اپنے لطف وکرم سے اس وقت کی دعا کو دو قسم کے فوائد کا ذریعہ بنا دیا ہے ایک عبادت خدا اور دوسرے وسعت رزق کے اسباب مہیا ہونے کا باعث ہونا اور یہ مفہوم دوسرے بہت سی احادیث سے بھی ثابت ہے، چنانچہ ملاحظہ ہو: سفینۃ البحار، ج ۲ صفحہ: ۶۲۴، ۶۲۵ بحوالہ کتاب الاحتجاج وتہذیب الاحکام تحریر ہے: قال صادق علیه السلام: نَوْمَةُ الْغَدَاةِ مَشْؤُمَةٌ تَطْرُدُ الرِّزْقَ وَ تُصَفِّرُ اللَّوْنَ وَ تُقَبِّحُهٗ وَ تُغَيِّرُهٗ وَ هُوَ نَوْمُ كُلِّ مَشْؤُمٍ إِنَّ اللهَ تَعَالٰى يَقْسِمُ الْأَرْزَاقَ مَا بَيْنَ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلٰى طُلُوعِ الشَّمْسِ وَ إِيَّاكُمْ وَ تِلْكَ النَّوْمَةَ وَ كَانَ الْمَنُّ وَ السَّلْوٰى يَنْزِلُ عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيلَ مَا بَيْنَ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلٰى طُلُوعِ الشَّمْسِ فَمَنْ نَامَ تِلْكَ السَّاعَةَ لَمْ يَنْزِلْ نَصِيبُهٗ وَ كَانَ إِذَا انْتَبَهَ فَلَا يَرٰى نَصِيبَهٗ احْتَاجَ إِلَى السُّؤَالِ وَ الطَّلَبِ۔

حضرت صادق آل محمد علیہم السلام نے فرمایا کہ صبح یعنی طلوع شمس سے پہلے کی نیند منحوس ہوتی ہے، انسان کے رزق کو زائل کر دیتی ہے، رنگ کو زرد اور متغیر کر دیتی ہے، چہرے کی رونق کو بگاڑ کر قبیح بنا دیتی ہے، وہ ہر ایسے شخص کی نیند ہے جو بد بخت ہو، اللہ تعالیٰ طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس تک رزقوں کو تقسیم فرماتا ہے لہٰذا تمہیں اس نیند سے بچنا چاہئے۔ بنی اسرائیل پر من وسلویٰ طلوع فجر سے لے کر طلوع شمس تک ہی نازل ہوتے تھے اور جو شخص اس وقت سو جاتا تھا اس کا حصہ نازل نہیں ہوتا تھا جب وہ بیدار ہوتا اور دیکھتا کہ اس کا حصہ نازل نہیں ہوا تو وہ پھر سوال کرنے اور طلب کرنے کی طرف محتاج ہو جاتا۔ نیز سفینۃ البحار، ج ۲، صفحہ ۲۰۸: عن الصادق علیه السلام: اَلتَّعْقِيبُ أَبْلَغُ فِيْ طَلَبِ الرِّزْقِ مِنَ الضَّرْبِ فِي الْبِلَادِ يعنى بالتعقيب الدعاء بعقب الصلوة. حضرت صادق آل محمد علیہ السلام نے فرمایا کہ تعقیبات کا بجالانا وسعت رزق کے متعلق (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

مِنَ الْمُعْجِزَاتِ إِنَّمَا كَانَتْ فِعْلَ الْقَادِرِ الَّذِي لَا يُشْبِهُ الْمَخْلُوقِينَ، لَا فِعْلَ الْمُحْدَثِ الْمُحْتَاجِ الْمُشَارِكِ لِلضُّعَفَاءِ فِي صِفَاتِ الضَّعْفِ. یہ روایت قبل ازیں الاحتجاج صفحہ ۲۴۴، اور تفسیر قمی، تفسیر آیت غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ کے تحت نقل کی جا چکی ہے۔ مترجم۔

عبارت ہذا کا ماحصل یہ ہے کہ جب علی علیہ السلام سے فقر و فاقہ اور احتیاج کا اظہار ہوا تو اس سے اس امر پر دلالت قائم ہوگئی کہ جس شخص کی ایسی صفتیں ہوں کہ جن میں اس کے ساتھ ضعفاء اور محتاجین شریک ہوں معجزات اس کا فعل نہیں ہو سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے جو معجزات ظاہر کئے تھے وہ اس قادرِ مختار اللہ جل شانہ کا فعل تھے جو مخلوق سے مشابہت نہیں رکھتا۔ وہ اس حادث شخصیت کا فعل نہیں ہو سکتے جو ایسی محتاج ہو کہ جو کمزوروں کے ساتھ صفات

(بقیہ حاشیہ۔۱) شہر بہ شہر سفر کرنے سے بھی زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور تعقیب سے مراد نماز کے بعد دعا کرنا ہے، نیز سفینۃ البحار، ج۲، صفحہ ۲۰۹:
قال رسول الله (ص) مَنْ أَدَّى لِلّٰهِ مَكْتُوبَةً فَلَهُ فِي أَثَرِهَا دَعْوَةٌ مُسْتَجَابَةٌ، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نماز فریضہ ادا کرے، اس نماز کے بعد اس کی دعا مستجاب ہوتی ہے اور بالخصوص نمازِ صبح کے بعد رزق کے متعلق دعا کو فوری طور پر قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک جو وقت ہے اسے اللہ تعالیٰ نے بالخصوص یہ شرف عطا فرمایا ہے کہ اس میں انسان کی روزی کے متعلق قسمت کھلتی ہے اور اس وقت کی دعاء سے رزق میں اضافہ ہوتا ہے، اس لئے اس وقت ہر شخص کو بیدار رہ کر دعاء میں مشغول رہنا چاہئے اور دیگر وظائف وغیرہ کو بجالانا چاہئے، نیند نہیں کرنا چاہئے۔
اس وضاحت سے بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ حکم تمام بندوں کے لئے ہے صرف ائمہ معصومین علیہم السلام کے ساتھ خاص نہیں لہٰذا "علی ایدینا یجریھا" میں ضمیر جمع متکلم سے تمام بندے مراد ہیں جن میں حضرات ائمہ معصومین علیہم السلام بھی داخل ہیں اور دیگر تمام لوگ اس ضمیر متکلم سے مراد صرف ائمہ علیہم السلام کے نفوس مقدسہ ہی مراد نہیں کیونکہ اس وقت دعا میں مشغول رہنے کا حکم تمام بندوں کے لئے ہے اور سب کی دعائیں اس وقت مستجاب ہوتی ہیں۔ یہ حکم یعنی اس وقت نیند سے اجتناب صرف ائمہ معصومین علیہم السلام سے خاص نہیں تاکہ ضمیر متکلم سے مراد صرف ائمہ علیہم السلام کے ذوات مقدسہ لئے جائیں لہٰذا وہ صاحبان جنہوں نے صرف ائمہ علیہم السلام کی ذوات مقدسہ مراد لی ہیں اور حدیث کا معنی یہ کیا ہے کہ تمام بندوں کا رزق ائمہ علیہم السلام کے ہاتھوں پر جاری ہوتا ہے یہ ان کے ذاتی توہم کی ترجمانی ہے جسے انہوں نے اپنا عقیدہ بنا رکھا ہے۔ حدیث کے الفاظ کا یہ معنی نہیں جو انہوں نے کیا ہے۔
اور وقت مذکور میں اللہ تعالیٰ کے رزق تقسیم کرنے کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت دعا اور تعقیبات بجالانے والوں کی قسمت کو کھولتا اور اجابت دعا کے ذریعہ ان کے رزق کی وسعت کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ پانی کی طرح رزق کو جاری کرنا مقصود نہیں کہ جو پرنالے کی طرح بہتا ہوا لوگوں کے یا ائمہ علیہم السلام کے ہاتھوں پر جاری ہو، جریانِ رزق سے مجازاً حصولِ رزق مراد ہے۔ "علی ایدینا" سے ان تمام بندوں کے ہاتھ میں رزق کا پہنچنا مراد ہے جو دعا کرنے والے ہوتے ہیں۔ دلیل یہی ہے کہ تمام بندوں کو طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک سونے سے منع کیا گیا ہے اور دعا وغیرہ تعقیبات میں مصروف رہنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس وقت تمام بندوں کے رزق کی تقسیم کی خبر دی ہے۔ نیز ائمہ علیہم السلام کو بالخصوص مراد لینا اس تفویض کے اثبات کا موجب ہے جس کی دیگر احادیث اور آیات سے نفی ثابت ہے۔ اس لئے ائمہ علیہم السلام کے ہاتھوں میں پہنچ کر لوگوں تک رزق کے پہنچنے والے معنی سے آیاتِ قرآنیہ اور دیگر احادیثِ معصومین علیہم السلام کا انکار لازم آتا ہے لہٰذا یہ معنی مراد لینا ہرگز جائز نہیں۔ ہاں ہر شخص کو اپنی دعا میں ائمہ معصومین علیہم السلام سے توسل کرنا چاہئے کیونکہ قرآن پاک اور ارشادات معصومین علیہم السلام میں اس توسل کا حکم فرمایا گیا ہے جو کہ دعا کی مقبولیت کے لئے انتہائی تاثیر رکھتا ہے۔ ائمہ معصومین علیہم السلام ہی دربارِ رب العزت کا وسیلہ ہیں، چنانچہ ارشاد قدرت ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (سورۃ المائدہ، آیت: ۳۵) اے ایمان لانے والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کے دربار کے لئے وسیلہ تلاش کرو۔

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

میں شرکت رکھنے والا ہو۔

پُرفائدہ نصیحت

واضح باد کہ غلات، مفوضہ اور صوفی شیعہ کا نقصان اور ضرر اہل حق کے لئے، کفار و منافقین اور منافقین کے ضرر سے بھی زیادہ ہے کیونکہ غلات، مفوضہ اور یہ صوفیہ اپنے آپ کو شیعہ محب آل رسول علیہم السلام اور موالی کہلواتے ہیں اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی مدح و ثناء حد سے زیادہ کرتے ہیں۔ اس لئے شیعہ عوام اشتباہ میں پڑ جاتے ہیں اور ان کو اپنا شیعہ ہی

(بقیہ حاشیہ۔۱) تفسیر صافی، صفحہ: ۱۲۷ بحوالہ کتاب عیون اخبار الرضا علیہ السلام: و باسناده قال رسول الله (ص) الأئمة من ولد الحسين (ع) من أطاعهم فقد أطاع الله و من عصاهم فقد عصى الله عز و جل هم العروة الوثقى و هم الوسيلة إلى الله عزوجل، آنحضرت نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ وسیلہ سے مراد وہ ائمہ معصومین علیہم السلام بھی ہیں جو حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد سے ہوں گے جو شخص ان کی اطاعت کرے گا وہ خداوند عالم کا مطیع قرار پائے گا اور جو ان کی نافرمانی کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان شمار ہوگا وہی عروۃ الوثقیٰ اور وہی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کا وسیلہ ہیں۔

تفسیر البرہان، ج ۱، صفحہ: ۲۸۶ بحوالہ المناقب ابن شہرآشوب: قال امیر المومنین علیه السلام فی قوله تعالی و ابتغوا الیه الوسیلة انا وسیلة کہ حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے فرمان: وابتغوا الیه الوسیلة کی تفسیر میں فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کا وسیلہ ہوں۔

انبیا علیہم السلام کی دعائیں بھی ائمہ علیہم السلام کے توسل اور استشفاع کے ذریعہ شرف قبولیت حاصل کرتی ہیں چہ جائیکہ دیگر مخلوق ان کو اپنا وسیلہ بنائے چنانچہ بحار الانوار میں انبیاء کی دعاؤں کے متعلق ایک مستقل باب ان الفاظ سے باندھا گیا ہے: باب ان دعاء الانبیاء استجیب بالتوسل و الاستشفاء بهم علیهم السلام یعنی اس امر کا باب کہ انبیاء علیہم السلام کی دعا بھی ائمہ علیہم السلام کو وسیلہ بنانے اور ان کی سفارش حاصل کرنے کی کوشش سے مستجاب ہوتی رہی، سفینۃ البحار، ج ۲، صفحہ: ۷۲۴۔

بہر حال یہ ایک امر مسلم ہے کہ ائمہ علیہم السلام کو استجابت دعا کے لئے وسیلہ بنانا قرآنی تعلیم اور انبیاء علیہم السلام کی سیرت ہے جس کی تفصیل کے لئے یہ مقام نہیں۔ اس وقت صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ حدیث زیر بحث میں واقع شدہ جملہ: "و علی ایدینا یجریها" کا ایسا معنی کرنا ہرگز جائز نہیں جس سے تفویض رزق بسوئے ائمہ علیہم السلام لازم آئے کیونکہ یہ نہ صرف عقلاً باطل ہے بلکہ قرآن پاک اور خود ارشادات معصومین علیہم السلام کے منافی ہے۔

توقیع حضرت صاحب الامر (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کا دوسرا جملہ ہے: لانه لیس بجسم و لاحال فی جسم، اس جملے کے ذریعہ سابق جملے کے مضمون کی وجہ اور علت بیان فرمائی ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نہ ہی جسم ہے اور نہ ہی امر جسمانی، اس لئے وہ ایسی ہستی ہے جس نے ہر ہر جسم کو پیدا کیا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ جسم کسی چیز کو پیدا نہیں کرسکتا اور وہ جسمانیات بھی کسی جسم کو پیدا نہیں کرسکتیں جو کہ جسم میں حال ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ ائمہ علیہم السلام جسم و جسمانیات سے مبرا نہیں اس لئے ثابت ہوا کہ وہ کسی جسم کو پیدا کرنے پر قادر نہیں اور جب قادر ہی نہیں تو عالم اجسام کے پیدا کرنے کو ان کے تفویض کرنے کا تصور ہی نہیں ہوسکتا بلکہ ائمہ علیہم السلام تو ہماری دعاؤں کی قبولیت کا وسیلہ ہیں جیسا کہ اس توقیع کے آخری جملہ کا مفہوم ہے۔

"حدیث ابوطاہر بن بلال سے مذہب مفوضہ ثابت نہیں ہوسکتا"

کتاب جواہر الاسرار صفحہ ۴۵ بحوالہ کتاب الغیبۃ شیخ الطوسی صفحہ: ۲۵۲، ابوطاہر بن بلال کی ایک حدیث منقول ہے جس کے بعض جملوں کے باعث ممکن ہے کسی کو مذہب مفوضہ کے صحیح ہونے کا توہم ہو حالانکہ اس حدیث کو مذہب مفوضہ کے اثبات سے کوئی تعلق نہیں۔ ذیل میں حدیث مذکور کو درج کر کے اس کے مضمون کی وضاحت کی جاتی ہے: (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

شمار کرتے ہیں لہٰذا ان کی باتوں پر کان دھرتے ہیں اور وہ محبت آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پردہ میں اپنے باطل عقائد کی تبلیغ کرتے، انہیں مشہور کرتے اور رواج دیتے ہیں۔ اس وجہ سے غافل اور نافہم شیعہ ان کے اس مکروفریب کے باعث دھوکہ کھا جاتے اور ان کے کلام پر یقین کر لیتے ہیں حالانکہ ائمہ ہدیٰ نے مفوضہ اور غلات سے پرزور طور پر برائت اور بیزاری کا اظہار فرمایا ہے اور ان کی روایات کی تصدیق سے اور ان کے ساتھ ہم نشینی اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے اور ان کی زبان اور ان کے ہاتھوں سے تنگ آ کر ان کے خلاف بد دعا فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی بد دعا کے بعض فقرات گذر چکے ہیں۔ لہٰذا محبانِ اہل بیت اطہار علیہم السلام کو چاہئے کہ ان بروں کی برائی اور شر سے اپنے آپ کو یکسو اور دور رکھنے کی کوشش کریں کیونکہ عقلاء کا مقولہ ہے کہ گھریلو دشمن سے چوکنا رہنا چاہئے خاص کر اس وجہ سے کہ حق پرستی، اخفاء حقانیت، مکاری اور فریب کاری اس فرقہ کی عادت ہے۔ اس چیز کے شواہد اور دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ کشیؒ نے اپنے اسناد کے ساتھ یونس سے اور اس نے ہشام بن حکم سے روایت کی ہے کہ اس نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو یوں فرماتے ہوئے سنا کہ آپ نے فرمایا مغیرہ بن سعید دیدہ و دانستہ میرے والد ماجد پر دروغ گوئی اور اتہام تراشی کیا کرتا تھا۔ اس کے اصحاب پدرم بزرگوار کے اصحاب میں مخفی اور پوشیدہ طور پر ملے رہتے تھے والدم ماجد

(بقیہ حاشیہ۔۱) الشیخ الطوسی فی کتاب الغیبة، عَنِ الْحُسَيْنِ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ عَنْ أَبِي عَبْدِ اللهِ الْحُسَيْنِ بْنِ عَلِيِّ بْنِ سُفْيَانَ الْبَزَوْفَرِيِّ رَحِمَهُ اللهُ قَالَ حَدَّثَنِي الشَّيْخُ اَبُو الْقَاسِمِ الْحُسَيْنُ بْنُ رَوْحٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: اِخْتَلَفَ اَصْحَابُنَا فِي التَّفْوِيضِ وَ غَيْرِهِ فَمَضَيْتُ إِلَى أَبِي طَاهِرِ بْنِ بِلَالٍ فِي أَيَّامِ اسْتِقَامَتِهِ فَعَرَّفْتُهُ الْخِلَافَ فَقَالَ اَخِّرْنِي فَاَخَّرْتُهُ اَيَّامًا فَعُدْتُ إِلَيْهِ فَاَخْرَجَ إِلَيَّ حَدِيثًا بِإِسْنَادِهِ إِلَى أَبِي عَبْدِ اللهِ (ع) قَالَ إِذَا أَرَادَ اللهُ اَمْراً عَرَضَهُ عَلَى رَسُولِ اللهِ (ص) ثُمَّ اَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ (ع) وَاحِداً بَعْدَ وَاحِدٍ إِلَى أَنْ يَنْتَهِيَ إِلَى صَاحِبِ الزَّمَانِ (ع) ثُمَّ يَخْرُجُ إِلَى الدُّنْيَا وَ إِذَا أَرَادَ الْمَلَائِكَةُ أَنْ يَرْفَعُوا إِلَى اللهِ عَمَلًا عُرِضَ عَلَى صَاحِبِ الزَّمَانِ (ع) ثُمَّ يَخْرُجُ عَلَى وَاحِدٍ [بَعْدَ] وَاحِدٍ إِلَى أَنْ يُعْرَضَ عَلَى رَسُولِ اللهِ (ص) ثُمَّ يُعْرَضُ عَلَى اللهِ فَمَا نَزَلَ مِنَ اللهِ فَعَلَى أَيْدِيهِمْ وَ مَا عُرِجَ إِلَى اللهِ وَعَلَى أَيْدِيهِمْ وَ مَا اسْتَغْنَوْا عَنِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ طَرْفَةَ عَيْنٍ.

مجھ کو حسین بن عبداللہ نے خبر دی انہوں نے حسین بن علی البزوفری سے روایت کی ہے انہوں نے حسین بن روح علیہ الرحمہ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب میں تفویض وغیرہ کے متعلق اختلاف ہوا پس میں ابو طاہر علی بن بلال کے ہاں گیا جن ایام میں وہ راہِ حق پر قائم تھے اور ان کے پاس میں نے اپنا اختلاف بیان کیا انہوں نے فرمایا چند روز ٹھہر جائیں تا کہ میں اس معاملہ کی تحقیق کر لوں چند روز بعد میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے اپنے اسناد سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث پیش کی کہ جب اللہ کسی امر کو نافذ کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کرتا ہے پھر امیر المومنین علیہ السلام پر پھر یکے بعد دیگرے باقی ائمہ اطہار علیہم السلام پر، یہاں تک کہ اس کو امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے پاس پیش کیا جاتا ہے اور پھر دنیا میں نافذ کرتا ہے اور جب فرشتے چاہتے ہیں کسی عمل کو اللہ کے پاس پیش کریں تو وہ پہلے امام زمانہ (عجل) کے پاس پیش کیا جاتا ہے پھر یکے بعد دیگرے باقی ائمہ علیہم السلام کے پاس، یہاں تک کہ وہ رسول خدا کی خدمت میں پیش ہوتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے پاس پیش ہوتا ہے پس جو کچھ اللہ کی طرف سے نازل ہوتا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے ہاتھوں میں نازل ہوتا ہے اور جو کچھ اللہ کی طرف جاتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے ہاتھوں سے جاتا ہے اور وہ چشم زدن سی دیر بھی اللہ سے مستغنی نہیں ہو سکتے، انتہیٰ ما فی جواهر الاسرار بقدر الحاجة.

اس حدیث میں جملہ: "ما نزل من الله فعلی ایدیهم" سے ممکن ہے کسی کو توہم ہو کہ مذہب مفوضہ صحیح ہے لیکن یہ توہم درست نہیں (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

کے اصحاب سے پوشیدہ طور پر کتاب حاصل کر لیتے تھے اور جا کر مغیرہ کو دے آتے تھے وہ مخفی طور پر ان کتابوں میں اپنے کفر اور زندیقیت کو درج کرتا اور پھر اسے والد ماجد علیہ السلام کی طرف منسوب کرتا اور پھر وہ کتاب اپنے اصحاب کو دے دیتا اور ان کو حکم دیتا کہ وہ اس کتاب کو شیعوں کے اندر مشہور اور منتشر کرے لہٰذا پدرم بزرگوار کی کتابوں میں جو غلو کے مضامین موجود ہیں اسی مغیرہ کی کارستانیوں کا نتیجہ اور ثمر ہے کہ وہ مضامین غلو اس ملعون نے میرے والد ماجد کی کتابوں میں داخل کر دیئے۔ اس حدیث سے دو فائدے واضح طور پر حاصل ہو رہے ہیں ایک یہ کہ تدلیس و تلبیس اور مکاری وفریب کاری اس گروہ کی عادت ہے لہٰذا اس گروہ کے معاملات میں دقت نظر سے کام لینا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ جو روایت ائمہ علیہم السلام کی طرف منسوب کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک کا لائق اعتماد ہونا ضروری نہیں، ایسا نہیں جیسا کہ ماضی قریب میں پیدا ہونے والی اس جماعت کا خیال ہے کہ بالخصوص فضائل کے بارے میں جو روایت ائمہ علیہم السلام کی طرف منسوب ہو، اس کا انکار کفر ہے، ان کا ائمہ اطہار علیہم السلام کی روایات کے متعلق قبولیت اور عدم انکار کے دائرہ کو اس قدر وسعت دینا گویا اس کی تمہید ہے کہ لوگ غلو کی روایتوں کا انکار نہ کریں اور حقیقت یہ ہے کہ ہر روایت کو قبول کرنا بھی تو غلو

(بقیہ حاشیہ۔۱) کیونکہ اس جملہ میں لفظ "مَا نَزَّلَ مِنَ اللّٰہِ الخ" سے مراد ان امور کا علم ہے جو اللہ کی طرف سے دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے ہوتے ہیں لہٰذا اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس امر کو دنیا میں نافذ اور واقع کرنے کا ارادہ کرتا ہے اس کے متعلق پہلے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور پھر یکے بعد دیگرے تمام ائمہ علیہم السلام کو آگاہ فرماتا ہے اور پھر اس امر کو خدا دنیا میں واقع کرتا ہے اور مفوضہ کو علم سے نہیں اشیاء دنیا کے پیدا کرنے میں اختلاف ہے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ دنیا میں منجانب خدا جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ خداوند عالم کی قدرت سے نہیں ائمہ علیہم السلام کی قدرت سے پیدا ہوتا ہے اور اس حدیث سے یہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا کہ جس امر کو خدا نافذ کرنا چاہتا ہے اس کے متعلق پہلے آنحضرت اور ائمہ علیہم السلام کو آگاہ اور مطلع کر دیتا ہے اور اس میں کلام نہیں لہٰذا مذہب مفوضہ اس حدیث سے ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ حدیث ان آیات اور احادیث کے معارض ہی نہیں جن سے یہ ثابت ہے کہ عالم دنیا کے اجسام و ارواح اور افعال عباد اختیاریہ کے علاوہ تمام اعراض کو پیدا کرنے والا خدا ہے اسی کی قدرت سے یہ تمام چیزیں پیدا ہوئیں اور پیدا ہو رہی ہیں اس نے ان چیزوں کو پیدا کرنے پر کسی کو قادر نہیں کیا یہ حدیث اس مضمون کی نفی پر دلالت نہیں کرتی تا کہ مفوضہ کا مذہب اس سے ثابت ہو سکے بلکہ اگر کسی حدیث کی دلالت بظاہر اس مضمون کی نفی پر ہو تو بھی اس کی ایسی تاویل کی جائے گی جو اس مضمون کے مطابق ہو کیونکہ یہ مضمون ضروریات دین میں سے ہے اور اگر کسی حدیث کی تاویل بھی نہ ہو سکے تو اسے ترک کر دیا جائے گا اس کے ظاہری مفہوم پر ایمان نہیں رکھا جائے گا زائد سے زائد اس کے متعلق یہی کہا جائے گا اس کی صحیح تاویل کا علم خود ائمہ علیہم السلام کو ہوگا ہمیں اس کی تاویل کا پتہ نہیں چل سکتا۔ ایسا ہرگز جائز نہیں کہ کسی مبہم روایت کی وجہ سے انسان ضروریات دین میں شک وشبہ کو راہ دے دے اور انہیں مشکوک نگاہ سے دیکھنے لگے کیونکہ ضروریات دین پر یقین رکھا جاتا ہے ان کے متعلق شک وشبہ جائز نہیں حتیٰ کہ آیات متشابہات کی بھی جب ایسی صحیح تاویل معلوم نہ ہو سکے جو ضروریات دین کے مطابق ہو تو اس کے علم کو بھی راسخین فی العلم ائمہ علیہم السلام کے سپرد کر دیا جاتا ہے لیکن ضروریات دین پر یقین رکھنے سے دست برداری اختیار نہیں کی جا سکتی۔ متشابہات ومبہمات خواہ آیات ہوں یا احادیث جب ان کی صحیح تاویل معلوم نہ ہو سکے تو ان کے متعلق یہی عقیدہ رکھا جاتا ہے کہ علم ائمہ علیہم السلام میں اس کی کوئی صحیح ایسی تاویل ہوگی جو ضروریات دین کے مطابق ہوگی لیکن ہمیں اس کا علم نہیں اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ ایسا ہرگز جائز نہیں کہ متشابہات، مبہمات اور مجملات کی کوئی من گھڑت ایسی تاویل تیار کر لی جائے جو ضروریات دین کے منافی ہو۔

اور حد سے تجاوز ہے اور فرمان پرور دگار: يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا[۱] (سورۂ حجرات، آیت:۶) اور حدیث معصوم علیہ السلام: فمن صدقهم فقد كذبنا[۲] کی مخالفت ہے کیونکہ یہ امر بذات خود واضح ہے کہ فضائل کی جن روایات کا انکار کرنا ممنوع ہے ان سے وہ فضائل مراد ہیں جو کہ پایۂ ثبوت کو پہنچے ہوئے برحق ہیں کہ جن کا انکار خارج از ایمان ہو جانے کا باعث ہوتا ہے ان فضائل کا انکار مراد نہیں جن کے فضائل ہونے میں اختلاف ہے جیسے غالیوں کے روایات اور نہ ہی ان فضائل کا انکار مراد ہے جو اصول قطعیہ کے خلاف ہونے کے باعث اصلاً فضائل ہی شمار نہیں ہو سکتے اور نہ ہی ان روایات کا انکار مقصود ہے جو شاذ ہیں، ثابت ہی نہیں کیونکہ یہ روایات اگر قابل انکار نہ ہوں تو لائق اعتقاد اور اقرار ہی نہیں ہو سکتیں۔ ان ہی کے منجملہ شلمغانی کی حکایت بھی ہے کیونکہ شہید ثانیؒ کتاب الروضۃ البھیۃ

---

(۱) اے ایمان کا اعتراف کرنے والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیق کر لیا کرو آیت کا مدلول یہ ہے کہ فاسق کی خبر بلا سوچے سمجھے اور بغیر تحقیق کئے قبول کر لینا جائز نہیں بلکہ انسان مامور ہے کہ اس کی تحقیق کرے بعد از اں تحقیق اگر پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تو اسے قبول کر لے ورنہ ردّ کر دے لہٰذا فضائل کے متعلق ہو یا دیگر کسی امر کے متعلق فاسق کی خبر کے متعلق تحقیق ضروری ہے یونہی آنکھیں بند کر کے اسے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) مصنف علامہ اعلی اللہ مقامہ نے یہ جملہ جس حدیث سے لیا ہے وہ کتاب عیون اخبار الرضا علیہ السلام ج ۱، صفحہ: ۹۷ میں موجود ہے اس جملہ کے معنی یہ ہے کہ جس نے غلاۃ کی تصدیق کی اس نے ہماری تکذیب کی، پوری حدیث کا متن یہ ہے: يَا ابْنَ خَالِدٍ إِنَّمَا وَضَعَ الْأَخْبَارَ عَنَّا فِي التَّشْبِيهِ وَ الْجَبْرِ الْغُلَاةُ الَّذِينَ صَغَّرُوا عَظَمَةَ اللهِ فَمَنْ أَحَبَّهُمْ فَقَدْ أَبْغَضَنَا وَ مَنْ أَبْغَضَهُمْ فَقَدْ أَحَبَّنَا وَ مَنْ وَالاهُمْ فَقَدْ عَادَانَا وَ مَنْ عَادَاهُمْ فَقَدْ وَالانَا وَ مَنْ وَصَلَهُمْ فَقَدْ قَطَعَنَا وَ مَنْ قَطَعَهُمْ فَقَدْ وَصَلَنَا وَ مَنْ جَفَاهُمْ فَقَدْ بَرَّنَا وَ مَنْ بَرَّهُمْ فَقَدْ جَفَانَا وَ مَنْ أَكْرَمَهُمْ فَقَدْ أَهَانَنَا وَ مَنْ أَهَانَهُمْ فَقَدْ أَكْرَمَنَا وَ مَنْ قَبِلَهُمْ فَقَدْ رَدَّنَا وَ مَنْ رَدَّهُمْ فَقَدْ قَبِلَنَا وَ مَنْ أَحْسَنَ إِلَيْهِمْ فَقَدْ أَسَاءَ إِلَيْنَا وَ مَنْ أَسَاءَ إِلَيْهِمْ فَقَدْ أَحْسَنَ إِلَيْنَا وَ مَنْ صَدَّقَهُمْ فَقَدْ كَذَّبَنَا وَ مَنْ كَذَّبَهُمْ فَقَدْ صَدَّقَنَا وَ مَنْ أَعْطَاهُمْ فَقَدْ حَرَمَنَا وَ مَنْ حَرَمَهُمْ فَقَدْ أَعْطَانَا. يَا ابْنَ خَالِدٍ مَنْ كَانَ مِنْ شِيعَتِنَا فَلَا يَتَّخِذَنَّ مِنْهُمْ وَلِيّاً وَ لَا نَصِيراً، نیز الاحتجاج للطبرسیؒ، صفحہ: ۲۲۸۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے حسین بن خالد سے فرمایا کہ فرزند خالد تشبیہ اور جبر کے بارے میں ان غالیوں نے حدیثیں وضع کر کے ہم اہل بیت علیہم السلام سے جھوٹ اور افترا کے طور پر نقل کی ہیں جنہوں نے اللہ جل شانہ کی عظمت، اور شان کو گھٹایا۔ تشبیہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے اوصاف سے متصف کیا جائے لہٰذا جو شخص ان غالیوں سے محبت رکھے اس نے ہم اہل بیت علیہم السلام سے عداوت اور بغض اختیار کیا اور جس نے ان سے عداوت اور بغض رکھا اس نے ہم سے محبت کی اور جس نے ان سے دوستی اختیار کی اس نے ہم سے دشمنی کی اور جس نے ان سے دشمنی اختیار کی اس نے ہم سے دوستی کی اور جس شخص نے ان سے اپنے تعلقات قائم کئے اس نے ہم سے لاتعلقی کی اور جس نے ان سے قطع تعلقی کی اس نے ہم سے اپنے تعلقات وابستہ کئے اور جو شخص ان سے جفا اور سختی سے پیش آئے گا وہ ہم سے نیکی کرے گا اور جو ہم سے نیکی کرنا چاہے گا وہ ضرور ان سے جفا قلبی اور سختی کا مظاہرہ کرے گا اور جو شخص ان کی عزت و اکرام کرے گا وہ یہ سمجھے کہ اس نے ہماری توہین کی اور جو شخص ان کو رسوا اور ذلیل کرے وہ یوں سمجھے اس نے ہماری عزت اور اکرام کیا ہے اور جس شخص نے ان کو ردّ کیا اس نے گویا ہمیں قبول کیا اور جس نے ان کو قبول کیا اس نے ہمیں ردّ کیا، جس نے ان سے احسان کیا اس نے ہم سے برائی کی اور جس نے ان سے اچھائی نہ کی اس نے ہم پر احسان کیا اور جس نے ان کی تصدیق کی اس نے ہمیں جھٹلایا اور جس نے ان کو جھٹلایا اس نے ہماری تصدیق کی جس نے ان کو کوئی شئے عطا کی اس نے ہمیں محروم رکھا اور جس نے انہیں محروم رکھا اس نے گویا ہمیں عطیہ دیا۔ اے فرزند خالد! جو ہمارا شیعہ ہو وہ ان غالیوں میں سے کسی کو ہرگز (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

میں فرماتے ہیں کہ جو شخص شیعہ کی طرف سے نقل کرے کہ قول مدعی کی وجہ سے شاہد گواہ قرار دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ مدعی برادر ایمانی ہو اور وہ اسے اچھی طرح پہچانتا ہو تو نقل کنندہ خطا کار ہے کیونکہ ہمارے علماء نے اس امر پر اجماع کیا ہے کہ بغیر یقین اور اطلاع کے قول مدعی کے باعث گواہی دینا جائز نہیں۔ ہاں یہ مذہب محمد علی شلمغانی کا ہے کہ جو غالیوں میں سے تھا، خدا اس پر لعنت کرے اور اس محمد علی شلمغانی کے قول کو شیعہ کی طرف نسبت دینے اور ناقل کو اشتباہ لاحق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مرد ملعون پہلے شیعہ تھا، ایک کتاب بھی اس نے شیعہ طریقہ پر لکھی جس کا نام اس نے "کتاب تکلیف" رکھا اور اس مسئلہ کو بھی اس نے اس میں درج کیا۔ اس کے بعد غلو کے کلمات اور ایسے جملے اس سے ظاہر ہوئے جو لائق انکار تھے لہٰذا شیعہ نے ان سے بیزاری اختیار کر لی۔ اس کی مذمت میں بارگاہ حضرت صاحب الامر (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) سے کچھ توقیعات بھی ظاہر ہوئیں تو بادشاہ نے اسے گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ لہٰذا جن لوگوں نے اس کی کتاب

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) نہ اپنا دوست بنائے نہ مددگار۔

"بعض بے جا تاویلات کا ازالہ"

بعض حضرات نے بعض روایات کی ایسی بے جا تاویلات کی ہیں جن سے مذہب مفوضہ کو تقویت حاصل ہوئی ہے لہٰذا ان کا ازالہ ضروری ہے، سفینۃ البحار، ج ا، صفحہ: ۳۴۸ تحریر ہے: کنز الفوائد للکراجکی، ذَكَرُوا اَنَّ اَبَا حَنِيْفَةَ اَكَلَ طَعَامًا مَعَ الْإِمَامِ الصَّادِقِ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ (ع) فَلَمَّا رَفَعَ الصَّادِقُ (ع) يَدَهٗ مِنْ اَكْلِهٖ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ اَللّٰهُمَّ هٰذَا مِنْكَ وَ مِنْ رَسُولِكَ (ص) فَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ يَا أَبَا عَبْدِ اللهِ اَجَعَلْتَ مَعَ اللهِ شَرِيْكاً فَقَالَ (ع) لَهٗ: وَيْلَكَ فَإِنَّ اللهَ تَعَالٰى يَقُولُ فِي كِتَابِهٖ: وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۚ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۞ وَيَقُولُ فِي مَوْضِعٍ آخَر: وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗ. فَقَالَ أَبُو حَنِيفَةَ وَ اللهِ لَكَأَنِّي مَا قَرَأْتُهُمَا قَطُّ مِنْ كِتَابِ اللهِ وَلَا سَمِعْتُهُمَا إِلَّا فِي هٰذَا الْوَقْتِ فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ (ع) بَلٰى قَدْ قَرَأْتَهُمَا وَ سَمِعْتَهُمَا وَلٰكِنَّ اللهَ تَعَالٰى أَنْزَلَ فِيكَ وَ فِي أَشْبَاهِكَ: اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا، وَقَالَ اللهُ تَعَالٰى كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ.

صاحب بحار الانوار نے بحوالہ کنز الفوائد علامہ کراجکی اعلی اللہ مقامہ تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابوحنیفہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ساتھ کھانا تناول کیا۔ حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کھانے سے فارغ ہوئے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ: الحمد للہ رب العالمین اللھم ھذا منك و من رسولك" سب تعریفیں اللہ جل شانہ کے لئے ثابت ہیں کہ جو رب العالمین ہے۔ اے پروردگار یہ رزق تیری طرف سے اور تیرے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہے"۔ اس پر ابوحنیفہ بولے کہ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیا؟ تو حضرت علیہ السلام نے فرمایا: "تیری یہ حالت لائق افسوس ہے کہ تو میری اتنی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتا کہ اسے شرک قرار دے رہا ہے۔ یہ شرک نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے: وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ○ انہوں نے صرف اسی وجہ سے انتقام لینے کی کوشش کی کہ ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے غنی کر دیا (سورۃ التوبہ، آیت: ۷۴)، نیز اللہ تعالیٰ کا دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ: وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ○ یہ لوگ اگر اس پر ہی راضی رہتے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ان کو دیا تھا اور کہتے کہ ہمیں خدا کافی ہے، عنقریب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اپنی مہربانی سے مزید عطا کرے گا ہم تو بس اللہ ہی کی طرف رغبت کرنے والے ہیں تو یہ ان کے لئے مناسب تھا (سورۃ التوبہ، آیت: ۵۹)"۔ حضرت علیہ السلام کا یہ کلام حق ترجمان سن کر ابوحنیفہ نے کہا کہ قسم بخدا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیتیں میں نے قرآن پاک میں پڑھی ہی نہیں اور ان دونوں کو میں نے (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

کی ابتداء دیکھی کہ وہ اصول شیعہ کے مطابق لکھی گئی ہے تو ان کو یہ وہم لاحق ہو گیا کہ یہ شخص شیعوں میں سے تھا اور اس نے یہ گمان کیا کہ یہ قول شیعہ علماء کا ہے۔

انہیں میں سے وہ ہے جسے عالم باعمل فاضل کامل سید نظام الدین حسین مرحوم بیان فرمایا کرتے تھے کہ ایک جزیرے میں ایک مرد عابد سے میری ملاقات ہوئی جو شیعہ ہونے کا اظہار کرتا اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کی محبت اور موالات کا دم بھرتا تھا تو مجھے یہ گمان ہوا کہ یہ شخص ہم میں سے ہی ہے چنانچہ میں نے اس کے ساتھ دوستی کے تعلقات استوار کئے۔ بعد ازاں جب عالم خلوت میں مجھے اس کے حالات پر اطلاع ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ شخص تو مفوضہ کا سردار ہے تو میں نے اس سے دوری اور بیزاری اختیار کر لی۔

اس جماعت مفوضہ کے تلبیس و تدلیس اور مکاری کے طور پر خفیہ رہنے کے کچھ حالات جب بیان ہو چکے تو پھر آپ کو

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) اس وقت سے پہلے کبھی سنا ہی نہیں تو حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ بے شک یہ تو نے دونوں آیتیں پڑھی بھی ہیں اور سنی بھی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے تیرے متعلق اور تجھ جیسے دوسرے اشخاص کے متعلق یہ آیت نازل فرمائی ہے کہ: ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں (سورۃ محمد، آیت: ۲۴) اور یہ فرمایا ہے کہ: ان کے کرتوتوں کے باعث ان کے دلوں پر سیاہی چڑھی ہوئی ہے اس لئے ان کو حقائق سمجھ نہیں آسکتے۔"

بعض حضرات نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس فرمان: اَللّٰهُمَّ هٰذَا مِنْكَ وَ مِنْ رَسُولِكَ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت کا یہ فرمان بالکل واضح کر رہا ہے کہ رزق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست حق پرست سے جاری ہو کر دنیا تک پہنچتا ہے حالانکہ ان حضرات کا یہ کہنا درست نہیں کیونکہ ان کے ان الفاظ کا تو مطلب یہ بنتا ہے کہ تمام مخلوقات کو رزق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ سے ملتا ہے اور اس سے مفوضہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کیونکہ وہ یہی کہتے ہیں کہ پیدا کرنے اور رزق دینے کے معاملات اللہ تعالیٰ نے ائمہ علیہم السلام اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیئے ہیں لہٰذا وہی تمام مخلوق کو رزق دیتے ہیں حالانکہ قرآن پاک اور احادیث معصومین علیہم السلام پر اطلاع رکھنے والا اور عقل سلیم سے کام لینے والا شخص یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہر شخص کا رزق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر جاری ہوتا اور ہر شخص کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رزق تقسیم کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو پھر ان آیات اور احادیث کا کیا مطلب ہوگا جن سے یہ ثابت ہے کہ ہر شخص پر طریق بطریق رزق کا حاصل کرنا واجب ہے اور ناجائز طریقہ سے حاصل کرنا حرام ہے۔

ارشاد قدرت ہے: فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ○ (سورۃ الجمعہ، آیت: ۱۰) کہ جب نماز جمعہ ادا کر دی جائے تو پھر تم زمین میں پھیل جاؤ اور فضل خدا سے رزق حلال کو طلب کیجئے اور اللہ تعالیٰ کا بکثرت ذکر کرتے رہئے تاکہ تم فلاح اور نجات پا جاؤ۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۸۸) کہ آپس کے مال باطل طریقہ سے نہ کھاؤ۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا (سورۃ آل عمران، آیت: ۱۳۰) اے ایمان کا اعتراف کرنے والو! سود نہ کھاؤ۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۔ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۔ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا○ (سورۃ النساء، آیت: ۲) کہ یتیموں کو ان کے اموال دے دو، مال حلال کے بدلے حرام خبیث کو اختیار مت کرو اور ان کے اموال کو اپنے اموال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ○ (سورۃ الانعام، آیت: ۱۱۸) اگر تم اللہ کی آیات پر ایمان رکھنے والے ہو تو اس ذبیحہ کا گوشت کھاؤ جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

معلوم ہونا چاہئے کہ دیندار اور تقویٰ شعار علماء نے اس فرقے کی کچھ علامات بیان کی ہیں تا کہ جس شخص میں وہ سارے علامات یا بعض یا ان کی مثل پائی جائیں تو مومنین اپنے دین کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کے اعتقادات کے متعلق جستجو اور جانچ پڑتال کے در پے ہوں اور ان کی اس حالت سے خوفزدہ رہیں اور ان کے شر سے ڈرتے رہیں۔ نیز بعض روایات میں جو وارد ہوا کہ انسان کو اپنے سب سے زیادہ قابل اعتماد بھائی سے بھی ڈرتے رہنا چاہئے تو وہ ایسے ہی مقامات پر محمول کیا گیا ہے کیونکہ جب انسان اس طرح خطرہ محسوس کرتا رہے گا تو وہ خود کو بھی اور اپنے دیگر کمزور مومن بھائیوں کو بھی ایسے برے لوگوں کی برائی سے محفوظ رکھ سکے گا جو مومنین کو گمراہ کرنے کی کمین گاہ میں چھپے رہتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ایسے خطرناک انسانوں کے جو افعال و اقوال ظاہراً اسلام کے مطابق ہوں ان کو انسان صحت پر محمول کرنے کے باعث ان کو مومن قرار دے دے اور پھر ان کے ان کلمات کی تاویل کرنا شروع کر دے اور ان کی اصلاح کے در پے ہو جائے جو انہوں نے شرع شریف کی مخالفت میں کہے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ جلیل شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب اعتقادات میں فرماتے ہیں کہ غلات اور مفوضہ کے متعلق ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ یہ لوگ کافر باللہ ہیں اور یہود و

(بقیہ حاشیہ۔۲) یَاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ (سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۶۸) اے لوگو! زمین میں جو اشیاء موجود ہیں ان میں سے عمدہ اور حلال چیزوں کو کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (سورۃ البقرۃ، آیت: ۱۷۳)

سوائے اس کے نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر مردار کو اور خون اور خنزیر کے گوشت اور اس چیز کو حرام کیا ہے جس کو غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (سورۃ البقرۃ، آیت: ۲۷۵) اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا۔

وسیلۃ النجاۃ، ج ۲ صفحہ: ۸، مصنف آقا سید ابوالحسن الاصفہانی ؒ، سفینۃ البحار، ج ۱، صفحہ: ۱۲۰،

عن النبی (ص) العبادۃ سبعون جزء افضلها طلب الحلال، نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ عبادت کی ستر قسمیں ہیں ان سب میں سے افضل عبادت رزق حلال کا طلب کرنا ہے۔

وسیلۃ النجاۃ، صفحہ مذکور، قال أمیر المؤمنین (ع) إن الله تبارك وتعالى يُحِبُّ الْمُحْتَرِفَ الْاَمِيْنَ، حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے محبت رکھتا ہے جو کسی صنعت وحرفت کے ذریعہ روزی کمانے والا ہو اور امین ہو۔

وسیلۃ النجاۃ صفحہ مذکور: عَنْ مَوْلَانَا الْبَاقِرِ (ع): مَنْ طَلَبَ الرِّزْقَ فِي الدُّنْيَا، اسْتِعْفَافًا عَنِ النَّاسِ، وَتَوْسِيْعًا عَلٰى اَهْلِهٖ، وَتَعَطُّفًا عَلٰى جَارِهٖ، لَقِيَ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهٗ مِثْلُ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ۔

حضرت باقر العلوم امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے کہ جو شخص دنیا کو اس لئے طلب کرے کہ وہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے بچ جائے اور اپنے بیوی بچوں کو رزق حلال کی روزی دے اور اپنے ہمسایہ پڑوسی حاجت مند کی حاجت روائی اور اس سے ہمدردی کر سکے تو وہ شخص بروز قیامت اللہ تعالیٰ سے اس شان سے ملاقات کرے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے ماہِ کامل کی طرح روشن اور تاباں ہوگا۔

وسیلۃ النجاۃ، صفحہ مذکور: عن مولانا امیر المومنین علیہ السلام: فَاتَّجِرُوْا بَارَكَ اللّٰهُ لَكُمْ فَاِنِّيْ قَدْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ (ص) يَقُوْلُ: اَلرِّزْقُ عَشَرَةُ اَجْزَاءٍ تِسْعَةُ اَجْزَاءٍ فِي التِّجَارَةِ وَوَاحِدَةٌ فِيْ غَيْرِهَا،

حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ لوگو! تجارت کرو کیونکہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ رزق کے دس حصے ہیں نو حصے ان میں سے تجارت میں رکھ دیئے گئے ہیں اور صرف ایک حصہ دیگر تمام کمائی کے طرق میں رکھا گیا ہے۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

نصاریٰ سے بھی بدتر ہیں تا آنکہ آپ نے فرمایا کہ ان ملاعین کی علامت یہ ہے کہ علماء قم شریف کو جو علماء حق ہیں یہ ملاعین انہیں تقصیر کی طرف نسبت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علمائے قم ولائے اہل بیت علیہم السلام میں مقصر ہیں۔ شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں علمائے قم کا تذکرہ گویا اس زمانہ کے فردِ اظہر کی صورت اور تمثیل کے طریقہ پر ہو گیا ہے ورنہ ان ملاعین کی یہ نسبت قم کے علماء سے مختص نہیں کیونکہ یہ تمام علمائے حق کو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ پھر فرماتے ہیں کہ غلات میں سے حلاجیہ کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے اعظم کی معرفت اور حق کے کشف و انکشاف کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ دعوے کرتے ہیں کہ ولی جب ان کے مذہب کا عارف اور مخلص ہو جاتا ہے تو وہ انبیاء سے افضل ہو جاتا ہے نیز ان کے علامات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ علم کیمیا رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ وہ جھوٹ فریب کے علاوہ کچھ نہیں جانتے، انتہیٰ ملخص کلامہ۔

اور یہ جماعت کہ اس زمانہ میں جن کا کلمات غلات سے انس رکھنا ظاہر ہوا ہے گویا ان تمام صفات کے جامع ہیں۔

(بقیہ حاشیہ۔۲) وسیلۃ النجاۃ صفحہ مذکور: عن زید بن علی عن آبائه (ع) عن النبی (ص) قال تسعة اعشار الرزق فی التجارة و الجزء الباقی فی السابیاء یعنی الغنم ثم الزرع و الغرس و افضله النخل (وسائل الشیعۃ باب استحبابہا واختیارہا)، امیر المومنین علیہ السلام سے ہی مروی ہے کہ رزق کے نوحصے تجارت میں رکھے گئے ہیں اور ایک حصہ بکریوں، بھیڑوں میں، اس کے بعد کاشتکاری میں اور درخت لگانے اور باغبانی کے کام میں رکھا گیا ہے اور درختوں میں افضل شجر خرما ہے۔

وسیلۃ النجاۃ صفحہ مذکور: عن مولانا الباقر (ع) یقول: خَيْرُ الْأَعْمَالِ الْحَرْثُ تَزْرَعُهُ فَيَأْكُلُ مِنْهُ الْبَرُّ وَ الْفَاجِرُ أَمَّا الْبَرُّ فَمَا أَكَلَ مِنْ شَيْءٍ اسْتَغْفَرَ لَكَ وَ أَمَّا الْفَاجِرُ فَمَا أَكَلَ مِنْهُ مِنْ شَيْءٍ لَعَنَهُ وَ يَأْكُلُ مِنْهُ الْبَهَائِمُ وَ الطَّيْرُ، حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے متعلق مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: میرے والد ماجد امام زین العابدین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ بہترین عمل ہے کاشتکاری کیونکہ اسی کا پھل ہر نیک انسان بھی کھاتا ہے اور ہر برا بھی کھاتا ہے حتیٰ کہ آپ نے فرمایا چوپائے بھی کھاتے اور پرندے بھی کھاتے ہیں۔

وسیلۃ النجاۃ صفحہ مذکور: عن مولانا الصادق (ع) یقول: اِزْرَعُوا وَ اغْرِسُوا فَلَا وَ اللهِ مَا عَمِلَ النَّاسُ عَمَلًا اَحَلَّ وَ لَا اَطْيَبَ مِنْهُ، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے متعلق مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: کاشت کاری کرو اور درخت لگاؤ، کیونکہ قسم بخدا بندوں کا کوئی دیگر عمل ایسا نہیں جو اس سے زیادہ طیب اور زیادہ حلال ہو۔

وسیلۃ النجاۃ صفحہ مذکور: اَبَا عَبْدِ اللهِ (ع) يَقُوْلُ: اَلزَّارِعُونَ كُنُوْزُ الْأَنَامِ يَزْرَعُوْنَ طَيِّبًا أَخْرَجَهُ اللهُ عَزَّ وَ جَلَّ وَ هُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَحْسَنُ النَّاسِ مَقَامًا وَ اَقْرَبُهُمْ مَنْزِلَةً يُدْعَوْنَ الْمُبَارَكِيْنَ، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا کاشتکار مخلوق خدا کے خزانے ہیں وہ کاشت کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی کاشت کردہ چیز کو طیب ہونے کی حالت میں پیدا کرتا ہے بروز قیامت ان کا مقام تمام لوگوں سے اچھا ہوگا اور ان کی منزلت خوشنودی خدا کے قریب تر ہوگی انہیں بروز قیامت مبارک کے نام سے پکارا جائے گا، مبارک اسے کہتے ہیں جو بابرکت ہو۔

وسیلۃ النجاۃ صفحہ مذکور: عنه الکیمیا الا کبر الزراعة ثم اقتناء الاغنام للاستفادہ فان فیھا البرکة، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ سب سے بڑا کیمیا زراعت ہے اور اس کے بعد بھیڑ بکری پالنے کا درجہ ہے کیونکہ ان میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے۔

وسیلۃ النجاۃ صفحہ مذکور: عَنْ مَوْلَنَا الصَّادِقِ (ع) قَالَ: إِذَا اتَّخَذَ أَهْلُ بَيْتٍ شَاةً أَتَاهُمُ اللهُ بِرِزْقِهَا وَ زَادَ فِي أَرْزَاقِهِمْ وَ ارْتَحَلَ الْفَقْرُ عَنْهُمْ مَرْحَلَةً فَإِنِ اتَّخَذَ شَاتَيْنِ اَتَاهُمُ اللهُ بِأَرْزَاقِهِمَا وَ زَادَ فِيْ اَرْزَاقِهِمْ وَ ارْتَحَلَ الْفَقْرُ عَنْهُمْ مَرْحَلَتَيْنِ فَإِنِ اتَّخَذُوْا ثَلَاثَةً اَتَاهُمُ اللهُ بِأَرْزَاقِهِمْ وَ ارْتَحَلَ الْفَقْرُ عَنْهُمْ رَأْسًا۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اوّلاً یہ اپنے متعلق گمان کرتے ہیں کہ انہوں نے ولاء اہل بیت علیہم السلام میں دوسرے علماء کی نسبت سبقت حاصل کر لی ہے۔ دوسرے علماء ان مدارج تک پہنچنے سے قاصر اور مقصر جن کا نام یہ مدارج سلمانیہ رکھتے ہیں اور ثانیاً یہ کہ یہ اپنے آپ کو معارف باطنیہ اور بواطن اسرار کا عالم جانتے ہیں۔

اور اپنا نام مومن ممتحن رکھتے ہیں اور ادعائے کشف کرتے ہیں حالانکہ ان کو یہ مرتبہ ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ آپ جان چکے کہ غیر معصوم جب کشف و الہام کا دعویٰ کرے وہ اس کے غیر پر بلکہ خود اس کی ذات پر بھی حجت نہیں ہوسکتا، کشف رحمانی بھی ہوسکتا اور کشف شیطانی بھی ہوسکتا ہے اور ان دونوں میں عمومی آدمی تمیز نہیں کر سکتا اور قرآن کریم

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے متعلق ہی مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: جب کسی گھر والے ایک بھیڑ پالیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اس کا رزق بھی عطا کرتا ہے اور ان کے اپنے رزق میں بھی اضافہ کرتا ہے اور فقر و احتیاج ان سے ایک منزل دور ہو جاتا ہے اور اگر وہ دو بھیڑیں پالیں تو اللہ تعالیٰ ان کو ان کی خوراک کا خرچہ بھی دیتا ہے اور خود ان کے رزق میں بھی اضافہ کرتا ہے اور فقر و احتیاج دو منزل تک ان سے دور ہو جاتا ہے اور اگر وہ تین بھیڑیں پالیں تو اللہ تعالیٰ ان کو ان بھیڑوں کا خرچہ خوراک بھی مرحمت کرتا اور ان کے رزق میں بھی اتنا اضافہ کر دیتا ہے کہ فقر و احتیاج ان سے بالکل دور ہو جاتا ہے اور کوچ کر جاتا ہے۔

وسیلۃ النجاۃ صفحہ مذکور: عَنْ سُلَيْمَانَ الْجَعْفَرِيِّ رَفَعَهُ إِلَى أَبِي عَبْدِ اللهِ (ع) قَالَ: مَا مِنْ أَهْلِ بَيْتٍ تَرُوحُ عَلَيْهِمْ ثَلَاثُونَ شَاةً إِلَّا لَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تَحْرُسُهُمْ حَتَّى يُصْبِحُوا ثم اقتناء البقر فانها بغدو بخير و تروح بخير و اما الابل فقد نهى عن اكثارها فعن النبي (ص) ان فيها الشقاء و الجفاء و العناء، حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ہی کے متعلق مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کوئی ایسا گھر نہیں کہ جس کے مالکوں کے پاس ان کی تیس بھیڑیں شام کو ان کے پاس آتی ہوں مگر یہ کہ ملائکہ اس گھر والوں کی صبح تک حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ بھیڑوں کے بعد گائے کا رکھنا شرف کا باعث ہے کیونکہ وہ صبح بھی خیر آنے کا باعث ہوتی ہے اور شام کو بھی لیکن اونٹوں کے بکثرت رکھنے سے منع کیا گیا ہے کیونکہ وہ شقاوت، جفاء قلب اور تکلیف و تکان کا باعث ہوتے ہیں۔

جبکہ ان تمام آیات اور احادیث اور ان کے ایسے دیگر بہت سے نصوص کے ذریعہ مثل روز روشن واضح ہے کہ رزق ہر انسان کو نبی پاک کے دست مبارک سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ ہر شخص رزق کو کسی دیگر طریقہ سے حاصل کر کے کھاتا ہے کیونکہ رزق کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پیدا کر دیا ہے اور ہر شخص کو مامور کیا ہے کہ وہ حلال طریقہ سے حاصل کر کے کھائے تو پھر معلوم ہوا کہ آیت مبارکہ: وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ، اور ارشاد حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام: اللهم هذا منك و من رسولك، کا یہ معنی ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہر شخص کا رزق رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست حق پرست پر جاری ہوتا ہے بایں معنی کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر شخص کا رزق تقسیم کرتے اور اسے عطا کرتے ہیں کیونکہ اس معنی کو اگر صحیح اور متحقق فرض کیا جائے تو گذشتہ تمام آیات و احادیث اور دیگر اس مضمون کی بہت سی نصوص کا انکار اور العیاذ باللہ ان کا بطلان لازم آتا ہے کیونکہ اگر رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رزق کو تقسیم کرتے ہوتے تو لوگوں کو حکم دینے کا کوئی معنی نہیں ہوسکتا کہ وہ حلال طریقہ پر حاصل کر کے کھاویں لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اس آیت اور حضرت صادق آل محمد علیہ السلام کے اس ارشاد کا تعلق اُن اموال سے ہے جو از قسم مال غنیمت و مال زکوٰۃ وغیرہ تھے کہ جو اموال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے تقسیم ہوئے تھے اور انہیں اموال کے ذریعہ وہ منافق لوگ غنی ہوئے تھے جنہوں نے جنگ تبوک سے واپسی پر جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا نیز ان ہی اموال کے ذریعہ وہ لوگ بھی غنی ہوئے تھے جنہوں نے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ستودہ صفات پر زبان طعن کو دراز کرتے ہوئے اعتراض کیا تھا کہ آپ نے تقسیم مال میں انصاف سے کام نہیں لیا کیونکہ قرآن پاک کا سیاق و سباق دال ہے کہ یہ آیات مذکورہ ان منافقوں ہی کے متعلق نازل ہوئی ہیں، یہ آیتیں تمام انسانوں کے حق میں نازل نہیں ہوئی ہیں

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اور احادیث معصومین علیہم السلام کے ظاہر سے استدلال بواطن کو واضح نہیں کر سکتا اور اصول اعتقاد میں اخبار آحاد پر مدار قائم نہیں کیا جا سکتا اور ثالثاً یہ لوگ علم کیمیا کے ساتھ فخر کرتے ہیں اور سوائے مکر و فریب کے ان سے کوئی چیز دیکھی نہیں جاتی اور شیعہ عوام کو کہ جو محبان اہل بیت علیہم السلام ہیں ولائے اہل بیت علیہم السلام اور ان کی مداح خوانی کے پردہ میں اپنی طرف مائل کرتے ہیں اور اہل دنیا کو علم کیمیا کے حیلہ سے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اس مکر و فریب کے ضمن میں خلاف مذہب شیعہ کے پریشان کلمات اپنی زبان پر اجراء کرتے ہیں اور جب گرفت کی جائے تو ایک شاخ سے دوسری شاخ کی طرف اڑتے نظر آتے ہیں اور اپنے کلام میں ایسے تشابہ کا ادعاء کرتے ہیں کہ ان کے اقوال سے امان مرتفع رہتی ہے اور

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) ارشاد باری تعالیٰ: وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ الخ جبکہ آیت میں واقع ہے وہ پوری آیت اس طرح ہے:

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ۭ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ (سورۃ التوبہ، آیت: ۷۴) وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا حالانکہ یقیناً انہوں نے کفر کا کلمہ کہا تھا اور وہ مسلمان ہونے کے بعد پھر کافر ہو گئے تھے اور انہوں نے ایک ایسے غلط اور ناجائز امر کا ارادہ کیا تھا جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اس ناجائز امر کی جرأت ہی تو انہوں نے اس لئے کی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے اپنے فضل و کرم سے ان کو غنی کر دیا تھا۔

آیت "وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ" کا شانِ نزول

تفسیر البرہان ج ۱، صفحہ: ۴۳۵، تفسیر کافی، صفحہ: ۱۹۶، علی بن ابراهيم قال نزلت في الذين تحالفوا في الكعبة أن لا يردوا هذا الأمر في بني هاشم فهي كلمة الكفر ثم قعدوا لرسول الله (ص) في العقبة و هموا بقتله و هو قوله وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا.

علی ابن ابراہیم قمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ آیت ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی تھی جنہوں نے خانہ کعبہ میں باہم مل کر قسمیں اٹھائی تھیں کہ اس امر خلافت کو بنی ہاشم میں نہیں رکھیں گے اور یہ کلمہ کفر کا کلمہ تھا پھر وہ وہی تو تھے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کے لئے گھاٹی میں بیٹھ گئے اور انہوں نے آپ کے قتل کا مصمم ارادہ کر لیا تھا لیکن وہ اپنی مراد کو پا نہ سکے، یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پاک سے: وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا.

نیز تفسیر البرہان، ج ۱، صفحہ: ۴۳۵، شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے مستند طور پر حضرت حذیفہ بن یمانی سے روایت کی ہے: أنه قال الذين نفروا برسول الله ناقته في منصرفه من تبوك أربعة عشر أبو الشرور و أبو الدواهي و أبو المعازف و أبوه و طلحة و سعد بن أبي وقاص و أبو عبيدة و أبو الأعور و المغيرة و سالم مولى أبي حذيفة وخالد بن الوليد و عمرو بن العاص و أبو موسى الأشعري و عبد الرحمن بن عوف و هم الذين أنزل الله عز وجل فيهم: وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا.

حضرت حذیفہ نے کہا کہ جن لوگوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی کو ڈرانے کی اس وقت کوشش کی تھی جبکہ آپ جنگ تبوک سے واپس آ رہے تھے وہ چودہ آدمی تھے (۱) ابوالشرور (۲) ابوالدواہی (۳) ابو المعازف (۴) اس کا باپ (۵) طلحہ (۶) سعد بن ابی وقاص (۷) ابوعبیدہ (۸) ابوالاعور (۹) مغیرہ (۱۰) سالم حذیفہ کا آزاد کردہ (۱۱) خالد بن ولید (۱۲) عمرو بن العاص (۱۳) ابوموسیٰ اشعری (۱۴) عبدالرحمن بن عوف اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت: وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا. نازل کی ہے کہ انہوں نے اس برائی کا ارادہ کیا تھا جسے وہ پا نہ سکے اور اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ معلوم ہوا کہ یہ آیت مبارکہ منافقوں کے متعلق نازل ہوئی ہے وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ الخ کے الفاظ میں ضمیر جمع منافقوں کی طرف لوٹ رہی ہے لہٰذا اس آیت کا یہ معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اموال غنیمت اور زکوٰۃ وغیرہ کے ذریعہ ان منافقوں کو غنی بنا دیا تھا جس کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اللہ جل شانہ کا شکریہ ادا کرتے لیکن غنی ہو جانے کے باعث یہ غرور و تکبر میں پڑ گئے اور بجائے شکریہ کے انہوں نے کفران کیا کیونکہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کے درپے ہو گئے۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

مکر وفریب کے آثار ان کے کلمات میں واضح اور ظاہر ہوتے ہیں چنانچہ انہوں نے صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کے نام رکھے ہوئے ہیں اور توحید، فعل اللہ، ارادۃ اللہ، قدرۃ اللہ علم باصلح اور اسماء حسنیٰ انہوں نے موجودہ اشخاص قرار دے رکھے ہیں اور علم خدا کو اشیاء کے ساتھ حادث سمجھتے ہیں اور توحید کے مراتب ایک ہزار سے بھی زیادہ شمار کرتے ہیں۔ بعض چیزوں کو سینہ کے ساتھ اور بعض کو دل کے ساتھ تعلق پذیر جانتے ہیں اور علماء اصول کلام میں سے بعض کے کلام کو مکر وفریب کے طریقہ پر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ یہ ظاہر نہ ہو کہ ان کا طریقہ اہل حق کے طریقہ کے خلاف ہے اور اس کے باوجود کہتے ہیں کہ ہم اپنے بھید اور راز کو زیادہ تر ظاہر نہیں کرتے کیونکہ دیوار بھی کان رکھتی ہے اور علماء مذہب حق سے اسے پوشیدہ کیوں رکھتے ہیں؟ انہوں نے وہ اسرار کہاں سے معلوم کر لئے ہیں؟ کیا کوئی ایسی

(بقیہ حاشیہ۔۲) غرض یہ آیت عامۃ الناس سے تعلق ہی نہیں رکھتی تاکہ یہ احتمال پیدا ہو سکے کہ تمام انسانوں کا رزق رسول خدا ﷺ کے دست مبارک پر جاری ہو کر آتا ہے اور ہر شخص تک آپ کے ہاتھوں سے پہنچتا ہے لہٰذا اس آیت سے اس مطلب پر دلیل قائم کرنا غلط ہے اور آیت کریمہ کے متعلق تحریف معنوی کا ارتکاب ہے جو ہرگز جائز نہیں۔

دوسری آیت بھی ان منافقوں کے متعلق ہی نازل ہوئی ہے جو بعد کو خارجی بن گئے چنانچہ پوری آیت کے الفاظ یہ ہیں:

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ‌ۚ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا وَاِنۡ لَّمۡ يُعۡطَوۡا مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ يَسۡخَطُوۡنَ۝ وَلَوۡ اَنَّهُمۡ رَضُوۡا مَاۤ اٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ ۙ وَقَالُوۡا حَسۡبُنَا اللّٰهُ سَيُؤۡتِيۡنَا اللّٰهُ مِنۡ فَضۡلِهٖ وَرَسُوۡلُهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوۡنَ۝ (سورۃ التوبہ، آیت: ۵۸، ۵۹)

ان منافقین میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو تقسیم صدقات یعنی زکوٰۃ کے بارے میں آپ کو الزام کا مورد قرار دیتے ہیں اور حالت ان کی یہ ہے کہ اگر ان کو کچھ عطا کیا جائے تو پھر وہ راضی ہو جاتے ہیں اور اگر صدقات میں سے کچھ نہ دیا جائے تو ناگاہ وہ غضب ناک ہو جاتے ہیں اور اگر وہ اس پر راضی ہو جاتے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ان کو عطا کیا تھا اور "حسبنا اللہ" کہہ دیتے یعنی کہتے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول ہمیں کافی ہیں تو ضرور اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ان کو اپنے فضل وکرم سے بہت کچھ عطا کر دیتے ہم تو بے شک اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔

ان ہر دو آیات کا مضمون واضح کرتا ہے کہ ان میں جن اموال کا تذکرہ ہے وہ اموال زکوٰۃ اور غنیمت وغیرہ تھے جو رسول ﷺ بحکم خدا اہل اسلام میں تقسیم کیا کرتے تھے اور آپ ان اموال سے منافقوں کو بھی حصہ دیتے تھے اور ان کے باعث وہ غنی بھی ہو گئے تھے لیکن منافقین نے شکریہ کی بجائے کفران نعمت کیا مگر رسول پاک کا یہ عطیہ خارج از بحث چیز ہے اس میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اختلاف تو اس میں ہے کہ عالم دنیا کی ساری مخلوق کا رزق کیا رسول ﷺ اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کے ہاتھوں پر جاری ہوتا ہے اور ہر شخص جو کچھ کھاتا ہے وہ ان نفوس مقدسہ کے ہاتھوں پر جاری ہو کر آتا ہے تو یہ مطلب ان آیات سے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جو شخص اس مطلب پر ان آیات سے استدلال کرتا ہے اسے اس کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں کہ وہ اپنی جہالت کو طشت از بام کرتا ہے، ملاحظہ ہو تفسیر صافی صفحہ: ۱۹۴ آیت مبارکہ: وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّلۡمِزُكَ فِى الصَّدَقٰتِ‌ۚ فَاِنۡ اُعۡطُوۡا مِنۡهَا رَضُوۡا وَاِنۡ لَّمۡ يُعۡطَوۡا مِنۡهَاۤ اِذَا هُمۡ يَسۡخَطُوۡنَ۝ (سورۃ التوبہ، آیت: ۵۸) کے تحت تحریر ہے۔

فی المجمع عن الباقر (ع): بَيْنَا رَسُولِ اللهِ (ص) إذْ جَاءَهُ ابْنُ ذُو الْخُوَيْصِرَةِ التَّمِيْمِي وَ هُوَ حَرْقُوْصُ بْنُ زُهَيْرٍ اَصْلُ الْخَوَارِجِ فَقَالَ اعْدِلْ يَا رَسُولَ اللهِ. فَقَالَ: وَيْلَكَ مَنْ يَعْدِلُ إنْ أنَا لَمْ أعْدِلْ. (الحدیث)

کہ تفسیر مجمع البیان میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت رسول خدا ﷺ تشریف فرما تھے کہ اتنے میں ابن ذوالخویصرہ تمیمی آ گیا اور یہی شخص حرقوص بن زہیر ہے جو کہ خارجیوں کا اصل اصیل اور ان کا سب سے بڑا گروہ تھا۔ اس نے آتے ہی رسول ﷺ سے کہا کہ یا حضرت! انصاف کیجئے، تو حضرت ﷺ نے فرمایا: ارے تجھ پر نفرین اور پھٹکار ہو اگر میں عدل نہیں کرتا تو پھر اور کون عدل وانصاف کرے گا۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

دلیل ان کے پاس موجود ہے جو سمعاً متواتر ہو؟ یا کوئی دلیل عقلی اس پر انہوں نے قائم کی ہے؟ جو کچھ ان کے رسالوں میں دیکھا گیا ہے وہ تو مغالطہ اور سفسطہ کے علاوہ کچھ نہیں، بمطابق "الاناء یترشح بمافیه" جو کچھ ان سے ظاہر ہوا ہے اس کی حالت تو یہی ہے جو بیان ہوئی اور ان کے اسرارِ پوشیدہ کا نمونہ یہی ہے جو پیش کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو صراط مستقیم اور طریق قویم کی ہدایت کرے۔ ہم نے مقصد کو واضح کرنے کی خاطر اور مخلوقات خدا میں سے جو عقل وفہم رکھنے والے طالب حق ہیں ان کو تنبیہ کرنے کے لئے یہاں کلام کو طول دے دیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) واضح باد کہ تفسیر صافی کا جو نسخہ ہمارے پاس ہے اس میں مندرجہ بالا الفاظ ہیں لیکن تفسیر مجمع البیان کی اصل عبارت اور تفسیر صافی کی مذکورہ بالا عبارت میں قدرے اختلاف ہے معلوم ہوتا ہے کہ ناقل کی غلطی سے کچھ الفاظ رہ گئے ہیں۔

مجمع البیان ج ۳، صفحہ: ۴۰ میں اصل عبارت اس طرح ہے: قال الطبرسي عن أبي سعيد الخدري قال بينا رسول الله (ص) يقسم قسما و قال ابن عباس كانت غنائم هوازن يوم حنين إذ جاءه ابن أبي الخويصرة التميمي و هو حرقوص بن زهير أصل الخوارج فقال اعدل يا رسول الله فقال ويلك و من يعدل إذا لم أعدل، انتهى بقدر الحاجة.

کہ حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت رسول خدا ﷺ کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے اور حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ وہ اموال جنگ حنین میں قبیلہ ہوازن سے حاصل کردہ اموال غنیمت تھے، اتنے میں ابن ابی ذی الخویصرہ آ گیا اور اس نے آنحضرت ﷺ کی ذات ستودہ صفات پر زبان طعن دراز کرتے ہوئے اعتراض کیا کہ یا حضرت انصاف کیجئے، تو حضرت نے فرمایا کہ نفرین ہو تجھ پر جب میں انصاف نہ کروں گا تو پھر اور کون انصاف کرے گا۔

تفسیر البرہان ج ۱، صفحہ: ۴۲۹: عن سماعة عن أبي عبد الله أو أبي الحسن (ع) قال ذكر أحدهما أن رجلا دخل على رسول الله (ص) يوم غنيمة حنين و كان يعطي المؤلفة قلوبهم يعطي الرجل منهم مائة راحلة و نحو ذلك و قسم رسول الله (ص) حيث أمر فأتاه ذلك الرجل قد أزاغ الله قلبه و ران عليه فقال له ما عدلت حين قسمت فقال له رسول الله (ص) ويلك ما تقول؟ ألا ترى قسمت الشاة حتى لم يبق معي شاة أولم أقسم البقر حتى لم يبق معي بقرة واحدة أولم أقسم الإبل حتى لم يبق معي بعير واحد فقال بعض أصحابه له اتركنا يارسول الله حتى نضرب عنق هذا الخبيث فقال لا هذا يخرج في قوم يقرءون القرآن لا يجوز تراقيهم بلى قاتلهم غيري.

سماعہ نے حضرت جناب امام جعفر صادق علیہ السلام اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ ان دونوں امامین ہمامین علیہما السلام میں سے کسی ایک نے فرمایا: جنگ حنین کے اموال غنیمت تقسیم ہونے کے دن ایک شخص جناب رسول خدا ﷺ کی خدمت عالی مرتبت میں حاضر ہوا۔ حضور ﷺ، مؤلفۃ القلوب کو مال غنیمت عطا فرما رہے تھے۔ ایک ایک شخص کو سو سو اونٹ اور اس کی مثل عطا فرما رہے تھے اور اس تقسیم میں ان لوگوں کو عطا فرما رہے تھے جن کو عطا کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا۔ وہ شخص جو آیا تھا اللہ تعالیٰ نے ان کی توفیق کو سلب کر لیا تھا اور خذلان کا شکار ہونے کے باعث اس کا دل ٹیڑھا ہو گیا تھا اس نے حضرت کی ذات والا صفات پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے اس تقسیم میں انصاف نہیں کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تیرا برا ہو، کیا کہہ رہا ہے؟ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ میں نے گوسفند تقسیم کئے تو سب کے سب ہی تقسیم کر دیئے حتیٰ کہ میرے پاس ایک گوسفند بھی نہیں رہا اور پھر گائے بھینس تقسیم کیں تو ان میں سے بھی میرے پاس ایک گائے تک نہیں رہی پھر اونٹ تقسیم کئے تو بھی ایک اونٹ تک میرے پاس نہ رہ گیا، سب تقسیم کر دیئے۔ اب بھی تو زبان طعن دراز کر رہا ہے؟ حضور کے ایک صحابی نے عرض کیا کہ حضور ﷺ ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اس خبیث کی گردن اڑا دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا نہیں، میں اجازت نہیں دیتا کیونکہ یہ ابھی زندہ رہے گا، پھر ایک ایسی قوم میں خروج کرے گا جو قرآن پاک کو پڑھیں گے لیکن وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا، ان کا قاتل میں نہیں، ان کا قاتل ایک اور شخص ہو گا۔

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

صفات سلبیہ میں سے دوسری صفت "نفی صفات"

صفات سلبیہ میں سے دوسری صفت نفی صفات ہے۔ امیر المومنین یعسوب الدین علیہ السلام نے فرمایا: اَوَّلُ الدِّيْنِ مَعْرِفَتُهُ الخ[۱] دین کی ابتدائی بنیاد معرفت خدا ہے اور معرفت خدا کا کمال اس کی تصدیق ہے اور تصدیق کا کمال اس کی توحید ہے اور توحید کا کمال اس کی ذات پاک کی تنزیہہ اور اخلاص ہے اور اخلاص و تنزیہہ کا کمال یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت شہادت دیتی ہے کہ وہ موصوف سے مغائر ہے اور ہر موصوف گواہی دیتا ہے کہ اسے

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) ان تمام حوالہ جات سے معلوم ہوا کہ اس حدیث اور ان آیات سے مراد اموال صدقات اور اموال غنیمت ہیں، عمومی اموال مراد نہیں اور ان کا تقسیم کرنا بھی مقصود نہیں۔ اس سے عمومی اموال کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست حق پرست پر جاری ہو کر مخلوق تک پہنچنا ان آیات و احادیث سے مراد نہیں ہوسکتا اور امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ فرمان: اللهم هذا منك و من رسولك بھی اس معنی پر دلالت نہیں کرتا کہ تمام تر رزق اللہ تعالیٰ کی طرف سے جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کے دست حق پرست پر تمام لوگوں کو جاری ہو کر آتا ہے۔

اور اگر تنزلاً تسلیم بھی کیا جائے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے جس مال کے متعلق یہ فرمایا: اللهم هذا منك و من رسولك وہ اموال بالخصوص اموال غنیمت یا اموال زکوٰۃ نہیں تھے بلکہ عمومی اموال میں سے تھے تو بھی یہ مفہوم ہرگز نہیں ثابت ہوتا کہ تمام اموالِ ائمہ علیہم السلام کے ہاتھ پر جاری ہو کر مخلوق تک پہنچتے ہیں کیونکہ عمومی اموال کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر ائمہ معصومین علیہم السلام کو جو رابطہ حاصل ہے وہ علت غائیہ کا ہے، علت فاعلیہ کا نہیں کیونکہ پیدا کرنے والا خود خداوند عالم ہے جس نے ہر شئے کو پیدا کیا ہے لیکن چہاردہ معصومین علیہم السلام کی خاطر پیدا کیا ہے اگر اللہ تعالیٰ ان نفوس مقدسہ کو پیدا نہ کرتا تو کسی چیز کو پیدا نہ کرتا اور جب تک ان کا ایک فرد غائب ہے دنیا قائم اور باقی ہے لہٰذا تمام مخلوق جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تصدق سے ہر قسم کا رزق کھا رہی ہے لیکن یہ مطلب ہرگز ثابت نہیں ہوسکتا کہ ہر شخص کا رزق امام علیہ السلام کے ہاتھ میں پہنچ کر ہر شخص کو پہنچتا ہے لہٰذا امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ پروردگار یہ اموال تیرے اور تیرے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہیں کیونکہ تو نے پیدا کئے اور اصلاً رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر پیدا کئے اس لئے سب لوگ ان کے باعث کھا رہے ہیں۔

غرض رزق کے متعلق آیات و احادیث میں جو کچھ وارد ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام مرزوقات کو خداوند عالم نے ہی پیدا کیا ہے کیونکہ تمام کی تمام اشیاء یعنی اجسام و ارواح اور بندوں کے افعال اختیاریہ کے علاوہ تمام اعراض کو پیدا کرنے والا وہی وحدہ لاشریک ہے اور رزق کے حامل ہونے کے تمام اسباب کو پیدا کرنے والا اور مہیا کرنے والا بھی وہی پاک پروردگار ہے۔ ہر سبب اور موثر کی تاثیر کا ترتب اسی کی مشیت پر موقوف ہے لہٰذا وہی منعم حقیقی اور حقیقۃً عطا کنندہ ہے۔ اس لئے اس معنی میں رازق ہونا اسی کی ذات بابرکات سے مختص ہے ورنہ رزق بمعنی عطا کرنے کو اگر عام معنی میں لیا جائے تو پھر عطا کرنا خداوند عالم کی ذات سے مختص نہیں بلکہ عطا کنندگان اس معنی کے اعتبار سے صرف متعدد ہی نہیں بلکہ بکثرت متحقق ہیں اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (سورۃ جمعہ، آیت: ۱۱) کہ اللہ تعالیٰ تمام عطا کنندگان میں سے بہتر عطا کنندہ ہے۔ غرض لفظ "رازق" کا جو معنی خداوند عالم کی ذات سے مختص ہے وہ یہی ہے کہ وہ تمام اشیاء خوردنی کو پیدا کرنے والا، نیز ان کے حصول کے مخفی اسباب کو مہیا کرنے والا ہے۔

اور تقسیم رزق کا جو معنی خدا کی ذات سے مختص ہے وہ بھی یہی ہے کہ علم الٰہی کے مطابق ہر شخص کے رزق کی تقسیم ہو چکی ہے اور اس کا اندراج لوح محفوظ میں ہو چکا ہے جس کا اجمالی اندراج لوح محو و اثبات میں بھی آ چکا ہے لیکن اعمال خیر و افعال بد کے طفیل لوح محو و اثبات میں رزق کی وسعت یا تنگی کا تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جس کی تفصیل لوح محفوظ کے مطابق وقوع پذیر ہوتی ہے۔ بندہ اپنا رزق حلال طریقہ پر حاصل کرنے کے لئے مامور ہے ایسا نہیں ہے کہ ہر بندے کو اس کا رزق کوئی فرشتہ پہنچا جاتا ہے یا امام معصوم پہنچاتے ہیں۔

(۱) نہج البلاغہ، ترجمہ حضرت علامہ مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ، ج۱، صفحہ: ۵۱۔

صفت سے تغایر حاصل ہے لہٰذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو کسی صفت سے متصف قرار دیا اس نے ذات خدا کو اس کے متغایر امور سے مقارن بنا دیا اور جس شخص نے اس طرح اسے مقارن بنایا اس نے دو چیزوں کے مجموعہ کو خدا مان لیا اور جس نے ایسے مجموعہ کو خدا مانا وہ خدا کے متعلق اجزاء سے مرکب ہونے کا قائل ہو گیا اور جو اجزاء سے مرکب ہونے کا قائل ہوا وہ معرفت خدا سے بے بہرہ اور جاہل رہا۔

اس کے علاوہ دیگر بہت سی احادیث اس مطلب پر دلالت کرنے والی موجود ہیں جن کا تذکرہ ابھی آجائے گا۔ امیر المومنین علیہ السلام کے اس کلام معجز نظام سے حضرت کا مقصود ذات خداوند عالم سے کلیۃً صفات کی نفی کرنا نہیں ورنہ ذات خداوند عالم سے علم وقدرت اور بقیہ صفات الٰہیہ کی نفی کرنا جائز ہو جائے گا اور یوں کہنا جائز ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ عالم نہیں ہے، قادر نہیں ہے، حالانکہ ایسا ہرگز جائز نہیں کیونکہ یہ مذہب حق میں بداہۃً باطل ہے اور تمام اسلامی فرقوں کے اتفاق اور اجماع کے ذریعہ فاسد ہے سوائے باطنیہ اور اسماعیلیہ کے جیسا کہ ان کے متعلق نقل کیا گیا ہے اور آیات و روایات متواترہ صفات باری تعالیٰ کے اثبات کے متعلق پُر اور چھلک رہی ہیں۔ ارشاد قدرت ہے: وَ اَنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ، کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے، وَ اَنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ، کہ وہ ہر شئے کو جاننے والا ہے، وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ، بندے اللہ تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اتنے علم کے جتنا کہ وہ خود چاہے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: عَزَّتْ قُدْرَتُهٗ وَ وَسِعَ سَمْعُهُ الْاَصْوَات، کہ اس کی قدرت کو ہر چیز پر غلبہ حاصل ہے اور اس کا علم تمام آوازوں کو شامل اور حاوی ہے لہٰذا ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نہ عالم ہے نہ جاہل نہ موجود ہے نہ لاموجود، نہ قادر ہے نہ عاجز، اگر ماوّل نہ ہو تو کفر محض ہے اور خالص سفسطہ ہے۔

نیز امیر المومنین علیہ السلام کے اس کلام حق کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ذات خداوند عالم اور اس کے صفات، مفاہیم اور معانی میں اس سے لازم آئے گا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس کے صفات کا حمل از قسم حمل اوّلی[1] ہو کہ جس میں موضوع اور محمول کے درمیان سوائے التفات کے تغایر کے کوئی تغایر نہیں ہوتا جیسا کہ اس نے نئے پیدا شدہ فرقے کے بعض بتکلف مہارت کا ادعاء رکھنے والے اشخاص کا خیال ہے کہ صفات پروردگار کا حمل از قبیل اوّلی ہوتا ہے لیکن یہ درست نہیں ورنہ لازم آئے گا کہ جب ہم کہیں کہ خدا عالم ہے تو یہ ایسے ہی ہو جیسے کہا جائے کہ خدا خدا ہے دیگر صفات الٰہیہ میں بھی یہی

---

(۱) حمل اوّلی: موضوع اگر بعینہٖ محمول ہو تو اسے حمل اوّل کہتے ہیں جیسے مثلاً کہا جائے "الانسان انسان" کہ انسان انسان ہے اور اگر موضوع ذہن و خارج ہر دو کے اعتبار سے بعینہٖ محمول نہ ہو بلکہ صرف وجود خارجی میں ہی یہ متحد ہوں تو اسے حمل شائع متعارف کہتے ہیں جیسے مثلاً "الانسان حیوان" کہ ہر انسان حیوان ہوتا ہے۔ واضح باد کہ محکوم علیہ یعنی مسند الیہ کو موضوع کہا جاتا ہے اور محکوم بہ یعنی مسند کو محکوم کہا جاتا ہے اور حمل اوّلی میں ایک ہی چیز موضوع بھی ہوتی ہے اور محمول بھی، فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ اس میں چیز کا تصور دو مرتبہ ہوتا ہے۔ پہلی مرتبہ جب اس کا تصور کیا جاتا ہے تو اسے موضوع بنایا جاتا ہے اور دوسری مرتبہ اس چیز کا تصور کیا جاتا ہے تو اسے محمول بنا دیا جاتا ہے۔ چیز صرف ایک ہوتی ہے اس کی طرف التفات اور اس کا تصور دو مرتبہ ہوتا ہے۔ لہٰذا حمل اولی میں موضوع اور محمول ذہن اور خارج دونوں میں متحد ہوتے ہیں، نہ ان میں ذاتی حیثیت سے تغائر ہوتا ہے اور نہ ہی مفہوم کے لحاظ سے۔

صورت لازم آئے گی کیونکہ اس تقدیر پر کلام مقصود کو ادا کرنے کے فائدہ سے ساقط ہو جائے گا اور ان متعدد جملوں میں سے ہر جملہ معنی جدید کا فائدہ نہیں پہنچا سکے گا حالانکہ اس کا بطلان واضح ہے۔

برادران کے اعتراض کی تردید

اسی مذکورہ بالا خیال فاسد کے باعث کہ اگر ذات پروردگار سے صفات کی نفی کی جائے تو پھر صفات کا حمل بر ذات باری حمل اوّلی ہو جائے گا اور اس وجہ سے کلام فائدہ جدید نہیں پہنچا سکے گا اہل سنت نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے عالم، حیّ اور قادر ہونے کا مفہوم خود عین ذات باری ہو تو پھر ان صفات کا حمل کرنا کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا اور لازم باطل ہے کیونکہ ان صفات کا حمل صحیح فائدہ پہنچاتا ہے۔

نیز انہوں نے اعتراضاً کہا کہ اگر علم وقدرت سے مراد نفس ذات باری تعالیٰ ہو تو پھر علم اور قدرت دونوں کا مفہوم اور معنی ایک ہی ہوگا حالانکہ یہ بدیہی طور پر باطل ہے لہٰذا ملزوم بھی مثل لازم باطل ہوگا۔

اہل سنت کے جلیل القدر علماء صاحب کتابِ مواقف[1] وشارح مواقف نے ان کے دو اعتراضات کے جواب میں

---

[1] المواقف صفحہ:۵۸۱ پر تحریر ہے: الوجه الثانی: لو كان مفهوم كونها عالما حيا قادرا نفس ذاته لم يفد حملها على ذاته وكان قولنا على طريقة الإخبار الله الواجب أو العالم أو القادر أو الحي إلى ساير الصفات حمل الشيء على نفسه واللازم باطل لأن حمل هذه الصفات يفيد فائدة صحيحة بخلاف قولنا ذاته ذاته وإذا بطل كونها نفسا ولا مجال للجزئية قطعا تعين الزيادة على الذات وفيه نظر فإنه لا يفيد إلا زيادة هذا المفهوم أعنی مفهوم العالم والقادر ونظائرهما على مفهوم الذات ولا نزاع فی ذلك وأما زيادة ما صدق عليه هذا المفهوم على حقيقة الذات فلا يفيده هذا الدليل نعم لو تصورا أی مفهوما الوصف والذات معا بحقيقتهما وأمكن حمل أحدهما أی الوصف على الذات دون حمل الآخر أی الذات عليها حصل المطلوب وهو زيادة الوصف على الذات لكن أنى ذلك تصور الواصل إلى كنه حقيقتهما الوجه الثالث لو كان العلم نفس الذات والقدرة أيضا نفس الذات كما زعموه لكان العلم نفس القدرة فكان المفهوم من العلم والقدرة أمرا واحدا وإنه ضروری البطلان وكذا الحال فی باقی الصفات التی ادعی أنها عين الذات وهذا الوجه من النمط الأول أی الوجه السابق عليه والإيراد يعنی أنه يدل على تغاير مفهومی العلم والقدرة ومغايرتهما للذات لا على تغاير حقيقتهما ومغايرتهما لها والمتنازع فيه هو الثانی دون الأول فمنشأ هذين الوجهين عدم الفرق بين مفهوم الشیء وحقيقته فإن قلت كيف يتصور كون صفة الشیء عين حقيقته مع أن كل واحد من الموصوف والصفة يشهد بمغايرته لصاحبه وهل هذا إلا كلام مخيل لا يمكن أن يصدق به كما فی سائر القضايا المخيلة التی يمتنع التصديق بها فلا حاجة بنا إلى الاستدلال على بطلانه قلت أوليس معنی ما ذكروه أن هناك ذاتا وله صفة وهما متحدان حقيقة كما تخيلته بل معناه إن ذاته تعالى يترتب عليه ما يترتب على ذات وصفة معا مثلا ذاتك ليست كافية فی انكشاف الأشياء عليك بل تحتاج فی ذلك إلى صفة العلم التی تقوم بك بخلاف ذاته تعالى فإنه لا يحتاج..... (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

بے شک انصاف سے کام لیا ہے کیونکہ ان دونوں علماء نے ان ہر دو اعتراضات کا جواب یوں دیا ہے کہ ان دونوں اعتراضات سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف اتنی بات ہے کہ صفات باری تعالیٰ کے مفاہیم ذات باری سے زائد اور جداگانہ ہیں ان اعتراضات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ صفات باری تعالیٰ کے مصادیق ذات خداوند عالم سے جداگانہ اور زائد ہیں اور جس میں جھگڑا اور اختلاف ہے وہ دوسری شق ہے پہلی شق میں جھگڑا نہیں، شارح مواقف کہتے ہیں اشاعرہ نے یہ دو اعتراض جو کئے ہیں ان کی وجہ کسی چیز کے مفہوم اور اس کی حقیقت میں جو فرق ہوتا ہے اس کا نہ سمجھنا ہے۔

نفی صفات سے مراد تعدد مفاہیم کی ہی نفی کر دینا جیسے کہ اشاعرہ نے سمجھا ہے یہ درست نہیں کیونکہ اس سے تو خداوند عالم کے علم وقدرت کی نفی لازم آتی ہے کیونکہ اس تقدیر پر تو اللہ عالم اور اللہ قادر کا یہ معنی نہیں ہوگا کہ اللہ عالم ہے اور اللہ قادر ہے بلکہ ان الفاظ کا معنی یہ بنے گا کہ اللہ اللہ ہے حالانکہ معتقدین مذہب وملت میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو ان الفاظ کا معنی یہ نہ سمجھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ عالم ہے اور قادر ہے بلکہ ہر دین دار یہی معنی سمجھتا ہے اور اسی کا یقین رکھتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ۔۱) فی انکشاف الأشياء وظهورها عليه إلى صفة تقوم به بل المفهومات بأسرها منكشفة عليه لأجل ذاته تعالى فذاته بهذا الاعتبار حقيقة العلم وكذا الحال في القدرة فإن ذاته تعالى مؤثرة بذاتها لا بصفة زائدة عليها كما في ذواتنا فهي بهذا الاعتبار حقيقة القدرة وعلى هذا تكون الذات والصفات متحدة في الحقيقة متغايرة بالاعتبار والمفهوم ومرجعه إذا حقق إلى نفي الصفات مع حصول نتائجها وثمراتها من الذات وحدها.

دلائل فرقہ اشاعرہ میں سے دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے عالم، حیّ اور قادر ہونے کا مطلب یہ ہو کہ یہ صفات اس کی بعینہٖ ذات ہیں تو یہ استحالہ لازم آئے گا کہ ان صفات کا اس کی ذات پر حمل کرنا فائدہ بخش نہ رہے گا اور بطریقہ اخبار ہمارا یوں کہنا کہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود ہے یا عالم یا قادر یا حیّ ہے یا اور کسی اپنی صفت سے متصف ہے یہ ایسے ہی ہوگا جیسے کسی شئے کو اس کے نفس پر محمول کر دیا جائے اور لازم باطل ہے کیونکہ ذات باری کے لئے ان صفات کا محمول بنانا صحیح فائدہ پہنچاتا ہے بخلاف اس کے اگر کہا جائے "ذاتہ ذاتہ" کہ اس کی ذات اس کی ذات ہے تو اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا لہٰذا ثابت ہوا کہ صفات خداوند عالم کا عین ذات ہونا باطل ہے اور جب ان کا نفس ذات ہونا باطل ہوا تو ان کا زائد بر ذات ہونا معین ہوا کیونکہ اس احتمال کی تو بالکل گنجائش ہی نہیں کہ وہ صفات ذات باری کا جز ہوں۔

اشاعرہ کی یہ دلیل نقل کر کے صاحب کتاب کہتے ہیں: اس دلیل میں نقص ہے کیونکہ اس دلیل سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ صفات خداوند عالم کا مفہوم یعنی عالم، قادر اور ان کی مثل دیگر صفات کا مفہوم مفہوم ذات سے زائد اور اس سے جداگانہ ہے اور اس میں کوئی جھگڑا اور نزاع نہیں رہا ان صفات کے مصداق کا مصداق ذات سے زائد اور جداگانہ ہونا تو اس دلیل سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

ہاں ذات اور صفت دونوں کے مفہوموں کی حقیقت کا اگر تصور کیا جائے اور ذات اور وصف میں سے ایک کا حمل یعنی وصف کا ذات پر حمل ممکن ہو اور دوسرے یعنی ذات کا ل وصف پر ممکن نہ ہو تو پھر مقصود حاصل ہو جائے گا اور وہ ہے صفت کا ذات پر زائد ہونا، لیکن ایسا تصور ممکن نہیں کیونکہ اللہ جل شانہ کی حقیقت کی کنہ کا تصور محال ہے۔

مذہب اشاعرہ کی تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر علم باری تعالیٰ عین ذات باری ہو نیز قدرت خدا بھی عین ذات باری ہو جیسا کہ ان لوگوں کا خیال ہے تو پھر لازم آئے گا کہ علم عین قدرت ہو تو پھر قدرت اور علم کا مفہوم امر واحد بن جائے گا اور اس سے علم وقدرت کا اتحاد لازم آئے گا حالانکہ اس کا باطل ہونا بدیہی ہے اور یہی حال ہے تمام ان صفات کا جن کو ان لوگوں نے عین ذات باری قرار دیا ہے۔

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

مطلقاً نفی صفات والا اعتقاد تو باطنیہ فرقہ کے اعتقاد کی طرف لوٹ جاتا ہے جو کہتے ہیں کہ نہ خدا عالم ہے نہ جاہل، نہ قادر ہے نہ عاجز کیونکہ نفی صفات والے اس اعتقاد کی بناء پر علم وقدرت وغیرہ صفات کی کلیۃً نفی ہو جاتی ہے اور جس طرح کہ ان کے عقیدہ پر گرفت کی جائے تو تعدد قدماء کے استحالہ سے بچنے کے لئے کہنے لگتے ہیں کہ صفات خداوند عالم نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات، اسی طرح باطنیہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ عالم ہے نہ جاہل حالانکہ ان دونوں فرقوں میں سے ہر ایک کا عقیدہ ارتفاع نقیضین کا علم رکھتا ہے اور ارتفاع نقیضین کا بطلان واضح ہے۔ نیز امیر المومنین علیہ السلام کے ارشاد پاک: كَمَالُ الْإِخْلَاصِ لَهُ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ سے مراد صفات فعل کی نفی بھی نہیں ہوسکتی کیونکہ مذہب حق کے

(بقیہ حاشیہ۔۱)

"الجواب" اشاعرہ کی یہ دلیل بھی دلیل سابق کی ہی مثل ہے اور اس پر بھی اعتراض اسی طرح وارد ہوتا ہے جس طرح کہ سابق دلیل پر وارد ہوتا ہے یعنی یہ دلیل بھی اسی امر پر دلالت کرتی ہے کہ علم وقدرت کے مفاہیم میں تغایر ہے اور ان دونوں مفہوموں کو ذات باری تعالیٰ سے تغایر حاصل ہے لیکن یہ دلیل اس امر پر بھی دلالت نہیں کرتی کہ علم وقدرت ہر دو کی باہم حقیقتوں میں بھی تغایر ہے اور ان کی حقیقتیں حقیقت باری تعالیٰ کے بھی متغائر ہیں اور نزاع و جھگڑا دوسری شق میں ہے پہلی شق میں نزاع نہیں ہے لہٰذا اشاعرہ کے ان دونوں اعتراضات کی وجہ یہ ہے کہ ان کو کسی چیز کے مفہوم اور اس کی حقیقت میں جو فرق ہوتا ہے وہ سمجھ نہیں آسکا۔

"ایک اور اعتراض کا جواب" اگر آپ کہیں کہ کسی چیز کی صفت کا بعینہٖ وہ چیز ہونا کیسے متصور ہوسکتا ہے حالانکہ صفت اور موصوف میں سے ہر ایک دوسرے سے مغائرت رکھنے کی خود شہادت دیتا اور اس مغائرت پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا صفت کا عین موصوف ہونا بس ایک وہمی اور خیالی بات ہے جس کی تصدیق نہیں کی جاسکتی جس طرح دیگر ان تمام باتوں کی تصدیق نہیں کی جاسکتی جو محض خیالی اور وہمی ہوتی ہیں لہٰذا اس وہمی بات کے بطلان پر دلیل قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

"الجواب" تو میں اس کا جواب دوں گا کہ جو کچھ ان لوگوں نے کہا ہے جو صفات کو عین ذات باری جانتے ہیں اس کا وہ مطلب نہیں جو آپ نے سمجھا اور آپ کے خیال شریف میں آیا ہے کیونکہ ان کا یہ مطلب نہیں کہ واقع میں ایک ذات اور دوسری اس کی صفت موجود ہیں اور وہ دونوں اپنی حقیقت کے لحاظ سے متحد ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی اس شان کی مالک ہے کہ صرف اس ذات پر وہ اثرات مرتب ہوتے ہیں جو ممکنات میں ایک ذات اور اس کی صفت پر مرتب ہوتے ہیں مثلاً تیری ذات تنہا انکشاف اشیاء کے لئے کافی نہیں بلکہ آپ اس میں صفت علم کی طرف محتاج ہوتے ہیں جو صفت کہ آپ کی ذات کے ساتھ قائم ہوتی ہے لیکن خداوند عالم کی ذات انکشاف اشیاء میں اس طرح نہیں کہ وہ ایسی صفت علم کی طرف محتاج ہو جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہو بلکہ تمام کے تمام مفہومات اس کی نفس ذات کے باعث اس پر واضح اور منکشف ہیں لہٰذا اس اعتبار سے کہتے ہیں کہ اس کی ذات حقیقۃً علم ہے اور یہی حالت قدرت کی ہے کیونکہ اس کی ذات گرامی بذات خود اشیاء میں موثر ہے ایسا نہیں کہ وہ ذات پاک کسی صفت زائدہ کے ذریعہ موثر ہو جیسا کہ ہماری ذوات صفت زائدہ کے ذریعہ موثر ہوسکتی ہیں بذات خود موثر نہیں ہوسکتیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ذات اس اعتبار سے حقیقۃ القدرۃ اور عین قدرت کہلاتی ہے اور اس بنا پر اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے صفات حقیقت کے اعتبار سے متحد کہلاتے ہیں اور مفہوم کے لحاظ سے متغائر اور جب بنظر تحقیق دیکھا جائے تو اس بحث کی بازگشت اس امر کی طرف ہے کہ صفات کی تو ذات خدا سے نفی ہے لیکن ان صفات کے ثمرات اور نتائج تنہا ذات خدا سے حاصل ہوتے ہیں۔

چونکہ شرح مواقف کی یہ عبارت بہت سے فوائد پر مشتمل تھی اور اس میں اس نے مسلک حق کی کافی حد تک تائید کی ہے اس لئے ہم نے باوجود عبارت کے طولانی ہونے کے اسے نقل کر کے اس کا ترجمہ سپرد قلم کر دیا ہے۔

ضروریات اور مسلمات بدیہہ میں سے ہے یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ تمام بندوں کا خالق، ان کا رازق، ان کو حیات عطا کرنے والا اور موت دینے والا محی وممیت ہے اور وہ ایسا حیّ ہے کہ جس کے لئے موت ممکن نہیں۔

ارشاد امیر المومنین علیہ السلام کا صحیح معنی

امیر المومنین علیہ السلام کے اس کلام معجز نظام سے مراد اشاعرہ اور ان کی مثل دیگر فرقوں کے اوہام باطلہ کی نفی ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حیات کے ذریعہ حیّ، زندگی کے ذریعہ زندہ، علم کے ذریعہ عالم اور قدرت کے ذریعہ قادر ہے وہ صفات خداوند عالم میں سے ہر ایک صفت کے مبدأ اور مشتق منہ کو ایک امر موجود اور ذات خداوند عالم سے زائد قرار دیتے ہیں اور ان کو وہ معانی ذات خداوند عالم میں حلول کرنے والے صفات اور صفات حقیقیہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک صفت کو وہ قدیم جانتے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اشاعرہ کے اس عقیدہ کی تردید فرمائی ہے چنانچہ ان کے قول کو باطل کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ باری تعالیٰ عزاسمہ کی تصدیق اور "توحید و اخلاص" کا کمال اس کی ذات سے صفات "زائدہ برذات" کی نفی کرنا ہے اور چونکہ ایسے صفات کو صفات حقیقیہ کہتے ہیں اور عرف عام اور استعمال، شائع ومشہور کے لحاظ سے ان صفات کا اطلاق انہیں صفات زائدہ برذاتِ باری پر کیا جاتا ہے اس لئے امیر المومنین علیہ السلام نے صفات کو زائدہ برذات باری کی قید لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی لہٰذا وہ اسی مطلب کو سمجھانے کے لئے اس قید کا اضافہ کرنے سے مستغنی اور بے نیاز تھے علماء اعلام وفضلاء عالی مقام نے اپنی تحریروں میں اس مطلب کی تصریح فرمائی ہے اور یہ امر مذہب شیعہ میں ضرورۃً وبداہۃً ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے ان صفات کی نفی ہے جو زائد برذات ہیں ان صفات کی نفی نہیں کی جاسکتی جو عین ذات قرار دی جاتی ہے۔

بیان اختلاف علماء در تشخیص صفات ثبوتیہ

اگرچہ علماء کے درمیان صفات ثبوتیہ کی تشخیص میں اختلاف ہے کہ آیات صفاتِ ثبوتیہ سے مراد اعدام ثابتہ ہیں مثلاً علم سے مراد جہالت کی نفی ہے اور قدرت سے مراد عجز کی نفی اور اس کا سلب ہے یا صفات ثبوتیہ سے مراد وہ مفاہیم وجودیہ انتزاعیہ[1] ہیں جو ذات خداوند عالم کی معرفت حاصل ہونے سے سمجھ میں آئے اور اس ذات گرامی سے عقلاً منتزع

---

[1] صفات انتزاعیہ کی توضیح یہ ہے کہ صفت انتزاعیہ صفت انضمامیہ کے خلاف ہوتی ہے صفت انضمامیہ وہ ہوتی ہے جو خارج میں موصوف کے ساتھ ایسے وجود سے ہوتی ہے جو وجود موصوف سے زائد ہوتا ہے جیسے مثلاً آسود کیونکہ سواد ایک ایسی صفت ہے جو موصوف کے ساتھ خارج میں ایسے وجود سے موجود ہوتا ہے جو اس کے موصوف یعنی جسم کے وجود پر زائد ہوتا ہے اور جسم کے ساتھ وصفِ سواد منضم ہوتا ہے تو وہ اسود کہلاتا ہے اتصاف انضمامی میں دو چیزوں کا موجود ہونا ضروری ہے ورنہ انضمام صادق ہی نہیں آسکتا اس لئے ظرف اتصاف میں صفت اور موصوف دونوں اپنے اپنے مصداق اور وجود کے ذریعہ موجود ہوتے ہیں لیکن صفت انتزاعیہ اس صفت کا نام ہے جو خارج میں وجود موصوف کے علاوہ کوئی اور وجود نہیں رکھتی۔

ضروریات اور مسلمات بدیہہ میں سے ہے یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ تمام بندوں کا خالق، ان کا رازق، ان کو حیات عطا کرنے والا اور موت دینے والا محی و ممیت ہے اور وہ ایسا حیّ ہے کہ جس کے لئے موت ممکن نہیں۔

ارشاد امیر المومنین علیہ السلام کا صحیح معنی

امیر المومنین علیہ السلام کے اس کلام معجز نظام سے مراد اشاعرہ اور ان کی مثل دیگر فرقوں کے اوہام باطلہ کی نفی ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حیات کے ذریعہ حیّ، زندگی کے ذریعہ زندہ، علم کے ذریعہ عالم اور قدرت کے ذریعہ قادر ہے وہ صفات خداوند عالم میں سے ہر ایک صفت کے مبدأ اور مشتق منہ کو ایک امر موجود اور ذات خداوند عالم سے زائد قرار دیتے ہیں اور ان کو وہ معانی ذات خداوند عالم میں حلول کرنے والے صفات اور صفات حقیقیہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک صفت کو وہ قدیم جانتے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اشاعرہ کے اس عقیدہ کی تردید فرمائی ہے چنانچہ ان کے قول کو باطل کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ باری تعالیٰ عزاسمہ کی تصدیق اور "توحید و اخلاص" کا کمال اس کی ذات سے صفات "زائدہ بر ذات" کی نفی کرنا ہے اور چونکہ ایسے صفات کو صفات حقیقیہ کہتے ہیں اور عرف عام اور استعمال، شائع و مشہور کے لحاظ سے ان صفات کا اطلاق انہیں صفات زائدہ بر ذاتِ باری پر کیا جاتا ہے اس لئے امیر المومنین علیہ السلام نے صفات کو زائدہ بر ذات باری کی قید لگانے کی ضرورت نہیں سمجھی لہٰذا وہ اسی مطلب کو سمجھانے کے لئے اس قید کا اضافہ کرنے سے مستغنی اور بے نیاز تھے علماء اعلام و فضلاء عالی مقام نے اپنی تحریروں میں اس مطلب کی تصریح فرمائی ہے اور یہ امر مذہب شیعہ میں ضرورۃً و بداہۃً ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے ان صفات کی نفی ہے جو زائد بر ذات ہیں ان صفات کی نفی نہیں کی جاسکتی جو عین ذات قرار دی جاتی ہے۔

بیان اختلاف علماء در تشخیص صفات ثبوتیہ

اگر چہ علماء کے درمیان صفات ثبوتیہ کی تشخیص میں اختلاف ہے کہ آیات صفاتِ ثبوتیہ سے مراد اعدام ثابتہ ہیں مثلاً علم سے مراد جہالت کی نفی ہے اور قدرت سے مراد عجز کی نفی اور اس کا سلب ہے یا صفات ثبوتیہ سے مراد وہ مفاہیم وجودیہ انتزاعیہ [1] ہیں جو ذات خداوند عالم کی معرفت حاصل ہونے سے سمجھ میں آئے اور اس ذات گرامی سے عقلاً منتزع

---

[1] صفات انتزاعیہ کی توضیح یہ ہے کہ صفت انتزاعیہ صفت انضمامیہ کے خلاف ہوتی ہے صفت انضمامیہ وہ ہوتی ہے جو خارج میں موصوف کے ساتھ ایسے وجود سے ہوتی ہے جو وجود موصوف سے زائد ہوتا ہے جیسے مثلاً آسود کیونکہ سواد ایک ایسی صفت ہے جو موصوف کے ساتھ خارج میں ایسے وجود سے موجود ہوتا ہے جو اس کے موصوف یعنی جسم کے وجود پر زائد ہوتا ہے اور جسم کے ساتھ وصفِ سواد منضم ہوتا ہے تو وہ اسود کہلاتا ہے اتصاف انضمامی میں دو چیزوں کا موجود ہونا ضروری ہے ورنہ انضمام صادق ہی نہیں آسکتا اس لئے ظرف اتصاف میں صفت اور موصوف دونوں اپنے اپنے مصداق اور وجود کے ذریعہ موجود ہوتے ہیں لیکن صفت انتزاعیہ اس صفت کا نام ہے جو خارج میں وجود موصوف کے علاوہ کوئی اور وجود نہیں رکھتی۔

ہوتے ہیں اور خارج میں ان کا وجود بعینہٖ ذات باری کا وجود ہے جو کہ ان کے انتزاع کا منشاء ہے اور اکثر علماء کرام کے کلام سے یہی احتمال ظاہر ہوتا ہے یا ان سے مراد ایک مجہول الکنہ ذات کا اتصاف[1] ہے جس کی کنہ ذات کو سمجھنے سے کل عقول بشریہ عاجز ہیں۔

ان مدارج کی تحقیق کتاب افاداتِ حسینیہ کے سپرد کر دی گئی ہے کیونکہ اس کتاب میں ان مباحث کو اس قدر بیان کر دیا ہے کہ جو ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کافی اور وافی ہے لہٰذا جسے شوق ہو وہ اس کتاب کی طرف رجوع کرے اور امیر المومنین علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا ہے یہی ادلہ عقلیہ ونقلیہ ہر دو کا مقتضا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات زائد بر ذات سے پاک و پاکیزہ اور منزہ و مبرا ہے۔

صفات زائد بر ذات کی نفی پر دلائل عقلیہ

دلیل اوّل: یہ ہے کہ صفات زائدہ ذات خداوند عالم کے ساتھ قائم ہوں تو لازم آتا ہے کہ ذات پاک پروردگار اپنے غیر کے ذریعہ کمال حاصل کرے حالانکہ ذات خداوند عالم کامل بالذات اور مستغنی عن الاحتیاج ہے وہ ہر قسم کے افتقار و احتیاج سے پاک اور منزہ ہے اور صفات کی زیادتی، احتیاج و افتقار کو مستلزم اور موجب نقصانِ ذات ہے بخلاف اس کے کہ اس کی ذات پاک صفات حقیقیہ کے قائم مقام اور ان آثار کا مبدأ ہو کہ جو اس ذات پر مترتب ہوتے ہیں کیونکہ اس صورت میں اس کا کمال ذاتی ہوگا اور احتیاج و افتقار لازم نہیں آئے گا۔

مثلاً ممکنات اپنے علم میں صورت حاصلہ کے محتاج ہوتے ہیں کہ جو صورت معلومات غائبہ کا مبداءِ انکشاف ہے لہٰذا بندوں میں علم حقیقی صورت حاصلہ کا نام ہے اور انکشاف اس کے آثار میں سے ہے اور آدمی انکشاف کو حاصل کرنے میں

---

[1] ظرف اتصاف یعنی خارج میں موصوف اس شان سے موجود ہوتا ہے کہ اس کے ادراک سے ذہن انسان ایک صفت کا معنی سمجھتا ہے اور موصوف اس صفت کے انتزاع اور سمجھ میں آنے کا منشا ہوتا ہے جیسے مثلاً کہا جائے "السقف فوقنا" چھت ہم سے فائق اور اونچا ہے۔ اس مثال میں فوقیت کا چھت کے وجود کے علاوہ کوئی وجود نہیں۔ چھت اس کا منشاء انتزاع ہے۔ چھت کو دیکھ کر اس کے اونچا ہونے والا وصف سمجھ میں آتا ہے ایسی صفت کو صفت انتزاعیہ کہا جاتا ہے جو خارج میں خود موجود نہیں ہوتی بلکہ اس کا منشاءِ انتزاع موجود ہوتا ہے اسی منشاءِ انتزاع کا وجود ہے اس صفت کا وجود ہوتا ہے اور وہی اس کا مصداق ہوتا ہے۔

صفات خداوند عالم صفات انتزاعیہ ہیں کیونکہ خارج میں صرف ذات خداوند عالم موجود ہے جو کہ اپنے صفات کا منشاءِ انتزاع ہے ان صفات کا وجود ذات خداوند عالم موجود ہے جو کہ اپنے صفات کا منشاءِ انتزاع ہے۔ ان صفات کا وجود ذات خداوند عالم کا ہی وجود ہے اور وہی ان کا مصداق ہے۔ ذات خداوند عالم کے وجود سے زائد ان کا کوئی وجود نہیں۔ ذات پاک پروردگار سے ان صفات یعنی عالم، قادر وغیرہ کا انتزاع ہوتا ہے اور یہی معنی ہے صفات خداوند عالم کے عین ذات ہونے کا۔ خلاصہ اینکہ صفات انضمامیہ کی ذات خداوند عالم سے نفی ہے اور صفات انتزاعیہ کا اثبات ہے لہٰذا جناب امیر المومنین علیہ السلام نے جن صفات کی نفی کی ہے ان سے مراد صفات انضمامیہ ہیں جو ذات موصوف پر زائد ہوتی ہیں صفات انتزاعیہ مراد نہیں کیونکہ صفات انتزاعیہ کے اثبات پر صرف عقل دال ہے بلکہ قرآن وحدیث بھی ان صفات کے اثبات سے پر اور لبریز ہیں۔

اس صورت حاصلہ کا محتاج ہے اگر وہ صورت حاصل نہ ہو تو معلوم، انسان پر منکشف نہیں ہوگا اور ذات خداوند عالم بذات خود انکشاف اشیاء کا مبدأ ہے لہٰذا ہر شئے ازل سے اس کے لئے واضح اور ظاہر ہے اور کوئی چیز اس پر مخفی اور پوشیدہ نہیں اور علم بمعنی انکشاف و انجلاء میں وہ صورت کو واسطہ بنانے کی احتیاج نہیں رکھتا اور وہ اپنے غیر کے ذریعہ کمال حاصل کرنے کی احتیاج بھی نہیں رکھتا اور دیگر صفات میں بھی اللہ تعالیٰ کی یہی شان ہے۔

دلیل دوم: دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر صفات خداوند عالم زائد بر ذات ہوں تو وہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتے کیونکہ یا وہ غیر اللہ کی طرف محتاج ہوں گے یا نہ، شق اول کی بنا پر اللہ تعالیٰ کا اپنے غیر کی طرف محتاج ہونا لازم آتا ہے اور شق ثانی کی تقدیر پر جب کہ اپنے وجود میں اللہ جل شانہ کی طرف وہ محتاج ہوں گے تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے لئے یا فاعل بالایجاب ہوگا یا فاعل بالاختیار، شق اول کی صورت میں ذات پاک پروردگار کا نقص اور عیب لازم آتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ ہر نقص و عیب سے پاک و پاکیزہ ہے اور ان میں سے بعض کا یہ توہم فاسد و باطل ہے کہ صفت کمال کا ایجاب نقص نہیں ہوتا ہے صفت نقص کا ایجاب نقص ہوتا ہے اس توہم کے بطلان و فساد کو شارح مواقف[1] نے خود تسلیم کیا ہے۔

اور شق ثانی کی تقدیر پر صفات خداوند عالم کا حادث ہونا لازم آتا ہے اگر یہ صفات کسی چیز کی طرف محتاج نہ ہوں یعنی نہ واجب الوجود کی انہیں احتیاج ہو نہ غیر واجب کی تو پھر واجب الوجود کا تعدد لازم آتا ہے اور یہ واضح طور پر شرک ہے۔

دلیل سوم: اگر صفات خداوند عالم کو زائد بر ذات قرار دیا جائے تو تعدد قدماء لازم آتا ہے حالانکہ قدیم ہونے کی صفت اس ذات سے مختص ہے جس کے لئے عدم محال ہو جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ ازل میں صرف اللہ تعالیٰ موجود تھا اور اس کے ساتھ کوئی شئے نہیں تھی اور یہی وجہ ہے کہ نصاریٰ کو کافر قرار دیا گیا کیونکہ وہ تین خداؤں کے قائل ہیں اور جب تین قدماء کو ماننے والے کافر قرار پائے تو افسوس صد افسوس ان کے لئے جو آٹھ ایسی صفات کے قدیم ہونے کے قائل ہیں جن کو وہ ذات خداوند عالم پر زائد مانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ نفی صفات کے تمام دلائل صفات انضمامیہ

---

[1] ملاحظہ ہو شرح مواقف صفحہ: ۵۸۲ و صفحہ ۵۸۳ طبع نولکشور تحریر ہے:

لکن یتجه أن یقال تأثیره تعالی فی صفة القدرة مثلاً ان کان بقدرة و اختیار لزم محذوران، التسلسل فی صفاته وحدوثها وان کان بایجاب لزم کونه موجبا بالذات فلا یکون الایجاب نقصانا فجاز ان یتصف به بالقیاس الی بعض مصنوعاته، و دعویٰ ان ایجاب الصفات کمال و ایجاب غیرها نقصان مشکلة، لیکن جب خداوند عالم اپنی صفات کا فاعل اور موجد ہو تو یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ صفت قدرت میں مثلاً اس کی تاثیر اگر قدرت اور اختیار کے ساتھ ہو تو دو محال لازم آتے ہیں ایک اللہ تعالیٰ کی صفات میں تسلسل اور دوسرے ان صفات کا حادث ہونا" حالانکہ یہ دونوں باطل ہیں" اور اگر اس کی تاثیر بطریق ایجاب ہو تو خداوند عالم کا موجب بالذات ہونا لازم آتا ہے اور اس سے لازم آئے گا کہ ایجاب کو نقص و عیب قرار نہ دیا جائے حالانکہ ایجاب کا نقص ہونا مسلم ہے تو پھر یہ جائز ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض مصنوعات کے اعتبار سے ایجاب کے ساتھ متصف ہو اور یہ دعویٰ مشکل ہے کہ صفات کا ایک ایجاب کمال ہوتا ہے غیر صفات کا ایجاب نقص و عیب ہوتا ہے، صفت علم کے لحاظ سے بھی اسی طرح استحالات لازم آتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار ہے لہٰذا حدوث علم باری اور جہل خداوند عالم لازم آتا ہے۔

کے ساتھ مختص ہیں کہ جو ذات باری تعالیٰ کے وجود پر زائد ہوں صفات انتزاعیہ اور ان کی مانند صفات کی نفی پر یہ دلائل قائم نہیں ہو سکتے لہٰذا صفات خداوند عالم انضمامیہ نہیں انتزاعیہ ہیں جن کو عین ذات کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

نفی صفات زائدہ برذات کے دلائل نقلیہ

(۱) دلائل نقلیہ میں سے پہلی دلیل حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا خطبہ ہے جس کی ایک روایت گزر چکی ہے اور دوسری روایت یہ ہے: اَوَّلُ عِبَادَةِ اللهِ مَعْرِفَتُهُ وَ اَصْلُ مَعْرِفَتِهٖ تَوْحِيدُهُ وَ نِظَامُ تَوْحِيدِهٖ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ جَلَّ عَنْ اَنْ تَحُلَّهُ الصِّفَاتُ لِشَهَادَةِ الْعُقُولِ اَنَّ كُلَّ مَنْ حَلَّتْهُ الصِّفَاتُ مَصْنُوعٌ وَ شَهَادَةِ الْعُقُولِ اَنَّهُ جَلَّ جَلَالُهُ صَانِعٌ لَيْسَ بِمَصْنُوعٍ، یعنی اول عبادت خود اس کی معرفت ہے اور اس کو یکتا و یگانہ سمجھنا ہے اور اس کی توحید و یگانگت کا دار و مدار اور کمال اس سے صفات زائدہ برذات کی نفی کرنا ہے۔ وہ اس سے بلند و بالا ہے کہ صفات اس کی ذات میں حلول کریں اور وہ ان صفات کا محل ہو کیونکہ تمام عقلاء کی عقلیں یہ شہادت دیتی ہیں کہ جس چیز میں صفات حلول کریں وہ مصنوع اور مخلوق ہوتی ہے حالانکہ تمام عقلیں بھی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ صانع اور خالق ہے مصنوع اور مخلوق نہیں۔

یہ عبارت شریفہ جس طرح کہ صفات کی نفی پر دلالت کرتی ہے اسی طرح اس پر دلالت کرتی ہے کہ ان صفات سے مراد وہ صفات ہیں جن کی شان سے حلول کرنا ہے اور حلول ایسے اعراض کا حصہ ہے جو کہ فی الواقع موجود ہوتے ہیں اور ان کا وجود معروض کے وجود پر زائد ہوتا ہے۔ حلول ان صفات کی شان سے نہیں ہے جو کہ انضمامیہ نہیں انتزاعیہ ہوں کہ جن کا وجود بعینہٖ ان کے منشاءِ انتزاع کا وجود ہوتا ہے اور نہ ہی حلول ان صفات کی شان ہے جو کہ صفات انتزاعیہ کی مانند ہوں۔

(۲) کتاب توحید میں حسین بن خالد[۱] سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو یوں فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ ازل سے عالم، قادر، حیّ، قدیم، سمیع اور بصیر ہے۔ میں نے عرض کیا کہ فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ایک قوم ایسی موجود ہے جو کہتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے علم کے ذریعہ عالم اور قدرت کے ذریعہ قادر، حیات کے ذریعہ حیّ، قدم کے ذریعہ قدیم، سمع کے ذریعہ سمیع اور بصر کے ذریعہ بصیر ہے۔

حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص اس قول کا قائل ہوا اور اس عقیدہ کا معتقد ہوا وہ خداوند عالم کے ساتھ دیگر خدا قرار دینے والا ہے، اسے ہماری ولایت سے کوئی حصہ حاصل نہیں بلکہ حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے بذات خود عالم، قادر، سمیع اور بصیر ہے۔ یہ مشرک لوگ جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالا اور برتر ہے۔

---

[۱] حسین بن خالد کی یہ روایت الاحتجاج للطبرسی صفحہ: ۲۲۵، نیز اصول الکافی ج ۱، صفحہ: ۱۰۷ / کتاب التوحید باب آخر من باب صفات الذات حدیث ۱۔

(۳) کتاب الاحتجاج للطبرسیؒ میں محمد بن مسلم[۱] سے روایت ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے صفت قدیم کے متعلق فرمایا کہ وہ واحد و یکتا ہے وہ ہر ایک سے بے نیاز اور ہر شخص اس کا نیاز مند ہے وہ ذات بسیط رکھنے والا ہے وہ چند مختلف معانی کا مجموعہ نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میری جان حضور پہ قربان، اہل عراق کی ایک قوم کہتی ہے کہ وہ جس چیز کے ساتھ دیکھتا ہے اس کے علاوہ دوسری چیز کے ذریعہ سنتا ہے اور جس چیز کے ذریعہ سنتا ہے اس کے غیر کے ذریعہ دیکھتا ہے تو آپ نے فرمایا: یہ لوگ جھوٹے اور ملحد ہیں انہوں نے اللہ جل شانہ کو مخلوق سے مشابہت دے رکھی ہے۔ اللہ جل شانہ بایں معنی سمیع اور بصیر ہے کہ وہ جس چیز کے ذریعہ سنتا ہے اسی کے ذریعہ دیکھتا ہے اور جس چیز کے ذریعہ دیکھتا ہے اسی کے ذریعہ سنتا بھی ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے کہا کہ وہ تو کہتے ہیں کہ وہ ایسی صورت پر بصیر ہے جس کو کہ ہم اپنی عقل کے مطابق سمجھتے اور دیکھتے ہیں۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بلند و بالا ہے، ہماری سمجھ میں تو وہی آ سکتا ہے جو صفت مخلوق سے متصف ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے۔

یہ امر از خود ظاہر ہے کہ جب صفات حقیقیہ عین ذات ہوں کہ جو صفات اعتباریہ ہوں جن کا منشاءِ انتزاع نفس ذات ہو تو صادق آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اسی چیز کے ذریعہ سنتا ہے جس کے ذریعہ وہ دیکھتا بھی ہے یعنی وہ اپنی ذات ہی کے ذریعہ سنتا بھی ہے اور بذاتِ خود ہی دیکھتا بھی ہے کیونکہ اس کی ذات ہی تمام صفات کا مبداء ہے اور تعدد مفاہیم کی نفی ایسی ذات سے ہرگز مستفاد نہیں ہوسکتی اور آنحضرت علیہ السلام کے الفاظ: احدی المعنی، لیس بمعان کثیرۃ، سے مراد تعدد مفاہیم کی نفی نہیں ہے بلکہ صفات زائدہ انضمامیہ کی نفی مراد ہے اور ان صفات پر "معانی" کا اطلاق عام اور شائع ہے نیز حضرت صادق آل محمد علیہ السلام سے روایت[۲] ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی عضو، بغیر کسی آلہ کے سمیع اور بصیر ہے، وہ بذات خود سنتا بھی ہے اور بذات خود دیکھتا بھی ہے۔

ان تینوں روایات میں سے ہر ایک کے ذریعہ یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام کے کلام میں جن صفات کی نفی مقصود ہے وہ صفات حقیقۃٔ انضامیہ ہیں۔ ہر قسم کی صفات کی نفی مقصود نہیں ہے کیونکہ امیر المومنین علیہ السلام سمع بصر، قدرت اور علم کو ہمیشہ ذات خدا کے لئے ثابت فرماتے تھے اور آلات اعضاء و جوارح اور ایسے امور "یعنی ایسے صفات" کی حضرت ہمیشہ نفی کرتے تھے۔ وہ وجود ذات پر زائد وجود کے ذریعہ موجود ہوں اور اس میں شک نہیں کہ صفات زائدہ موجودہ کا خدا کی ذات کے لئے قائل ہونا تعدد قدماء کو مستلزم ہے حالانکہ یہ شرک ہے اور اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف محتاج ہونے کو مستلزم ہے لہٰذا ان صفات کی نفی لازم ہے لیکن علم اور قدرت اور ان صفات کا استحقاق اور ان کی صلاحیت کہ جو صفات انضامیہ نہیں بلکہ انتزاعیہ اور اضافیہ ہیں اور نفس ذات خدا ان کے انتزاع کا منشاء اور ان کا مبداء ہے ان صفات

---

[۱] روایت محمد مسلم کے لئے ملاحظہ ہو، الاحتجاج صفحہ: ۲:۱۷۔

[۲] اصول الکافی، ج ا، صفحہ: ۱۵۰، کتاب التوحید باب حدوث العالم المحدث حدیث: ۶۔

اور ان کے استحقاق کی نفی کسی بھی طرح نہیں کی جاسکتی ان کی نفی ضروریات دین حق کے منافی اور خلاف ہے اور اسی وجہ سے اللہ جل شانہ کی صفات ذات کو عین ذات کہتے ہیں کہ خود وہ ذات پاک بغیر کسی امر زائد کے دخیل ہونے کے اپنے ان صفات کا منشاء ہے اور خود ذات پاک ہی صفات حقیقیہ کے قائم مقام ہے اس وجہ سے اس کے صفات کو عین ذات نہیں کہتے کہ اس کی صفات کے مفاہیم میں اختلاف نہیں کیونکہ مفاہیم کا اختلاف تو ایسے یقینی ہے کہ بدیہیات اولیہ میں سے ہیں یہی وجہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ بے شک اللہ جل شانہ ایسا عالم ہے کہ جس میں جہالت کو کوئی راہ نہیں مل سکتی اور وہ ایسی زندگی ہے کہ جس میں موت کا امکان نہیں اور ایسا نور ہے جس میں تاریکی کا کوئی نام و نشان نہیں یعنی اس کا وجود پاک بذات خود ظاہر ہے اور دیگر تمام اشیاء کے وجود کا باعث ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے اس مسئلہ کی توضیح کے لئے تمثیل کے طور پر کہا ہے کہ دیگر ہر شئے اپنے روشن ہونے میں روشنی کی محتاج ہے لیکن خود روشنی اپنے روشن ہونے میں کسی دوسری روشنی کی محتاج نہیں بلکہ وہ بذات خود روشن ہے مثلاً انسان اس وقت تک روشن نہیں ہوسکتا جب تک کہ روشنی اس کے ساتھ اتصال پذیر نہ ہو نیز انسان جب تک قوت نہ رکھتا ہو، پتھر وغیرہ کسی چیز کو اٹھا نہیں سکتا کیونکہ روشنی اور قوت انسان کے جسم کے علاوہ ایک چیز ہے اگر انسان بیمار ہوجائے اور طاقت اس کی زائل ہوجائے تو پتھر وغیرہ کو اگر اٹھانا چاہے اٹھا نہیں سکتا۔ علیٰ ہذا القیاس روشنی کو اگر اپنے ساتھ نہ رکھے کسی چیز کو روشن نہیں کرسکتا لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اس طرح نہیں کہ وہ روشنی اور قوت کی محتاج ہو بلکہ قوت وقدرت اور نورانیت اس کی عین ذات ہے، کبھی اس سے جدا نہیں ہوسکتی۔ اسی باب سے ہے وہ ارشاد پاک جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ ازل سے ہمارے رب کی یہ شان ہے کہ علم اس وقت بھی اس کی عین ذات تھی جب کہ اس کی ذات کے علاوہ کوئی معلوم موجود نہ تھا اور سمع اس وقت بھی اس کے لئے عین ذات تھی جب کہ کوئی مسموع موجود متحقق نہ تھا اور بصر اس وقت بھی اس کے عین ذات تھی جب کہ کوئی مبصور نہ تھا اور قدرت اس وقت بھی اس کی عین ذات تھی جب کہ کوئی مقدور نہ تھا۔

اس قسم کی عبارتیں کلام حکماء اور محاورات عقلاء میں بکثرت موجود ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ صورت جسمیہ بذات خود اتصال پذیر ہے بلکہ عین اتصال ہے اور ہیولی عین قوت اور نفس استعداد ہے لہٰذا جن لوگوں نے امیر المومنین علیہ السلام کے ارشاد پاک: "كَمَالُ الْإِخْلَاصِ لَهُ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ" سے اختلاف معانی ومفاہیم کی نفی سمجھی ہے یہ ان کی جہالت کا باعث ہے اور ائمہ أنام اور علماء اعلام کے کلام عالی مقام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا کس قدر تعجب اس قوم سے کہ بات تک سمجھنے کی ان میں صلاحیت نہیں ہے۔

ابتداء کلام برائے ازالہ اوہام

اور ان لوگوں کا تو ہم فاسد اور باطل ہے جنہوں نے یہ وہم کیا ہے کہ اگر مفاہیم مختلفہ کو ذات باری عزاسمہ سے منتزع قرار دیا جائے تو ذات باری کا مرکب ہونا لازم آتا ہے اور ان کے وہم کے بطلان وفساد کی وجہ یہ ہے کہ اضافات اور

انتزاعیات ذاتی باری تعالیٰ کی حقیقت سے خارج ہیں لہٰذا مفہوم کے لحاظ سے ان کا متعدد ہونا یہ حقیقت خداوند عالم میں داخل نہیں اس لئے یہ تعدد ترکیب کو ہرگز مستلزم نہیں ہوسکتا اور امیر المومنین علیہ السلام کا یہ جملہ: **من و صفه فقد قرنه الخ** کہ جس نے خداوند عالم کو صفات انضامیہ سے متصف کیا اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ غیر خدا کو ملایا اور جس نے دو کے مجموعے کو خدا مانا اس نے خدا کو اجزاء والا اور مرکب تسلیم کرلیا اور جس نے اجزاء والا مانا وہ جہالت کا شکار ہو گیا اور معرفت سے خالی رہا۔

اور ساتھ اس جملے کے امیر المومنین علیہ السلام کا فقرہ: **لشهادة كل صفة الخ** کہ ہر صفت انضامیہ گواہی دیتی ہے کہ وہ موصوف کا غیر ہے اور ہر موصوف گواہی دیتا ہے کہ وہ صفت انضامیہ کا غیر ہے یہ دونوں جملے صراحۃً اس مطلب کو واضح کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک میں ترکیب ممکن نہیں بلکہ ترکیب اس اعتبار سے لازم آتی ہے کہ ذات خداوند عالم کو وصف انضامی سے متصف قرار دیا جائے حالانکہ وہ اس ترکیب سے پاک و پاکیزہ اور منزہ و مبرا ہے ورنہ تو صرف صفت قدیم کے باعث کہ جو خداوند عالم کی صفت مختصہ ہے خداوند عالم کی ترکیب اور اشتراک و قابل تجزیہ ہونا لازم آجائے گا۔

دوسری وجہ سے توضیح

اللہ کہ جو معبود حقیقی ہے وہ ایسی ذات پاک ہے جو کہ جامع جمیع کمالات و مجمع جمیع صفات ہے اور اس کے یہ صفات و کمالات صفات حقیقیہ انضامیہ نہیں ہیں بلکہ وہ صفات انتزاعیہ ہیں کیونکہ اگر صفات حقیقیہ ہوں تو ان کا ذات پاک پروردگار سے منضم اور مقترن ہونا یعنی اس کا ان سے متصف ہونا ہی معبود حقیقی کے مرکب ہونے کو مستلزم ہوگا حالانکہ اس کی ذات پاک ترکیب کے نقص سے پاک ہے۔ رہا اعتبارات اور اضافات کا تعدد تو وہ ایسا واضح امر ہے کہ اس کا انکار بدیہیات اوّلیہ کا انکار ہے اور فلاسفہ نے اپنے اس مزعومہ مخصوصہ[1] **الواحد لا يصدر عنه الا الواحد** کے تحت جو زعم باطل قائم کیا ہے کہ تعدد اعتبارات ذات باری کے لئے درست نہیں ہوسکتا محقق طوسی علیہ الرحمہ نے اس کے متعلق فصول میں تصریح فرمائی ہے کہ فلاسفہ کی تقریر بالخصوص اس مزعومہ میں ظاہری طور پر ناقص اور کمزور ہے اور ایسا کیونکر نہ ہو جبکہ مسبوق بالعدم نہ ہونے کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کو قدیم کہتے ہیں اور تمام اشیاء کے اس کے ہاں منکشف ہونے اور کسی چیز کے مخفی نہ ہونے کے اعتبار سے اسے عالم اور قدرت و توانائی رکھنے کے اعتبار سے قادر کہتے ہیں۔

اور یہ سب کچھ اس سے واضح اور روشن ہے کہ وہ خود اثبات علم میں کہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ عالم نہ ہو تو العیاذ باللہ جاہل ہوگا اور اثبات قدرت کے سلسلہ میں کہتے ہیں اگر قادر نہ ہو تو عاجز ہوگا اور اثبات قِدَم کے لئے کہتے ہیں کہ اگر قدیم نہ ہو

---

[1] ایک چیز سے ایک ہی شئ صادر ہوسکتی ہے اور فلاسفہ کا یہ ایک بنیادی غلط نظریہ ہے جو دیگران کے بہت سے نظریات کے غلط ہو جانے کا باعث ہے۔

تو حادث ہوگا اور ان صفات میں سے ہر ایک کا مفہوم دوسرے سے جداگانہ ہے تو پھر ان کے یہ سب اقوال کس طرح صحیح قرار دیئے جاسکتے ہیں لہٰذا اس قاعدے کے مطابق کہ ہر شئے اپنی ضد کے ذریعہ پہچانی جاتی ہے ان مفہومات کا متعدد ہونا واضح ہے اور ان سب کی نفی ذات پاک پروردگار کے محض معطل ہو جانے اور تمام صفات کے ابطال کا باعث ہے حالانکہ محال ہے لہٰذا جس شخص نے حملی اولی اور اتحادِ مفہوم کا ادعاء کیا ہے اس کا دعویٰ ظاہری طور پر باطل ہے۔

صفات سلبیہ میں سے تیسری صفت، "نفی ترکیب"

تیسری صفت سلبیہ نفی ترکیب ہے اور جسمیت اور صورت اس کے افراد میں سے فرد اطہر ہے لہٰذا نفی ترکیب نفی جسمیت وصورت کو مستلزم ہے واضح باد کہ ترکیب چند قسموں پر متصور ہوسکتی ہے۔ قسم اوّل ان اجزاء سے مرکب ہونا جو کہ خارج میں موجود ہوں جیسے کہ مثلاً تخت یا پلنگ اجزاء چوبی اور ہیئات خاصہ سے مرکب ہوتا ہے اور جسم انسان اور حیوان اجزاء ظاہرہ اعضاء و جوارح یعنی سر، گردن، پاؤں، گوشت، پوست اور ہڈی سے، اور اجزاء غیر ظاہرہ جیسے اربعہ عناصر مٹی، ہوا، پانی اور آگ سے، اور بنا بر فلاسفہ کے قول مشہور کے ہیولی، صورت جسمیہ اور صورت نوعیہ سے مرکب ہے۔

ترکیب کی دوسری قسم: اجزاء وہمیہ تخلیہ سے مرکب ہونا ہے کہ جو ایک ایسی شئے کو فرض کرنے پر مبنی ہے جو اس قسم کے توہم کی صلاحیت رکھتی ہو یعنی وہ انتزاع صحیح کا منشاء بن سکتی ہو مثلاً جسم اور خط ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک متصل واحد ہے لیکن قوت واہمہ ان کے اجزاء میں سے بعض خاص کو دوسرے اجزاء سے تمیز دے سکتی ہے اور یہ اجزاء اگرچہ بالفعل نہیں بالقوۃ موجود ہیں لیکن قوت سے فعلیت کی طرف ان کا منتقل ہونا ان کی ذات کے پیش نظر ممکن ہے۔

ترکیب کی تیسری قسم: اجزاء عقلیہ سے مرکب ہونا ہے اور اس کی دو نوعیں ہیں۔ نوعِ اول یہ ہے کہ حکم عقل کے ذریعہ اجزا قرار دیئے جائیں اور تقسیم وہمیہ اور اس معنی میں تقسیم عقلیہ کے درمیان خارج میں فرق یہی ہے کہ پہلی تقسیم یعنی وہمیہ جزئیہ ہوتی ہے کیونکہ قوت وہم کا کام ہی معانی جزئیہ کا تصور کرنا ہے اور دوسری تقسیم کلیہ ہوتی ہے کیونکہ عقل کلیات کا ادراک کرتی ہے لہٰذا اگر یہ حکم لگایا جائے کہ فلاں جسم معین اس نصف معین اور اس نصف سے مرکب ہے تو تقسیم وہمیہ ہوگی اور اگر یہ حکم لگایا جائے کہ ہر جسم دو نصفوں سے مرکب ہوتا ہے تو یہ تقسیم فرضیہ عقلیہ ہوگی۔

اجزاء عقلیہ سے جو مرکب ہوتا ہے اس کی دوسری نوع اجزاء ذہنیہ سے مرکب ہونا ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ نفس ذات سے عقل کی مدد سے چند مفاہیم انتزاع کریں اور ان کے منشاء انتزاع کو ان مفاہیم سے مرکب قرار دیں مثلاً جنس اور فصل کے مفاہیم ہیں کہ نوع کو ان سے مرکب کہتے ہیں۔

ترکیب پہلی تینوں قسموں کے لحاظ سے تمام اہل مذاہب کے ہاں متفقہ طور پر ذات باری تعالیٰ کے لئے ممکن نہیں ہوسکتی سوائے ان لوگوں کے جو ذات پاک پروردگار کی جسمیت کے قائل ہیں یا دوسرے بعض لوگ جو ان ہی کے نقش قدم

پر چلتے ہیں عنقریب نفی جسمیت کے بیان میں ان لوگوں کے عقیدہ کی تفصیل آجائے گی لہٰذا اللہ تعالیٰ ایسا مرکب نہیں ہے کہ جو اجزاء خارجیہ یا وہمیہ یا عقلیہ رکھتا ہو کیونکہ یہ نقل وعقل کے ذریعہ ثابت ہے۔

نفی ترکیب پر دلائل عقلیہ

دلیل اول: اینکہ اگر معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ مرکب ہوتو اجزاء کی طرف محتاج ہوگا اور ظاہر ہے کہ کل و جزء باہم متغائر ہوتے ہیں اور کل کا متحقق ہونا تمام اجزاء کے تحقق کی فرع ہے اور جو چیز اپنے موجود ہونے میں غیر کی محتاج ہو وہ یقیناً ممکن ہوتی ہے لہٰذا اگر ممکن ہوتو اجزاء کی طرف محتاج ہوگا لہٰذا واجب الوجود نہیں ممکن الوجود ہوگا اور ہر ممکن علت کی طرف محتاج ہوتا ہے اور یہ امر مرتبہ وجوب وجود کے منافی ہے۔

دلیل دوم: اگر اجزاء رکھتا ہوتو ان اجزاء میں سے ہر ایک یا ممکن ہوگا یا واجب، اگر سارے کے سارے اجزاء واجب ہوں تو تعدد وجباء لازم آئے گا جو کہ حتماً باطل ہے اور اگر سب کے سب ممکن ہوں تو ان اجزاء کے مجموعہ کا امکان لازم آئے گا اور یہ بھی باطل ہے۔

نفی ترکیب کے دلائل نقلیہ

۱۔ دلائل نقلیہ بکثرت نصوص ہیں جن کے منجملہ امیر المومنین علیہ السلام کا گذشتہ ایک ارشاد ہے: **من جزأه فقد جهله** کہ جس نے اللہ تعالیٰ کو اجزاء سے مرکب قرار دیا وہ اس کی ذات والا صفات کی معرفت سے بے بہرہ اور جاہل رہا۔

۲۔ انہی نصوص میں سے امیر المومنین علیہ السلام ہی کا فرمان ہے کہ وہ احدی المعنی ہے۔ اس کا بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات منقسم نہیں ہوسکتی نہ وجود میں، نہ عقل میں اور نہ ہی وہم میں بے شک ہمارے پروردگار کی یہی شان ہے۔

۳۔ نیز حضرت صادق آل محمد علیہم السلام کا ارشاد[1] ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کل ذات کے ذریعہ سمیع ہے لیکن نہ بایں معنی کہ اللہ تعالیٰ کی کل ذات اجزاء رکھنے والی ہے جس طرح کہ بعض اوقات اکبر کو اصغر کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور بعض اوقات اکبر اسے کہا جاتا ہے جس سے کوئی بڑا نہ ہو۔ اس طرح کل بعض اوقات جزء کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور بعض اوقات کل کا اطلاق ایسی ذات پر ہوتا ہے جو کہ بایں ہمہ معنی مجرد ہو کہ کوئی امر خارج اس کے ساتھ منضم نہ ہوا۔

۴۔ انہی نصوص میں حضرت جواد علیہ السلام کا ارشاد پاک ہے: "اور وہ ذات پاک ہے کہ اختلاف اور ترکیب ائتلاف اس کی شان کے لائق نہیں سوائے اس کے نہیں کہ مختلف اور متفق وہ چیز ہوسکتی ہے جو اجزاء رکھنے والی ہو اور اس ذات پاک کے حق میں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ قلیل ہے یا کثیر وہ ذات پاک قدیم بالذات ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر

---

[1] اصول الکافی ج۱، صفحہ: ۱۸۰، کتاب التوحید باب طلاق القول حدیث: ۲۔

شئے اجزاء رکھنے والی ہے اور تقسیم قبول کرنے والی ہے اور ذات خداوند عالم بسیط اور یکتا ہے، وہ متجزی نہیں ہوسکتا اس کی ذات کے متعلق قلت و کثرت کا وہم نہیں کیا جاسکتا اور ہر وہ شئے جو اس طرح قلیل و کثیر ہوسکتی ہے وہ مخلوق ہے خالق نہیں وہ خالق کی طرف احتیاج رکھنے والی ہے، الی غیر ذلک من الادلۃ۔

اللہ تعالیٰ کے متعلق اجزاء عقلیہ اصطلاحیہ کی بحث

اللہ تعالیٰ کے متعلق ان اجزاء عقلیہ ثانویہ کی نفی اور اثبات میں متکلمین کے مابین اختلاف ہے جن کو ذاتیات اور اجزاء ذہنیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اکثر متکلمین اس خیال کے باعث ان کی نفی کرتے ہیں کہ اجزاء ذہنیہ اجزاء خارجیہ کو مستلزم ہوتے ہیں اور اس تصور پر ان کا منتفی ہونا ان دلائل کے باعث واضح ہے جن کا بیان گزر چکا ہے اور کچھ متکلمین ان اجزاء کو ممکن اور جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ امر یقینی نہیں کہ اجزاء ذہنیہ اجزاء خارجیہ کو مستلزم ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اجزاء ذہنیہ جن پر حکماء کی اصطلاح قائم ہوئی ہے وہ نہ اجزاء حقیقیہ ہیں اور نہ اجزاء حقیقیہ کو مستلزم، اس لئے محل بحث ان کے اجزاء ہونے کی نفی ہے لہٰذا یہ لوگ خداوند عالم کی ترکیب کی نفی اجزاء اصطلاحیہ کے اجزاء ہونے کی نفی کے ذریعہ کرتے ہیں ان کا یہ مقصد نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے اثبات اجزاء کرتے ہیں، تعالی اللہ من ذلك علوا كبيرا، باوجودیکہ عرضیات اور ذاتیات میں تمیز مشکل ہے جیسے کہ بڑے بڑے علماء نے خود اعتراف کیا ہے اور اس امر کے لئے ان کا مضبوط ضابطہ نہیں ہے جس پر بھروسہ کیا جاسکے۔

بہر حال جو صورت بھی ہو ذات باری تعالیٰ سے مفاہیم متعدد کے منتزع ہونے کے استحالہ کی مطلقاً نفی اگر چہ بذریعہ اضافات ہی ہو محل انکار نہیں کیونکہ اس کی ذات واحدہ بسیط سے مفاہیم متعددہ کا انتزاع، اس تقدیر پر بھی تمام اہل عقل کے ہاں مسلمات میں سے ہے جبکہ کسی اعتبار سے اس کی ذات پاک میں ترکیب کا شائبہ تک نہ ہو کیونکہ وجوب، وجود، قدم اور امتناع عدم نفس ذات باری منتزع ہوتے ہیں بنا بر مذہب حق امامیہ بلکہ نزد محققین حکماء بھی تمام صفات ثبوتیہ اس کی ذات پاک سے منتزع ہوتے ہیں جیسا کہ آپ جان چکے ہیں کہ ان کا منشاء انتزاع نفس ذات باری ہے اور ان کو اجزاء واجب نہیں کہا جاسکتا ایسے مفہومات کا تعدد مستلزم ترکیب نہیں ہوسکتا بلکہ ان کا منشاء ذات حق تعالیٰ ہے کہ جو بسیط مطلق ہے اور وجود اور اس کا تشخص عین ذات پاک ہے لہٰذا وہ پاک پروردگار حقیقت نہیں رکھتا چہ جائیکہ اس کے اجزاء حقیقیہ ہوں اور اس قسم کے مفہومات انتزاعیہ کی نفی علماء اعلام میں سے کسی کے کلام سے مستفاد نہیں ہوتی۔

ہاں فلاسفہ اپنے قول فاسدہ "ان الواحد لا يصدر عنه الا الواحد" میں اس مبالغہ کے مرتکب ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سوائے ایک چیز کے دیگر کسی چیز کا مصدر نہیں ہوسکتا کیونکہ ان کا خیال یہ ہے کہ اگر وہ ذات پاک دو چیزوں کا مصدر ہو تو ایک چیز کا مصدر ہونا دوسری چیز کے مصدر ہونے کے متغائر ہوگا لہٰذا اس ذات پاک کے لئے جہات کا تعدد لازم آئے گا جو تعدد اجزاء کا باعث ہوگا اور فلاسفہ کے اس خیال خام کا فساد اور بطلان ایک ناقد بصیر پر مخفی اور پوشیدہ

نہیں ہے۔ محقق علیہ الرحمۃ نے فصول میں فرمایا ہے کہ اس دعویٰ پر فلاسفہ کا ہر شبہ انتہائی رکیک اور ناقص ہے اور محقق نے جو کچھ افادہ فرمایا وہ واضح ہے مستور نہیں لیکن جسے اللہ تعالیٰ نے نور عطا نہ کیا ہو بے شک وہ نور سے خالی ہوتا ہے۔

صفات سلبیہ میں سے چوتھی صفت

"جسمیت اور صورت کی نفی"

چوتھی صفت سلبیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم اور صورت سے پاک اور جوہر وعرض ہونے سے مبرا و منزہ ہے کیونکہ جسم اس جوہر کا نام ہے جو طول وعرض اور عمق رکھتا ہو اور صورت ایک عرض خاص یعنی شکل محدود کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ان دونوں سے پاک و پاکیزہ ہے۔

جوہر وعرض دونوں ممکن الوجود کی اقسام میں سے ہیں لہٰذا جوہر اس ماہیت اور حقیقت کلیہ رکھنے والی ممکن شئے کا نام ہے جو بذات خود قائم ہو اور اللہ جل شانہ ممکن نہیں ہے، واجب الوجود ہے لہٰذا وہ ذات اقدس نہ جوہر ہو سکتا ہے اور نہ عرض۔

اگر جوہر کے معنی میں امکان اور حقیقت کلیہ کی قید کو ماخوذ نہ کریں جیسا کہ مشہور ہے کہ کہتے ہیں کہ جوہر اس موجود کا نام ہے جو بذات خود قائم ہو تو پھر معنوی حیثیت سے تو ذات پاک پروردگار پر جوہر کا اطلاق صحیح ہوگا لیکن شرعی حیثیت سے جوہر کا اطلاق خداوند عالم پر مناسب نہ ہوگا کیونکہ اسماء الٰہیہ توقیفیہ ہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو الفاظ اس ذات کردگار کے لئے منقول نہ ہوئے ہوں ان کا اطلاق اس ذات پر اس کی شان میں درست نہیں۔

اگرچہ سابق مسئلہ سے یہ واضح ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جسم کا ہونا بھی باطل ہے اور صورت کا ہونا بھی باطل، نہ اس کے لئے جسم ممکن ہے نہ صورت لیکن باطل فرقوں کی تردید کہ مؤکد کرنے اور ان کی تشنیع کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ وہ جسم وصورت سے پاک و پاکیزہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ جسمیت وصورت کی نفی بالخصوص قرآن کریم میں وارد ہے چنانچہ ارشاد پروردگار ہے "لیس کمثلہ شیء" کہ اس کی مثل کوئی شئے نہیں کیونکہ اگر وہ جسم رکھتا ہو تو پھر تمام اجسام جسم ہونے میں اس کی مثل ہو جائیں گے اور اگر صورت رکھتا ہو تو پھر تمام اجسام صورت والا ہونے میں اس کی مثل قرار پائیں گے تو پھر العیاذ باللہ "لیس کمثلہ شیء" کا جملہ اس کی شان میں صحیح نہ ہوگا مع اس کے دوسرا استحالہ یہ لازم آتا ہے کہ صورت اجسام کے عوارض مختصہ میں سے ہے کہ جو مستلزم ترکیب ہے، وتعالی اللہ من ذلک علوا کبیرا۔

حدیث پاک خبر سید عبد العظیم حسنی میں وارد ہوا ہے کہ وہ ذات نہ جسم ہے نہ صورت، نہ عرض ہے نہ جوہر بلکہ وہ تمام جسموں کا بنانے والا اور ساری صورتوں کو صورت بنانے والا ہے۔ وہ تمام جواہر و اعراض کا خالق ہے۔ سید موصوف نے فرمایا کہ میں نے اپنے اعتقادات کو حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا اور انہوں نے ان کو پسند فرمایا۔

کافی شریف[۱] میں حضرت محمد بن یعقوب کلینیؒ نے اپنے اسناد کے ذریعہ حمزہ بن محمد سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت ابوالحسن امام علی نقی علیہ السلام کی خدمت میں لکھ کر جسم اور صورت کے متعلق سوال کیا تو حضرت نے لکھا کہ پاک ہے وہ ذات کہ جس کی مثل کوئی شئے نہیں اور نہ ہی وہ جسم رکھتا ہے نہ صورت۔ نیز اصول کافی[۲] میں ہی محمد بن حکیم سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابوابراہیم حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں ہشام ابن سالم جوالیقی کے اس قول کو بیان کیا کہ خداوند عالم جسم رکھتا ہے تو حضرت نے جواباً ارشاد فرمایا کہ بے شک اللہ تعالی کی مثل کوئی شئے نہیں اور اس شخص کے قول سے زیادہ فحش اور قبیح امر کیا ہے جو تمام اشیاء کے خالق کو جسم وصورت سے متصف کرے یا اس کے لئے خلقت یا حد بندی یا صورت یا کوئی عضو قرار دے، تعالی اللہ عن ذلك علوا کبیرا، وہ ذات پروردگار ان تمام چیزوں سے انتہائی طور پر پاک و پاکیزہ ہے۔ نیز صاحب کافی[۳] حضرت محمد ابن یعقوب کلینیؒ نے اپنے اسناد کے ساتھ محمد بن فرخ سے روایت کی ہے کہ میں نے حضرت ابوالحسن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی خدمت میں لکھ کر ہشام ابن حکیم اور ہشام بن سالم کے اس قول کے متعلق سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ جسم اور صورت رکھتا ہے تو حضرت نے جواباً تحریر کیا کہ حیرتِ متحیرین کو اپنے سے دور کیجئے اور شر شیطان سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اور حفاظت طلب کیجئے۔ مسئلہ اس طرح نہیں ہے جس طرح ہر دو ہشامین سمجھے ہیں یا حضرت کے کلام کا معنی یہ ہے کہ ہر دو ہشامین کا قول نہیں ہے۔ تقدیر اول کی بنا پر امام علیہ السلام کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے ہشامین کا یہ اعتقاد تھا کہ اللہ تعالیٰ جسم وصورت رکھتا ہے کیونکہ امام عالی مقام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہونے سے قبل ان کے اعتقادات فاسد تھے اور ائمہ علیہم السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کی برکت سے ان کے یہ تمام نقائص دور ہو گئے۔ اور دوسری تقدیر کی بنا پر اس روایت کے ذریعہ ہر دو ہشامین کی برأت حاصل ہوتی ہے لہٰذا احتمال ہوسکتا ہے کہ مخالفین مذہب حق نے بغض وعناد کے باعث ہشامین کے متعلق اس قول باطل کے قائل ہونے کو ہوا دی اور مشہور کیا ہو کیونکہ ہشامین میں سے ہر ایک کی جلالت قدر اس سے بلند تر ہے کہ وہ اس قسم کے باطل اقوال کے قائل ہوجائیں۔

جناب والد ماجد طاب ثراہ نے اپنی کتاب صوارم میں ارشاد فرمایا کہ شہرستانی باوجودیکہ اہلسنت کے فضلاء میں سے ہے، ہشام کی برأت کے متعلق کہتا ہے کہ یہ ہشام بن حکم وہ شخصیت ہے جو اصول عقائد میں گہرائی تک پہنچنے والے ہیں لہٰذا یہ ہرگز ممکن نہیں کہ جو الزامات معتزلہ پر قائم ہوتے ہیں ان سے وہ غافل ہو کیونکہ ایک شخص جس الزام کو اپنے خصم پر عائد کرتا ہے ان سے وہ خود یقیناً بیزار ہوتا ہے اور جو امر خالق کو مخلوق سے مشابہت رکھنے کو ظاہر کرے اس سے ہشام حتماً بری اور بیزار ہے۔ الی آخر قال الشهرستانی۔

---

[۱] اصول کافی، کتاب التوحید، باب ا، نہی عن الجسم والصورۃ، حدیث ۲، ج ا، صفحہ: ۱۹۰۔

[۲] اصول الکافی، کتاب التوحید، باب النہی عن الجسم والصورۃ، حدیث: ۴، ومرسل محمد بن ابی عبداللہ، ج ا، صفحہ: ۱۹۱۔

[۳] اصول الکافی، کتاب التوحید، باب النہی عن الجسم والصورۃ، حدیث: ۴، ومرسل محمد بن ابی عبداللہ، ج ا، صفحہ: ۱۹۱۔

اللہ تعالیٰ کے جسم وصورت سے پاک و پاکیزہ اور منزہ ومبرٰی ہونے کے متعلق اس قسم کی بکثرت احادیث وارد ہوئی ہیں کہ جن کا احصاء واستقصاء باعث تطویل ہے یہ مسئلہ اس طور پر ضروریات دین و مذہب میں سے ہے کہ وہ شخص بھی جانتا اور اس سے واقف ہے جو مذہب حق کی ادنیٰ معرفت رکھنے والا ہے اور طریقہ حق سے تھوڑی سی شناسائی رکھنے والا ہے وہ بھی جانتا ہے کہ اس مطلب کا انکار اصل شریعت اور مذہب سے انکار کو مستلزم ہے اور اس عقیدہ کا شریعت میں ثابت ہونا بداہۃً اس پر واضح اور عیاں ہے۔

ان کا ایک گروہ جو کہ اس امت میں مخلوق کے ساتھ خالق کے مشابہہ ہونے کے قائل ہیں وہ خداوند عالم کا جسم ہونے کے قائل ہیں اور اس مقام پر وہ کئی ایک خرافات کے قائل ہوئے ہیں چونکہ ان کے مزید منخرفات میں سے بعض کا تذکرہ ان کی حماقت اور سفاہت کی مزید وضاحت اور ظہور کا باعث ہے لہٰذا اگر ان کا ایک حصہ بیان کر دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہوگا، لہٰذا واضح باد کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ:۔

"اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہے اور اس کا جسم اس کے اپنے ہاتھ کی بالشت کے لحاظ سے چھ چھ بالشت عرش کے چاروں طرف سے اس طرح زیادہ رہتا ہے کہ عرش پر بیٹھنے کے وقت اس کا جسم عرش کے چاروں طرف چھ چھ بالشت عرش سے باہر بڑھا رہتا ہے اور شب جمعہ گدھے پر سوار ہو کر نازل ہوتا ہے اور صبح تک ندا کرتا رہتا ہے کہ میرے بندوں میں سے کوئی ہے جو توبہ کرے اور گناہوں سے استغفار وزاری کرے تاکہ میں اس کی توبہ کو قبول کروں"۔

بعض ان میں سے کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جو طوفان آیا تھا اس وقت اللہ تعالیٰ اس قدر رویا کہ اس کی دونوں آنکھیں آشوب زدہ ہوگئیں اور ملائکہ اس کی بیمار پرسی کے لئے حاضر ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ خداوند عالم ایک کبیر السن انسان کی صورت میں ہے اس کے سفید بال سیاہ بالوں کے ساتھ سر میں بھی اور داڑھی میں بھی باہم مخلوط ہیں ان کے اس قسم کے خرافات بکثرت ہیں سب کا ذکر باعث تطویل واملال ہے۔ یہ اقوال ان میں سے حنابلہ کے مریدوں، مجسمہ اور مشبہہ کے ہیں، تعجب ہے کہ وہ اپنے خانگی امور کی طرف نگاہ نہیں کرتے۔ اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتے اور ہشامین پر طعن وتشنیع کرتے ہیں حالانکہ ہشامین کی طرف جو اقوال منسوب کئے گئے ہیں ان کے متعلق ان کا قائل ہونا ثابت نہیں ہے اور اگر ہو بھی، تاہم ان دونوں کا ان اقوال سے بری ہونا یقینی ہے جیسا کہ آپ جان چکے ہیں۔

لیکن برادران اپنے اہل مذہب کے ان فرقوں کی برأت ہرگز نہیں کر سکتے کیونکہ ان فرقوں کے یہ اقوال انتہائی طور پر مشہور ہو چکے ہیں بلکہ بقیہ برادران کہ جو اپنے آپ کو ان فاسد اعتقادات سے بری جانتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کی جسمیت سے اپنی برأت کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتے کیونکہ وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے دکھائی دینے اور اس قسم کے دوسرے اعتقادات فاسدہ کے قائل ہیں اگرچہ کہ ظاہراً اعتقادات مذکور بالا سے انکار کرتے ہیں۔

ان کا فرقہ مشبہہ: کہ جو خالق کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتا ہے وہ آیات متشابہات اور اپنی روایات مختلفہ کے ذریعہ اپنے

اس اعتقاد باطل کی بنیادوں کو محکم کرتا ہے لہٰذا ان کو جسمیت سے برأت کا خیال امر محال ہے۔

ببین تفاوت راه از کجا است تا بکجا

مشبہہ کے استدلال کا بطلان اور فساد ایک عاقل خبیر پر واضح اور ظاہر ہے احتجاج طبرسی[1] میں ابراہیم بن ابی محمود سے روایت ہے کہ میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! حضور اس روایت کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں جو لوگ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ روزانہ شب کے آخری تہائی حصہ میں آسمان سے دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے تو حضرت علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ خدا لعنت کرے ان لوگوں پر جنہوں نے روایت کو محرّف اور متغیر کر دیا۔ بخدا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح ہرگز نہیں فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو یوں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ روزانہ شب کے آخری تہائی حصہ میں اور شب جمعہ کو اول شب سے آسمان کی طرف ایک فرشتہ نازل کرتا ہے اور اس فرشتے کو اللہ تعالیٰ ندا دینے پر مامور کرتا ہے جو اللہ کی طرف سے ندا کرتا رہتا ہے کہ آیا کوئی سوال کنندہ ہے جسے میں عطا کروں؟ آیا کوئی توبہ کنندہ ہے کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ آیا کوئی طلب مغفرت کرنے والا ہے کہ میں اسے مغفرت عطا کروں؟ اے خیر کے طلب کرنے والے آگے آیئے اور متوجہ ہو جایئے، اے طالب شر اپنے ارادہ کو ترک کر دیجئے۔ یہ فرشتہ صبح تک ندا کرتا رہتا ہے جب صبح ہو جاتی ہے تو وہ ملکوت سماوات کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔

حسین بن خالد[2] نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے ہی روایت کی ہے کہ میں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: آپ اس روایت کے متعلق کیا ارشاد فرماتے ہیں جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا، تو حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کو تباہ کرے کہ

---

[1] متن روایت کے الفاظ یہ ہیں ملاحظہ ہو: الاحتجاج للطبرسی، ص:۲۲۵، طبع قدیم بیان احتجاجات الامام علی بن موسی الرضا علیه الصلوٰة والسلام عن إبراهيم بن أبي محمود قال قلت للرضا(ع): يا ابن رسول الله ما تقول في الحديث الذي يرويه الناس عن رسول الله (ص) أن الله تبارك و تعالى ينزل كل ليلة إلى السماء الدنيا فقال (ع) لعن الله المحرّفين الكلم عن مواضعه. و الله ما قال (ع) كذلك إنما قال (ع) إن الله تبارك و تعالى ينزل ملكا إلى السماء كل ليلة في الثلث الأخير و ليلة الجمعة في أول الليل فيأمره فينادي هل من سائل فأعطيه هل من تائب فأتوب عليه هل من مستغفر فأغفر له يا طالب الخير فأقبل يا طالب الشر أقصر فلا يزال ينادي بهذا حتى يطلع الفجر فإذا طلع الفجر عاد إلى محله من ملكوت السماء حدثني بذلك أبي عن جدي عن آبائه عن رسول الله (ص).

[2] متن روایت کے الفاظ حسب ذیل ہیں، ملاحظہ ہو الاحتجاج للطبرسی، ص: ۲۲۵، طبع قدیم و عن الحسين بن خالد قال قلت للرضا(ع) يا ابن رسول الله إن قوما يقولون إن رسول الله (ص) قال إن الله خلق آدم على صورته فقال قاتلهم الله لقد حذفوا أوّل الحديث إن رسول الله مرّ برجلين يتسابان فسمع أحدهما يقول لصاحبه قبح الله وجهك و وجه من يشبهك فقال له (ص) يا عبد الله لا تقل هذا لأخيك فإن الله عز و جل خلق آدم على صورته.

ان لوگوں نے حدیث کے ابتدائی حصہ کو ساقط کر کے لوگوں پر معنی فرمان رسالت مآب ﷺ کو مشتبہ کر دیا، پھر فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت جناب رسول خدا ﷺ کا دو ایسے شخصوں سے گزر ہوا جو ایک دوسرے کو دشنام دہی کر رہے تھے تو حضرت نے ایک سے سنا کہ دوسرے کو کہہ رہا تھا کہ خدا برا کرے تیری صورت کا اور ہر اس شخص کی صورت کا کہ جو تیرے مشابہ ہو، تو حضرت ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اے بندۂ خدا! اس قسم کا کلمہ اپنے بھائی کے حق میں نہ کہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس کی صورت میں پیدا کیا تھا۔ انتہیٰ محصل الروایۃ۔

اور بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ حدیث خلق اللہ آدم علی صورتہ سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے آدمی کو حضرت آدم علیہ السلام کی صورت پر پیدا کیا ہے، اس تقدیر پر ضمیر حضرت آدم علیہ السلام کی طرف لوٹے گی اور پہلی روایت کی بنا پر ضمیر سب کنندہ کی طرف لوٹے گی اور ہر دو تقدیر پر خداوند عالم کی طرف ضمیر نہیں لوٹتی جیسا کہ یہ مشبہہ فرقہ گمان کرتا ہے لہٰذا دونوں تقادیر کی بنا پر یہ حدیث اس مطلب سے خارج ہوجائے گی جس کے متعلق مشبہہ اسے لے جانا چاہتے ہیں اور جس سے متعلق ہم بحث کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو اس گروہ سے اپنی پناہ اور حفاظت میں رکھے کہ جو اللہ جل شانہ کو مخلوقات کے ساتھ تشبیہ دیتے اور اس پاک پروردگار کو ایسے عیوب و نقائص کی طرف نسبت دیتے ہیں جس تشبیہ اور جن نقائص سے وہ پاک اور پاکیزہ و منزہ اور مبرا ہے۔ قاتلھم اللہ انّٰی یؤفکون، اللہ تعالیٰ ان کو تباہ کرے، کہاں بہکے پھرتے ہیں۔

صفات سلبیہ میں سے پانچویں قسم
"نفی مکان وجہت"

پانچویں صفت سلبیہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ مکان رکھتا ہے اور نہ جہت اور نہ ہی زمانہ اس کا احاطہ کرسکتا ہے کیونکہ یہ سب امور جسمیت اور امکان کے لوازم میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات جسمیت و امکان سے بالاتر اور بلند ہے کیونکہ عقل و نقل کے ذریعہ ان کا بطلان ثابت ہے۔

شیخ صدوق ؒ نے کتاب توحید میں اپنی سند کے ساتھ سلیمان بن مہران سے روایت کی ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ خداوند عالم کسی مکان میں ہو تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و برتر ہے کہ وہ کسی مکان میں ہو اور اگر اس طرح ہو تو پھر وہ حادث ہوجائے گا کیونکہ جو مکان میں موجود ہو وہ مکان کی طرف محتاج ہوتا ہے اور احتیاج حوادث کی صفات میں سے ہے قدیم کے صفات میں سے نہیں۔

جناب والد ماجد اعلی اللہ مقامہ و احلہ دار الکرامہ نے اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ حدیث جس طرح کہ دلیل نقلی ہے اس طرح دلیل عقلی پر بھی مشتمل ہے اور بظاہر اس کا ماحصل یہ ہے کہ ہر وہ شئے جس کا کسی مکان میں ہونا تصور کیا جائے عقل سلیم اس کے متعلق یہ فیصلہ کرتی ہے کہ بغیر مکان کے وہ موجود ہو نہیں سکتی لہٰذا وہ مکان کی محتاج ہوگی

اور محتاج ہونا امکان اور حدوث کی دلیل ہے نیز دوسرے مقام پر والد ماجد اعلی اللہ مقامہ نے دلیل عقلی کو دوسرے عنوان سے بیان فرمایا ہے اور وہ یہ ہے کہ بداہت عقل حاکم ہے کہ مکان میں ہونا جسمیت کے لوازم میں سے ہے اور خداوند عالم کے لئے جسمیت کا ہونا باطل اور محال ہے۔

واضح باد کے مکان کے دو مشہور و معروف معنی ہیں جو شخص ان دونوں کی طرف رجوع کرے اس پر مذکورہ بالا دعویٰ واضح اور ظاہر ہوجائے گا کیونکہ مکان کا ایک معنی ہے جسم حاوی کی سطح باطن جو کہ جسم محوی کی سطح ظاہر سے ملاصق اور ملی ہوئی ہوتی ہے اور مکان کا دوسرا معنی ہے وہ بُعد جو کہ مادہ سے مجرد ہو۔ مکان کا پہلا معنی مقتضی ہے کہ مکان رکھنے والی شئے سطح رکھنے والی ہوتی ہے اور دوسرا معنی چاہتا ہے کہ مکان رکھنے والی چیز کے لئے "ابعادِ ثلاثہ" طول، عرض اور عمق ہوں کہ جو مکان کے ابعاد کے ساتھ منطبق ہونے والے ہوں اور ظاہر ہے کہ سطح بھی اور ابعاد ثلاثہ بھی جسمیت کے لوازم میں سے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کے لئے جسمیت کا ہونا محال اور ناممکن ہے تو جسمیت کے لوازم کا بھی اس کے لئے ثابت ہونا محال اور ناممکن ہے۔ یہ تو ہیں اللہ تعالیٰ کے مکانی نہ ہونے اور لا مکان ہونے کے دلائل۔

رہا یہ امر کہ اللہ تعالیٰ کا کسی جہت میں ہونا بھی محال ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کے کسی جہت میں ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ شئے اس جہت تک پہنچی ہوئی ہو یا اس کے قریب پہنچ چکی ہو اور یہ معنی بھی جسمیت و مکان کے لوازم میں سے ہے اور مکان کو مستلزم ہے کیونکہ جو چیز مکان نہ رکھتی ہو اس کا کسی چیز کے قریب ہونا یا اس سے بعید ہونا متصور ہی نہیں ہوسکتا۔

شیخ صدوقؒ نے امالی[1] میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نہ مکان سے متصف ہوسکتا ہے نہ زمانہ سے اور نہ حرکت سے نہ انتقال مکانی سے اور نہ سکون سے بلکہ وہ ذات پاک زمان و مکان اور انتقال حرکت وسکون کو پیدا کرنے والی اور ان کی خالق ہے، **تعالی اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا،** کہ ظالم جو کچھ کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اس سے انتہائی طور پر بلند و برتر ہے۔

شیخ مفیدؒ نے کتاب الارشاد[2] میں روایت کی ہے کہ علماء یہود میں سے ایک شخص حضرت اوّل کے پاس آیا اور کہا کہ آپ اس امت کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں۔ یہودی عالم نے کہا کہ میں نے توریت میں لکھا ہوا دیکھا ہے کہ خلفاء انبیاء ان کی امتوں کے تمام افراد سے زیادہ علم رکھنے والے ہوتے ہیں لہٰذا بتایئے کہ خدا

---

(۱) اصل روایت کا متن حسب ذیل ہے، ملاحظہ ہو سفینۃ البحار، ج ۲، صفحہ: ۴۹۹ بروایت امالی تحریر ہے: عن أبي بصير عن أبي عبد الله الصادق عليه السلام قال إن الله تبارك و تعالى لا يوصف بزمان و لا مكان ولا حركة ولا انتقال ولا سكون بل هو خالق الزمان والمكان و الحركة و السكون و الانتقال، تعالى عما يقول الظالمون علوا كبيرا.

(۲) متن روایت کے الفاظ ملاحظہ ہوں کتاب الارشاد، شیخ المفید علیہ الرحمہ، صفحہ: ۹۶ تحریر ہے: وجاءت الرواية أن بعض أحبار اليهود جاء إلى .... فقال أنت خليفة نبي هذه الأمة فقال له نعم فقال فإنا نجد في التوراة أن خلفاء الأنبياء أعلم أممهم فخبرني عن الله تعالى أين هو في السماء أم في الأرض فقال له .... في السماء على العرش

(اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

آسمان میں ہے یا زمین میں؟

انہوں نے سادہ لوح ہونے کے باعث کہا کہ وہ آسمان میں عرش پر ہے۔ یہودی نے کہا کہ اس کا معنیٰ تو یہ ہے کہ اس وقت زمین اس سے خالی ہے، آپ کے اس قول کی بنا پر تو خداوند عالم ایک مکان میں ہے اور دوسرے مکان میں نہیں ہے۔ اول نے کہا[1] یہ آپ زندیقوں اور بے دینوں کی طرح گفتگو کر رہے ہیں میرے پاس سے دور ہو جائے ورنہ قتل کر دوں گا۔ چنانچہ یہودی تعجب کرتا ہوا اور اسلام کا تمسخر اڑاتا ہوا لوٹ پڑا۔ راستے میں اس کی امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ اے یہودی مجھے تیرے سوال کا بھی علم ہے اور تجھے جو جواب ملا ہے اس کا بھی مجھے علم ہے۔ لو سنو! میں تمہیں صحیح جواب دیتا ہوں۔ "ہم مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مکان کا خالق ہے لہٰذا اس کا کوئی مکان نہیں وہ اس سے برتر ہے کہ کوئی مکان اس کا احاطہ کرے۔ وہ ہر مکان میں موجود ہے مگر نہ بایں معنیٰ کہ اس مکان کے ساتھ مماس اور ملا ہوا ہے اور اس کا مجاور ہے بلکہ وہ بایں معنیٰ ہر مکان میں موجود ہے کہ اس کا علم تمام ان اشیاء کا احاطہ کئے ہوئے ہے جو ہر مکان میں موجود ہیں اور کوئی مکان اس کی تدبیر سے خالی نہیں ہے اور میں تمہیں اس کے متعلق اس کی خبر دیتا ہوں جو کچھ تمہاری کتابوں میں وارد ہوا ہے اور وہ اس کی بھی تصدیق کرتا ہے جو میں نے تجھے کہا ہے لہٰذا بتائیے کہ جو کچھ میں تمہیں تمہاری کتابوں سے بتانا چاہتا ہوں اگر وہ ٹھیک ہو اور میری تصدیق کرے

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) فقال اليهودي فأرى الأرض خالية منه و أراه على هذا القول في مكان دون مكان فقال .... هذا كلام الزنادقة اغربْ عنّي و إلا قتلتك فولى الحبر متعجبا يستهزء بالإسلام فاستقبله أمير المؤمنين عليه السلام فقال له يا يهودي قد عرفتُ ما سئلتَ عنه و ما أجبتَ به و انا نقول إن الله جلّ و عزّ اين الاين فلا أين له و جل عن أن يحويه مكان و هو في كل مكان بغير مماسة و لا مجاورة يحيط علما بما فيها ولا يخلو شيء منها من تدبيره و إني مخبرك بما جاء في كتاب من كتبكم يصدق ماذكرتُه لك فإن عرفتَه أتؤمن به؟ قال اليهودي نعم قال ألستم تجدون في بعض كتبكم أن موسى بن عمران كان ذات يوم جالسا إذ جاءه ملك من المشرق فقال له موسى من أين أقبلت قال من عند الله عز وجل ثم جاءه ملك من المغرب فقال له من أين جئت قال من عند الله و جاءه ملك آخر فقال قد جئتُك من السماء السابعة من عند الله تعالى و جاءه ملك آخر فقال قد جئتُك من الأرض السابعة السفلى من عند الله عز اسمه فقال موسى عليه السلام سبحان من لا يخلو منه مكان ولا يكون إلى مكان أقرب من مكان فقال اليهودي أشهد أن هذا هو الحق و أنك أحق بمقام نبيك من استولى عليه.

[1] اوّل کا یہ جواب اس کی دلیل ہے کہ ان کو معرفت خداوند عالم کا شرف حاصل نہ تھا۔ اس کے خیال میں خداوند عالم مکان رکھنے والی ہستی تھی وہ لا مکاں نہیں تھی۔ اس لئے اس نے یہ جواب دیا کہ وہ عرش پر آسمان میں ہے حالانکہ اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ عرش آسمان اور مکان تو حادث امور ہیں جو نہ ہونے کے بعد پیدا ہوئے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا اور جب خدا نے ان کو پیدا نہیں کیا تھا تو اس وقت یقیناً وہ لا مکاں تھا، لہٰذا معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ایسی ہستی ہے جسے اپنے موجود ہونے میں مکان کی احتیاج نہیں۔ وہ تو مکان کو بھی پیدا کرنے والا ہے جیسے امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات پاک لا مکان ہے اور انہیں اس کا بھی پتہ نہیں تو معلوم ہوا کہ وہ خلافت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل نہیں تھے بلکہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام اس کے اہل تھے۔

اور تمہیں اس کا پتہ بھی چل جائے تو کیا ایمان لے آؤ گے؟ یہودی نے اقرار کیا کہ ہاں ایمان لے آؤں گا۔ تو فرمایا کہ کیا تم اپنی بعض کتابوں میں یہ لکھا ہوا نہیں پاتے کہ ایک دن حضرت موسیٰ بن عمران علیہ السلام ایک مقام پر بیٹھے تھے کہ اچانک ایک فرشتہ مشرق کی جانب سے آیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو فرشتے نے جواباً کہا کہ اللہ کے پاس سے، اس کے بعد ایک اور فرشتہ مغرب کی جانب سے آیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ کہاں سے آرہے ہو، اس نے جواب دیا کہ اللہ جل شانہ کے پاس سے آرہا ہوں، اس کے بعد تیسرا فرشتہ حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ میں ساتویں آسمان سے آرہا ہوں اللہ تعالیٰ کے پاس سے، اسی وقت اس کے بعد ایک چوتھا فرشتہ حاضر ہوا اور کہا کہ میں زمین کے ساتویں طبقہ سے خداوند عالم کے پاس سے آرہا ہوں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ پاک ہے وہ خداوند عالم کہ جس سے کوئی مکان خالی نہیں اور کسی مکان کے وہ دوسرے مکان کی نسبت قریب تر نہیں ہے۔ یہودی عالم نے فوراً کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ حق یہی ہے اور خلافت پیغمبر کے آپ اس شخص کی نسبت زیادہ حقدار ہیں جو اس پر متمکن ہے اور اسی سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ حنابلہ اور مشبّہہ جو کچھ کہتے ہیں کہ خدا عرش پر بیٹھا ہے یہ اوّل کے کلام سے ماخوذ ہے کہ جس نے اپنے وصف کو اس یہودی بے چارہ کی گردن پر تھوپ دیا تھا۔

مخفی نہ رہے کہ جب عوام کے قلوب اور اوہام جسمیت، مکانیت اور اس قسم کے دیگر امور کی اللہ تعالیٰ سے نفی پر مطلع ہوتے ہیں کہ جو امور محسوسات کے لوازم اور ان کے مالوفات کے عوارض میں سے ہیں تو اکثر و بیشتر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نفسانی خیالات اور شیطانی وسواس ان پر غلبہ پا لیتے ہیں حتیٰ کہ وہ گمان کرتے ہیں کہ ایسی کوئی چیز موجود ہی نہیں ہو سکتی جو ان لوازم و عوارض سے پاک اور خالی ہو۔ لہٰذا ان اوہام کو رفع کرنے اور ایسے توہمات کی بیخ کنی کرنے کے لئے ہم نے رسالہ وسیلۃ النجاۃ میں ذکر کیا ہے کہ ایک عاقل کو چاہئے کہ وہ اپنے نفس کی طرف رجوع کرے اور غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے چند حواس عطا فرمائے ہیں کہ جن کے ذریعہ وہ مختلف محسوسات کا ادراک کرتا ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ ہر امر محسوس کو وہ ہر حاسہ کے ذریعہ ادراک کر سکتا ہو۔ ذرا غور تو کیجئے کہ ہر قسم کے رنگوں، سرخ، سفید، زرد، سبز وغیرہ کو بھی اور ان کی مثل دیگر اشیاء مرتبہ، شکلوں وغیرہ کو بھی آپ اپنی چشم کی بینائی سے ادراک کرتے ہیں اور اگر آپ چاہیں کہ آپ چکھنے اور مس کرنے وغیرہ کے دیگر حواس کے ذریعہ ان مذکورہ اشیاء مبصرات کا بھی ادراک کریں تو ان حواس سے ان کا آپ ہرگز ادراک نہیں کر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مادر زاد اندھا اگر چاہے کہ رنگوں کے اقسام و انواع کا ادراک کرے تو جتنی بھی کوشش کرے کہ لوگ اسے سمجھائیں مگر اس کی سمجھ میں نہ آ سکے گا اور وہ ان کا ادراک نہیں کر سکے گا اور اس کے دل میں ان رنگوں کی حقیقت کے متعلق جو خیالات پیدا ہوں گے وہ رنگ کی حقیقت اور واقعیت پر ہرگز منطبق نہیں ہوں گے کیونکہ ان مبصورات کا ادراک حاسۂ بصر کے احساس میں منحصر ہے کہ جو حاسہ اس اندھے کے پاس نہیں ہے۔ لہٰذا وہ ان مبصورات کے ادراک کے لئے جس قدر زیادہ سوچ بچار اور غور و خوض کو عمل میں لائے وہ ان کا ادراک ہرگز نہیں کر سکے

گا، اس کی حیرت اور زیادہ ہوتی جائے گا۔

ہمارے نفوس وعقول ناقصہ کی یہی کیفیت ہے کیونکہ ذات پاک پروردگار کو ادراک کرنے والی کوئی قوت ہم نہیں رکھتے اس لئے ذات خداوند عالم کی حقیقت اور ماہیت کا ادراک کرنے کے لئے غور وخوض کی زیادتی، حیرت و پریشانی کے زیادہ ہوجانے کا باعث ہوتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ جو کچھ دلائل قطعیہ کا مقتضی ہے لوگ اسی کے مطابق اعتقاد رکھیں اور اپنی عقل وفہم کے ناقص اور قاصر ہونے کا اعتراف کریں اور جس امر کے سمجھنے کی عقل میں طاقت اور قدرت نہیں اس کے سمجھنے اور اسے ادراک کرنے کی زحمت اور تکلیف سے اسے باز رکھیں کیونکہ اس میں ہلاکت اور خسران کا خطرہ ہے۔

منقول ہے کہ حضرت ابوالحسن امام رضا علیہ السلام[1] نے جناب باری تعالیٰ کے اوصاف کے متعلق بیان فرمایا کہ حواس کے ذریعہ اس کا ادراک ممکن نہیں اور کسی چیز پر اسے قیاس نہیں کیا جا سکتا، تو ایک بے دین نے حضرت علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ جب حواس کے ذریعہ اس کا ادراک نہیں ہوسکتا تو پھر وہ موجودات کی فہرست میں کیسے داخل ہوسکتا ہے؟ تو امام عالی مقام علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تیری حالت قابل افسوس ہے جب کہ تیرے حواس اس ذات احدیت کو ادراک کرنے سے عاجز ثابت ہوتے تو، تو نے یہ گمان بد قائم کرلیا کہ تیرا کوئی پیدا کرنے والا پروردگار ہے ہی نہیں مگر ہم نے جب اس کی ذات پاک کو پایۂ ادراک حواس سے بلند پایا تو ہم اس کی ربوبیت اور اس کے پروردگار ہونے پر ایمان لے آئے نیز اس پر ایمان لے آئے کہ وہ اپنی پیدا کردہ تمام اشیاء سے جداگانہ شان رکھنے والا ہے اگر وہ ان کی مثل ہوتا تو مخلوقات سے کوئی نہ کوئی چیز ضرور اس کی مثل ہوتی۔

مختصر اینکہ جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس سے واضح اور ظاہر ہوگیا ہے کہ ذات خداوند عالم نہ جسم ہے نہ جسمانی، نہ مکانی ہے نہ زمانی، نہ وہ کسی جہت میں ہے اور نہ ہی وہ قابل حرکت وسکون اور یہ سارے حقائق دین وملت کی ضروریات میں سے ہیں اور جب کوئی امر دلائل قطعیہ، عقلیہ اور نقلیہ کے ذریعہ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے اور پھر شرع شریف میں کوئی کلام ایسا وارد ہو کہ جو بظاہر اس امر قطعی کے منافی ہو تو اس کی تاویل کرنا چاہئے اور معانی خاصہ کی طرف راجع کرنا چاہئے۔ یہ طریقہ مخالف ومؤلف فریقین کے ہاں مسلمات میں سے ہے اور عقل ونقل کے مطابق ہے کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ اقتضائے مصالح کے پیش نظر شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام مجازات واستعارات کا طریقہ اختیار فرماتے ہیں جو کہ کلام عرب میں عمومی طور پر مروج وشائع ہے بلکہ یہ تمام زبانوں اور عبارات میں مروج ہے اور آزمائش واختیار خلق کے لئے قرائن حالیہ اور علامات مقالیہ پر بھروسہ اور اعتماد کر کے معنی غیر موضوعہ لہ کو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام اختیار کرتے اور اپنے محاورات وملفوظات میں ایسے معانی مراد لیتے ہیں جن کے لئے الفاظ کی وضع نہیں ہوتی اور وہ معانی ظاہر وضع کے خلاف ہوتے ہیں اور جب کہ معنی مراد ظاہر ہو اور بندوں پر اتمام حجت ہو چکی ہو تو پھر اس سے خلاف موضوع لہ مراد لینے میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔

---

[1] اصول الکافی ج ۱، صفحہ: ۱۳۴، ۱۳۵، کتاب التوحید باب حدوث العالم واثبات المحدث، حدیث: ۳۔

لیکن جن لوگوں پر شیطانی وسوسوں کا غلبہ ہوتا ہے انکا پاؤں مقام آزمائش میں صراط مستقیم سے لغزش کھا جاتا ہے اور بمفاد آیہ وافیۃ الہدایۃ: فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ[1] اپنی قلبی کجی کے باعث وہ معنی مراد لے کر چاہ ضلالت میں گر جاتے ہیں جو شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مراد نہیں لیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک: يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (سورۃ فتح، آیت:۱۰) اور ارشاد پاک: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (سورۃ طہ، آیت:۵) اسی باب سے ہیں کیونکہ اگرچہ ان الفاظ کا اصل وضع کے لحاظ سے معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے اور اہل عالم پر رحمت کرنے والا عرش پر مستولی ہے فرقہ مشبہ اور مجسمہ اس قسم کی آیات واحادیث کے ظاہری موضوع لہ معنی کے پیش نظر خداوند عالم کے لئے ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء و جوارح اور عرش پر بیٹھنا وغیرہ قرار دیتے ہیں جیسا کہ سابق گزر چکا ہے تعالی الله عن ذلك علوا كبيرا، اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ان چیزوں سے بہت بلند اور برتر ہے۔

لیکن ایک دیندار اور عقلمند شخص ان صحیح معانی کو سمجھ لیتا ہے جو ایسے مقامات پر شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مراد لئے ہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ استعارات اور تشبیہات، محاورات کلام میں عام اور شائع ہیں اور ایسے مقامات پر اس امر کے قرائن واضحہ اور جلیہ، عقلیہ ونقلیہ قائم ہیں کہ ظاہری لغوی معنی مراد نہیں ہے مثلاً کہتے ہیں علی علیہ السلام شیر خدا ہیں یا دست خدا ہیں یا لسان خدا لیکن یہ معنی مراد نہیں کہ علی علیہ السلام درحقیقت شیر ہیں یا ہاتھ ہیں بلکہ تشبیہ و استعارہ کے طور پر اسد اللہ بھی ہیں اور ید اللہ بھی، جیسے مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں کی زبان ہے اور اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اپنے موکل کی مرضی کے مطابق کہتا ہے اور اس کا کلام اس کے ہاں پسندیدہ اور صحیح ہے۔

اسی طرح جس چیز کو ہم بیان کر رہے ہیں اس میں بھی حقیقت لغویہ مراد نہیں بلکہ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ سے مراد یہ ہے کہ بیعت میں پیغمبر خدا کا ہاتھ خدا کے ہاتھ کا حکم رکھتا ہے، یہ مراد نہیں کہ خدا ہاتھ رکھتا ہے کہ جو ہاتھ ان بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں کے اوپر ہوتا ہے کیونکہ یہ آیت بالخصوص بیعت رضوان کے متعلق نازل ہوئی اور پوری آیت اس طرح ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۚ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (سورۃ فتح، آیت:۱۰)[2] پوری آیت کے پیش نظر معنی مراد نہایت واضح ہے کہ جو بنا برحقیقت نہیں بلکہ بنا بر مزید توثیق و تاکید استعارہ اور تشبیہ مقصود ہے اور ایسے مجازات، محاورات میں عام واقع ہوئے ہیں اور اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى[3] سے مراد یہ

---

[1] سورۃ آل عمران آیت ۷ کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ فتنہ پروری کی غرض سے اور اپنے مقصد کے مطابق تاویل کر لینے کی خاطر ان آیات کی اتباع کرتے ہیں جو آیات محکمات نہیں متشابہات میں سے ہوتی ہے۔

[2] سورۃ الفتح آیت:۱۰، بے شک جو لوگ تیری بیعت کرتے ہیں سوائے اس کے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی بیعت کرتے ہیں گویا بوقت بیعت ان کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔

[3] سورۃ طہ، آیت:۵

ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب اور قادر ہے، عرش بھی اور اس کا ماتحت بھی اور مافوق بھی اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ایک زندیق بے دین نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر اللہ تعالیٰ کے اسی فرمان اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی کے متعلق سوال کیا تو امام علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل معنی یہ ہے کہ استویٰ اس مقام پر مستولی اور غالب و قادر کے معنی میں ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس صفت کے ساتھ اپنی ذات پاک کی مدح و تعریف فرمائی ہے لہٰذا فی الواقع وہ استیلاء اور غلبہ کے ساتھ متصف ہے لیکن اس طرح نہیں کہ عرش اللہ تعالیٰ کی ذات کامل اور اس کا احاطہ کرنے والا اور اسے اٹھا رکھنے والا ہے بلکہ وہ ہی تو وہ ذات ہے جس نے عرش کو اپنی جگہ میں قرار دیا اور اسے اس مقام میں معلق کیا ہے، انتہیٰ۔

جاننا چاہئے کہ قرآن و حدیث میں متشابہات کا وارد ہونا کہ جو بہت سے مصالح پر مشتمل ہے باعتبارِ ظاہر دو قسموں پر ہے۔ پہلی قسم یہ کہ شارع علیہ السلام اکثر اوقات وہ استعارات جو محاورات کے اعتبار سے شائع ہوتے ہیں اس لئے استعمال فرماتے ہیں کہ معنی مراد تمام مخلوقات پر مشتبہ نہ رہے بلکہ واضح ہو جائے اگرچہ بعض لوگ ان کو جہالت کی وجہ سے تجاہل عارفانہ کے طور پر کجروی کے باعث باطل معنوں پر محمول کرتے ہیں لیکن ایک منصف المزاج، ہوش مند شخص سے حقیقت حال مخفی نہیں رہ سکتی لہٰذا جو الفاظ کہ محاورات میں شائع اور عام استعمال کے لحاظ سے ظاہراً خالق کو مخلوق کے ساتھ اور صانع کو مصنوع کے ساتھ تشبیہ دینے کے مقصد کو ادا کرتے ہیں ان الفاظ کو ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ آیات اور روایات متشابہ کا منشا اور ان سے مقصد مخلوق کا امتحان کرنا اور ان کی آزمائش کرنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ بقیہ تمام تکالیف شرعیہ کے ذریعہ مکلفین کو آزماتا ہے کہ آیا وہ معنی حق کی طرف مائل ہوتے ہیں یا سوئے اختیار کی وجہ سے اسے غیر واقعی معنی کی طرف پھیر دیتے ہیں اور یہ معاملہ امتحان شارع علیہ السلام کی نسبت مکلفین کے لئے زیادہ اہمیت کا باعث ہوتا ہے نہ بقیہ مخلوق کے لئے کیونکہ تکلیف دہندہ خود شارع علیہ السلام ہیں اور وہ اپنے اقوال و افعال کے مصالح کو آپ خوب جانتے ہیں لہٰذا دوسرے لوگوں کو ایسے امتحانی امور میں ان کی اقتداء کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں پہنچتا بلکہ ضروری ہے کہ وہ تشابہ کا دفعیہ کریں اور معنی مراد کی نقاب کشائی کریں نہ یہ کہ وہ الٹا اشتباہ اور الجھن کو اور زیادہ کریں۔ ہاں اگر عامۃ الاستعمال استعارات ہوں تو پھر ان کو اختیار کر سکتے ہیں مگر ایسے رکیک مجازات کا استعمال روا نہیں جن کا معنی مراد مخفی ہو کیونکہ اغراء بالجہل لازم آتا ہے۔ ایسے مجازات کا استعمال اصل کے لحاظ سے ممنوع ہے اسی لئے دیندار صاحبان تقویٰ علماء ہمیشہ شکوک و شبہات کو زائل کرنے اور مقصود کو ظاہر اور واضح کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ اگرچہ ایسا تشابہ بشریت کے تقاضہ سے ان کے کلام میں واقع ہو جاتا ہے جس کا عمداً ارتکاب نہ کیا گیا ہو، تاہم یہ ایسا امر ہے جو بہت ہی شاذ و نادر طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور تاویل کی گنجائش پھر بھی اس میں رہتی ہے لیکن جن لوگوں نے اپنی عادت بھی یہ بنائی ہے کہ ظاہر الفساد کلمات کو اپنی زبان پر جاری کرتے ہیں اور پھر ان کی تاویلیں کرنے لگتے ہیں یہ لوگ اہل

باطل کے لئے دائرۂ تاویل کو وسعت دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کے کلام سے مقصد برابری کا اطمینان مرتفع اور منتفی ہوجاتا ہے حالانکہ شرع شریف میں ظاہر کے مطابق حکم لگایا جاتا ہے اور اگر شبہات ہی کثرت سے ہونے لگیں تو پھر تاویلات کی تو کوئی گنجائش ہی نہ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ راستی اور صواب کی طرف ہدایت کرنے والا ہے اور جس ضابطہ کی طرف یہاں اشارہ اور انتباہ کردیا گیا آنے والے اکثر معاملات کے ساتھ اس کا تعلق ہے، اس کا اس مقام پر ذکر کرنا اہم تھا۔ لہٰذا کسی قدر اجمالاً اسے بیان کردیا گیا ہے۔

صفات سلبیہ میں سے چھٹی صفت
"حلول واتحاد کی نفی"

اللہ تعالیٰ کی چھٹی صفت سلبیہ یہ ہے کہ حلول واتحاد اس کے لئے ممکن نہیں۔ یہ امر بداہت عقل کے ذریعہ ثابت اور مذہب حق کی ضروریات میں سے ہے، بکثرت نصوص اس پر دلالت کرتے ہیں۔ تمام اہل اسلام میں سے سوائے صوفیہ کے ایک چھوٹے سے گروہ کے اس مسئلہ پر کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے۔

دلیل عقلی کے ذریعہ حلول کا ابطال اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ اگر حلول سے ان کی مراد حلول کا عرف خاص والا معنی ہو کہ جسے وہ اختصاص ناعتی سے تعبیر کرتے ہیں اور اس سے حلول کنندہ کا محتاج محل ہونا لازم آتا ہے تو اس کا معنی ہے کسی چیز کا احتیاج اور افتقار کے طریقہ پر دوسری چیزوں میں داخل ہوجانا اور اس کا بطلان ظاہر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بالذات مستغنی ہے اور وہ اپنے وجود میں کسی چیز کی طرف محتاج نہیں ہوسکتا اور اگر حلول سے عرف عام والا معنی مراد لیں یعنی کسی چیز کا دوسری چیز میں کسی طریقہ سے داخل ہونا اگرچہ کہ احتیاج و افتقار کے طور پر نہ ہو تو یہ معنی بھی باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ مکانی نہیں، وہ لامکان ہے اور وہ کسی جہت میں متحقق اور موجود نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا وہ کسی جسم میں کس طرح حلول کرسکتا ہے؟ اور داخل ہوسکتا ہے؟ مگر صوفیہ نے اس مسئلے میں اختلاف کیا ہے۔

علامہ حلیؒ اپنی کتاب کشف الحق[1] میں فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں جمہور مسلمین میں سے صوفیہ نے اختلاف کیا ہے انہوں نے عارفین کے بدنوں میں اللہ تعالیٰ کے حلول کو جائز اور ممکن قرار دیا ہے، **و تعالی اللہ عن ذلك علوا كبيرا.**

حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، وہ اس سے بہت بلند اور برتر ہے۔ وہ نہ کسی میں حلول کرسکتا ہے اور نہ کسی چیز کے ساتھ متحد ہوسکتا ہے۔ بداہت عقل اس کا حکم لگانے والی ہے کہ دو متغائر چیزوں میں اتحاد محال ہے لیکن صوفیہ اس کو

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب احقاق الحق، طبع ایران، صفحہ: ۳۰، البحث السادس فی انہ تعالی لایحل فی غیرہ، وصفحہ ۲۹، البحث الخامس فی انہ تعالی لا یتحد بغیرہ.

جائز وممکن قرار دیتے ہیں۔

علامہ حلیؒ فرماتے ہیں کہ مسئلہ اتحاد میں بھی صوفیہ عامہ کی ایک جماعت نے مخالفت کی ہے چنانچہ انہوں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ عارفین کے بدنوں کے ساتھ متحد ہو جاتا ہے ان میں سے بعض نے تو اس حد تک مبالغہ کر دیا ہے کہ کہتے ہیں کہ خدا نفس موجود ہے اور ہر موجود خدا ہے حالانکہ یہ الحاد اور عین کفر ہے، انتھی مخلصہ۔

علامہ حلیؒ نے آخری قول جو نقل کیا ہے اور محققین صوفیہ کے اتحاد والے قول سے جو کچھ غور وتدبر کے ذریعہ معلوم ہوا ہے یہ بعینہ ابن عربی اور ملا حیدر علی آملی کا قول ہے کہ جو کتاب جامع الاسرار ومنبع الانوار کا مصنف ہے جیسا کہ ان کے کلمات میں چشم بصیرت سے نگاہ کرنے والے پر مخفی نہیں رہ سکتا اور تاویل کی اس میں گنجائش نہیں ہے اور تشیع اسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتا اگرچہ آیت اللہ قاضی نور اللہ شوستری اعلی اللہ مقامہ کا کلام اس مقام پر اضطراب سے خالی نہیں ہے قاضی صاحب قدس سرہ کو چونکہ ان کے متعلق حسن ظن حاصل تھا اس لئے وہ ان کے کلام کی تاویل کرتے ہیں اگرچہ کہ وہ ان کے اعتقاد فاسد میں شریک نہیں ہیں لیکن وہ کہاں تک تاویل کریں گے۔ مقولۂ عقلاء ہے: لن یصلح العطار ما افسد الدھر، زمانہ جسے خراب کر دے عطار اس کی اصلاح ہرگز نہیں کر سکے گا۔

اس مقام پر شارح مواقف نے انصاف کیا ہے کہ جو برادران کے فضلاء میں سے ہے چنانچہ اس نے کہا ہے کہ میں نے صوفیہ وجودیہ میں سے ایک شخص کو دیکھا ہے جو حلول اور اتحاد ہر دو عقیدوں سے انکار کرتا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ یہ دونوں قول غیریت کا پتہ دیتے ہیں حالانکہ ہم وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ دوئی اور غیریت کے اصلاً قائل نہیں ہیں بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اس کے گھر میں دوسرا کوئی ہے ہی نہیں وہ خود ہی ہے۔

شارح مواقف نے یہ وحدت الوجود والا جو قول نقل کیا ہے یہ بعینہٖ ملا حیدر علی عبیدلی کا قول، ہے جو اس نے ابن عربی کی اتباع میں اختیار کیا ہے کیونکہ اس نے کہا ہے کہ اتحاد اور حلول والا قول نصاریٰ اور بعض صوفیہ کا مذہب ہے لیکن صوفیہ حقہ اتحاد کے قائل نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب ہم نے وجود غیر کی مطلقاً نفی کر دی ہے تو پھر ہم بس صرف ایک وجود کے قائل ہیں دوسرے کسی وجود کے قائل نہیں ہیں تو پھر اتحاد اور حلول کے قائل کیسے ہو سکتے ہیں حالانکہ یہ دونوں قول دوئی اور غیریت پر مبنی ہیں۔

جب یہ امر معلوم ہو چکا تو اب جاننا چاہئے کہ شارح مواقف اپنے کلام سابق کے بعد کہتے ہیں یہ عذر اس گناہ سے بھی بدتر ہے اور قول وحدت وجود کا بطلان قول اہل حلول واتحاد کے بطلان سے بھی زیادہ واضح ہے کیونکہ ان کے قول کی بنا پر حقائق امکانیہ کا واجب تعالیٰ کے ساتھ اختلاط لازم آتا ہے کہ جس کی جسارت کوئی عقلمند نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی ایسا شخص کر سکتا ہے جو تھوڑی بھی تمیز رکھنے والا ہو۔ انتھی مخلص کلمہ۔

علامہ حلیؒ کشف الحق میں اقوال صوفیہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں ان مشائخ کی طرف دیکھئے کہ جن کی زیارت

کے ذریعہ وہ برادران تبرک حاصل کرتے ہیں کہ پروردگار عالم کے متعلق ان کے کیسے کیسے اعتقادات ہیں کہ کبھی اس کے لئے حلول جائز قرار دیتے ہیں اور کبھی اتحاد کو اس کے لئے صحیح قرار دیتے ہیں۔ عبادت ان کی ناچ، گانا اور تالیاں بجانا ہے اور ان کا یہ حال وجد اور "حال" کی مجلسوں میں ساری مخلوقات پر واضح اور ظاہر ہے۔ یہی تو وہ امور ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے زمانہ کفر و جاہلیت کے کفار کی مذمت اور تعبیر کی ہے چنانچہ فرمایا ہے: وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً، کہ ان کفار کی بیت اللہ کے پاس عبادت سوائے تالیاں بجانے اور سیٹیاں بجانے کے کچھ اور نہ تھی (سورۃ الانفال، آیت: ۳۵)۔

اس سے بڑھ کر کوئی حماقت اور تغافل نہیں ہوسکتا کہ ایسے لوگوں کو متبرک سمجھ کر ان سے تبرک حاصل کیا جائے جو ایسے طریقہ سے عبادت کرتے ہیں جس عبادت پر اللہ تعالیٰ نے کفار کی مذمت کی ہو،

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ، ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں لیکن دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں (سورۃ الحج، آیت: ۴۶)۔

میں نے صوفیاء[1] کی ایک جماعت کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی مشہد مبارکہ اور روضۂ اقدس میں دیکھا تھا جنہوں نے ایک شخص کے علاوہ نماز مغرب پڑھی مگر وہ شخص بغیر نماز بجالانے کے یونہی بیٹھا تھا۔ ایک گھڑی بھر کے بعد وہ نماز عشاء بجالائے لیکن وہ شخص نماز عشاء بھی نہ بجالایا۔ میں نے ان میں سے بعض سے پوچھا کہ اس شخص نے نماز کیوں نہیں پڑھی تو انہوں نے کہا کہ اس کو نماز کی کیا حاجت وضرورت ہے حالانکہ خدا تک پہنچ چکا ہے اور جب واصل باللہ ہو چکا ہے تو پھر کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ اپنے اور خداوند عالم کے درمیان حجاب قائم کرے۔ نماز تو بندہ اور پروردگار کے درمیان ایک حجاب ہے۔ صاحبان عقل ان لوگوں اور ان کے اعتقادات فاسدہ دربارۂ خداوند عالم اور ان کی عبادت اور ترک نماز کے متعلق ان کے تراشے ہوئے عذر پر ذرا غور فرماویں باوجود ان کی اس حالت کے یہ جہاں ان کو اہل کمال سے قرار دیتے ہیں اور ان کو ابدال کے منجملہ سمجھتے ہیں۔

علامہ محمد باقر مجلسیؒ اپنے رسالہ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں کہ ہمارے اہل زمانہ میں سے ایک جماعت ہے جنہوں نے بدعات کو اپنا دین بنا رکھا ہے۔ ان کے ذریعہ وہ اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں اور اس کا نام انہوں نے تصوف رکھا ہوا ہے الخ اور رہبانیت یعنی ترک اہل و اقارب اور مخلوق خدا کے ساتھ مل کر زندگی بسر نہ کرنے کو وہ عبادت جانتے ہیں حالانکہ پیغمبر خدا نے رہبانیت سے منع فرمایا اور نکاح کرنے، متعہ کرنے اور مومنین کی صحبت میں بیٹھنے، ان کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنے، جمعہ و جماعت میں حاضر ہونے، ایک دوسرے کو ہدایت کرنے، احکام دین کی تعلیم دینے، احکام دین کے حاصل کرنے، مریضوں کی بیمار پرسی کرنے، جنازۂ مومن کے ساتھ جانے، مومنین کی حاجت روائی کے لئے کوشش

---

[1] صوفیہ کے متعلق یہ ساری عبارات احقاق الحق کے صفحات: ۲۹، ۳۰ میں مرقوم ہے۔

کرنے، نیکی کا حکم دینے، برائی سے منع کرنے، حدود الٰہیہ کو قائم کرنے، شریعت جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کو ترویج دینے، ان کی اشاعت کرنے وغیرہ امور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی تاکید سے ترغیب دلائی اور ان کے بجالانے پر مخلوقات کو آمادہ کیا۔ اور یہ رہبانیت جو انہوں نے خود ایجاد کر لی ہے اس سے ان تمام امور خیر، واجبات اور مستحبات کا ترک لازم آتا ہے اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے بہت سی عبادات ایجاد کر لی ہیں جن کے منجملہ ہے ذکر خفی اور ذکر جلی کو مخصوص ہیئتوں پر بجالاتے ہیں اور وہ اشعار میں راگ الاپتے ہیں اور گدھوں کی طرح وہ آوازیں بلند کرتے ہیں، تالیاں بجاتے اور سیٹیاں بھی بجاتے ہیں اور گمان یہ رکھتے ہیں کہ ان دو طریقہ کی عبادتوں کے علاوہ کوئی ایسی عبادت نہیں جو اللہ تعالیٰ کے دربار میں توجہ اور اعتناء کے لائق ہو اور نماز میں صرف زمین پر اس طرح سر دے مارنے پر اکتفا کرتے ہیں جس طرح کہ کوا اپنی چونچ سے زمین پر ٹھونگیں مارتا ہے اور اگر ان کو علماء دین کا خوف نہ ہوتا تو بالکل نماز کو ترک ہی کر دیتے اور صرف اسی پر ہی انہوں نے اکتفا نہیں کیا بلکہ اصول دین کو درہم برہم کر دیا اور وحدت الوجود کے قائل ہو گئے اور اس وحدت وجود کا جو معنی ان کے مشائخ سے سنا جاتا ہے وہ کفر محض ہے اور وہ جبر کے قائل اور عبادات و طاعات کے ساقط ہونے کے قائل ہیں اور اس قسم کے دیگر پست اور خسیس اقوال کے بھی قائل ہیں۔

لہٰذا اے برادران ایمانی: اپنے آپ کو اور اپنے ایمان کو ان شیطانوں کے وسوسہ سے بچایئے اور ان کے اس مکر و فریب سے محفوظ رہئے جس کے ذریعہ وہ عوام کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

ساتویں صفت سلبیہ

"وہ مرئی نہیں"

جب یہ معلوم ہو چکا کہ خداوند عالم نہ جسم ہے نہ جسمانی اور نہ وہ مکان کا محتاج ہے نہ کسی جہت میں ہونا اس کی شان کے لائق ہے اور نہ ہی یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اوپر کی جانب ہے یا نیچے کی جانب اور نہ ہی یہ کہ وہ بجانب شمال ہے یا بجانب جنوب یا دائیں جانب کو یا بائیں جانب کو، یا مشرق میں ہے یا مغرب میں، نہ وہ جہت رکھتا ہے نہ کسی چیز کے بالمقابل ہوسکتا ہے لہٰذا ضروری اور لازم ہے کہ دنیا اور آخرت ہر دو میں اس کا آنکھ سے دکھائی دینا محالات میں سے ہو، چنانچہ ارشاد ربی ہے: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ، آنکھیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ آنکھوں کا ادراک کرتا ہے، وہ بڑا باریک بین اور خبردار ہے (سورۃ الانعام، آیت: ۱۰۳)، نیز فرمایا: فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (سورۃ النساء، آیت: ۱۵۳) قَالَ لَنْ تَرَانِىْ (سورۃ الاعراف، آیت: ۱۴۳) بے شک انہوں نے موسیٰ سے اس سے بھی بڑی چیز کا سوال کیا تھا چنانچہ انہوں نے کہہ دیا ہمیں ظاہر بظاہر خدا دکھا دے اور اللہ نے فرمایا تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکو گے، یہ نصوص ہیں اس مسئلہ کے متعلق اور ایک خبردار واقف کار کے علاوہ آپ کو صحیح خبر کوئی نہیں دے سکے گا۔

ابو ہاشم جعفری[۱] سے مروی ہے کہ میں نے حضرت امام محمد تقی علیہ السلام سے آیت مبارکہ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ، کا معنی دریافت کیا تو فرمایا قلبی خیالات و اوہام آنکھوں کی نظر سے زیادہ دقیق ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوسکتا ہے کہ تو اپنے وہم کے ذریعہ سندھ، ہند اور دیگر ان ممالک و علاقہ جات کو پالے اور ان کا ادراک کرتا رہے کہ جن میں تو داخل ہی نہ ہوا ہو اور تو نے دیکھا ہی نہ ہو لیکن اللہ جل شانہ کی ذات والا صفات تک وہم کو بھی رسائی نہ ہوسکتی اور جب وہم کو رسائی نہیں ہو سکتی تو نگاہِ چشم تو اس سے بھی ضعیف تر ہے۔

الاحتجاج طبرسیؒ[۲] میں یونس بن طبیان سے مروی ہے کہ ایک شخص حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ آیا آپ نے خدا کو دیکھا ہے جس کی عبادت کرتے ہو؟ فرمایا کہ میں اس خدا کی عبادت کرنے والا نہیں جسے میں نے دیکھا نہ ہو۔ اس نے عرض کیا کہ آپ نے کس طرح دیکھا ہے؟ فرمایا کہ آنکھوں نے معائنہ اور مشاہدہ کے طور پر اسے نہیں دیکھا لیکن دل کی آنکھوں نے اسے حقائق ایمان کے ذریعہ دیکھا۔ وہ حواس کے ذریعہ ادراک نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی وہ پاک پروردگار لوگوں اور انسانوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ وہ معروف ہے، عارفین کو اس کی معرفت حاصل ہے لیکن مخلوق کے ساتھ شبیہ رکھنے کے بغیر اس کی معرفت حاصل کی جاتی ہے۔

ایک اور روایت میں حضرت امام علی رضا علیہ التحیۃ والثناء سے منقول ہے کہ ایک کلام طویل کے بعد حضرت علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ پاک پروردگار آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا[۳]۔

اور جب دلائل عقلیہ و نقلیہ کے ذریعے ثابت ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کا آنکھ سے دکھائی دینا محال ہے تو معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ دکھائی دینے والی شئے نہیں ہے۔ لہٰذا وہ آیات اور احادیث مبارکہ جن کا ظاہر اس مقصد متیقن و معلوم کے خلاف وہم پیدا کرے وہ ماؤل ہوں گی یا مطروح قرار پائیں گی، لیکن ان میں سے فرقہ اشاعرہ والے عقل سے دست بردار ہو کر قلبی کجی کے باعث بعض متشابہات سے تمسک کرتے ہوئے اور بعض موضوع روایات کی طرف استناد کرتے ہوئے

---

[۱] اصول الکافی، ج ۱، صفحہ: ۷۹ا، طبع جدید مرآۃ العقول شرح اصول الکافی، ج ۱، صفحہ: ۷ا، متن حسب ذیل ہے:

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عِيسَى عَنْ دَاوُدَ بْنِ الْقَاسِمِ أَبِي هَاشِمٍ الْجَعْفَرِيِّ قَالَ: قُلْتُ لِأَبِي جَعْفَرٍ عليه السلام: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصارَ فَقَالَ يَا أَبَا هَاشِمٍ أَوْهَامُ الْقُلُوبِ أَدَقُّ مِنْ أَبْصَارِ الْعُيُونِ أَنْتَ قَدْ تُدْرِكُ بِوَهْمِكَ السِّنْدَ وَ الْهِنْدَ وَ الْبُلْدَانَ الَّتِي لَمْ تَدْخُلْهَا وَ لَا تُدْرِكُهَا بِبَصَرِكَ وَ أَوْهَامُ الْقُلُوبِ لَا تُدْرِكُهُ فَكَيْفَ أَبْصَارُ الْعُيُونِ.

[۲] الاحتجاج، صفحہ: ۸۱، طبع قدیم متن حدیث:

۔ عَنْ يُونُسَ بْنِ ظَبْيَانَ قَالَ دَخَلَ رَجُلٌ عَلَى أَبِي عَبْدِ اللهِ عليه السلام قَالَ أَرَأَيْتَ اللهَ حِينَ عَبَدْتَهُ؟ قَالَ مَا كُنْتُ أَعْبُدُ شَيْئاً لَمْ أَرَهُ قَالَ فَكَيْفَ رَأَيْتَهُ؟ قَالَ لَمْ تَرَهُ الْأَبْصَارُ بِمُشَاهَدَةِ الْعِيَانِ وَ لٰكِنْ رَأَتْهُ الْقُلُوبُ بِحَقَائِقِ الْإِيمَانِ لَا يُدْرَكُ بِالْحَوَاسِّ وَ لَا يُقَاسُ بِالنَّاسِ مَعْرُوفٌ بِغَيْرِ تَشْبِيهٍ.

[۳] اصول الکافی، طبع جدید، ج ۱، صفحہ: ۱۷۳، مرآۃ العقول، ج ۱، صفحہ: ۶۹، حدیث: ۳ میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام کا یہ ارشاد موجود ہے: فهذا دليل على أن الله تعالى لا يرى بالعين۔

آخرت میں اللہ تعالیٰ کے ان آنکھوں سے دکھائی دینے کے قائل ہیں جو ہر انسان کے سر میں جاگزیں ہیں اور رؤیت و دکھائی دینے کی شرائط سے انہوں نے انکار کر دیا اور سوفسطائیہ[۱] سے بھی گوئے سبقت[۲] لے گئے۔ اس اجمال کی تفصیل جیسے کہ علامہ حلیؒ نے افادہ فرمایا ہے یہ ہے کہ دکھائی دینے کے لئے آٹھ چیزیں شرط ہیں۔

ایک حاسۂ بصر کا صحیح و سالم ہونا، دوسرے یہ کہ جو چیز دیکھی جارہی ہے وہ دیکھنے والے کے سامنے مقابلہ میں ہو یا سامنے ہونے کا حکم رکھتی ہو، جیسے آئینہ کے ذریعہ اس چیز کا سامنے ہونے کے حکم میں ہونا، تیسرے وہ چیز حد سے زیادہ قریب نہ ہو، چوتھے بہت زیادہ دور نہ ہو، پانچویں درمیان میں کوئی چیز حائل اور حاجب نہ ہو، چھٹے دکھائی دینے والی چیز ہوا کی طرح ایسی شفاف نہ ہو کہ جو دکھائی نہ دے سکتی ہو، ساتویں دیکھنے والا دیکھنے کا ارادہ رکھتا ہو اور آٹھویں اندھیرا نہ ہو روشنی ہو۔

ظاہر ہے کہ ان شرائط کے موجود اور متحقق ہونے کی صورت میں رؤیت اور دکھائی دینا ضروری اور لازم ہے۔ ان آٹھ شرائط میں سے کسی ایک کے متحقق نہ ہونے کی صورت میں رؤیت متحقق نہیں ہوسکتی، منتفی ہو جاتی ہے۔ کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ اگر بینائی میں عیب ہو تو رؤیت واقع نہیں ہوسکتی، اسی طرح اگر دکھائی دینے والی چیز سامنے بالمقابل نہ ہو تو دکھائی نہیں دے سکتی اور اگر اس کو آنکھ کے ساتھ اس طرح متصل کر دیا جائے کہ درمیان میں کوئی چیز حائل اور مانع موجود ہو تو بھی نظر نہیں آ سکتی اور اگر دیکھنے والا دیکھنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو یا چشم پوشی کرے تب بھی دکھائی نہیں دے سکتی۔ اگر دکھائی دینے والی چیز تاریکی اور اندھیرے میں ہو تو بھی قوتِ باصرہ اس کا ادراک نہیں کرسکتی تاوقتیکہ روشنی حاصل نہ ہو، مگر اہل سنت کہتے ہیں کہ یہ شرائط ضروری نہیں ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ایک نابینا شخص مثلاً اگر مشرق میں ہو تو بھی وہ ایک سیاہ چیونٹی کو دیکھ سکتا ہے جو کہ ایک ایسے ہی سیاہ پتھر پر بیٹھی ہو اور وہ پتھر رات کی تاریکی میں نقطہ مغرب میں پڑا ہوا ہو اور بکثرت حجابات اور حائل ہونے والی چیزیں درمیان میں موجود ہوں اور اس کے برعکس وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک صحیح البصر شخص کے سامنے بلند و بالا مختلف رنگ رکھنے والے پہاڑ موجود ہوں جو سر بفلک اونچے اور روشنی میں متحقق اور موجود ہوں تاہم ممکن ہے کہ شخص ان پہاڑوں کو نہ دیکھ سکے گویا ان بدیہات کے انکار سے ان کا اپنا مقصد اپنے اس فاسد عقیدہ کو قرار دینے کی کوشش ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت اور دیدار ہوگا۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی اپنے "تحفہ" میں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مومنین آخرت میں اس کے دیدار سے

---

[۱] سوفسطائیت اس حکمت کا نام ہے جس کی بنیاد وہم پر ہے۔ سوفسطائی حکماء کا ایک گروہ ہے جس کی بنیاد وہم پر ہے اور حقائق کو نہیں مانتے، لغات فیروزی، صفحہ: ۳۰۷

[۲] گو (ف) گیند الخ، لغات فیروزی، صفحہ: ۳۱۱۔

مشرف ہوں گے اور کافر و منافقین اس نعمت سے محروم رہیں گے۔ یہی ہے ان کا مذہب، انتہیٰ کلامہ۔

ان لوگوں کا یہ عقیدہ کہ جس پر انہیں بڑا فخر ہے اس کی نہ کوئی دلیلِ عقلی ہوسکتی ہے اور نہ ہی آیاتِ محکمات اور احادیث میں سے کوئی دلیلِ نقلی، عقلی کے فقدان کی وجہ یہ ہے کہ خود حضرات کا امام فخر الدین رازی ان کے دلائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: نظهر لك من مجموع الخ، کہ جو کچھ ہم نے ذکر کردیا ہے اس کے مجموعہ سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوگئی ہے کہ اس مسئلہ میں ادلہ قوی نہیں ہیں۔

ہم کہتے ہیں حق یہ ہے کہ ان لوگوں کا عقیدہ بداہتِ عقل کے منافی ہے جیسے کہ سابقاً واضح ہو چکا اور اس اعتقاد کا بطلان واضحات میں سے ہے لیکن ان کے امام مذکور کا اس ہمہ دانی کے باوجود سپر انداختہ ہوکر کنایہ کے طور پر یہ اعتراف کرنا کہ ان کے دلائل عقلیہ ضعیف اور کمزور ہیں حالانکہ کنایہ تصریح سے زیادہ بلیغ اور زوردار ہوتا ہے ہمارے لئے ان کی ادلہ کی کمزوری کے لئے کافی ثبوت ہیں۔

رہا مسئلہ رؤیت میں ان کے دلائل نقلیہ جن پر اعتماد کرکے انہوں نے مقتضائے عقل سے دستبرداری اختیار کرلی ہے ان کے منجملہ ایک دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا دکھائی دینا ممکن نہ ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو پیغمبر مرسل تھے اپنے قول: رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ (سورۃ الاعراف، آیت: ۱۴۳)، جناب رب العزت سے رؤیت کا سوال نہ کرتے کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حال دو صورتوں سے باہر نہیں ہوسکتا، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان امور کا علم حاصل ہوگا جو خدا کے حق میں ممکن ہیں اور ان کا بھی کہ جو ناممکن ہے یا ان امور کا آپ کو علم نہیں ہوگا۔ پہلی صورت پر سوال کا عبث ہونا لازم آتا ہے اور دوسری صورت پر کلیم اللہ کا العیاذ باللہ جہل لازم آتا ہے، یہ ہے ان کے استدلال کا خلاصہ اور ماحصل۔

مگر تعجب ہے کہ یہ لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قول کی طرف تو نظر کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے جو جواب دیا ہے "لن ترانی" اس کی طرف نگاہ نہیں کرتے حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے از خود سوال نہیں کیا تھا بلکہ جب آپ کی قوم نے اصرار کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ضرور اس کا سوال کریں اور باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سمجھانے کے انہوں نے اس پر ضد کی حتیٰ کہ حضرت موسیٰ کے لئے سوائے سوال کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تو اس وقت آپ نے سوال کیا جیسا کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے کلام عالی مقام سے اس اجمال کی تفصیل واضح ہوجاتی ہے۔

علی بن جہم نے روایت کی ہے کہ مامون رشید نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آیت کریمہ: وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ (سورۃ الاعراف، آیت: ۱۴۳) کیا معنی رکھتی ہے؟ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ موسیٰ کلیم اللہ اس قدر بھی نہ جانتے ہوں کہ خداوند عالم کا دکھائی دینا ممکن نہیں ہے تا آنکہ نوبت بایں جا رسید کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب رب العزت سے دیدار کرانے کا سوال کیا۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام[1] نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالا اور برتر ہے کہ آنکھوں کے ساتھ دکھائی دے لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور آپ نے اپنی قوم کو اس کی خبر دی کہ اللہ جل شانہ نے ان کو اپنے مکالمہ کے شرف سے سرفراز کیا ہے اور موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی ہے تو آپ کی قوم نے کہا کہ ہم تم پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے اور اس امر میں آپ کی تصدیق نہیں کریں گے جب تک کہ ہم خود اپنے کانوں سے اس طرح کے کلام کو نہیں سنیں گے جس طرح کہ آپ نے سنی ہے اور آپ کی قوم اس وقت سات لاکھ کی تعداد میں تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ۷۰ ہزار آدمیوں کا انتخاب کیا پھر ان میں سے سات ہزار کا انتخاب کیا پھر ان میں سے سات سو کا اور پھر ان میں سے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا اور ان کو اپنے ساتھ لے کر کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور دامن کوہ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر خود پہاڑ کے اوپر تشریف لے گئے اور بارگاہ رب العزت میں عرض کیا کہ اللہ جل شانہ پھر ان کو اپنی ہم کلامی کا شرف بخشئے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عرض کو شرف قبولیت حاصل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی ہم کلامی کے شرف سے نوازا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے باری تعالیٰ کے کلام کو ہر شش جہت سے سنا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں عرض گزار ہوئے کہ اس وقت تک ہم یقین نہیں کر سکتے کہ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جب تک کہ ہم اسے ظاہر بظاہر اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔ لہٰذا یہ سب کے سب اس سوال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عتاب کا مورد ہو کر ہلاک ہو گئے اور اپنی جانیں انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان حالات کو دیکھا تو دربار ربّ العزت میں عرض گزار ہوئے کہ اے پروردگار جب میں تنہا واپس جاؤں گا تو بنی اسرائیل مجھ پر اعتراض کریں گے اور طعنہ دیں گے اور کہیں گے کہ تو چونکہ اپنے دعوے میں سچا نہیں تھا اس لئے تو نے ان کو قتل کر دیا تو اس وقت میں کیا جواب دوں گا اور کون سے عذر کے ذریعہ ان سے نجات حاصل کروں گا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ واپس بھیج دیا۔

قوم موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں کہ وہ اپنی ذات پاک کو تیرے سامنے ظاہر کرے اور پھر آپ ہمیں اس کی کیفیت کے متعلق خبر دیں تو ہمیں اس کی کمال معرفت حاصل ہو جائے گی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ اے قوم: اللہ تعالیٰ کو ان سر والی آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا اور اس کی کوئی کیفیت نہیں ہے اور اس پاک پروردگار کی معرفت ان علامتوں اور نشانیوں میں منحصر ہے جن کو اس نے اپنی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے ان کے کلام کو گوش قبولیت سے سماعت نہ کیا اور اپنے سوال پر اصرار کرنے لگے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ رب العزت میں عرض کیا کہ پروردگار تو میری قوم کے کلام کو سن رہا ہے تو اس امر کو بہتر جانتا ہے جس میں ان کی اصلاح اور بہتری ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ آپ اس کے متعلق

---

[1] اس روایت کے لئے ملاحظہ ہو الاحتجاج للطبرسی، صفحہ: ۲۳۷۔

سوال کریں جو یہ لوگ آپ سے کہتے ہیں اور اس امر کے باعث میں تجھ سے تیری قوم کی جہالت کے سبب مواخذہ نہیں کروں گا۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ ؕ قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ وَلٰکِنِ انۡظُرۡ اِلَی الۡجَبَلِ فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرٰىنِیۡ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ جَعَلَهٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوۡسٰی صَعِقًا ۚ فَلَمَّاۤ اَفَاقَ قَالَ سُبۡحٰنَکَ تُبۡتُ اِلَیۡکَ وَاَنَا اَوَّلُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ[1] بعد ازاں حضرت علیہ السلام نے "تُبۡتُ اِلَیۡکَ" کی تفسیر میں فرمایا کہ میں نے اپنی قوم کی جہالت سے روگردانی کر کے اپنی اس معرفت کی طرف رجوع کیا جو مجھے تیری ذات کے متعلق حاصل ہے اور میں پہلا وہ شخص ہوں جو اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ تو دکھائی نہیں دے سکتا۔

حضرت والد ماجد اعلی اللہ مقامہ کتاب صوارم میں فرماتے ہیں کہ اس مطلب اور معنی کا قرینہ اور دلیل کہ اللہ تعالیٰ کا دکھائی دینا ممکن نہیں ہے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَاِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی الخ (سورۃ البقرہ، آیت:۵۵) کہ اس وقت کا تذکرہ کیجئے جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم تیرے لئے ہرگز ایمان نہیں لائیں گے یہاں تک کہ ہم اللہ تعالیٰ کو ظاہر بظاہر دیکھیں تو پھر ایمان لائیں گے اس پر بجلی کے عذاب نے آلیا حالانکہ تم دیکھ رہے تھے۔

نیز اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: وَاخۡتَارَ مُوۡسٰی الخ (سورۃ الاعراف، آیت:۱۵۵)، کہ موسیٰ نے ہمارے وعدہ کو پورا کرنے کے لئے کوہ طور پر لے جانے کے لئے ستر آدمیوں کو چنا پھر جب ان کو زلزلہ نے آلیا تو موسیٰ نے عرض کیا کہ اے پروردگار اگر تو چاہتا تو پہلے ہی ان کو بھی اور مجھ کو بھی ہلاک کر دیتا، کیا اب ہمارے بے وقوفوں اور احمقوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی وجہ سے تو ہمیں ہلاک کرتا ہے۔

نیز فرمایا کہ اس کی دلیل خداوند تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے: فَقَدۡ سَاَلُوۡا مُوۡسٰۤی اَکۡبَرَ الخ (سورۃ النساء، آیت:۱۵۳) کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے تو اس سے بڑا نامناسب سوال کیا تھا کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کی ذات ظاہر بظاہر دکھا دے۔

والد گرامی کا یہ جواب نہایت ہی محکم اور پختہ ہے جو کہ واضح دلائل پر مشتمل اور ائمہ طاہرین علیہم السلام کی حدیث کے ذریعہ تائید یافتہ ہے اور شیخ صدوق ابن بابویہ رحمۃ اللہ علیہ اور سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اعلی اللہ مقامہ نے اسی جواب کو اختیار کیا ہے۔

شیخ اجل ابو الفتوح رازی اپنی تفسیر میں اللہ کے فرمان: وَلَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ الآیۃ، کے تحت اس طرح فرماتے ہیں جیسا کہ ان کے متعلق منقول ہوا ہے یہ فرمان الٰہی ان لوگوں کے قول کے بطلان کی دلیل ہے جو کہتے ہیں کہ دیدار کا سوال

---

[1] سورۃ الاعراف، آیت: ۱۴۳، تو موسیٰ نے کہا اے پروردگار تو مجھے اپنی ذات دکھا دے تاکہ میں تیری طرف نگاہ کروں تو خداوند عالم نے ارشاد فرمایا کہ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکے گا لیکن اس پہاڑ کی طرف نگاہ کیجئے اگر وہ اپنے مقام پر قرار پکڑے رہا تو عنقریب تم مجھے دیکھ سکو گے لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ پر اپنی تجلی ڈالی تو اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے پھر تھوڑی دیر بعد جب ہوش میں آئے تو کہا کہ اے پروردگار بے شک تو دکھائی دے سکنے سے پاک و پاکیزہ اور بلند تر ہے، میں تیرے دربار میں توبہ گار ہوتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ سے موسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی طرف سے کیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تصریح کر دی ہے کہ یہ سوال ان کی طرف سے یعنی قوم موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے تھا اور ان کے سوال کے لفظ: حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً کا حوالہ دے دیا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ عذاب کی بجلی جو آسمان سے آئی وہ ان لوگوں پر پڑی جو سوال کرنے والے تھے موسیٰ علیہ السلام اس سے محفوظ اور صحیح وسالم رہے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوال کیا ہوتا تو پہلے بجلی موسیٰ پر پڑتی۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور آیت میں یوں فرمایا ہے: يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ الخ کہ اہل کتاب تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ تو ان پر آسمان سے کتاب نازل کردے تو موسیٰ علیہ السلام سے تو اس سے بھی زیادہ نامعقول سوال انہوں نے کیا تھا کیونکہ انہوں نے کہا تھا: نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً، کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات ظاہر دکھادے، اَتُهْلِكُنَا الخ کہ پروردگار: جو کچھ ہم میں سے سفہاء اور احمقوں نے کیا ہے اس کے باعث کیا تو ہمیں ہلاک کرتا ہے۔

سبحان اللہ: بنی اسرائیل کی جس جاہل جماعت نے کمال تمنا سے اس سوال کا اصرار کیا تھا انہیں تو عذاب کی بجلی نصیب ہوئی اور موسیٰ علیہ السلام کو پڑوس میں ہونے کے باعث بے ہوشی نصیب ہوئی اور وہ پہاڑ کہ جو ان جاہلوں کے قدم رکھنے کا مقام تھا اسے یہ حالت نصیب ہوئی کہ ریزہ ریزہ ہو گیا، نہ معلوم ان لوگوں کا نصیب کیا ہوگا جو صدق دل سے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جسموں اور رنگوں کی طرح خداوند عالم کا ظاہر بظاہر دیدار ہوگا، انتہیٰ کلامہ۔

اس مقصد کی تائید میں کتب فریقین سے دیگر دلائل و براہین اور دیگر جوابات کتاب صوارم میں مذکور ہیں جسے شوق ہو اس کی طرف رجوع کرے۔ ان کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دیدار کو پہاڑ کے قرار پکڑنے پر معلق اور موقوف کیا تھا اور پہاڑ کا استقرار فی نفسہٖ امر ممکن ہے اور ممکن پر جو موقوف ہو وہ بھی ممکن ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ پہاڑ کا استقرار فی نفسہٖ ممکن ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فرمان "لن ترانی" کے پیش نظر اور خداوند عالم کے پہاڑ کے متعلق اس علم ازلی کے پیش نظر کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائے گا وہ ممتنع اور ناممکن ہے (اقول) بعض علماء نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ پہاڑ کے ریزہ ریزہ ہونے کی حالت میں پہاڑ کا استقرار فی نفسہٖ ممتنع اور ناممکن ہے اور دیدار پروردگار جس استقرار پر موقوف تھا وہ اسی حالت کا استقرار تھا لہٰذا دیدار خدا امر ممکن پر نہیں امر محال پر معلق اور موقوف ہے۔ (مترجم)

ان کے دلائل میں سے ایک یہ آیت بھی ہے: وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝[1]، نیز یہ آیت بھی ہے جو حق کفار میں وارد ہوئی ہے: كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝[2]، عبدالعزیز دہلوی کہتا ہے لہٰذا

(۱) سورۃ القیامۃ، آیت ۲۲۔ ۲۳۔ کچھ چہرے اس دن تروتازہ اور ہشاش بشاش ہوں گے جو اپنے پروردگار کی نعمت کو دیکھ رہے ہوں گے۔
(۲) سورۃ المطففین، آیت: ۱۵، بے شک یہ لوگ اپنے پروردگار کی رحمت سے روک دیئے جائیں گے۔

معلوم ہوا کہ مومنین کے لئے حجاب نہیں ہوگا۔

پہلی آیت سے استدلال کا جواب یہ ہے کہ لفظ "نظر" لغت عرب میں چند معنوں کے لئے آیا ہے ایک رؤیت جیسے کہ وہ ادعا کرتے ہیں، دوسرے انتظار، تیسرے دیکھنے کے لئے آنکھ کے ڈھیلے کو حرکت دینا اور چونکہ دلائل عقلیہ ونقلیہ کے ذریعے معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رؤیت حقیقۃً محال ہے اس لئے دیدار چشم اس جگہ مراد نہیں ہوسکتا اور اس آیت کو صحیح معنوں پر محمول کرنا ممکن ہے۔ لہٰذا محال معنی کو اختیار کرنا اور اس پر اعتماد کرنا نادانی اور حماقت ہے۔

اس اجمال کی تفصیل اور اس مقال کی توضیح یہ ہے کہ فخر الدین[۱] نے لفظ "نظر" کے متعلق ان تینوں معنوں کو نقل کیا ہے اور پہلے معنی کو اس نے ترجیح دی ہے جیسے کہ ان کا مذہب ہے اور شاہ عبدالعزیز دہلوی نے کہا ہے کہ آیت مذکورہ میں لفظ نظر "الیٰ" کے ساتھ متعدی واقع ہوا ہے اس سے رؤیت حقیقی اور دیدار چشم کے علاوہ دیگر کسی معنی کا احتمال نہیں رکھتا حالانکہ اس کے ثبوت کی تقدیر پر بھی یعنی ہرگز مراد نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ امر بدیہی ہے کہ نظر صرف وہ چیز آسکتی ہے جو جسم ہو اور صورت و مکان رکھنے والی ہو اور ایسی جہت میں ہو جو نظر کرنے والے کے سامنے اور بالمقابل ہو لہٰذا اگر دیدار چشم مراد لیں تو مذکورہ سارے لوازم ان کو اللہ تعالیٰ کے لئے تسلیم کرنا پڑیں گے جیسے کہ ان کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کیونکہ ملزوم کا اپنے لوازم سے منفک اور جدا ہونا محال ہے اور لفظ "الیٰ" کہ جو مسافت کی انتہا پر دلالت کرتا ہے اس تقدیر پر وہ خداوند عالم تک مسافت کے منتہی ہونے پر دلالت کرے گا اور اس سے اللہ تعالیٰ کا مکانی ہونا لازم آئے گا۔

علامہ سیوطی نے اپنی تفسیر میں عبدالرزاق، احمد، عبدالحمید، بخاری[۲] مسلم، نسائی دارقطنی، اور بیہقی سے ابو ہریرہ کے ذریعہ ایک طولانی روایت نقل کی ہے جس کے بعض فقرات کا حاصل مضمون یہ ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ آیا بروز قیامت ہم خداوند عالم کو دیکھ سکیں گے تو حضرت نے فرمایا کہ تم بروز قیامت خداوند عالم کو اس طرح دیکھو گے کہ جس طرح آفتاب اور ماہتاب کو تم اس وقت دیکھتے ہو جب کہ ان کے سامنے کوئی حجاب اور کوئی چیز حائل نہ ہو اللہ تعالیٰ اس وقت تمام لوگوں کو جمع کرے گا اور ارشاد فرمائے گا کہ تم میں سے ہر شخص نے جس جس چیز کی اتباع اور پیروی کی تھی اس چیز کی اقتداء میں چلو لہٰذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کی پرستش کی تھی وہ اپنے معبود کی پیروی اور اقتداء میں چلے گا۔

اس امت کے مومنین اور منافقین اپنی جگہ پر باقی رہ جائیں گے اللہ تعالیٰ اس صورت کو متغیر اور ہیئات کو تبدیل کر کے ان کے سامنے آئے گا اور کہے گا کہ میں ہوں تمہارا پروردگار، وہ اپنے پروردگار کو پہچان نہیں سکیں گے۔ لہٰذا کہیں گے نعوذ باللہ ہم تیرے شر سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں ہم اپنی جگہ پر قائم ہیں تاوقتیکہ ہمارا پروردگار ہمارے پاس آئے اور

---

(۱) ملاحظہ ہو تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازی، ج ۸، صفحہ: ۲۸۴، ۲۸۵

(۲) صحیح البخاری، طبع مصر، ج ۴، صفحہ: ۹۵، باب الصراط وصحیح مسلم باب رؤیت المومنین فی الاخرۃ ربہم برنودی شرح المسلم ج ۱، صفحہ: ۱۰۰۔

اسے پہچان لیں۔

پھر اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اس صورت میں آئے گا کہ جس سے وہ اسے پہچان لیں گے وہ ان سے کہے گا کہ میں تمہارا رب ہوں تو وہ کہیں گے کہ بے شک تو ہی ہمارا رب اور پروردگار ہے لہٰذا وہ اس کی متابعت کریں گے۔

دوسری ایک روایت میں منقول ہے کہ خداوند عالم ایک اونچے مکان پر چڑھ کر جھانکے گا اور ان سے کہے گا کہ تم کون ہو؟ وہ کہیں گے کہ ہم مسلم ہیں تو خدا کہے گا کہ تم کیا انتظار کر رہے ہو؟ تو عرض کریں گے ہم اپنے پروردگار کے منتظر ہیں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر تم اسے دیکھو تو کیا اسے پہچان لو گے؟ تو کہیں گے کہ ہاں پہچان لیں گے تو خداوند عالم فرمائے گا کس طرح پہچانو گے حالانکہ تم نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے؟ تو وہ عرض کریں گے کہ ہم اسے اس طرح پہچانیں گے کہ وہ نظر نہیں رکھتا۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کے سامنے ایسی حالت میں ظاہر ہوگا کہ خوش باش اور خندہ پیشانی ہوگا۔

اور آیت کریمہ: يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ (سورۃ القلم، آیت: ۴۲) کی تفسیر میں ایک دوسری روایت بخاری، ابن منذر، ابن مردویہ نے ابوسعید سے نقل کی ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے جناب رسول خدا ﷺ کو یوں فرماتے سنا کہ ہمارا پروردگار بروز قیامت اپنی پنڈلی سے پردہ اٹھائے گا تو ہر وہ مومن مرد اور مومن عورت اس کے سجدہ میں گر جائیں گے جنہوں نے دنیا میں اس کی خالص عبادت کی ہوگی اور جس شخص نے ریاکاری اور شہرت حاصل کرنے کے لئے اس کی اطاعت کی ہوگی، اس کی پشت اس طرح سخت ہو جائے گی کہ سجدہ کی طرف جھکا نہ جا سکے گا۔[1]

اور مسند ابن راہویہ طبرانی، دارقطنی اور دیگر لوگوں سے حاکم کی تصحیح کے ساتھ ایک طولانی حدیث منقول کی ہے جس کے بعض الفاظ کا ماحاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بروز قیامت مسلمانوں سے پوچھے گا کہ ہر شخص اپنے معبود کی اتباع کے باعث اس کے پیچھے چلا گیا تم کس فکر میں ہو؟ وہ کہیں گے ہمارا ایک پروردگار ہے جسے ہم نے اس وقت تک دیکھا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اگر تم اسے دیکھ لو تو آیا پہچان لو گے؟ وہ کہیں گے ہمارے پاس اس کی ایک علامت ہے جس کے ذریعہ اگر ہم اسے دیکھ لیں تو پہچان لیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ وہ کیا علامت ہے؟ تو وہ کہیں گے کہ علامت ہے پنڈلی کو ظاہر کرنا۔ اللہ تعالی اپنی پنڈلی کھول دے گا تو وہ سب سجدے میں گر جائیں گے تا آنکہ سب کے سب بہشت میں دروازے کی طرف چل دیں گے اور بہشت کی منازل میں ادنیٰ منزل کو دیکھیں گے تو اس کی خواہش کریں گے تو حق تعالیٰ فرمائے گا کہ یہ منزل اگر تمہیں دے دی جائے تو ہوسکتا ہے کہ تم پھر کسی دوسری منزل کی خواہش اور خواستگاری کرو تو اس پر وہ خاموش ہو جائیں گے اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ تو عرض کریں گے ہم نے سوال کیا تھا مگر ہمیں اب حیاء لاحق ہوگئی ہے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آیا تم اس پر راضی نہ ہو کہ دنیا سے دس گنا زائد تم کو عطا کر دوں تو وہ کہیں گے کہ اے پروردگار! کیا تو ہمارے ساتھ تمسخر اور ٹھٹھہ مخول کرتا ہے؟ عبداللہ جب اس مقام پر پہنچا تو کہا

[1] صحیح مسلم، باب رؤیۃ المومنین فی آخرۃ ربھم، تفسیر محمد ابن جریر طبری، ج ۲۹ صفحہ: ۲۳ تفسیر نیشاپور برحاشیہ تفسیر ابن جریر، ج: ۲۹، صفحہ ۲۲۔

کہ اللہ تعالیٰ اس وقت اس قدر ہنسے گا کہ اس کے آخری دانت اور حلق کا لٹکا ہوا گوشت ظاہر ہو جائے گا۔

اس قسم کی روایتیں اس کتاب میں بکثرت درج ہیں۔ ان سب روایتوں سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ دیدارِ خدا کی صورت میں جسمیت اور مکانیت وغیرہ لوازمِ رؤیت متحقق ہو جائیں گے بلکہ جو مضحکہ خیز چیز ہے وہ یہ ہے کہ دیدار میں جو چیزیں ضروری نہیں ہیں جیسے ہنسنا اور داڑھوں اور حلق کے لٹکے ہوئے گوشت کا ظاہر ہونا بھی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت کرتے ہیں، تعالی اللہ عن ذلك علوا كبيرا اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات اس قسم کی چیزوں سے پاک اور پاکیزہ ہے اور اگر باوجود اپنے مشائخ معتمدین کی ان روایت کے اگر ان کو اللہ تعالیٰ کے تقدس وتنزیہہ کا خیال ہوتو پھر رؤیت کے ادعا اور آیت کو اس معنی پر محمول کرنے سے دست کش ہو جائیں اور شیعوں کے معانی حقہ کی طرف رجوع کریں۔

چونکہ ان امور کی قباحت اور جمہور کے اس مذہب مشہور کے لوازم کی خرابی اور بطلان اس قدر واضح اور روشن ہے کہ منافی بداہت کہا جا سکتا ہے اس لئے علماء اہل سنت سے محققین ان قبائح و شنائع کے لازم وملزوم آنے کو سوچ کر تاویل کے درپے ہو گئے ہیں حتیٰ کہ علامہ قوشجی نے رؤیت حقیقیہ کی نفی پر اتفاق علماء کا ادعا کرتے ہوئے کہا ہے: لانزاع للنافين الخ کہ رؤیت کی نفی کرنے والوں کے درمیان اس امر میں تو کوئی نزاع اور جھگڑا ہی نہیں کہ بروز قیامت اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات کا علمی کامل انکشاف مخلوق کے لئے جائز اور ممکن ہے اور نہ ہی اثبات کنندگان کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صورت کا آنکھ پتلی میں مرتسم اور منطبع ہونا یا آنکھ سے نکلنے والی شعاع کا ذات پاک پروردگار سے اتصال پذیر ہونا ممتنع اور محال ہے۔ ان کے علماء محققین نے بالخصوص نزاع کا محل حالت ادراکیہ خاصہ کو قرار دیا ہے کہ جو رؤیت و دیدار کا حقیقی معنی ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ علم تمام کی طرف راجع ہوتا ہے اور شیعہ جو تاویل کرتے ہیں وہ اس کے قریب ہے اس لئے ان کے امام فخر الدین رازی نے کہا ہے کہ بے شک اس مسئلہ میں تحقیق یہ ہے کہ مثبتین و نافین کا اختلاف اس میں نزاع لفظی کے قریب ہے لیکن شاہ صاحب ان کی سنت قدیمہ کو محکم پکڑے ہوئے حقیقی معنی میں رؤیت دیدار کے الزام کی صراحت کرتے اور اس پر فخر ومباہات کرتے ہیں اور اپنے علماء محققین کی اس تمام کوشش ناکام کو تباہ اور برباد کرتے ہیں کہ جو انہوں نے ان کی پردہ پوشی کے متعلق اختیار کی تھی اور بمفاد مثل مشہور "ہمہ آش درکاسہ وہی" مذہب باطل اپناتے ہوئے سوفسطائیہ کی اقتدا اور انکار بداہت کی قباحت اختیار کر کے جواب سے چشم پوشی اختیار کر لی ہے۔

ہاں تو پھر فرمادیں کہ جب دیدار حقیقی مراد لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کو جسم دیکھنے والے کے سامنے اور خاص جہت و مکان میں ہونے والا قرار دیا ہے جیسے کہ ان کا فرقہ مشبہہ ان کی روایات کے مطابق اس کا قائل ہوا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی جسمیت اور جسمانیت سے مراد تنزیہہ اور پاکیزگی کا ادّعاء مباحث الٰہیات میں کس طرح کر دیا ہے البتہ شرم وحیاء کا پردہ اپنے چہرے سے ہٹا کر اللہ تعالیٰ کی جسمیت اور جسمانیت کی تصریح نہیں کرتے اور اگر علم تمام بذاتِ الٰہی حاصل ہو جانے

کے ساتھ تاویل کریں تو پھر شیعوں کا کیا قصور ہے حالانکہ شیعوں نے اس آیت میں یہ تاویل بھی نہیں کی ہے بلکہ دوسرے معنی مراد لئے ہیں جو احادیث کے نصوص صریحہ اور اہل لغت کی ان تصریحات کے مطابق ہیں جو انہوں نے اس مقام پر ذکر کی ہیں۔

اول یہ کہ "ناظرہ" کا لفظ اس آیت میں "منتظرہ" کے معنی میں ہے اور "الیٰ" حرف جر ہے، احتجاج طبرسی[1] میں امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ وُجُوْہٌ یَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ کی تفسیر میں حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ حالت اس مقام اور اس جگہ کی ہوگی کہ جب دوستانِ خداوند عالم حساب سے فراغت حاصل کر کے ایک نہر کی طرف جائیں گے جس کا نام حیوان ہے اس میں وہ غسل کریں گے اور اس کا پانی پئیں گے تو وہ تروتازہ ہو جائیں گے، صورتیں ان کی نورانی ہو جائیں گی، ہر قسم کے میل کچیل اور کثافت ان سے دور ہو جائے گی۔ اس کے بعد بہشت عنبر سرشت میں داخل ہونے کا انہیں حکم دیا جائے گا تو یہ وہ مقام ہوگا جہاں وہ اپنے رب کے انتظار میں ہوں گے کہ کیسے ان کو ثواب سے سرفراز کرتا ہے۔

کتاب الاحتجاج میں ہی ہے کہ بعض لغتوں میں لفظ "ناظرۃ"، "منتظرہ" کے معنی میں آیا ہے۔ کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا: فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ، یعنی حضرت بلقیس نے کہا کہ میں منتظر ہوں کہ قاصد کیا جواب لاتے ہیں، ان کی کتب میں بھی اس کی مثال اس لفظ کی تفسیر میں وارد ہوئی ہے۔ علامہ سیوطی نے اپنی تفسیر دُرّ منثور میں کہا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے ابوصالح سے اللہ تعالیٰ کے فرمان وُجُوْہٌ یَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ، کے متعلق حدیث نقل کی ہے کہ فرمایا نَّاضِرَةٌ بمعنی خوبصورت اور تروتازہ اور اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے ثواب کی طرف منتظر ہوں گی۔

جناب علامہ فہامہ والد ماجد اعلی اللہ مقامہ اس قسم کی روایات نقل کرنے کے بعد فخر الدین رازی کے کلام سے عدلیہ کی حکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بکثرت صحابہ اور تابعین نے حضرت علی علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں اس طرح روایت کی ہے کہ وہ آخرت میں بھی اس کیفیت سے دیکھیں گے جس طرح وہ دنیا میں دیکھتے تھے لیکن وہ انتظار میں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کونسی نعمتیں اور کونسا احسان انہیں حاصل ہوتا ہے۔

سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ نافع ارزق نے ابن عباس سے پوچھا تو ابن عباس نے کہا کہ نَاظِرَةٌ کا معنی یہ ہے کہ اہل جنت اللہ تعالیٰ کی رحمت، کرامت و اعزاز کا انتظار کریں گے، یہ معنی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے کیونکہ آنکھیں اس کی ذات پاک کا ادراک نہیں کرسکتیں۔ نیز سعید سے بھی اور مجاہد سے بھی روایت ہے کہ اس آیت وُجُوْہٌ یَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ کا معنی یہ ہے کہ وہ چہرے خوبصورت اور ہشاش بشاش ہوں گے اور اپنے پروردگار کے ثواب کی طرف منتظر ہوں گے۔

---

[1] الاحتجاج للطبرسی، صفحہ: ۲۹۔

اور ہم کہتے ہیں کہ امامیہ اثناء عشریہ کے طریقہ سے ان احادیث کی مؤید احادیث بکثرت وارد ہوئی ہیں لہٰذا کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ باوجود مسلمانی کے دعویٰ کے کلامِ اہل بیت اطہار علیہم السلام کو العیاذ باللہ پس پشت ڈال دیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی کتاب ناطق ہیں اور تمام امت کے اجماع واتفاق کے مطابق اہل اسلام کو ان سے تمسک کرنے اور ان کی اتباع اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور آیات قرآن کی تفسیر میں ان کی طرف رجوع کرنے کا ارشاد فرمایا گیا ہے اور حسبنا کتاب اللہ کے قائل کی تقلید کرتے ہوئے احد ثقلین یعنی اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روگردانی اختیار کر کے بمقتضائے من تخلف عنها هویٰ، اپنے آپ کو گمراہی کے سمندر میں غرق کر دیں، انتہیٰ کلامہ اعلی اللہ مقامہ ہے۔ اور یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ لفظ "نظر" انتظار کے معنی میں ہو تو اس کا تعدیہ لفظ "الیٰ" سے واقع نہیں ہوا۔ اس کے دفعیہ اور جواب کے لئے امام فخر الدین رازی کا کلام ہی کافی ہے کیونکہ اس نے اپنی تفسیر کبیر میں کہا ہے کہ اسکے متعلق مقام تحقیق یہ ہے کہ نظر انتظار کے معنی میں از استعمال نظر نہ بغیر صلہ کے اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کہ خود کسی انسان کا انتظار مقصود ہو لیکن جب کہ کسی کے انعام، احسان اور مدد کی انتظار کا معنی مراد ہو تو پھر "نظرت الیہ" "الیٰ" کے تعدیہ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کتاب صوارم کے الٰہیات میں دیگر شواہد و مسندات بھی موجود ہیں۔

آیت کریمہ وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ۙ الخ، کا دوسرا حل، یہ ہے کہ نقطہ "نظر" خواہ انتظار کے معنی میں ہو خواہ دیدار اور رؤیت کے معنی ہر دو صورت لفظ "الیٰ" حرفِ جر نہیں ہے بلکہ آلاء کا مفرد ہے جو کہ نعمت کا نام ہے جیسا کہ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الغرر والدرر میں بعض فضلاء سے نقل کیا ہے کہ "الیٰ ربہا" سے مراد "نعمۃ ربھا" ہے لیکن وہ چہرے اپنے پروردگار کی نعمت کے منتظر ہوں گے یا اسے دیکھنے والے ہوں گے کیونکہ "آلاء" نعمتیں ہوتی ہیں، اس کے مفرد میں چار نعتیں ہیں (۱) ألاً جیسے قفاً (۲) ألی جیسے وصیٰ (۳) أَلِیٌ جیسے مَعِیٌ (۴) أَلِیَ جیسے خَشِیَ۔

والد مرحوم اعلی اللہ مقامہ نے جوہری سے نقل کیا ہے۔ آلاء نعمتیں ہوتی ہیں اور اس کا مفرد "ألی" ہے بالفتح اور کبھی کبھی مکسور بھی آتا ہے اور یاء کے ساتھ لکھا جاتا ہے اس کی مثال معیٰ اور امعاء ہے۔ فیروز آبادی سے منقول ہے کہ آلاء نعمتوں کو کہتے ہیں اس کا مفرد أَلِیَ، أَلوٌ، أَلیٰ اور أَلِی آیا ہے۔ ابن درید اور ابن سکیت دونوں سے مروی ہے مقصور و ممدود دونوں میں یہ ساری نعتیں وارد ہوئی ہیں اور یہ احتمال بہت واضح اور عمدہ ہے۔

مزیدار بات یہ ہے کہ فخر الدین رازی نے اس احتمال کے جواب میں یوں درفشانی کی ہے کہ "الیٰ ربہا" میں لفظ "الیٰ" کے حرف جر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ الف کے ساتھ "جو کہ بعد از لام" بغیر تنوین کے آیا ہے اور جو لفظ "الیٰ" نعمت کے معنی میں ہوتا ہے وہ تنوین کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے یہ احتمال تمہیں کوئی فائدہ بخش نہیں ہوسکتا مگر فخر الدین رازی بے چارہ اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکا کہ "الیٰ" بمعنی نعمت تنوین کے ساتھ اس وقت آتا ہے جب کہ یہ مضاف نہ ہو لیکن آیت کریمہ "الیٰ ربہا" میں صراحۃً اضافہ موجود ہے لہٰذا باوجود مضاف ہونے کے مُنَوَّن کیسے ہوسکتا ہے لہٰذا رازی صاحب نے جو فرق ظاہر کرنے

کی ناکام کوشش کی ہے وہ اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور ہمارے مطلب میں کوئی خلل پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ امر انتہائی طور پر ظاہر ہے لیکن رازی صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا، سچ ہے اللہ تعالیٰ نے جسے نور نہ بخشا ہو وہ نور سے خالی ہی ہوتا ہے۔

تیسرا حل:۔

آیت پاک "اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" کا تیسرا حل یہ ہے کہ یہ مجاز حذف ہے لہٰذا اصل کلام کی تقدیر اس طرح ہے: نَاظِرَةٌ اِلٰی رَحْمَةِ رَبِّهَا وَ ثَوَابِ رَبِّهَا، کہ وہ چہرے اپنے پروردگار کی رحمت کی طرف یا اس کے ثواب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے چنانچہ حضرت علامہ علی بن ابراہیم قمی نے اپنی تفسیر[1] میں فرمایا ہے: **ينظرون الى وجه الله اى الى رحمة الله و نعمته،** قمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اسی مجاز حذف ہی کے مطابق یہ الفاظ تحریر کئے ہیں اور جب دلیل نقلی یا عقلی حذف پر دلالت کرنے والی موجود ہو تو کسی کلمہ کو تقدیراً محذوف اور ساقط قرار دینے میں کوئی نقص و عیب لازم نہیں آتا۔ قرآن کریم میں اس کی بکثرت نظیریں موجود ہیں۔

چنانچہ ارشاد قدرت ہے: وَسْئَلِ الْقَرْيَةَ (سورۃ یوسف، آیت: ۸۲) **اى اسئل اهل القرية**۔[2]

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَجَاءَ رَبُّكَ، **اى أمر ربك**[3]،

نیز ارشاد پروردگار ہے: وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ، **اى الى توحيده**[4]

---

[1] تفسیر قمی، صفحہ ۲۶۰، مطبوعہ ۱۳۱۵ھ، طبع ایران۔

[2] مطلب یہ کہ لفظ "اسئل" اور القریۃ کے درمیان لفظ "اہل" محذوف ہے۔ گاؤں سے پوچھ لو یعنی گاؤں والوں سے پوچھ لو۔ اس حذف کی تصدیق کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر کبیر فخر الدین رازی، ج ۵، صفحہ: ۱۵۴، تفسیر ابوالسعو دالعمادی برحاشیہ تفسیر کبیر، صفحہ ۸۹، تفسیر محمد ابن جریر طبری، ج ۱۳، صفحہ: ۲۲، تفسیر کشاف، ج ۲، صفحہ: ۲۷۰، تفسیر حسن بن محمد النیشاپوری، ج ۱۳، صفحہ: ۳۷، برحاشیہ تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر مدارک التنزیل، ج ۱، صفحہ: ۴۰۶، تفسیر جامع البیان برجلالین، صفحہ: ۱۹۵، تفسیر جلالین صفحہ: ۱۵۱۔

[3] سورۃ الفجر آیت: ۲۲ مطلب یہ کہ لفظ "جاء" اور "ربک" کے درمیان مثل "امر" محذوف ہے، تیرا رب آئے گا یعنی تیرے رب کا امر آئے گا۔ اس حذف کی تصدیق کے لئے ملاحظہ ہوں کتب تفسیر عامہ نیشاپوری نظام الدین الاعرج بن محمد حسین القمی برحاشیہ تفسیر ابن جریر طبری ج ۳۰، صفحہ: ۹۰، تفسیر کبیر فخر الدین محمد بن عمر الرازی، ج ۸، صفحہ: ۴۲۸، تفسیر ابی السعود العمادی برحاشیہ تفسیر کبیر رازی، ج ۸، صفحہ: ۴۲۶، تفسیر کشاف، ج ۴، صفحہ: ۲۱۱، تفسیر مدارک تنزیل، ج ۳، صفحہ: ۳۴۹، تفسیر جلالین، ص ۴۹۷ اور کتب خاصہ تفسیر البیان للشیخ ابی جعفر محمد بن الطوسی اعلی اللہ مقامہ، ج ۲، صفحہ: ۷۷۲، تفسیر مجمع البیان للشیخ ابی الفضل بن حسن الطبرسی رضوان اللہ علیہ، ج ۵، صفحہ: ۴۸۸، تفسیر البرہان، مطبوعہ ۱۳۰۲ھ، ج ۲، صفحہ: ۱۱۹۰، تفسیر صافی للعلامۃ الفیض رحمۃ اللہ علیہ، صفحہ: ۴۸۱، ترجمہ مولانا فرمان علی، صفحہ: ۹۴۶، ترجمہ مولانا مقبول احمد، صفحہ: ۷۱۱۔

[4] سورۃ المومن آیت: ۴۲ مطلب اینکہ لفظ "الی" اور العزیز الغفار کے درمیان لفظ "توحید" اس کی مثل لفظ محذوف ہے۔ اس حذف کی تصدیق کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر ابن جریر طبری، ج ۲۴، صفحہ: ۴۰، تفسیر کبیر فخر الدین رازی، ج ۷ صفحہ: ۲۲۰، تفسیر البیان، ج ۲، صفحہ: ۵۳۵، مجمع البیان، ج ۲ صفحہ: ۵۲۵

کہ میں تمہیں عزیز غفار کی طرف یعنی اس کی توحید کی طرف بلاتا ہوں۔

مگر لفظ "ربك" سے پیغمبر خدا یا ائمہ ہدیٰ علیہم السلام مراد لینا یہ کلام غلات سے مشابہت رکھتا ہے۔ غیر اللہ پر علی الاطلاق لفظ "رب" کا اطلاق نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ایسا اطلاق کسی صحیح حدیث میں بلکہ معتبر یا غیر معتبر کسی بھی قسم کی حدیث میں نہیں دیکھا گیا۔ لہٰذا میانہ روی اور حتمی صورت کو اختیار کرنا لازم ہے کہ جو صراط مستقیم اور بلند مرتبہ مسلک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۝ (سورہ فصلت، آیت: ۳۰)، بے شک وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے اور پھر وہ مسلک ائمہ ہدیٰ پر استقامت پذیر ہوئے "بوقت موت" ان پر رحمت کے فرشتے نازل ہوں گے اور ان سے کہیں گے کہ تم کوئی ڈر اور خوف نہ کرو اور نہ کوئی افسوس کرو اور جس بہشت عنبر سرشت کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا اس کی خوش خبری حاصل کرو۔

حضرت علامہ فیض کاشانی نے تفسیر صافی[1] میں اس آیت: إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ، کے متعلق تحریر کیا ہے: اعترفوا بربوبيته و اقرار الوحدانية ثم استقاموا على مقتضاه، کہ اس کا معنی یہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اعتراف اور اس کی توحید کا اقرار کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے اور پھر اس اعتراف و اقرار کے مقتضا کے مطابق انہوں نے استقامت اختیار کی ان لوگوں پر فرشتے نازل ہوں گے اور جنت کی مذکورہ خوشخبری دیں گے اور کہیں گے کہ کوئی خوف خطرہ نہ کرو اور کوئی افسوس بھی مت کرو۔

حضرت علامہ علی بن ابراہیم قمی نے اپنی تفسیر قمی میں تحریر کیا ہے کہ اس آیت کے اس جملہ "ثُمَّ اسْتَقَامُوا" سے

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر صافی، صفحہ: ۴۰۹، مطبوعہ ۱۳۰۱ھ، طبع ایران۔ تفسیر صافی میں اس مقام پر مزید لکھا ہے کہ:

وفي نهج البلاغة: وَ إِنِّي مُتَكَلِّمٌ بِعِدَةِ اللهِ وَ حُجَّتِهِ قَالَ اللهُ تَعَالَى إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَ لَا تَحْزَنُوا وَ أَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ وَ قَدْ قُلْتُمْ رَبُّنَا اللهُ فَاسْتَقِيمُوا عَلَى كِتَابِهِ وَ عَلَى مِنْهَاجِ أَمْرِهِ وَ عَلَى الطَّرِيقَةِ الصَّالِحَةِ مِنْ عِبَادَتِهِ ثُمَّ لَا تَمْرُقُوا مِنْهَا وَ لَا تَبْتَدِعُوا فِيهَا وَ لَا تُخَالِفُوا عَنْهَا فَإِنَّ أَهْلَ الْمُرُوقِ مُنْقَطَعٌ بِهِمْ عِنْدَ اللهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

کہ نہج البلاغہ میں تحریر ہے کہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اللہ کے عہد اور اس کی حجت کے متعلق کلام کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے: ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا الخ کہ جن لوگوں نے کہا ہے کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے اور پھر اس پر انہوں نے استقامت اختیار کی اور تم نے یہ کہا ہے کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے لہٰذا تم اس کی پاک کتاب اور اس کے فرمودہ صحیح راستہ اور اس کی عبادت کے بہترین طریقہ پر استقامت اختیار کرو اسے اختیار کرنے کے بعد اس سے پھر خارج نہ ہو جاؤ اور اس میں بدعات بھی ایجاد نہ کرو اور اس کی مخالفت بھی مت کرو کیونکہ بروز قیامت در بار رب العزت میں نجات کاملہ اور مکمل کامیابی اہل مروت سے ہی مختص ہوگی۔

مراد یہ ہے کہ وہ ولایت امیر المومنین علی علیہ السلام کے بارے میں استقامت اختیار کریں گے۔

کافی شریف میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ "ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" کے الفاظ سے مراد یکے بعد دیگرے تمام ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی امامت پر استقامت اختیار کرنا ہے، تفسیر مجمع البیان (جلد:۵ صفحہ:۱۲) میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے متعلق مروی ہے کہ لوگوں نے آپ سے "ثُمَّ اسْتَقَامُوْا" کے الفاظ کا معنی دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے بخدا اس مسلک شیعہ اثنا عشریہ پر استقامت اختیار کرنا مراد ہے کہ جس پر تم قائم ہو لہٰذا اس سے مراد امام زمانہ (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کا مذہب اور اس کا مسلک ہے کہ جو دنیا میں صراط مستقیم ہے اور افراط و تفریط یعنی زیادتی اور کمی سے خالی ہے اور یہ استقامت بہت ہی مشکل اور دشوار امر ہے جو بھی شخص امام کے رستہ سے ہٹ کر کسی دوسری طرف دائیں یا بائیں جانب کو جائے گا وہ طریق حق اور صراط مستقیم سے خارج ہو جائے گا۔

اسی لئے ائمہ ہدیٰ علیہم السلام نے فرمایا: **امر نا صعب مستعصب**، کہ ہمارا معاملہ انتہائی دشوار اور مشکل[1] ہے۔ اور اسی لئے حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا: **هلك فيّ اثنان، ولا ذنب لي، مبغض مفرط و محب مفرط** (عیون اخبار الرضا، ج: ۳، صفحہ: ۱۵۷) کہ میری وجہ سے دو قسم کے لوگ ہلاک ہو جائیں گے ایک تقصیر کنندہ دشمن جو مجھے میرے شان اور مرتبہ سے گھٹاتے ہیں (جیسے وہ جنہوں نے سفینۂ اہل بیت علیہم السلام سے انحراف کیا اور اعتقادات فاسدہ اور خرافات باطلہ میں گرفتار ہو کر ہلاکت کے گڑھے میں گر گئے) اور دوسرے وہ میری محبت کا دم بھرنے والے جنہوں نے اس محبت کے معاملے کو افراط اور غلو تک پہنچا دیا، جیسے وہ لوگ جو حضرات ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کی ربوبیت اور ان کی الوہیت کے قائل ہو گئے یا جنہوں نے ان معصومین علیہم السلام کے لئے وہ صفات ثابت کرنے کی کوشش کی جو خداوند عالم

---

[1] ائمہ علیہم السلام کا معاملہ دشوار اور مشکل اس لئے ہے کہ عموماً انسان تفریط یا افراط میں سے کسی ایک نقص کا شکار ہو جاتے ہیں اس لئے صراط مستقیم پر گامزن ہونے سے وہ محروم ہو جاتے ہیں تفریط میں واقع ہونے والے مثلاً وہ جو امیر المومنین علیہ السلام کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بلافصل اور اول خلیفہ نہیں مانتے ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو آپ سے بغض و عناد کو اپنا دین سمجھتے ہیں جیسے خارجی اور ناصبی اور بعض وہ ہیں جو ان کے دشمنوں سے دوستی رکھتے ہیں کیونکہ دشمن کا دوست بھی انسان کا دشمن ہوتا ہے لہٰذا جو لوگ اغیار سے محبت رکھتے ہیں وہ اس وجہ سے امیر المومنین علیہ السلام کے دشمن ہیں کہ وہ ان سے دوستی رکھتے ہیں اور وہ امیر المومنین علیہ السلام کے دشمن تھے اور افراط میں گرفتار ہو جانے والے وہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یا امیر المومنین علیہ السلام یا کسی امام پاک کو رب العالمین یا الہ العالمین قرار دیں یا جو صفات خداوند عالم سے مختص ہیں مثلاً خالق ارواح و اجسام، رازق انام اور محی و ممیت ہونا معصومین علیہم السلام کے لئے ثابت کریں تو یہ سب واصل جہنم ہو جائیں گے اور فرمان امیر المومنین علیہ السلام: **هلك فيّ اثنان** الخ کا مصداق بن جائیں گے کیونکہ اول صورت پر شرک فی استحقاق عبادت لازم آتا ہے، دوسری صورت پر شرک فی الافعال لازم آتا ہے اور شرک ایسا گناہ ہے کہ جو توبہ کے بغیر نہیں بخشا جائے گا۔ خداوند عالم کا ارشاد پاک ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ. (سورۃ النساء، آیت: ۴۸) کہ اللہ تعالیٰ اس کے گناہ نہیں بخشے گا کہ کسی کو کسی طرح سے اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرایا جائے اور شرک پست درجہ کا گنا جس کے لئے چاہے گا بخش دے گا، لہٰذا دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مومن کو افراط و تفریط سے محفوظ رکھے اور محمد و آل محمد علیہم السلام کے نقش قدم و صراط مستقیم پر چلنے کی محبت اور توفیق عطا کرے اور اسی پر مومن کا خاتمہ ہو، بحق محمد و آل محمد علیہم السلام۔

سے مختص ہیں مگر میرا اس میں کوئی قصور نہیں کیونکہ وہ از خود شیطان کے گمراہ کرنے کے باعث ایسا کرتے ہیں میں نے ان کو ایسا حکم نہیں دیا بلکہ بڑی سختی سے منع کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ائمہ علیہم السلام نے فرمایا: **نزلونا عن الربوبیة وقولوا فینا ما شئتم**، کہ ہم کو درجہ ربوبیت سے نیچے رکھو اور پھر جو چاہو ہمارے متعلق کہو اور جو چاہو کہو کے الفاظ سے بھی مراد یہ ہے کہ ایسے فضائل میں سے جو چاہو کہو جو حد افراط وتفریط تک نہ پہنچے ہوئے ہوں اور ان کی عقلی یا نقلی کوئی صحیح دلیل موجود ہو جو الفاظ ذات پروردگار سے مختص ہیں اور جو صفات اس کی ذات پاک سے خصوصیت رکھتے ہیں ان کا اطلاق ائمہ علیہم السلام کی ذوات مقدسہ پر جائز نہیں ہے۔

آیت پاک: كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ (سورۃ المطففین، آیت: ۱۵) کے ذریعہ وہ جو استدلال کرتے ہیں کہ یہ آیت اپنے مفہوم مخالفت کے اعتبار سے دلالت کرتی ہے کہ مومنین اپنے پروردگار کی رؤیت اور دیدار سے محروم نہیں ہوں گے۔ اس استدلال کا جواب انتہائی واضح اور ظاہر ہے کیونکہ اس آیت میں وہ امر مذکور نہیں ہے جس سے کفار کی محجوبیت کا تعلق مقصود الٰہی ہے لہٰذا جس چیز سے محجوبیت کا تعلق ہے اس کے لحاظ سے آیت مجمل ہے حالانکہ مجمل آیت سے استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

ان لوگوں کو کہاں سے معلوم ہو گیا ہے کہ جس چیز سے محجوبیت کفار کا تعلق ہے اس سے مراد رؤیت اور دیدار ہی ہے تاکہ اس کے برعکس مومنین کے لئے رؤیت کا اثبات ہو سکے اور اگر فرض کیا جائے کہ کفار کی محجوبیت تمام جہات قرب کے اعتبار سے مقصود ہے تو پھر بھی یہ مقصود نہیں ہو سکتا کہ مومنین مفہوم مخالفت کے لحاظ سے تمام جہالت قرب سے محروم نہیں ہوں گے بلکہ زائد سے زائد اتنا ثابت ہو سکے گا کہ مومنین بعض مدارج قرب سے محجوب نہیں ہوں گے کیونکہ علم منطق کا مسئلہ مشہور ہے کہ ایجاب کلی[1] کا سلب سالبہ جزئیہ کے حکم میں ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ بعض مدارج قرب کا اثبات دیدار خداوند عالم کو مستلزم نہیں ہے۔

تعجب ہے کہ یہ حضرات ایسے واضح مسائل کو بھی نہیں سمجھ سکتے یا دیدہ دانستہ طور پر ان حقائق سے چشم پوشی کرتے ہیں علاوہ ازیں اس آیہ مبارکہ کے مفہوم مخالفت کو رؤیت اور دیدار سے رابطہ ہی کوئی نہیں کیونکہ لفظ "حجب عنہ" محاورۂ عرب میں اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جب کسی شخص کو حاکم یا امیر کے دربار میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے اور اسے اس سے منع کر دیا جائے لہٰذا یہ رؤیت اور دیدار کے منع کو مستلزم نہیں تاکہ اس کے مفہوم، مخالفت سے رؤیت کا اثبات کیا جا سکے نیز محاورۂ عرب میں کہا جاتا ہے "**حجب عن المیراث**" کہ فلاں شخص کو میراث سے محجوب کیا گیا یعنی اس سے اسے

---

[1] کیونکہ ایجاب کلی پر جو قضیہ مشتمل ہوتا ہے اسے موجبہ کلیہ کہتے ہیں اور موجبہ کلیہ کا نقیض سالبہ جزئیہ ہوتی ہے اس لئے ایجاب کلی کا سلب سالبہ جزئیہ کے حکم میں ہوتا ہے اور آیت مبارکہ: كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ (سورۃ المطففین، آیت: ۱۵) وجبہ کلیہ ہے اس کے مفہوم کی مخالفت کا تحقق سلب ایجاب کلی کی صورت میں ہوگا اور سالبہ جزئیہ اسے لازم ہے۔

روک دیا گیا اور اس مطلب کو بھی رؤیت کے ساتھ کوئی تعلق حاصل نہیں ہے لہٰذا اس آیہ مبارکہ سے منطوقاً یا مفہوماً کفار یا مومنین کی رؤیت کی نفی یا اثبات کیسے کیا جاسکتا ہے؟ غرض نہ اس آیت سے کفار کی رؤیت کی نفی مراد لی جاسکتی ہے اور نہ پھر مفہوماً مومنین کی رؤیت کا اثبات کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس آیت کو رؤیت پروردگار سے کوئی ربط ہی نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں اہل سنت مفسرین کے اقوال باہم اختلاف رکھتے ہیں جناب مولانا شیخ ابوعلی فضل بن حسن طبری نے اپنی تفسیر مجمع البیان[1] میں تحریر کیا ہے کہ حسن بصری اور قتادہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ کفار بروز قیامت اللہ تعالیٰ کے احسان اور اس کی رحمت سے محجوب اور محروم ہوں گے اور بعض نے یوں تفسیر کی ہے کہ کار رحمت خدا سے ممنوع اور اس کے ثواب سے مدفوع قرار دے دیئے جائیں گے وہ مقبولیت و رضائے پروردگار سے مشرف نہیں ہوسکیں گے، یہ ابو مسلم کے متعلق مروی ہے اور بعض نے کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ثواب اور اس کے اعزاز و اکرام سے محروم رہیں گے امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے مروی ہے۔

ابن بابویہؒ نے علی بن فضال سے روایت کی ہے کہ میں نے اس آیت مبارکہ کے معنی کے متعلق حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے[2] سوال کیا تو جناب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات والا صفات محتاج مکان نہیں وہ لا مکان ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی مکان میں تشریف فرما ہو اور اس کی خدمت میں حاضر ہونے سے لوگوں کو روک دیا جائے بلکہ: اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے رب کے ثواب سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ ان مباحث کی تفصیل والد ماجد حضرت علام احلہ دار المقام کی کتاب مستطاب عماد الاسلام اور صوارم میں بڑے بسط اور نقض و ابرام کے ساتھ موجود ہے جسے شوق ہو ان کی طرف رجوع کرے۔

آٹھویں صفت سلبیہ "محل حوادث کی نفی"

اللہ تعالیٰ کی آٹھویں صفت سلبیہ یہ ہے کہ وہ محل حوادث نہیں کیونکہ اگر وصف حادث اس کی ذات بابرکات کے لئے کمال ہو تو پھر اس کی ذات کا اس سے خالی ہونا محال ہوگا اور اگر وہ وصف حادث اس کی ذات اقدس کے لئے عیب اور نقص ہو تو پھر اس کی نفی اللہ جل شانہ کے لئے کمال ہوگی لہٰذا وہ اس وصف سے پھر متصف کیسے ہوسکے گا۔

---

(۱) ملاحظہ ہو تفسیر مجمع البیان ج ۵، صفحہ: ۴۵۴۔

(۲) سبحان اللہ کیا حکیمانہ انداز میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے سمجھایا، مقصد یہ کہ اگر خداوند عالم کی رؤیت اور دیدار کو ممکن قرار دیا جائے تو پھر اس کی ذات والا صفات کا کسی مکان اور کسی جہت خاص میں موجود ہونا لازم آئے گا جو اس کی جسمیت کو مستلزم ہے وتعالی الله عن ذلك علوا كبيرا، وہ لا مکان ہے اور کسی خاص جہت میں بھی اس طرح موجود نہیں جیسے ایک جسم والی چیز موجود ہوتی ہے لہٰذا آیت کا معنی وہ نہیں کیا جاسکتا جو مستلزم جسمیت ہو اس لئے اس کا معنی یہ ہے کہ کفار و فجار اس کے ثواب سے محروم ہوں گے۔

حضرت محمد بن یعقوب کلینیؒ کی مصنفہ کتاب کافی شریف[1] میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ عمرو بن عبید نے حضرت باقر العلوم علیہ السلام سے آیت مبارکہ: وَمَنْ يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوٰى کا معنی دریافت کیا تو حضرت نے فرمایا کہ اس آیت میں جو لفظ غضب وارد ہوا ہے اس سے مراد عذاب وعتاب خداوند ہے، اے عمرو: جو شخص گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تغیر پذیر ہوا ہے جیسا کہ انسان بوقت غضب وغصہ متغیر ہو جاتا ہے تو اس شخص نے اللہ تعالیٰ کو صفات[2] مخلوق کے ساتھ متصف قرار دے دیا ہے حالانکہ خداوند تعالیٰ کی ذات پاک ایسی نہیں ہے کہ اسے کوئی چیز حرکت میں لے آئے اور اسے متغیر کر دے۔

اور ہشام بن حکم[3] سے مروی ہے کہ ایک زندیق نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا خدا کے لئے رضا اور غضب ہے؟ تو حضرت نے فرمایا کہ ہاں ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح کہ مخلوقات میں پایا جاتا ہے کیونکہ بندوں کی

---

[1] اصول الکافی، ج۱، صفحہ:۲۰۱، طبع تہران، حدیث: ۵، متن عربی کے الفاظ یہ ہیں:۔
عِدَّةٌ مِنْ أَصْحَابِنَا عَنْ أَحْمَدَ بْنِ مُحَمَّدٍ الْبَرْقِيِّ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عِيسَى عَنِ الْمَشْرِقِيِّ حَمْزَةَ بْنِ الْمُرْتَفِعِ عَنْ بَعْضِ أَصْحَابِنَا قَالَ: كُنْتُ فِي مَجْلِسِ أَبِي جَعْفَرٍ علیہ السلام إِذْ دَخَلَ عَلَيْهِ عَمْرُو بْنُ عُبَيْدٍ فَقَالَ لَهُ جُعِلْتُ فِدَاكَ قَوْلُ اللهِ تَبَارَكَ وَ تَعَالَى وَ مَنْ يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَى مَا ذَلِكَ الْغَضَبُ فَقَالَ أَبُو جَعْفَرٍ علیہ السلام هُوَ الْعِقَابُ يَا عَمْرُو إِنَّهُ مَنْ زَعَمَ أَنَّ اللهَ قَدْ زَالَ مِنْ شَيْءٍ إِلَى شَيْءٍ فَقَدْ وَصَفَهُ صِفَةَ مَخْلُوقٍ وَ إِنَّ اللهَ تَعَالَى لَا يَسْتَفِزُّهُ شَيْءٌ فَيُغَيِّرَهُ.

[2] فقد وصفه صفة المخلوق کے الفاظ دال ہیں کہ صفات خالق اس طرح نہیں جیسے کہ مخلوق کی صفات ہیں اور اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ صفات مخلوق صفات انضامیہ ہوسکتی ہیں مگر صفات خالق جل شانہ ہمیشہ صفات انتزاعیہ ہوتی ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی صفات عین ذات ہیں اور وجہ اس کی ظاہر ہے کیونکہ صفات انتزاعیہ خارج میں بلکہ ظرف اتصاف میں اس طرح موجود نہیں ہوتیں کہ وہ زائد بر ذات موصوف ہوں کیونکہ خارج میں ان صفات انتزاعیہ کا موصوف موجود ہوتا ہے اور اس حیثیت میں موجود ہوتا ہے کہ اس سے صفات مذکور منتزع کی جاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ خارج میں صرف ذات خداوند عالم موجود ہے اور صفات اس کے اس کی ذات سے منتزع ہوتے ہیں اسی لئے وہ اپنی صفات علم وقدرت وغیرہ میں وحدہ لاشریک ہے جو شخص اس کی صفات میں کسی کو شریک قرار دے وہ مشرک فی الصفات ہوگا اور بغیر توبہ کے بخشا نہیں جائے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن بنا رہے گا۔

[3] ملاحظہ ہو اصول کافی، ج۱، صفحہ:۲۰۱، طبع تہران، اصل متن حدیث: عَلِيُّ بْنُ إِبْرَاهِيمَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَبَّاسِ بْنِ عَمْرٍو عَنْ هِشَامِ بْنِ الْحَكَمِ فِي حَدِيثِ الزِّنْدِيقِ الَّذِي سَأَلَ أَبَا عَبْدِ اللهِ علیہ السلام فَكَانَ مِنْ سُؤَالِهِ أَنْ قَالَ لَهُ فَلَهُ رِضًا وَ سَخَطٌ فَقَالَ أَبُو عَبْدِ اللهِ علیہ السلام نَعَمْ وَ لَكِنْ لَيْسَ ذَلِكَ عَلَى مَا يُوجَدُ مِنَ الْمَخْلُوقِينَ وَ ذَلِكَ أَنَّ الرِّضَا حَالٌ تَدْخُلُ عَلَيْهِ فَتَنْقُلُهُ مِنْ حَالٍ إِلَى حَالٍ انتهى ما نقله المصنف العلام نور الله مرقده، اس کے بعد بھی اس حدیث پاک کا کچھ حصہ موجود ہے حضرت مصنف سید حسین علیین مکان اعلی اللہ مقامہ نے صرف اتنا حصہ نقل کیا ہے جتنے سے ان کے استدلال کا تعلق تھا اور جس قدر انہوں نے نقل فرمایا اس سے ان کا مقصود ثابت ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ جسم اور جسمانیت سے منزہ ومبرا ہے اس لئے وہ ایسے عوارض وحوادث کا محل نہیں ہوسکتا جن کا محل جسم ہوتا ہے مخلوق کا رضا اور غضب چونکہ ایسے عوارض ہیں جو جسم کو عارض ہوتے ہیں اور اسے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف متغیر کر دیتے اور اس لئے اللہ تعالیٰ ایسے رضا وغضب سے پاک ہے جو اسے متغیر کر دے تغیر تو اس کی ذات پاک کے لئے ممکن ہی نہیں کیونکہ تغیر موجب حدوث ہوتا ہے اور وہ ذات پاک قدیم ہے اس لئے وہ کسی بھی امر حادث کا محل نہیں ہوسکتی۔

رضا ایک جدید حالت کا نام ہے کہ جو ان کی طبیعت میں داخل ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تغیر پذیر ہو جاتے ہیں نیز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول[1] ہے کہ آپ نے فرمایا سوائے خداوند عالم کی ذات پاک کے دیگر جو بھی چیز موجود ہے وہ فانی اور تغیر پذیر ہونے والی ہے۔ ہر چیز کی ذات میں بھی اور اس کی صفات میں بھی تغیر اور زوال داخل اور اسے لاحق و عارض ہوتا ہے کیونکہ وہ ایک رنگ سے دوسرے رنگ کی طرف اور ایک صورت سے دوسری صورت کی طرف اور ایک صفت سے دوسری صفت اور زیادتی سے نقصان اور اس کے برعکس انتقال پذیر ہوتی رہتی ہے مگر خداوند عالم کی ذات پاک ہے جو ہمیشہ ایک ہی حال پر ہے اور ایک ہی حال پر ہمیشہ رہے گا وہی اول ہے جو ہر شئے سے پہلے ہمیشہ سے موجود ہے اور وہی آخر ہے کہ جو ہر شئے کے بعد ہمیشہ کے لئے رہے گا وہ اسی حال پر ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا جس پر کہ اوّلاً موجود تھا اس کے اسماء وصفات میں تغیر اور مختلف حالت پیدا نہیں ہو سکتی جس طرح کہ اس کے غیر کی صفات میں تغیر پیدا ہوتا ہے مثلاً انسان کہ کبھی وہ مٹی تھا اور کبھی گوشت پوست وغیرہ اور کبھی وہ بوسیدہ ہڈیاں بن جاتا ہے اور جیسے خرما کہ کبھی وہ "بسر" یعنی کچی کھجور کہلاتی ہے اور کبھی وہ "رطب" تازہ کھجور کہلاتی ہے اور کبھی "تمر" خشک کھجور کا نام اسے حاصل ہو جاتا ہے، اس طرح ہر چیز کے اسماء اور صفات متغیر اور متبادل ہوتے رہتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات میں تغیر نہیں آسکتا۔

ہم نے اس مقام پر جو دلائل عقلیہ ونقلیہ پیش کی ہیں ان سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے صفات میں وہ تغیر محال ہے جو کہ ممکنات کی ذوات اور صفات انضمامیہ میں ہوسکتا ہے لیکن صفاتِ فعل کے وہ تغیرات کہ جو افعال[2] کے صادر ہونے کے سبب وقوع پذیر ہوتے ہیں وہ خداوند عالم کے لئے بھی ثابت ہوتے ہیں مثلاً خالق اور موجد مغنی اور معدوم کر دینے والا محی و ممیت کیونکہ یہ امور یعنی خلق و ایجاد، اعدام و افناء و اماتت و احیاء صفات اضافیہ اور امور

---

[1] یہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی جس حدیث پاک کا ماحصل ہے اس کے اصل متن کے لئے ملاحظہ ہو کتاب اصول الکافی ج۱، صفحہ: ۲۱۰ طبع تہران ایران، اصل متن یوں ہے حدیث نمبر ۵: اَحْمَدُ بْنُ إِدْرِيسَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الْجَبَّارِ عَنْ صَفْوَانَ بْنِ يَحْيَى عَنْ فُضَيْلِ بْنِ عُثْمَانَ عَنِ ابْنِ أَبِي يَعْفُورٍ قَالَ: سَأَلْتُ اَبَا عَبْدِ اللهِ عليه السلام عَنْ قَوْلِ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ هُوَ الْأَوَّلُ وَ الْآخِرُ وَ قُلْتُ اَمَّا الْاَوَّلُ فَقَدْ عَرَفْنَاهُ وَ اَمَّا الْآخِرُ فَبَيِّنْ لَنَا تَفْسِيرَهُ. فَقَالَ إِنَّهُ لَيْسَ شَيْءٌ إِلَّا يَبِيدُ اَوْ يَتَغَيَّرُ اَوْ يَدْخُلُهُ التَّغَيُّرُ وَ الزَّوَالُ اَوْ يَنْتَقِلُ مِنْ لَوْنٍ إِلَى لَوْنٍ وَ مِنْ هَيْئَةٍ إِلَى هَيْئَةٍ وَ مِنْ صِفَةٍ إِلَى صِفَةٍ وَ مِنْ زِيَادَةٍ إِلَى نُقْصَانٍ وَ مِنْ نُقْصَانٍ إِلَى زِيَادَةٍ إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ فَإِنَّهُ لَمْ يَزَلْ وَ لَا يَزَالُ بِحَالَةٍ وَاحِدَةٍ هُوَ الْأَوَّلُ قَبْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَ هُوَ الْآخِرُ عَلَى مَا لَمْ يَزَلْ وَ لَا تَخْتَلِفُ عَلَيْهِ الصِّفَاتُ وَ الْاَسْمَاءُ كَمَا تَخْتَلِفُ عَلَى غَيْرِهِ مِثْلُ الْإِنْسَانِ الَّذِي يَكُونُ تُرَاباً مَرَّةً وَ مَرَّةً لَحْمًا وَ دَمًا وَ مَرَّةً رُفَاتًا وَ رَمِيمًا وَ كَالْبُسْرِ الَّذِي يَكُونُ مَرَّةً بَلَحاً وَ مَرَّةً بُسْراً وَ مَرَّةً رُطَباً وَ مَرَّةً تَمْراً فَتَتَبَدَّلُ عَلَيْهِ الْأَسْمَاءُ وَ الصِّفَاتُ وَ اللهُ جَلَّ وَ عَزَّ بِخِلَافِ ذَلِكَ.

[2] افعال فعل کی جمع ہے اور فعل قدرت کی تاثیر کا نام ہے اور قدرت خداوند عالم چونکہ عین ذات ہے اس لئے اسے تغیر اور حدوث لاحق نہیں ہوسکتا لیکن اس کی تاثیرات کا حادث ہونا ایک واضح امر ہے کیونکہ خداوند عالم حکیم ہے اس کا فعل حکمت اور مصلحت کے تابع ہوتا ہے۔ (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

اعتبار یہ ہیں ان کا حادث ہونا کسی نقص کا باعث نہیں ہوسکتا کیونکہ افعالِ خداوند عالم کا صدور مصالح اور حکمتوں سے وابستہ ہوتا ہے اللہ جل شانہ کا ہر فعل اور ترک مصلحت اور حکمت کے موافق صادر ہوتا ہے وہ جس وقت کسی چیز کے وجود کو مطابق مصلحت پاتا ہے اسے موجود کر دیتا ہے اور جب اس کے فناء اور معدوم ہو جانے میں مصلحت پاتا ہے تو اسے فنا کر دیتا ہے لہٰذا جب اس نے مخلوقات کو پیدا کیا تو اس وقت بالفعل خالق ہونے کا اس پر اطلاق ہوا اور جب اس نے ان کو رزق اور نعمتیں عطا کیں تو بالفعل رازق اور منعم اس پر صادق آیا اور اس اعتبار سے کہ اس نے بے جان چیزوں کو جان بخشی "محی" اس پر صادق آیا اور اس اعتبار سے کہ زندوں کو موت دیتا ہے اور انہیں مار دیتا ہے اس پر لفظ "ممیت" کا اطلاق ہوتا ہے لہٰذا وہ خالق بھی ہے، باری اور مصور بھی ہے، زندہ بھی کرتا ہے، موت بھی دیتا ہے اور وہ بذات خود ایسا زندہ ہے جس کے لئے موت نہیں ہے ہر روز اور ہر وقت و ہر آن میں وہ اپنی ایک نئی شان میں ہے۔

بعض اتباع شیخ احمد احسائی کے قول کا بطلان

اس سابقہ تحقیق سے یہ امر واضح ہوگیا کہ شیخ احمد احسائی کے بعض اتباع نے جو کچھ کہا ہے وہ گمان فاسد اور توہم باطل و کاسد ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فعل صرف ایک بے مثل و بے مثال فعل میں منحصر ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو خلق و ایجاد، رزقِ عباد اور احیاء و اماتت بلا واسطہ اور براہ راست ذات خداوند عالم سے وابستہ ہو جائے گی اور اس سے لازم آئے گا کہ اللہ جل شانہ کی ذات محل حوادث ہو۔

شیخ احمد احسائی کے بعض اتباع کا یہ قول باطل دلالت کرتا ہے کہ ان کو معارفِ حقہ سے کمال درجہ (۱) کی جہالت اور اجنبیت حاصل ہے اور جو مفاسد اور استحالات ان کے اس قول ناقص و باطل پر متفرع ہوتے ہیں وہ بیان سے مستغنی ہیں

(بقیہ حاشیہ۔ ۲) لہٰذا جس وقت کسی چیز کا وجود قرین مصلحت و حکمت ہوتا ہے تو اللہ جل شانہ اس کے موجود ہو جانے کا ارادہ فرماتا ہے اور اس کی قدرت اثر کرتی ہے تو وہ چیز فوراً موجود ہو جاتی ہے لہٰذا خداوند عالم اس کا خالق کہلاتا ہے اور اسی طرح جب کسی چیز کے فنا اور معدوم کر دینے میں مصلحت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے فنا کا ارادہ فرماتا ہے اور قدرت خدا کے اثر سے وہ شئے فنا ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ قدرت اللہ جل شانہ اگرچہ حادث نہیں لیکن اس کی تاثیرات حادث ہیں جو ہر وقت مصالح اور حکم کے مطابق وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔

اور اسی وجہ سے وہ ذات پروردگار "كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" کی مصداق ہے۔ لہٰذا ان تاثیرات اور افعال کی وجہ سے جن الفاظ کا اطلاق ذات خداوند عالم پر ہوتا ہے ان پر تغیر واقع ہوا ہے اور وہ حادث ہیں لیکن ان کے حادث ہونے سے ان صفات کا حادث ہونا لازم نہیں آتا، جو عین ذات ہیں اور جو اس کے افعال کا سبب اور ان کی علت ہیں خلاصہ اینکہ خداوند عالم کی قدرت اور علم میں تغیر راہ نہیں پا سکتا کیونکہ وہ اس کی ذات کے صفات ہیں جو عین ذات ہیں لیکن قدرت اور علم کے اپنے متعلقات کے ساتھ جو تعلقات وقوع پذیر ہوئے ہیں وہ حادث اور تغیر پذیر ہوتے ہیں اور اس سے کسی قسم کا استحالہ اور نقص لازم نہیں آتا۔

(۱) کمال درجہ کی جہالت اور اجنبیت شیخ احمد احسائی کے ان بعض اتباع کی اس وجہ سے ظاہر ہے کہ ان کو اتنی سمجھ نہیں آسکتی کہ قدرت خداوند عالم کے تاثیرات کے حادث ہونے کے باعث اور ان میں تغیر واقع ہونے کے سبب نہ، قدرت خداوند عالم کا حادث اور متغیر ہونا (اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

عنقریب بعد کو آنے والے ابواب میں ان مفاسد میں سے بعض کا تذکرہ کر دیا جائے گا۔

احقر الوریٰ

السید گلاب علی شاہ نقوی البخاری عفی عنہ

۲۳/اپریل ۱۹۷۴ء بمطابق ۲۹/ربیع الاول ۱۳۹۴ھ

بروز منگل صبح سوا دس بجے، در بلدۂ شیعہ میانی، ملتان۔

(بقیہ حاشیہ۔۱) لازم آتا ہے اور نہ ہی ذات خداوند کا حادث اور متغیر ہونا، صفاتِ ذاتِ الٰہی اور صفاتِ افعال خدا کا باہمی فرق ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا اس حقیقت کے سمجھنے سے وہ قاصر رہے کہ وہ ذات سرمدی، ازلی و ابدی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اس کے وہ صفات بھی جو عین ذات ہے اس ذات کے لئے ہمیشہ سے ہی حالت واحدہ پر بلا تغیر و بلا کم وکاست متحقق اور ثابت چلے آرہے ہیں لیکن اس ذاتِ قدیم کے نہ افعال قدیم اور ازلی ہیں جو اس کی صفت قدرت کے طفیل وقوع پذیر ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں اور نہ ہی وہ صفات ازلی و ابدی ہو سکتے ہیں جو ان افعال کے باعث ذات خداوند عالم کے لئے متحقق ہوئے لہٰذا وہ ازلی عالم وقادر تو ہے ہی لیکن خالق ورازق ومحیی وممیت ازل سے بالفعل نہیں بالقوہ ہے ورنہ تو عالم دنیا کا قدیم ہونا لازم آئے گا حالانکہ قدم عالم کا بطلان اسلامی دنیا کے مسلمات اولیہ میں سے ہے۔

تاریخ وفات (مترجم وشارح)

حضرت علامہ السید گلاب علی شاہ نقوی (قدس سرہ الشریف)

یکم ستمبر ۱۹۹۲ء - بمطابق یکم ربیع الاول ۱۴۱۳ھ

مدفون، در جامعۃ العربیہ مخزن العلوم الجعفریہ، شیعہ میانی، ملتان، پاکستان۔

تکملہ باب اول

از علامہ سید محمد تقی نقوی

(حصہ اول)

توحید اساس دین اسلام

قرآن و احادیث ائمہ معصومین علیہم السلام کی روشنی میں:

قَالَ اللهُ الْعَظِيْمِ فِيْ كِتَابِهِ الْكَرِيْمِ، شَهِدَ اللهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (سورۃ آل عمران، آیت۔ ۱۸)

قال مولانا علی امیر المومنین علیہ السلام فی خطبۃ: أَوَّلُ الدِّينِ مَعْرِفَتُهُ وَكَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِيقُ بِهِ، وَكَمَالُ التَّصْدِيقِ بِهِ تَوْحِيدُهُ، وَكَمَالُ تَوْحِيدِهِ الْإِخْلَاصُ لَهُ، وَكَمَالُ الْإِخْلَاصِ لَهُ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ، لِشَهَادَةِ كُلِّ صِفَةٍ اَنَّهَا غَيْرُ الْمَوْصُوفِ اَنَّهُ غَيْرُ الصِّفَةِ فَمَنْ وَصَفَ اللهَ سُبْحَانَهُ فَقَدْ قَرَنَهُ، وَمَنْ قَرَنَهُ فَقَدْ ثَنَّاهُ وَمَنْ ثَنَّاهُ فَقَدْ جَزَّأَهُ، وَمَنْ جَزَّأَهُ فَقَدْ جَهِلَهُ وَمَنْ جَهِلَهُ فَقَدْ اَشَارَ إِلَيْهِ، وَمَنْ اَشَارَ إِلَيْهِ فَقَدْ حَدَّهُ وَمَنْ حَدَّهُ فَقَدْ عَدَّهُ وَمَنْ قَالَ فِيمَ فَقَدْ ضَمَّنَهُ وَمَنْ قَالَ عَلَامَ فَقَدْ اَخْلَى مِنْهُ كَائِنٌ لَا عَنْ حَدَثٍ مَوْجُودٌ لَا عَنْ عَدَمٍ، مَعَ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُقَارَنَةٍ وَغَيْرُ كُلِّ شَيْءٍ لَا بِمُزَايَلَةٍ، فَاعِلٌ لَا بِمَعْنَى الْحَرَكَاتِ وَالْآلَةِ، بَصِيرٌ إِذْ لَا مَنْظُورَ إِلَيْهِ مِنْ خَلْقِهِ، مُتَوَحِّدٌ إِذْ لَا سَكَنَ يَسْتَأْنِسُ بِهِ وَلَا يَسْتَوْحِشُ لِفَقْدِهِ، اَنْشَأَ الْخَلْقَ إِنْشَاءً وَابْتَدَأَهُ ابْتِدَاءً بِلَا رَوِيَّةٍ اَجَالَهَا وَلَا تَجْرِبَةٍ اسْتَفَادَهَا وَلَا حَرَكَةٍ اَحْدَثَهَا وَلَا هَمَامَةِ نَفْسٍ اضْطَرَبَ فِيهَا، اَحَالَ الْاَشْيَاءَ لِاَوْقَاتِهَا وَلَاَمَ بَيْنَ مُخْتَلِفَاتِهَا وَغَرَّزَ غَرَائِزَهَا وَاَلْزَمَهَا اَشْبَاحَهَا عَالِماً بِهَا قَبْلَ ابْتِدَائِهَا مُحِيطاً بِحُدُودِهَا وَانْتِهَائِهَا لَيْسَ لِصِفَةٍ حَدٌّ مَحْدُودٌ وَلَا نَعْتٌ مَوْجُودٌ وَلَا وَقْتٌ مَعْدُودٌ وَلَا اَجَلٌ مَمْدُودٌ.

(نہج البلاغہ، خطبہ ۱)

اسلام دین حق:

اسلام دین حق ہے اس کے حق سے مراد یہ ہے کہ یہ وہی کچھ بتاتا، سکھاتا اور منواتا ہے جو واقعیت اور حقیقت ہوتا ہے یہ کبھی بھی دجل وفریب اور دھوکہ نہیں دیتا، موجود کو معدوم، یا معدوم کو موجود نہیں کہتا، وہی کچھ بتاتا ہے جو ہوتا ہے اور اسی کو ماننے کا حکم دیتا ہے، ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی شئے ہو اور اسلام کہے کہ نہیں، یا اس میں کوئی کمال موجود ہو اور اسلام کہے کہ نہیں ہے، یا وہ ایک ہو اور اسلام کہے کہ دو ہیں یا برعکس۔ پس اس کے حق ہونے کا حقیقی مقصد یہی ہے کہ وہ "ہے" کو "ہے" کہتا ہے اور "نہیں" کو "نہیں" کہتا ہے۔ کبھی بھی واقع کے خلاف اعتقاد رکھنے کی بات نہیں کرتا، تبھی قرآن کریم نے فرمایا:

هُوَالَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ○

(سورہ توبہ، آیت ۳۳)۔

اسلام میں عقیدۂ توحید کی حیثیت:

اسلام میں بنیادی اور اساسی عقیدہ، توحید پر ایمان ہے اور اسے مرکزی حیثیت حاصل ہے اور نبوت ورسالت اور امامت و ولایت پر فائز ہونے والے انبیاء ورسل اور آئمہ ہدیٰ و اولیاء اللہ سارے ہی اپنے تعارف کیلئے نہیں آئے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا تعارف کرانے آئے ہیں، ہاں یہ بھی برحق ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی معرفت کرواتا ہے اور اس کے نام کو بلند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بلند کر دیتا ہے، اسی لئے امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

أَوَّلُ الدِّينِ مَعْرِفَتُهُ،

یعنی دین کی ابتداء اور اس کی تعلیمات کا آغاز اللہ تعالیٰ کی معرفت سے ہوتا ہے،

وَكَمَالُ مَعْرِفَتِهِ التَّصْدِيقُ بِهِ،

اور اس کی معرفت تب کامل ہوتی ہے جب اس کے وجود کی دل سے تصدیق کر دیتا ہے،

وَكَمَالُ التَّصْدِيقِ بِهِ تَوْحِيدُهُ،

اور اس کے وجود کی قلبی تصدیق کو تب کمال ملتا ہے جب اس کی توحید پر ایمان ہوتا ہے،

وَكَمَالُ تَوْحِيدِهِ الْإِخْلَاصُ لَهُ،

اور توحید پر ایمان کو کمال تب حاصل ہوتا ہے جب اس ذات کیلئے خالص ہو جاتا ہے اور اسے ہر عیب سے خالص تسلیم کرتا ہے،

وَكَمَالُ الْإِخْلَاصِ لَهُ نَفْيُ الصِّفَاتِ عَنْهُ،

اور اس کی ذات کے حق میں اخلاص کی منزل میں کمال تب آتا ہے جب اس کا مومن اس سے (مخلوق کی مثل) صفات کی نفی کرتا ہے،

لِشَهَادَةِ كُلِّ صِفَةٍ اَنَّهَا غَيْرُ الْمَوْصُوفِ،

کیونکہ ہر صفت شہادت دے رہی ہے کہ وہ موصوف کا غیر ہوتی ہے،

وَشَهَادَةِ كُلِّ مَوْصُوفٍ اَنَّهٗ غَيْرُ الصِّفَةِ،

اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے۔

لیکن قرآن ناطق کے اس بے مثال بیان سے روشن ہو رہا ہے کہ اسلام میں عقیدۂ توحید کو بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے اور ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ پختہ یقین اور مضبوط ایمان رکھے اس پر کہ اس کائنات کا خالق و مالک، عالمین کا رب اور ہم سب کا معبود، اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے، نقص وعیب سے پاک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی کے دل و دماغ میں اس کا انکار پیدا ہوا یا اس بارے میں شک وتردید لاحق ہوئی تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہوتا ہے۔ پس ہم سب انسانوں کا سب سے بڑا فریضہ یہی ہے کہ اس عقیدۂ توحید پر پوری مضبوطی سے قائم رہیں۔ زندگی بھر اس میں شک نہ آنے دیں۔ اس کو سمجھیں، مانیں اور یقین کریں، اور اس میں تذبذب پیدا نہ ہونے دیں اور اپنی موت تک اس پر ثابت قدم رہیں، ورنہ اگر موت ایسی حالت میں آئے کہ دل میں شک ہو یا انکار ہو اور ملک الموت اس کیفیت میں روح قبض کرلے تو اگر لاکھوں مسلمان اور مومنین تجہیز و تکفین کریں، جنازہ پڑھیں، اور اس کی میت کو بڑے احترام کے ساتھ دفن کریں، اور شانے پکڑ کر تلقین عقائد کرتے رہیں، اس سے کوئی فرق نہ پڑے گا اور ملک الموت سے لے کر منکر نکیر تک بلکہ محشر اور پل صراط تک عالم آخرت کے سارے فرشتے وہی سلوک کریں گے جو کسی کافر اور منکر توحید کے ساتھ ہونا چاہئے، ایسے شخص کیلئے ہمیشہ کا عذاب ہے اور چھٹکارے کی کوئی امید نہیں۔

شیطان عقیدۂ توحید کا ازلی دشمن ہے:

قرآن مجید کا اعلان ہے: اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (سورہ یوسف، آیت۔۵)

کہ شیطان تمام انسانوں کا واضح دشمن ہے اور اس کے ساتھ اس کے دام میں پھنسے ہوئے بہت سارے شیاطین جن وانس بھی مصروف عمل ہیں۔ ان کا اہم ترین نشانہ یہی عقیدۂ توحید ہوتا ہے اور وہ اپنے آخری حملوں کو بھی اسی عقیدے کو کمزور کرنے کیلئے وقف رکھتے ہیں۔ اس کی کمین گاہوں سے اسی ایمان پر فائرنگ ہوتی رہتی ہے، اور بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نوع انسانی کی اکثریت ان حملوں کا شکار ہوجاتی ہے۔ وہ ملعون ایک معتد بہ تعداد کو آغوش مادر سے ہی توحید کا منکر بنا لینے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن جن افراد کو توحید پر ایمان رکھنے والے والدین کی آغوش نصیب ہوتی

ہے وہ ظالم ان پر بھی وار کرنے سے باز نہیں آتا، حتیٰ کہ ایسے صاحبان جنہوں نے دینی مراکز میں تربیت پائی اور علم دین کی غذا حاصل کی ہوتی ہے ان علماء کو مشرک بنالینا بھی اس کا بہت بڑا ہدف ہوتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے:

اذا فسد العالِم فسد العالَم،

جب ہم کسی ایسے عالم کو شرک سے آلودہ کرلیں گے تو پورے جہاں میں شرک کا پھیلانا آسان ہوجائے گا اور تاریخی تجربہ گواہ ہے کہ ابتداء آفرینش انسان سے آج تک کفر و شرک کے نظریات پھیلانے میں دو طبقات زیادہ شریک رہے ہیں، فاسد حکمران، گمراہ بدکردار علماء اور انہی دونوں کو سب سے سخت ترین عذابِ دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے۔ احادیث میں موجود ہے کہ روزِ محشر اہل جہنم کی صف بندی ہوگی تو پہلی صف میں فرعون و نمرود اور یزید و ابن زیاد جیسے ظالم حکمران ہوں گے تو ان کیساتھ دوسری صف میں علماء سوء اور گمراہ نظریات کے مروّج ہوں گے۔

عقیدۂ توحید اور دین اسلام عین فطرت ہے:

چونکہ شیاطین کا اہم ترین نشانہ ایمان بالتوحید ہوتا ہے تو اسی لئے رب العالمین نے بھی توحید کی معرفت کو سہل، آسان اور انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق بنادیا ہے۔ ایسا انتظام کیا ہے کہ نوع بشر پر حجت تمام ہو سکے، شیطان کا مؤثر دفاع کیا جاسکے چنانچہ جہاں اللہ تعالیٰ نے حجت ظاہری یعنی انبیاء و رسل، اولیاء و ائمہ ہدیٰ اور نور ہدایت پھیلانے والی آسمانی کتب نازل کی ہیں، وہاں حجت باطنی بھی خلق کی ہے اور اس سے مراد انسانی عقل و فکر اور فطرت سلیمہ ہے جو ہر مرد و زن کو عطا ہوتی ہے، جس سے حق و باطل کی تمیز ہوتی ہے۔ معرفت توحید کی طرف رغبت پیدا ہوتی ہے، ارشاد قدرت ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (سورۃ روم، آیت ۳۰)۔

"آپ اپنے رخ کو دین کی طرف رکھیں اور باطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہی اللہ تعالیٰ کی فطرت ہے جس پر اس نے سارے انسانوں کو پیدا کیا ہے یعنی یہ دین اس فطرت کے عین مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو تبدیل کرنا ممکن نہیں ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس کو نہیں جانتی۔"

اس آیت کریمہ سے واضح ہورہا ہے کہ دین اسلام کے تمام عقائد، اس کی شریعت کے تمام احکام اور اس کا پورا نظام انسانی فطرت کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور اس میں کوئی شئے غیر فطری نہیں ہے اسی لئے فرمایا:

کل مولود یولد علی الفطرۃ

ہر انسانی بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے (اصول کافی: جلد۔ ۲، ص۔ ۱۳)

یعنی اس کی فطرت میں دین حق کی طرف رجحان اور شرک سے دور رہنے کا میلان ہوتا ہے:

اَمَّا اَبَوَاهُ فَيُهَوِّدَانِهٖ وَيُنَصِّرَانِهٖ

پھر اس کے والدین (یا تربیت کا ماحول وغیرہ) اس کو یہودی یا نصرانیت یا دیگر انحرافی نظریات کا مالک بنا دیتے ہیں اسی طرح فرمایا:

فَطَرَهُمْ عَلَى التَّوْحِيْدِ

کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو توحید و یگانہ پرستی پر خلق فرمایا ہے (اصول کافی، جلد ۲ ص۔۱۱، ۱۲)

یعنی اس کی وحدانیت کی معرفت، اس کی ربوبیت کی معرفت کی شناخت اور اس کی عبادت کا جذبہ اس کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے نیز حدیث پاک میں ہے:

فَطَرَهُمْ عَلٰى مَعْرِفَتِهٖ اَنَّهٗ رَبُّهُمْ

کہ اللہ تعالیٰ نے سارے لوگوں کو اس پر خلق کیا ہے کہ وہ معرفت رکھیں اس کی کہ وہ ذات ان سب کی رب ہے (بحار الانوار جلد۔۳، ص۔۲۷۹)

اور قرآن مجید کا مشہور فرمان ہے کہ

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (سورۃ آل عمران، آیت ۱۹)

اور: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ○

(سورۃ آل عمران، آیت۔۸۵)

ایسی تمام آیات میں بھی اسی حقیقت کو روشن کیا گیا ہے کہ جس نے نوع انسانی کو خلق کیا ہے۔ اس نے ان کیلئے جو دین بنایا ہے وہ بھی ان کی خلقت و فطرت کے عین مطابق بنایا ہے لہٰذا جو کوئی اس دین کو ترک کر کے کسی دوسرے دین کو پسند کرے گا وہ بارگاہ الٰہی میں نا قابل قبول ہوگا اور عالم آخرت میں نجات پانے اور عذاب دوزخ سے محفوظ رہنے میں کبھی کامیاب نہ ہوگا۔

توحید کا مفہوم:

عقیدۂ توحید جس کا ادراک اور ایمان انسانی فطرت کے عین مطابق اور عقل وفکر کیلئے آسان ہے وہ یہ ہے کہ ہر انسان مندرجہ ذیل باتوں کو تسلیم کرے۔

ا۔ یہ کہ وہ ذات واجب الوجود ہے لیکن اس کو کسی نے موجود نہیں کیا بلکہ وہ از خود اور خودبخود موجود ہے اور اپنے

صفات وکمالات میں بے مثل و بے مثال اور وحدہٗ لاشریک ہے،

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ۝ (سورۃ شوریٰ، آیت ۱۱)

۲۔کائنات کے تمام موجودات کو اس اللہ واجب الوجود نے وجود عطا کیا ہے اور وہی ہر شئے کا خالق ہے۔

۳۔اس ساری کائنات کا رب بھی وہی رب العالمین ہے یعنی اس کائنات کے امور کا مدبر اور نظام چلانے والا اور تقدیر کے فیصلے کرنے والا وہی اللہ تعالیٰ ہے۔ ان امور میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ ربوبیت تکوینی ہو یا ربوبیت تشریعی، دونوں ہی اللہ تعالیٰ کیلئے مختص ہیں یعنی جس طرح کائنات کا نظام چلانا، ربوبیت تکوینی ہے اسی طرح اپنی مخلوقات کیلئے قانون بنانا، امر و نہی کرنا اور احکام جاری کرنا بھی اسی کا حق ہے۔ پس جو کوئی مخلوق خدا کا حکمران قرار پاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہیں پاتا کوئی مخلوق از خود یا کسی دوسری مخلوق کے اذن سے حق حکومت حاصل نہیں کرسکتی حکومت مخلوق کا سرچشمہ بھی اللہ تعالیٰ ہے اور یہی ربوبیت تشریعی ہے۔

۴۔ یہ کہ معبودیت اور الوہیت بھی اسی وحدہ لاشریک کیلئے ثابت ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور یہ حق فقط اور فقط اسی کو حاصل ہے اور پہلے تین مراحل کا طبیعی نتیجہ بھی یہی ہے کہ

"لا الہ الا اللہ"

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبودیت کا استحقاق نہیں رکھتا یعنی جب وجود اس نے دیا ہے، ہم پر سارا اختیار اسی کو حاصل ہے، اس پوری کائنات میں وہی مستقل مؤثر اور ربوبیت رکھتا ہے۔ ہر شئے اس کے دست قدرت میں ہے، اس کے علم سے سرمو انحراف نہیں کرسکتی، امر و نہی کرنا، قانون بنانا اور حکم چلانا بھی اسی کا اختیار ہے تو پھر عبادت کے لائق بھی فقط وہی ہے اور ہر مخلوق پر لازم ہے کہ وہ اس کی بندگی کرے اور یہی بندگی و عبادت ہی عبودیت کا اظہار ہے ہر عبادت کرنے والا دراصل یہی ظاہر کرتا ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں، تیرا عبد ہوں، تیرے اختیار میں ہوں، تیرا مال ہوں، تیری ملکیت ہوں، تجھ ہی سے سب کچھ مانگتا ہوں، مختصر یہ کہ عقیدہ الوہیت درحقیقت عقیدۂ ربوبیت کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور امیر المومنین علیہ السلام نے اپنی عظیم مناجات میں یہی فرمایا:

اِلٰهِیْ كَفٰى بِیْ عِزًّا اَنْ اَكُوْنَ لَكَ عَبْدًا, وَ كَفٰى بِیْ فَخْرًا اَنْ تَكُوْنَ لِیْ رَبًّا، اِلٰهِی اَنْتَ كَمَا اُحِبُّ فَاجْعَلْنِیْ كَمَا تُحِبُّ.

عقیدۂ توحید کیلئے لازمی نصاب اور توحید کی چار اقسام:

علماء محققین نے دین اسلام میں داخل ہونے اور مسلمان و مومن بننے کیلئے مندرجہ بالا چار اقسام میں سے ہر ایک پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ وہ اگر ان میں سے کسی ایک قسم میں بھی یقین پر نہ ہو، انکار کرے یا شک کرے تو دین

اسلام سے خارج اور کافر و مشرک قرار دیا جاتا ہے۔ اسی لئے انہوں نے ان چار اقسام کو اس طرح بیان فرمایا ہے۔

(۱) توحید ذاتی یا توحید در ذات

(۲) توحید صفاتی یا توحید در صفات

(۳) توحید افعالی یا توحید در افعال

(۴) توحید عبادتی یا توحید در عبادت

توحید ذاتی (توحید در ذات):

توحید در ذات سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک، یکتا و یگانہ ہستی ہے۔ نہ کوئی دوسرا ہے اس کی مثل ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ وہ از خود موجود ہے کوئی دوسرا خود بخود موجود نہیں، وہی واجب الوجود ہے اور کائنات کی ہر شئے ممکن الوجود ہے۔ اس کے وجود کے منکرین کو ملحد اور زندیق کہا جاتا ہے وہ کافر ہوتے ہیں اور اس نظریہ الحاد کا پرچار صادق آل محمد علیہم السلام اور آپ کے والد گرامی علیہ السلام کے دور میں کافی زیادہ ہونے لگ گیا اس لئے ان امامین ہمامین علیہما السلام نے پوری طاقت اور علم کی روشنی کے ساتھ ان کے تار پود کو بکھیر دیا اور امت مسلمہ کو ان کے گزند سے محفوظ کر لیا۔

توحید صفاتی (توحید در صفات):

توحید در صفات سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے صفات و کمالات کا مالک ہے کہ کوئی دوسرا ایسے صفات و کمالات سے متصف نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے، بلکہ اس کی ساری صفات عین ذات ہیں کوئی صفت اس کی ذات سے جدا اور علیحدہ حقیقت نہیں ہے اور نہ ہی جداگانہ وجود رکھتی ہے اس کی ذات و صفات میں دوئی نہیں ہے۔ جب کہ اس کے سوا ہر موجود جن صفات سے متصف ہوتا ہے وہ اس کی ذات سے جدا اور علیحدہ وجود رکھتی ہیں اور دونوں کے درمیان تغایر پایا جاتا ہے مثلاً انسان ایسا وجود رکھتا ہے جو علم و شعور کا مالک نہیں ہوتا، پیدا ہوتا ہے تو اس کے بارے میں قرآن مجید فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ اَخۡرَجَكُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا (سورہ نحل، آیت ۔۷۸)

اللہ تعالیٰ نے تمہیں مادران کے بطون سے نکالا تو تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

پھر رفتہ رفتہ اس کو نورِ علم حاصل ہونے لگتا ہے، اس کا دل و دماغ روشن ہوتا جاتا ہے۔ خود بھی عالم بن جاتا ہے اور دوسروں کو بھی اپنے علم سے روشن کرنے لگتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ علم ذات انسان سے علیحدہ حقیقت ہے۔ علم حاصل ہونے کے بعد بھی اس عالم کی حقیقت کا جز نہیں بن جاتا بلکہ یہی انسان ضعیفی اور درازی عمر کے نتیجے میں بچپن کی طرح دوبارہ لاعلم ہو جاتا ہے جیسا کہ قرآن کا بیان ہے:

وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَكِّسۡهُ فِي الۡخَلۡقِ ۔ (سورۂ یٰسین، آیت۔۶۸)

اور فرماتا ہے:

لِكَيۡلَا يَعۡلَمَ مِنۡۢ بَعۡدِ عِلۡمٍ شَيۡـًٔا ۔ (سورہ حج، آیت۔۵)

کہ جب ہم اس کو لمبی عمر دیتے ہیں تو اس کی خلقت میں کمزوری لے آتے ہیں اور یہ کہ یہ عالم شخص علم ہونے کے بعد دوبارہ لاعلم بن جاتا ہے۔

اور یہی صورت اس کے دیگر صفات، طاقت وقدرت، ارادہ ومشیت، حزن ومسرت وغیرہ کی ہوتی ہے کبھی اس میں یہ صفات نہیں ہوتی ہیں تو کبھی آجاتی ہیں، کبھی کم ہوتی ہیں اور کبھی زیادہ اور یہی ذوات وصفات کے علیحدہ علیحدہ وجود رکھنے کی دلیل ہے اور اسی کی طرف امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنے خطبہ میں توجہ دلائی ہے کہ فرمایا:

وَكَمَالُ تَوۡحِيدِهِ الۡإِخۡلَاصُ لَهُ، وَكَمَالُ الۡإِخۡلَاصِ لَهُ نَفۡيُ الصِّفَاتِ عَنۡهُ،

کہ اللہ تعالیٰ کیلئے عقیدۂ توحید کو تب کمال ملتا ہے جب معتقد اس کیلئے اخلاص اختیار کرتا ہے اور اس کے بارے میں خالص ہونے پر ایمان لاتا ہے اور اس اخلاص کو تب کمال نصیب ہوتا ہے جب وہ مومن اس ذات احدیت سے صفات کی نفی کرتا ہے پھر اس کی دلیل پیش کرتے ہیں:

شهادة كل صفة انها غير الموصوف و شهادة كل موصوف انه غير الصفة.

کہ ہر صفت شہادت دے رہی ہے کہ وہ اپنے موصوف کا غیر ہے اور ہر موصوف شہادت دے رہا ہے کہ وہ صفت کا غیر ہے اور ہر موصوف اور صفت کے درمیان تغایر پایا جاتا ہے جب کہ رب العالمین ایسی ذات ہے جو عین صفت ہے یعنی وہ عین علم وقدرت ہے عین ارادہ مشیت ہے وہ جوہر وعرض کا مجموعہ نہیں، کہ اس میں صفات اس طرح قائم ہوں جیسے پھول میں خوشبو یا ستاروں میں چمک بلکہ اس کی ذات خود ہی تمام صفات کا سرچشمہ ہے وہ اپنے کمالات کے اظہار کیلئے کسی توسط کی محتاج نہیں، اگر اس کو عالم کہا جاتا ہے تو اس لئے کہ اس سے علم کے آثار نمایاں ہیں اور اگر اسے قادر کہا جاتا ہے تو اس لئے کہ ہر ذرہ اس کی قدرت کا پتہ دیتا ہے اگر وہ سمیع وبصیر ہے تو اسلئے کہ کائنات کی شیرازہ بندی دیکھے اور سنے بغیر نہیں ہوسکتی۔

اس کی صفات اس طرح نہیں جس طرح ممکنات میں ہیں کہ ان میں علم آئے تو عالم بنیں! توانائی ملے تو توانا بنیں، کیونکہ صفت کو ذات سے الگ ماننا دوئی ہے اور جہاں دوئی کا تصور آیا وہاں توحید کا عقیدہ رخصت ہوا، اسی لئے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے صفات خدا کے زائد بر صفات ہونے کی نفی فرما کر توحید کے خدوخال سے آشنا فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دامن وحدت کو کثرت کے دھبوں سے بدنما نہیں ہونے دیا اور اس سے یہ مراد لینا بھی صحیح نہیں کہ اس کی کوئی

صفت تسلیم ہی نہیں کی جاسکتی، تا کہ ان لوگوں کی بات درست مانی جائے جو سلبی تصورات کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں کیونکہ کائنات کا گوشہ گوشہ اس کی صفات کے آثار سے جھلک رہا ہے اور مخلوقات کا ذرہ ذرہ گواہی دے رہا ہے کہ وہ علیم ہے، قدیر ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، وہی اپنے دامن ربوبیت میں ہر ایک کو پالنے والا ہے اور سایہ رحمت میں ہر کسی کو پروان چڑھانے والا ہے بلکہ حق یہ ہے کہ جو ذات ہے وہی صفت ہے اور جو صفت ہے وہی ذات ہے۔

اسی مطلب کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی زبان فیض ترجمان سے سماعت فرمائیے۔ پھر تمام عالم کے مذاہب کے عقیدۂ توحید کو اس کی روشنی میں پرکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ توحید کے صحیح مفہوم کو صحیح بیان کرنے والے کون سے بزرگان تھے آپ فرماتے ہیں:

لم یزل ربنا عزوجل والعلم ذاته ولا معلوم، والسمع ذاته ولا مسموع، والبصر ذاته ولا مبصور، والقدرة ذاته ولا مقدور، فلما أحدث الاشياء و کان المعلوم وقع العلم منه علی المعلوم، و السمع علی المسموع و البصر علی المبصور، و القدرة علی المقدور.

"ہمارا رب بزرگ و برتر ہمیشہ سے عین علم رہا، حالانکہ معلوم ابھی معدوم تھا، وہ عین سمع رہا جب کہ کسی آواز کی گونج بلند نہ ہوئی تھی، وہ عین بصر رہا جب کہ کوئی دکھائی دینے والی چیز وجود میں نہیں آتی تھی، وہ عین قدرت رہا حالانکہ قدرت کے آثار کو قبول کرنے والی شئے نہ تھی پھر جب اس نے ان اشیاء کو خلق فرمایا اور معلوم کو وجود ملا تو اس کا علم پوری طرح ان معلومات پر منطبق ہوا اور اس کی سمع سنائی دینے والی آوازوں پر اور اس کی بصر دکھائی دینے والی اشیاء پر مکمل طور پر تطابق کر رہی تھی اور اس کی قدرت مقدورات پر نمایاں ہو رہی تھی" (توحید، شیخ صدوق علیہ الرحمہ) یہ وہ عقیدہ ہے جس پر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کا اجماع ہے۔

اُن کا صفاتِ خدا کے بارے میں نظریہ:

مگر وہ اس سے مخالف راستے پر چلے ہیں اور انہوں نے صفات و ذات میں علیحدگی کا تصور اختیار کیا ہے چنانچہ علامہ شہرستانی لکھتے ہیں:

قال أبو الحسن (الأشعری) الباری تعالی عالم بعلم، قادر بقدرة، حیّ بحیاة، مرید بارادة، متکلم بکلام، سمیع بسمع، بصیر ببصر.

کہ ابوالحسن اشعری کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ علم، قدرت، حیات، ارادہ، کلام اور سمع و بصر کے ذریعہ عالم، قادر، زندہ، مرید، متکلم اور سمیع و بصیر ہے۔ (کتاب الملل والنحل، ص ۴۲)

حالانکہ اگر ان صفات خدا کو اس طرح زائد از ذات اور جدا مانا جائے جس طرح دیگر ممکنات میں ہے تو بات دو حال

سے خالی نہیں یا یہ صفات بھی ہمیشہ سے ہیں یا بعد کو طاری ہوئی ہیں، اگر پہلی صورت ہو تو یہ ساری صفات قدیم ہوتیں پس جتنی صفات ہیں اتنی قدیم ماننا پڑیں گی اور وہ سب قدیم ہونے میں ذات باری کے شریک ہوں گی۔

تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ○ (سورہ النمل، آیت ۶۳)

اللہ تعالیٰ ان مشرکوں کے ہر قسم کے شرک سے بلند و برتر ہے۔

اور دوسری صورت میں ذاتِ الٰہی کو محل حوادث قرار دینا پڑے گا اور لازم آئے گا کہ وہ ہستی ان صفات کے ہونے سے پہلے نہ عالم ہو، نہ قادر ہو، نہ سمیع ہو، نہ بصیر ہو اور یہ عقیدہ بنیادی طور پر دین اسلام اور قرآن مجید کے خلاف ہے۔

توحید صفاتی میں حق وہ ہے جو حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

کہ زبان وحی نے فرمایا تھا:

الحق مع علیؑ و علیؑ مع الحق اور علی مع القرانِ و القرانُ مع علیؑ.

چنانچہ کس قدر نورانی اور مستحکم ہے وہ بیان جو آپ نے اپنے اس خطبہ میں دیا اور علامہ رضیؒ نے اس کو نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ کے طور پر نقل کیا، فرماتے ہیں!

فمن وصف الله سبحانه فقد قرنه.

جس نے ذات الٰہی کے علاوہ صفات کو مانا اس نے اس کا دوسرا ساتھی مان لیا،

ومن قرنه فقد ثناه

اور جس نے دوسرا ساتھی اس کا مان لیا اس نے دوئی پیدا کر دی،

ومن ثناه فقد جزأه

اور جس نے دوئی پیدا کی اس نے اس کی اجزاء بنا ڈالیں،

ومن جزأه فقد جهله

اور جس نے اس کی اجزاء مان لیں وہ اس سے جاہل اور بے خبر ہو گیا،

ومن جهله فقد أشار اليه

اور جو اس سے بے خبر ہو گیا اس نے اسے اشارہ کے قابل مان لیا،

ومن أشار اليه فقد حدّه

اور جس نے اسے اشارہ کے قابل مان لیا اس نے اس کو محدود مان لیا،

و من حدّہ فقد عدّہ

اور جس نے اس کو محدود سمجھا اس نے اس کو دوسری اشیاء کی مثل تعداد کی قطار میں لے لیا،

ومن قال فیم فقد ضمنه

اور جس نے کہا کہ وہ کسی شئے کے اندر ہے اس نے اسے کسی شئے کے ضمن میں مان لیا،

ومن قال علام فقد أخلى منه

اور جس نے کہا کہ وہ کسی شئے کے اوپر ہے اس نے دیگر مقامات کو اس سے خالی سمجھ لیا،

کائن لا عن حدث

وہ ہے، ہوا نہیں،

موجود لا عن عدم

وہ موجود ہے مگر عدم سے وجود میں نہیں آیا،

مع کل شیء لا بمقارنة

وہ ہر شئے کے ساتھ ہے لیکن جسمانی اتصال سے نہیں،

و غیر کل شیء لا بمزایله

وہ ہر چیز سے علیحدہ ہے لیکن جسمانی دوری کے انداز سے نہیں،

فاعل لا بمعنی الحرکات والآلة

وہ فاعل ہے ہر کام کرتا ہے لیکن حرکات وآلات کا محتاج نہیں ہے،

بصیر اذ لا منظور الیه من خلقه

وہ اس وقت سے دیکھنے والا تھا جب دکھائی دینے والی کوئی مخلوق وجود میں نہ آئی تھی،

متوحد اذ لا سکن لیستأنس به

وہ واحد و یگانہ ہے اس لئے کہ کوئی ایسا ساتھی نہیں جس سے وہ مانوس ہوتا ہو،

ولا یستوحش بفقده

یا اس کو کھو کر پریشان ہوتا ہے،

أنشأ الخلق انشاء وابتدأه ابتداء

اس نے پہلے پہل خلق کو پیدا کیا اور اس کی ابتداء کی،

بلا رؤیة أجالها

تو بغیر کسی فکر کی جولانی کے،

ولا تجربة استفادها

اور بغیر کسی تجربہ کے جس سے اس نے فائدہ اٹھایا ہو،

ولا حركة استفادها

اور بغیر کسی حرکت کے جسے اس نے پیدا کیا ہو،

ولا همامة نفس اضطرب فيها

اور بغیر کسی اندرونی جوش و ولولہ کے جس سے وہ مضطرب اور بے تاب ہوا ہو،

أحال الاشياء لاوقاتها

اس نے تمام اشیاء کو اپنے اپنے مقررہ اوقات کا پابند کر دیا ہے،

ولا م بين مختلفاتها

اس نے تمام اشیاء کو اپنے اپنے مقررہ اوقات کا پابند کر دیا ہے،

غرز غرائزها و الزمها اشباحها

ان تمام اشیاء کو ان کی طبیعی ماہیات عطا کی ہیں اور پھر ہر شئے کو اس کی مخصوص صورت عطا فرمائی ہے،

عالما بها قبل ابتداءها

اس پوری دنیائے کائنات کی تخلیق کی ابتداء کرنے سے پہلے تو ان تمام کو جانتا ہے،

محيطا بحدودها و انحاءها

اور ان تمام اشیاء کی حدود و قیود اور ان کی سمتیں اور اطراف سب پر احاطہ کئے ہوئے ہے اور فرمایا

ليس لصفته حد محدود

اللہ تعالی کی کسی صفت کی کوئی معین شدہ حد نہیں، ہر صفت لا محدود ہے،

و لا نعت موجود

اور اس کی کسی صفت کی تعریف اور مداحی بھی کسی کے مقدورات میں نہیں ہے،

ولا وقت معدود

اور نہ ہی وہ کسی محدود و معین وقت تک محدود ہے،

ولا أجل ممدود

اور نہ ہی کوئی ایسی مدت طے شدہ ہے جس کے اندر تک یہ صفت بیان ہوسکتی ہے۔

توحید افعالی (توحید در افعال):

توحید در افعال سے مراد یہ ہے کہ اللہ رب العزت اپنے تمام افعال اور اختیارات میں ایسا وحدہ لاشریک ہے کہ کسی یار و مددگار کا محتاج نہیں، اسے کسی ناصر و معاون کی ضرورت نہیں وہ اپنے تمام افعال اور اختیارات کے استعمال میں مستقل اور یگانہ ہے وہ اس کائنات بلکہ سارے جہانوں کا واحد رب ہے۔ سارا نظام اس کے اختیار میں ہے۔ خلق و رزق اور امات و احیاء اس کی ربوبیت سے تعلق رکھنے والے افعال ہیں۔ وہ ہر دن، ہر رات بلکہ ہر دم، ہر لمحے ان کی انجام دہی میں مصروف ہے۔

يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ۝ (سورۃ رحمن، آیت۔۲۹)۔

ہر وقت اس کائنات کے اندر تغیر و تبدل، نشوونما اور ترقی و پستی کا عمل جاری و ساری نظر آتا ہے۔ اسباب و مسببات، تاثیرات و تاثرات کا سلسلہ قائم ہے۔ ان سب کا مسبب الاسباب وہی ہے اور سب کچھ اس کے ارادہ و مشیت سے مربوط ہے۔ وہی اس کائنات کا قیوم ہے، وہی معبود برحق اور زندہ ذات ہے جس نے اس عالم کائنات کو قائم رکھا ہوا ہے۔ وہ بیدار اور ہوشیار ذات ہے، نہ اسے نیند آتی ہے نہ اونگھ۔ وہ اپنے ان افعال کی انجام دہی سے نہ کبھی غافل ہوتا ہے اور نہ سست، نہ اسے تھکاوٹ لاحق ہوسکتی ہے نہ اکتاہٹ۔ اس کی حکومت و مالکیت تمام انسانوں و زمینوں بلکہ کائنات کے ذرے ذرے پر نافذ ہے۔ کوئی حصہ، کوئی ٹکڑا اس کے اختیار سے باہر نہیں، عرش و کرسی اور اس کے اوپر نیچے یا مابین سب ہی اس کے نظام ربوبیت کے اندر ہے۔ ساری مخلوقات اور سارے موجودات اس کے ہیں، وہی مالک، خالق، رازق، مدیر و مدبر اور رب العالمین ہے۔ کنٹرول اسی کا ہے اور ہر ذرہ اس کی مشیت سے وابستہ ہے۔ یہی آیت الکرسی کا معنی و مفہوم ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ (سورۃ بقرہ، آیت ۲۵۵)۔

یہ آیت پورے زور کے ساتھ اس کی توحید افعالی کو بیان فرما رہی ہے اور واضح کر رہی ہے کہ ان تمام اشیاء کی نگرانی اور حفاظت نہ اس کو تنگ کرتی ہے اور نہ وہ اس سے عاجز ہے۔ ناممکن ہے کہ اس پر کوئی سستی، تھکاوٹ، نیند یا اونگھ غالب آ سکے۔ وہ ان تمام کمزوریوں، کوتاہیوں اور عجز و ناتوانی سے بلند و پاک ذات ہے۔ وہ جسم و جسمانیت سے منزہ اور مبرأ ہے، وہ اپنی عظمت میں بے مثل و بے مثال ہے، اس نے اس کائنات کے نظام کو چلانے میں کسی کو اپنا شریک بنانا پسند نہیں کیا اور نہ اسے اس کی ضرورت ہے۔

يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ وَلَا يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ غَيْرُهٗ

وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، وہ کسی غیر کی مشیت پر عمل کرنے کا پابند نہیں ہے،

مَا شَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ

وہ جو چاہتا ہے وہی ہو کر رہتا ہے اور جو وہ نہ چاہے وہ کبھی نہیں ہو سکتا، کوئی ذرہ اس کی مشیت سے انحراف یا تجاوز نہیں کر سکتا،

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۝ (سورۃ یٰسین، آیت ۸۲)

سوائے اس کے نہیں کہ جب وہ کسی شئے کا ارادہ کرتا ہے اس کا کہ اس کو کہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔

یعنی اس کو یہ کہنے کی احتیاج بھی نہیں کہ "کن" کہے بلکہ اس کا ارادہ ہی اس قدر مؤثر ہے کہ ہر مراد حاصل ہو جاتی ہے اور ہو کر رہتی ہے جب کہ یہ بھی واضح رہے کہ اس کے ارادے کا مفہوم بھی انسان یا دیگر کسی مخلوق کے ارادے کی مثل نہیں۔ خالق کا ارادہ اور مخلوق کا ارادہ بھی مماثلت نہیں رکھتا بلکہ محققین فرماتے ہیں کہ اس کا ارادہ اس کا فعل ہے وہ نہ دل رکھتا ہے نہ سینہ، نہ فکر رکھتا ہے نہ دماغ، نہ سوچ بچار کرتا ہے نہ منصوبہ بندی، یہ سب کچھ ہمارے سمجھانے کیلئے ہے ورنہ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ اپنے ارادے میں بھی وحدہ لاشریک ہے اور اس میں کسی کا محتاج نہیں ہے اور نہ اسے احتیاج لاحق ہو سکتی ہے تبھی تو فرماتا ہے:۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝۱ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝۲ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝۳ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝۴ (سورہ الاخلاص)

توحید عبادتی (توحید در عبادت):

توحید در عبادت سے مراد یہ ہے کہ جب وجود دینا، ہر موجود کی ضروریات کو پورا کرنا، موجودات کے نظام کو چلانا خلق کرنا، رزق دینا، موت دینا اور زندگی بخشنا اس وحدہ لاشریک سے مختص ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ الوہیت و معبودیت بھی اسی کا حق ہے، اس کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں ہے۔ غیر اللہ کو قابل عبادت سمجھنا یا اس کی عبادت کرنا ہر لحاظ سے باطل اور مکمل طور پر بوگس خیال ہے۔ ایسے نظریئے سے جتنی بھی نفرین کی جائے کم تر ہے، کسی عقل مند

سے ناممکن اور بعید ترین ہے کہ وہ کسی بھی مخلوق کو عبادت کے لائق ماننے لگے۔ اس سے بڑھ کر نادانی اور غیر انسانی فکر کوئی نہیں ہو سکتی کہ کوئی انسان اور عقلمند ہو کر غیر اللہ کی عبادت کو صحیح اور جائز سمجھنے لگے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (سورۃ آل عمران، آیت ۱۸)

خود اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ وہی اکیلا لائق عبادت ہے اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور سارے ملائکہ اور تمام اہل علم ومعرفت بھی گواہی دیتے ہیں کہ وہی تنہاء لائق عبادت ہے، وہی نظام عدل وقسط کا قائم کرنے والا ہے اس عزیز (غالب) اور حکیم (صاحب حکمت) ذات کے علاوہ کوئی معبود ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (سورۃ کہف، آیت۔ ۱۱۰)

بے شک حق یہی ہے کہ تمہارا معبود وہ ایک معبود ہے،

اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ (سورۃ الاعراف، آیت ۵۹)

تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کیا کرو، اس کا غیر کوئی بھی تمہارے لئے لائق عبادت نہیں ہے،

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (سورۃ النحل، آیت۔ ۳۶)

ہم نے ہر امت میں ایک رسول کو ضرور مبعوث کیا ہے جو یہ پیغام دیتا رہا کہ فقط اس ایک اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت اور سرکش دشمنانِ خدا سے اجتناب کرتے رہو۔

اور اس مضمون کو بیان کرنے والی سینکڑوں آیات قرآن مجید میں موجود ہیں تبرکاً چند ایک ذکر کر دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توحید افعالی پر ایمان رکھنے کی توفیق دے، توحید کی کسی قسم کا انکار یا اس میں شک رکھنے والے کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، وہ زندگی میں بھی کافر ہے اور بوقت موت بھی کفار میں سے شمار ہوگا اور ہمیشہ جہنم میں جلتا رہے گا، وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔

شرک اور اس کی اقسام:

توحید کی مذکورہ چار اقسام کے مقابلے میں شرک کی بھی اسی طرح چار اقسام ہیں،

(۱) شرک ذاتی یا شرک در ذاتِ خدا، یعنی جو کوئی اللہ تعالیٰ کی ذات کی مثل کسی دوسری ہستی کو مان لے۔

(۲) شرک صفاتی یا شرک در صفاتِ خدا، یعنی کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی ایک صفت کی مثل کسی کو مان لے۔

(۳) شرک افعالی یا شرک در افعال خدا، یعنی کوئی اللہ تعالیٰ کی مختص افعال میں سے کسی ایک فعل کا فاعل کسی غیر کو مان لے۔

(۴) شرک عبادتی یا شرک در عبادت خدا یعنی کوئی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو لائق عبادت مان لے۔

جبکہ قرآن مجید کا اعلان ہے کہ شرک کسی بھی قسم کا ہو ظلم عظیم ہے،

يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۣ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ○ (سورۃ لقمان، آیت ۔ ۱۳)

لیکن شرک کا عقیدہ رکھنے والا شخص اللہ تعالیٰ پر بہت بڑا ظلم کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس ظلم کو کبھی بھی بخشنے کیلئے تیار نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ (سورۃ نساء، آیت ۴۸)

یقیناً اللہ تعالیٰ اس جرم کو کبھی بھی نہیں بخشے گا کہ اس کا کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس جرم سے کم تر کسی بھی جرم کو جس کے حق میں چاہے گا بخش دے گا۔

پس اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو واجب الوجود مانے یعنی اس کو خود بخود وجود رکھنے والا تسلیم کرے، کہے کہ وہ از خود موجود ہے، اپنے موجود ہونے میں کسی کا محتاج نہیں، اسے اللہ تعالیٰ نے وجود نہیں بخشا تو ایسا عقیدہ رکھنے والا شخص شرک ذاتی کا مرتکب ہے، اگر کوئی عقیدہ رکھے کہ کوئی دوسرا فرد ایسا ہے جو صفات میں سے کسی بھی صفت میں مثل خدا ہے، کہے کہ اس کی صفات عین ذات ہیں، یا اس کی فلاں صفت لامحدود ہے، مثلاً علم لامحدود ہے یا اس کی قدرت لامحدود ہے، یا اس کی کوئی بھی صفت اللہ تعالیٰ کی صفت سے مماثلت رکھتی ہے تو ایسا شخص شرک صفاتی کا معتقد ہو گیا ہے۔

اور اگر کوئی یوں اعتقاد رکھے کہ واجب الوجود تو فقط اللہ تعالیٰ ہے، لیکن خالقیت، یا رازقیت، یا ربوبیت، یا معبودیت کسی دوسری شخصیت کیلئے ثابت ہے مثلاً یوں تسلیم کرے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں کو پیدا کیا پھر اس کائنات کو اس نے پیدا کیا ہے یا یوں کہے کہ کائنات کو تو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے لیکن پھر اس نے یہ ساری کائنات یا اس کا کوئی حصہ کسی دوسری ہستی یا چند دوسری شخصیات کے سپرد کر دیا ہے، اب اس کی تدبیر اور مدیریت وہ کر رہے ہیں اور ان کی ربوبیت کی ذمہ داری ان پر ہے تو یہ شرک در افعال کا معتقد ہے، شرک افعال کا مرتکب ہو گیا ہے اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے ارشادات میں اور شیعہ فقہاء کی تعبیرات میں اس عقیدہ کو تفویض کہا گیا ہے اور بڑی صراحت سے فرمایا کہ یہ عقیدہ شرک ہے اور مفوضہ مشرک ہیں۔ تاریخ مشرکین کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ ادوار میں زیادہ تر لوگ اسی شرک افعالی کے مرتکب رہے ہیں، عرب قوم میں اکثر مشرکین عموماً اسی نظریئے کے قائل رہے ہیں اور انہیں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ (سورۃ توبہ، آیت۔۲۸)

کہ یہ مشرک لوگ نجس اور پلید ہیں

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (سورۃ بقرہ، آیت۔۱۹۱، سورۃ نساء، آیت ۹۱)

کہ ان مشرکوں کو جہاں پاؤ ان کو قتل کر دو۔

اور قرآن مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ مشرکین، کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے لیکن رب دیگر بعض مخلوقات کو مانتے تھے مثلاً فرماتا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ (سورۃ زمر آیت۔۳۸)

کہ اگر تو ان مشرکین سے پوچھے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے۔

تو واضح ہوا کہ وہ کائنات کے ارباب اور اس کے مدیر و مدبر بعض دیگر مخلوقات کو مانتے تھے، چنانچہ بعض لوگ ملائکہ کو ارباب مانتے تھے اور کہتے تھے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی پیاری بیٹیاں ہیں، پھر انہوں نے اپنے خیالات کے مطابق ملائکہ کے مجسمے اور بت بنائے اور پھر ان کی پرستش کرنے لگ گئے اور یوں کہنے لگے کہ ان کی عبادت کے ذریعہ ہم اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے ہیں فرمایا گیا:

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ (سورۃ زمر، آیت ۳)

کہ ہم ان کی عبادت فقط اس لئے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں بھی مصری لوگ کئی ارباب کے قائل تھے چنانچہ قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے زندانی ساتھیوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ (سورۃ یوسف، آیت ۳۹)

کیا کئی ایک رب ماننا بہتر ہیں یا ایک اللہ کو جو واحد اور قہار ذات ہے۔

پس ان سب کا شرک در ربوبیت ہے جو شرک افعالی ہے اور نجس ترین اور باطل ترین عقیدہ ہے۔

ہمارے وطن پاکستان کی افسوسناک صورتحال:

افسوس صد افسوس کہ دورِ حاضر کے بعض اہل منبر کو ان کی دنیا طلبی اس حالت تک لے گئی ہے کہ وہ اکثر عوام کی کم علمی اور عملی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی تقاریر کرتے ہیں کہ محمد وآل محمد علیہم السلام جیسی معصوم اور ہادی برحق ہستیوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ اس کائنات کو چلانے والے یا تقدیر کے فیصلے کرنے والے یہ معصومین علیہم السلام

ہیں۔ کبھی تو یہ باتیں صراحت سے کر دیتے ہیں اور کبھی اشارہ و کنایہ کا انداز اختیار کرتے ہیں، بلکہ بعض نادان تو اس کو نعرے کی شکل دے دیتے ہیں اور علی ربّ کی آوازیں بلند کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں اور بعض تو اس کو منظوم کلام کی بندش میں لا کر قصیدہ خوانی اور نوحہ خوانی، رباعی یا مسدس وغیرہ میں ڈھال لیتے ہیں۔ ان کے ہم خیال خطباء اپنے ان باطل مزعومات کو ثابت کرنے کیلئے بوگس استدلال پیش کرنے کی ناکام کوشش بھی کرتے ہیں حالانکہ خود آئمہ معصومین علیہم السلام نے تفویض کے معتقدین کو مشرک قرار دیا ہے، ان پر سخت ترین لعنت کی ہے علی الاعلان ان سے برأت کی ہے اور اپنے شیعہ کو ان سے مکمل طور پر بائیکاٹ کرنے کا حکم دیا ہے چنانچہ امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام نے فرمایا:

عَنْ اَبِی هَاشِمِ الْجَعْفَرِیِّ قَالَ: سَئَلْتُ اَبَا الْحَسَنِ الرِّضَا علیه السلام عَنِ الْغُلَاةِ وَ الْمُفَوِّضَةِ فَقَالَ الْغُلَاةُ كُفَّارٌ وَ الْمُفَوِّضَةُ مُشْرِكُونَ، مَنْ جَالَسَهُمْ اَوْ خَالَطَهُمْ اَوْ آكَلَهُمْ اَوْ شَارَبَهُمْ اَوْ وَاصَلَهُمْ اَوْ زَوَّجَهُمْ اَوْ تَزَوَّجَ مِنْهُمْ اَوْ آمَنَهُمْ اَوِ ائْتَمَنَهُمْ عَلٰی اَمَانَةٍ اَوْ صَدَّقَ حَدِيثَهُمْ اَوْ اَعَانَهُمْ بِشَطْرِ كَلِمَةٍ خَرَجَ مِنْ وَلَايَةِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ وَلَايَةِ رَسُولِ اللّٰهِ صلی الله علیه و آله وسلم وَ وَلَايَتِنَا اَهْلَ الْبَيْتِ۔

(عیون اخبار الرضا، جلد ۲ ص۔ ۱۵۸، منہاج البراعۃ شرح نہج البلاغہ ج۔ ۲۔ ۱۰۹)

ابو ہاشم جعفری سے منقول ہے کہ میں نے حضرت امام ابوالحسن الرضا علیہ السلام سے غالیوں اور مفوضہ کے بارے میں سوال کیا تو آپؑ نے فرمایا: غالی کافر ہیں، مفوضہ مشرک ہیں۔ جو ان کے ساتھ ہم نشین ہو، یا ان کے ساتھ میل جول رکھے، یا ان کے ساتھ کھائے پئے، یا ان کی امانت اپنے پاس رکھے، یا ان کی بات کی تصدیق کرے، یا ان کی اعانت کرے، اگرچہ ایک کلمہ یا کلمہ کے ایک حصے کے ذریعہ ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی ولایت، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت اور ہم اہل بیت علیہم السلام کی ولایت سے خارج ہو گیا۔

معجزہ برحق ہے لیکن عقیدۂ تفویض باطل ہے:

یہ ضال و مضل اور گمراہ کن مقرر اپنے غلط اور باطل تفویضی خیالات کی تائید کیلئے بعض اوقات انبیاء و رسل اور آئمہ معصومین علیہم السلام کے معجزات و کرامات کے بیان کا سہارا لیتے ہیں، ان کی ربوبیت کو ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں، حالانکہ ہر صاحب عقل اور اہل علم پر واضح ہے کہ معجزہ برحق ہے، کرامت صحیح ہے لیکن ان معجزات و کرامات کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ کے اذن سے ہوتا ہے، یعنی وہ رب العالمین کبھی کائنات کے کسی ایک حصے یا ایک ذرے میں معجزہ نما کی مراد یا دعا کے مطابق ایسی تبدیلی لاتا ہے، جو اس معجزنما ہستی کی صداقت و حقانیت اور ان کی عظمت عنداللہ کو ثابت

کرتی ہے لیکن وہ تبدیلی اللہ تعالیٰ کے ارادہ مشیت اور اس کے اذن کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتی ہے پس معجزہ بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ایک مظہر ہے۔ اگرچہ وہ خلاف عادت ہوتا ہے لیکن چونکہ ربوبیت سے مراد اس کائنات کے نظام کی مدیریت ہے۔

کائنات میں ہر لمحے تبدیلی و ترقی کا سفر اور اس کارخانے میں خلق و رزق اور امات و احیاء کا عمل ہر پل اور ہر دم جاری و ساری ہے۔ کوئی زندگی لے کر آرہا ہے اور کوئی موت کے منہ میں جارہا ہے۔ یہ سب کچھ جس ہستی کے علم و قدرت اور ارادہ و مشیت سے ہورہا ہے وہ اللہ رب العالمین ہے اور معجزہ جو عادی نظام کو توڑ کر اس کے کسی ایک حصے میں خلافِ عادت تبدیلی لانا ہے مثلاً مردے کا زندہ ہو جانا، چلتے دریا کے پانی کا رک جانا، تصویر کا زندہ شیر بن جانا، ایک پتھر سے اونٹنی کا باہر آجانا، ایک لاٹھی کا زندہ اژدھا بن جانا، ایک درخت کا چل کر قریب آکر گواہی دینا، یہ سب معجزات ہیں، معصومین علیہم السلام کی کرامات ہیں، لیکن ان سب اقدامات کی پشت پر اذن الٰہی کارفرما ہے، جس کا مقصد اپنے نبی، رسول، امام و ولی کی عظمت، حقانیت اور صداقت کو دیکھنے اور سننے والوں کے سامنے روشن کرنا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ کی مدیریت اور اس کی ربوبیت سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے تفویض جیسے شرک کو کبھی بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

توسل بذریعہ معصومین علیہم السلام برحق ہے لیکن تفویض شرک ہے:

بعض اوقات یہ باطل گو مقررین عوام فریبی کی مہارت سے استفادہ کرتے ہوئے معصومین علیہم السلام کے توسل اور شفاعت سے مربوط آیات و احادیث، ادعیہ و فرامین عصمت کو ناروا استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ دھوکہ اور فریب کے علاوہ کچھ نہیں کیونکہ اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ معصومین علیہم السلام کو وسیلہ ماننا اور ان کا توسل بارگاہِ ایزدی میں پیش کرنا اور ان سے شفاعت و سفارش کا طلب گار ہونا عین تشیع اور ہمارے ایمان کا اہم حصہ ہے۔

قرآن مجید میں حکم خداوندی ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (سورۃ مائدہ، آیت۔۳۵)

اے اہل ایمان! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس تک پہنچنے کے لئے وسیلہ تلاش کرو۔

اور ائمہ ہدیٰ علیہم السلام نے فرمایا ہے:

نحن الوسيلة،

وہ وسیلہ ہم اہل بیت ہیں۔

پس واضح ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ ائمہ ہدیٰ علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ بناؤ۔

ہماری ادعیہ میں ایک مشہور دعا "دعائے توسل" ہے اس میں انہیں چہاردہ معصومین علیہم السلام کو وسیلہ بنا کر دعا مانگی جاتی ہے

انا توجهنا و استشفعنا و توسلنا بك إلى الله، يا وجيها عند الله اشفع لنا عند الله

(ہم نے توجہ کی ہے اور ہم آپ سے سفارش کی درخواست کرتے ہیں اور ہم آپ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وسیلہ بناتے ہیں۔ اے بارگاہِ الٰہی میں بڑی عزت و عظمت رکھنے والے مولیٰ ہماری اللہ تعالیٰ کی خدمت میں شفاعت کر دیجئے)۔

اور چونکہ یہ معصوم اور ہادیٔ برحق ہستیاں، مقربانِ درگاہِ الٰہی ہیں اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کو قبول کرتا ہے اور دعاؤں کو مستجاب فرماتا ہے۔ ان کی شفاعت کے مطابق مشکلات کو حل کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ان کے ارادوں میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے اور کائنات میں مطلوبہ تبدیلی کر دیتا ہے اور اصطلاحاً اسی کو "ولایت تکوینی" سے بھی تعبیر کرتے ہیں جو کہ معجزات ہی کا دوسرا نام بنتا ہے لیکن یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے ذیل میں آتا ہے اور وہی اپنی مشیت کے مطابق ہر وسیلہ کے توسل کو قبول کرتا ہے اور ان کی شفاعت کو رنگ لگا دیتا ہے، لیکن کس قدر زیادتی ہے کہ کوئی گمراہ کن "شفیع اور وسیلہ" کو ربّ قرار دے دے یا اس ولایت کو ربوبیت کہنے لگ جائے اور اس طرح سادہ لوح عوام کو عقیدۂ تفویض کے جہنم میں دھکیل دے جو کہ شرک ہے اور ظلم عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان وسوسوں سے اپنی پناہ میں جگہ دے اسلئے ہم سب مل کر کہتے ہیں:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝١ مَلِكِ النَّاسِ ۝٢ اِلٰهِ النَّاسِ ۝٣ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۬ۙ الْخَنَّاسِ ۝٤ الَّذِيْ يُوَسْوِسُ فِيْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝٥ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ۝٦

(سورہ الناس، آیات ۱ تا ۶)

شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان و نہایت رحم والا ہے، آپ کہہ دیجئے! کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ میں آتا ہوں، لوگوں کے مالک اور لوگوں کے معبود کی (پناہ میں)، وسوسہ ڈالنے والے، پیچھے ہٹ جانے والے کے شر سے، جو لوگوں کے سینوں میں وسوسہ ڈالتا ہے (خواہ) وہ جنات میں سے ہو یا انسان میں سے۔

(حصہ دوم)

توحید در افعال

قرآن و ارشادات معصومینؑ کی روشنی میں:

قرآن مجید، احادیث معصومین علیہم السلام اور عقل و فکر انسانی سے جو صحیح عقیدہ ثابت ہوتا ہے اور جس پر ایمان لانا ہی انسان کو مومن بناتا ہے اور ہر قسم کے شرک سے محفوظ رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کی توحید پر ایمان رکھنا دین اسلام میں بنیادی عقیدہ ہے اور دیگر تمام عقائد کیلئے قطب اور مرکز کی حیثیت رکھتا ہے یعنی رسالت و نبوت اور ولایت و امامت بلکہ قیامت و آخرت پر ایمان رکھنا بھی توحید پر ایمان رکھنے کی فروع ہے اور توحید پر ایمان رکھنا اصل الاصول ہے۔

توحید پر ایمان رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات اور صفات میں لاشریک تسلیم کرے تو اسے اپنے افعال میں بھی ہر قسم کے شرک سے پاک مانے اور اقرار کرے کہ خلق ورزق، زندگی و موت اور اس کائنات کو پیدا کرنے والا اور اس کا نظام بنانے والا اور اسے چلانے والا وہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے اس کی خالقیت اور ربوبیت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور ان امور تکوینیہ کو اس نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔

اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہستی کو خلق کر لیا اور پھر اس کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ اس کائنات کو خلق کرے اور پھر اس ہستی نے اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ اس کائنات کو خلق کیا ہے تو یہ عقیدہ شرک ہے اور توحید و خالقیت کے خلاف ہے اور اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو خود خلق کیا لیکن اس کے بعد اس کی تدبیر و ادارت کو کسی دوسری ہستی کے سپرد کر دیا اور وہ ایک یا چند ہستیاں اس کائنات کا نظام چلا رہی ہیں اور تقدیر ان کے دست قدرت میں ہے تو یہ بھی شرک ہے اور توحید در ربوبیت کے خلاف ہے حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی خالق کائنات ہے اور خود ہی رب العالمین ہے۔

قرآن مجید میں توحید در خالقیت:

قرآن مجید میں جگہ جگہ واضح کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی پیدا کرنے والا نہیں، عالم ہستی یا اس میں موجود ہر شئے کو خلق کرنے والا وہ خود ہے اور کوئی نہیں اگرچہ ایسی آیات بہت زیادہ ہیں تاہم چند ایک آیات بطور تبرک پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (سورہ رعد، آیت ۔۱۶)

کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر شئے کا خالق ہے اور وہی یکتا اور غالب ہے

(۲) اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۙ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ○ (سورہ زمر، آیت ۔ ۶۲)

وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر شئے کا نگراں ہے۔

(۳) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (سورہ مومن/ غافر، آیت ۔ ۶۲)

وہی اللہ ہی تمہارا رب ہے، ہر شئے کو خلق کرنے والا ہے، اس کے علاوہ کوئی لائق عبادت نہیں۔

(۴) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ (سورہ الانعام، آیت ۱۰۲)

وہ اللہ ہی تمہارا رب ہے اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، وہی ہر شئے کا خالق ہے پس تم سب فقط اسی کی عبادت کرو۔

(۵) هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (سورہ حشر، آیت ۔ ۲۴)

وہ اللہ ہی خلق کرنے والا، وجود دینے والا، شکل وصورت بنانے والا ہے، تمام اچھے نام اسی کیلئے ہیں۔

(۶) اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۭ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ (سورہ انعام، آیت ۔۱۰۱)

اللہ تعالیٰ کا کوئی فرزند کیسے ہوسکتا ہے جبکہ اس کی تو کوئی شریک زندگی بھی نہیں اور اس نے ہر شئے کو خلق فرمایا ہے۔

(۷) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ (سورۃ فاطر، آیت ۔ ۳)

اے لوگو اللہ تعالیٰ کی جو تم پر نعمتیں ہیں ان کو یاد کرو، کیا اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے؟

(۸) اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (سورۂ اعراف ۔ آیت ۵۴)

خلق کرنا اور حکومتِ دنیا اس کے اختیار میں ہے، اللہ برکت والا ہے، وہی عالمین کا رب ہے۔

(۹) وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (سورۂ فرقان ۔ آیت ۲)

اور اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کو خلق کیا اور پھر ہر شئے کی اندازہ گیری کی ہے (تقدیریں بنائی ہیں)۔

(۱۰) الَّذِيٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (سورۃ طہ۔آیت ۵۰)

وہ اللہ ہے جس نے ہر شئے کو اس کی خلقت عطا کی ہے پھر اس کی ہدایت و رہنمائی کی ہے۔

(۱۱) الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ (سورۂ اعلیٰ۔آیات ۲ و ۳)

وہ اللہ جس نے ہر شئے کو خلق کیا پھر اسے صحیح و درست بنایا اور وہ جس نے تقدیر معین کی پھر اسے ہدایت فرمائی۔

(۱۲) هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(سورۃ لقمان، آیت۔۱۱)

یہ کائنات اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے، پس تم دکھاؤ کہ وہ کونسی شئے ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں نے خلق کیا ہے، لیکن ظالم لوگ بہت کھلی گمراہی میں ہیں۔

توحید در ربوبیت:

قرآن مجید اور محمد و آل محمد علیہم السلام جس ایمان کی دعوت دیتے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کیلئے رب العالمین ہونے کی توحید پر یقین رکھنا واجب ہے یعنی وہی وحدہٗ لاشریک، اس سارے جہاں کا اصلی اور حقیقی مدیر و مدبر اور اس کائنات کا ناظم اور چلانے والا ہے اس نے اپنا یہ نظام کلی یا جزوی طور پر کسی کے سپرد نہیں کیا اور نہ ہی اس کائنات میں موجود ہر شئے کی تقدیر سازی اس نے کسی شریک کے حوالے کی ہے پس وہ خود ہی ہر ہر ذرہ کے بارے میں فیصلے کرتا ہے اس کے وجود و عدم، اس کی ترقی و تنزلی، اس کے رزق اور موت و حیات کے فیصلے، غرض یہ کہ ہر قسم کا فیصلہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کرتا ہے اسی کا نام ربوبیت ہے جس میں وہ واحد لاشریک ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے منکر یا اس میں شریک کے قائل ہوئے ہیں ان کو کافر و مشرک قرار دیا ہے اور مومن وہی لوگ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں اس کی وحدانیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں بار ہا:

رب العالمین، رب کل شیء، رب العرش العظیم، رب السمٰوٰت والارض، رب نوح و ابراھیم، رب موسی وھارون، رب الانبیاء والمرسلین، رب السمٰوٰت السبع، ربکم ورب آبائکم الاوّلین، ربّ البیت، ربّ ھذہ البلدۃ، رب المشارق والمغارب، رب العزۃ، رب الشعریٰ، رب المشرقین، رب المغربین، رب الفلق اور رب الناس

کی تراکیب کو استعمال کیا گیا ہے اور بار بار اس ترکیب کے ذریعہ عقلاء عالم کو متوجہ کیا گیا ہے کہ کائنات کے مجموعے اور کائنات کی ہر شئے کا رب اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک ہے، یعنی اس کائنات کے ذرے ذرے پر اس ذات مدیر کا کنٹرول ہے ہر شئے اس کی مشیت سے مربوط ہے اس کے امر کا مطیع اور تابعدار ہے وہی ان کا مدیر و مدبر ہے وہی فیصلے

کرنے والا، بنانے والا، چلانے والا ہے۔ وہی ان کا قیوم ہے، اس کی ذات کے ساتھ ہر شئے قائم ہے۔ اشیاء عالم کو باہم مربوط کرنے والا، ان کی انواع واقسام کو تقسیم کرنے والا، ان کو اپنی اپنی حقیقت، ماہیت، طبیعت، فطرت، سرشت، خصوصیات، خاصیات، عوارض، لوازم دینے والا وہی ذات پروردگار ہے۔

اجسام کو ترکیب دینے والا، ان کا بسیط بنانے والا، ارواح و مجردات کو بنانے والا، اجسام کثیفہ ولطیفہ کو خلق کرنے والا، ان کے مشترکات و امتیازات کا ایجاد کرنے والا وہی وحدہٗ لاشریک ہے غرضیکہ ہر شئے کو شئے بنانے والا پھر ہر شئے کو ضروریات و احتیاجات لاحق کرنے والا، پھر ہر شئے کی ضروریات و احتیاجات کو دور کرنے کے وسائل پیدا کرنے والا، ان کو وسائل سے رزق مہیا کرنے والا، ان کو وجود از زندگی دینے والا، اس زندگی کی مدت معین کرنے والا، اس مدت کو اختتام دے کر موت دینے والا، پھر موت کے بعد نئی زندگی دینے والا، یہ سب کچھ ربوبیت کا حصہ ہیں اور وہ رب اللہ واحد ہے جس میں اس کا نہ کوئی شریک ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔

تمام انبیاء ورسل نے اوّل سے آخر تک اسی توحید در ربوبیت کی تعلیمات کو پھیلایا ہے اس پر زور دیا ہے اس کی تبلیغ کی اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ مقابلہ کیا، جہاد کیا، قربانیاں دیں اور کبھی بھی اس میں کسی ترمیم یا تبدیلی یا تنسیخ کو قبول نہ کیا۔ قول وعمل میں، سیرت و کردار میں، اس پر کار بند رہے۔ آج بھی قرآن مجید میں انبیاء و رسل اور ماسلف تمام پیامبران ومبلغین کے قصص اس سے بھرے ہوئے ہیں اور ان کی دعائیں بھی اسی پر دلالت کررہی ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام انبیاء جن کی تعداد بنابر مشہور ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے اور تمام رسل جن کی تعداد تین سو تیرہ اور تمام اولوالعزم ہستیاں جو پانچ ہیں اور اسی طرح تمام اوصیاء و اولیاء اور بارہ آئمہ ہدیٰ اور چودہ معصومین علیہم السلام سب اسی عقیدے پر ایمان رکھنے کی تبلیغ و ہدایت کرتے رہے ہیں کہ ہمارا رب، تمہارا رب، تمام انسانوں اور جنات کا رب، تمام ملائکہ ومقربین کا رب، تمام زمینوں اور آسمانوں کا رب، تمام جہانوں اور کائنات کا رب، ملاء اعلیٰ و عالم دنیا کا رب، گذشتہ حال اور آئندہ کا رب، جنت وجہنم اور عرش وکرسی کا رب، موت وحیات اور عالم برزخ ومحشر کا رب، غرضیکہ تمام عالمین کا رب وہی وحدہٗ ہے کہ جس کا کوئی شریک نہیں، نہ اس کی ذات میں، نہ اس کی صفات میں، نہ اس کے افعال میں، نہ اس کی خالقیت ورازقیت میں اور نہ اس کی ربوبیت و مدیریت میں، نہ یہ نظام بنانے میں اور نہ یہ نظام چلانے میں۔ چند قرآنی دعائیں قابل توجہ ہیں:

(۱) رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ، سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (سورۂ آل عمران، آیت۔۱۹۱)

اے ہمارے رب تو نے یہ سارا جہاں باطل (بے مقصد) خلق نہیں فرمایا، تو ہر نقص سے پاک ہے پس ہمیں جہنم کے عذاب سے بچالے۔

(۲)قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ.

(سورہ مائدہ، آیت ۱۱۴)

عیسیٰ نے دعا کی: اے میرے اللہ، ہمارے رب! ہم پر آسمان سے دسترخوان نعمت نازل فرما۔

(۳)وَقَالَ مُوْسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّاَمْوَالًا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔

(سورہ یونس، آیت۔ ۸۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اے ہمارے رب! بے شک تو نے ہی فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیوی زندگی کی زینت کا سامان اور سارے اموال عطا کئے۔

(۴)قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ○ (سورۃ طہٰ، آیت۔ ۵۰)

اس نے کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جس نے ہر شئے کو اس کی خلقت عطا کی ہے اور پھر اس کو راہ دکھائی ہے۔

(۵)رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا (سورۃ غافر، آیت۔ ۷)

ہمارا رب تو ہر شئے پر اپنی رحمت اور علم کی وجہ سے غلبہ رکھتا ہے پس ان لوگوں کو بخش دے جو توبہ کرتے ہیں۔

(۶)رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ (سورۂ اعراف، آیت ۸۹)

اے ہمارے رب، ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا دروازہ کھول دے اور تو سب سے بہترین راہ کھولنے والا ہے۔

توحید در الوہیت:

دین حق میں بدیہی اور ضروری عقیدہ جو روزِ روشن کی طرح واضح اور ہر مومن کیلئے ثابت ہے جس کے بغیر مسلمان ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا وہ یہ ہے کہ لائق عبادت اور معبودِ برحق فقط اللہ ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں ہے۔ کلمہ طیبہ میں

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

کا اقرار اور اذان و اقامت وتشہد اور ہر عبادت میں

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

کی علی الاعلان گواہی میں بھی یہی پیغام ہے اور اس ایمان کے بغیر دین اسلام میں داخل ہونا ناممکن ہے تو مسلمان رہنا بھی اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

قرآن مجید، احادیث نبویؐ اور آل محمد علیہم السلام کی تعلیمات اور تمام ماسلف علماء وفقہاء کی تصنیفات شاہد ہیں کہ اللہ تعالی نے اپنے لائق عبادت ہونے کا سبب اپنے خالق و رازق اور رب العالمین ہونے کو بیان فرمایا ہے بلکہ پوری صراحت سے فرمایا ہے کہ لائق عبادت ہونے کا استحقاق اسے اس لئے حاصل ہے کہ وہ تمہارا رب ہے اور اس نے تم سب کو خلق کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (سورہ بقرہ، آیت ۔۲۱)

اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے تمام انسانوں کو خلق کیا۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ (سورۃ الانعام، آیت ۔۱۰۲)

وہی (اللہ) ہی ہر شئے کا خالق ہے لہٰذا تم سب فقط اسی (خالق) کی عبادت کیا کرو۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ، هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○ (سورہ فاطر، آیت ۔ ۳)

اے لوگو! ان نعمتوں کو یاد رکھو جو اللہ تعالیٰ نے تم سب کو دی ہیں کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا ایسا خالق ہے جو تمہیں آسمان و زمین سے رزق دیتا ہو اس (اللہ) کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں تم کہاں بھٹک رہے ہو۔

ان تمام آیاتِ قرآنیہ پر غور کرنے والوں کیلئے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ فقط اللہ تعالیٰ ہی خالق ہے اور وہی رازق ہے۔ تمام نعمتیں دینے والا وہی ہے اور اسی لئے ہی لائق عبادت ہے کیونکہ اس کے معبود برحق ہونے کا سبب اس کا خالق و رازق اور منعم حقیقی ہونا ہے۔ پس اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو خالق و رازق اور رب تسلیم کرے گا تو ان پر لازم ہوگا کہ وہ اسی کو لائق عبادت بھی تسلیم کرے اور لا الہ الا اللہ کا منکر ہو جائے اور شرک کے گڑھے میں گر جائے بلکہ جتنے خالق مانتا جائے گا اتنے معبود تسلیم کرے گا حالانکہ قرآن مجید اور محمد وآل محمد علیہم السلام اور اسلام کی مسلم اور بدیہی تعلیم یہی ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اعلان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو لائق عبادت مانتے ہیں نہ رب العالمین، نہ خالق کائنات اور نہ ہی رازق آسمان و زمین۔

قرآن مجید میں ذکر شدہ دعائیں اور آئمہ علیہم السلام کی منقول ادعیہ میں ہر جگہ یہی بیان موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی خالق و رازق ہے، زندگی اور موت دینے والا ہے، سارے امورِ تکوینیہ اس کے اختیار میں ہیں اور وہی رب العالمین ہے۔ یہ

ساری کائنات اور اس کی ہر شئے اس نے خلق کی ہے، اسی کے ساتھ قائم ہے اور وہی لائق عبادت ہے۔ ملاحظہ ہو امام علی رضا علیہ السلام کی دعا میں ہے:

يَا مَنْ لَا شَبِيهَ لَهُ وَ لَا مِثَالَ أَنْتَ اللهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ وَ لَا خَالِقَ إِلَّا أَنْتَ تُفْنِي الْمَخْلُوقِينَ وَ تَبْقَى أَنْتَ.

اے وہ ذات جس کی کوئی شبیہ اور مثال نہیں ہے تو ہی وہ اللہ کہ تیرے سوا کوئی لائق عبادت نہیں اور تیرے سوا کوئی خالق نہیں تمام مخلوقات فنا ہو جائیں گی اور تیری ذات باقی رہے گی (عیون الاخبار الرضا، ج ۱، ص ۴۲)

دعائے جوشن کبیر میں ہے:

يَا خَالِقَ كُلِّ مَخْلُوقٍ يَا رَازِقَ كُلِّ مَرْزُوقٍ .... يَا مَنْ لَا يَخْلُقُ الْخَلْقَ إِلَّا هُوَ.... يَا مُحْيِيَ كُلِّ شَيْءٍ وَ مُمِيتَهُ يَا خَالِقَ كُلِّ شَيْءٍ وَ وَارِثَهُ.

اے ہر مخلوق کے خالق، اے ہر رزق پانے والے کے رازق، اے وہ کہ مخلوق کو کوئی خلق نہیں کر سکتا مگر وہ ہی خلق کرتا ہے، اے ہر شئے کو زندگی دینے والے اور موت دینے والے، ہر شئے کے خالق اور ہر شئے کے مالک۔

دعائے صباح میں ہے جو امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول دعا ہے:

اَللّٰهُمَّ يَا مَنْ دَلَعَ لِسَانَ الصَّبَاحِ بِنُطْقِ تَبَلُّجِهِ وَ سَرَّحَ قِطَعَ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ بِغَيَاهِبِ تَلَجْلُجِهِ وَ أَتْقَنَ صُنْعَ الْفَلَكِ الدَّوَّارِ فِي مَقَادِيرِ تَبَرُّجِهِ وَ شَعْشَعَ ضِيَاءَ الشَّمْسِ بِنُورِ تَأَجُّجِهِ.

اے وہ کہ جس نے صبح کو اس تابناکی کے ساتھ ظاہر کر دیا اور تاریک رات کے ٹکڑوں کو اس کے سیاہ پاروں سمیت پراگندہ کر دیا اور دورہ کرنے والے فلک کو اس کے مقرر کردہ برجوں میں مضبوط کر دیا اور آفتاب کی تیز روشنی کو اس کے فروزاں نور کے ساتھ ہر طرف پھیلا دیا۔

دعائے سمات میں ہے جو کہ امام صاحب الامر، امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہم السلام سے روایت کی گئی ہے:

اللهم اني اسئلك باسمك العظيم الاعظم الاعز الاجل الاكرم ..... وَ بِقُوَّتِكَ الَّتِي بِهَا تُمْسِكُ السَّمَاءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِكَ وَ تُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَ الْاَرْضَ اَنْ تَزُولَا وَ بِمَشِيَّتِكَ الَّتِي دَانَ لَهَا الْعَالَمُونَ وَ بِكَلِمَتِكَ الَّتِي خَلَقْتَ بِهَا السَّمَاوَاتِ وَ الْاَرْضَ وَ بِحِكْمَتِكَ الَّتِي صَنَعْتَ بِهَا الْعَجَائِبَ وَ خَلَقْتَ بِهَا الظُّلْمَةَ وَ جَعَلْتَهَا لَيْلًا وَ جَعَلْتَ اللَّيْلَ سَكَناً وَ خَلَقْتَ بِهَا النُّورَ وَ جَعَلْتَهُ نَهَاراً وَ جَعَلْتَ النَّهَارَ نُشُوراً مُبْصِراً وَ خَلَقْتَ بِهَا الشَّمْسَ وَ جَعَلْتَ

الشَّمْسَ ضِيَاءً وَ خَلَقْتَ بِهَا الْقَمَرَ وَ جَعَلْتَ الْقَمَرَ نُوراً وَ خَلَقْتَ بِهَا الْكَوَاكِبَ وَ جَعَلْتَهَا نُجُوماً وَ بُرُوجاً وَ مَصَابِيحَ وَ زِينَةً وَ رُجُوماً لِلشَّيَاطِينِ وَ جَعَلْتَ لَهَا مَشَارِقَ وَ مَغَارِبَ وَ جَعَلْتَ لَهَا مَطَالِعَ وَ مَجَارِيَ وَ جَعَلْتَ لَهَا فَلَكاً وَ مَسَابِحَ وَ قَدَّرْتَهَا فِي السَّمَاءِ مَنَازِلَ فَأَحْسَنْتَ تَقْدِيرَهَا وَ صَوَّرْتَهَا فَأَحْسَنْتَ تَصْوِيرَهَا وَ أَحْصَيْتَهَا بِأَسْمَائِكَ إِحْصَاءً وَ دَبَّرْتَهَا بِحِكْمَتِكَ تَدْبِيراً فَأَحْسَنْتَ تَدْبِيرَهَا وَ سَخَّرْتَهَا بِسُلْطَانِ اللَّيْلِ وَ سُلْطَانِ النَّهَارِ وَ السَّاعَاتِ وَ عَدَدِ السِّنِينَ وَ الْحِسَابِ وَ جَعَلْتَ رُؤْيَتَهَا لِجَمِيعِ النَّاسِ مَرْأًى وَاحِداً ..... الخ

اے میرے اللہ! میں تجھ سے تیرے اس اسم کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جو عظمت والا، سب سے بڑی شان والا، سب سے زیادہ عزت والا، سب سے اونچی جلالت والا، سب سے بلند کرامت والا ہے اور تیری اس قوت کے واسطے سے سوال کرتا ہوں جس کے ذریعہ تو نے آسمان کو زمین پر گرنے سے روک رکھا ہے، کہ ایسا تیرے اذن کے بغیر نہیں ہوسکتا، تو نے آسمانوں اور زمین کو اپنی جگہ چھوڑنے سے روک رکھا ہے، تیری اس مشیت کے توسل سے سوال کرتا ہوں جس کو سارے جہاں تسلیم کئے ہوئے ہیں، تیرے اس کلمہ کے وسیلے سے سوال کرتا ہوں جس کے ساتھ تو نے آسمانوں اور زمین کو خلق فرمایا ہے، تیری اس حکمت کے ذریعے سوال کرتا ہوں جس کے ذریعے تو نے تمام عجائبات کو بنایا ہے۔ جس کے ذریعہ تاریکی کو خلق کیا، اس کو رات قرار دیا اور اس رات کو سکون بنادیا اور جس کے ذریعہ تو نے نور کو خلق کیا، اسے دن بنادیا اور اس دن کو بیدار رہنے اور دیکھنے کا ذریعہ قرار دیا، اسی ذریعہ سے تو نے چاند کو خلق کیا، اس چاند کو نور بنادیا، اسی کے ذریعہ سے تو نے کواکب کو پیدا کیا تو نے ان کو ستارے اور بروج قرار دے دیا، نیز روشنی کے چراغ کو آسمانوں کی زینت اور شیاطین پر سنگباری کا ذریعہ بنادیا، ان کیلئے بہت سارے مشرق ومغرب بنائے، طلوع کے مقامات اور حرکت کرنے کے مقررہ راستے عطا کر دیئے، ان کیلئے افلاک اور وسیع آسمانی فضاؤں میں تیرنے کی منزلیں بنادیں، پس تو ہی ہے جس نے ان کی بہترین اندازہ گیری فرمائی، ان کو صورتیں دیں، خوبصورت ترین شکلیں عطا کر دیں، تو نے ہی ان سب کو اپنے اسماء کے ذریعہ دائرہ شمار میں صحیح طریقے سے گھیر لیا ہے، اپنی حکمت کے ساتھ ان کی بے مثال تدبیر کر رکھی ہے، ایسی تدبیر کہ جس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہوسکتی، تو نے اس عالم کائنات کو رات کی تاریکی اور دن کی روشنی اور گھڑیوں کے تسلط میں جکڑ لیا ہے، ان کے ذریعے سالوں کی تعداد اور کیلنڈر کے حساب کی معرفت پیدا کر دی ہے، ان کے دکھائی دینے کو سارے انسانوں کیلئے ایک مرکز رؤیت قرار دے دیا.........الخ۔

دعائے وحدت میں ہے کہ:

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ إِلٰهاً وَاحِداً وَ نَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ وَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّنَا وَ رَبُّ آبَائِنَا الْأَوَّلِينَ وَ لَا

اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَا نَعْبُدُ اِلَّا اِيَّاهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ..... يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وَ يُمِيْتُ وَ يُحْيِيْ وَ هُوَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ.

نہیں کوئی لائق عبادت سوائے اللہ تعالیٰ کے جو اکیلا معبود ہے اور ہم سب اس کو تسلیم کرنے والے ہیں، نہیں کوئی لائق عبادت سوائے اللہ تعالیٰ کے جو ہم سب کا رب اور ہمارے گذشتہ آبا ؤ اجداد کا رب ہے، نہیں کوئی لائق عبادت مگر وہ اللہ اور ہم سب فقط اسی کی عبادت کرتے ہیں، اس کے دین میں پوری طرح مخلص ہیں اگر چہ کہ مشرک لوگ اسے پسند نہیں کرتے، وہی اللہ زندہ کرتا ہے، وہی موت دیتا ہے، وہی دوبارہ زندگی عطا کرتا ہے، جبکہ وہ خود ایسا زندہ ہے جس کیلئے موت کا کوئی امکان نہیں، ہر خیر اس کے دست قدرت میں ہے، وہی ہر شئے پر قدرت رکھتا ہے۔

عقیدۂ تفویض شرک ہے:

اکثر مشرکین شرک در ربوبیت کی وجہ سے شرک در الوہیت کے مرتکب ہوئے قرآن مجید کی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ گذشتہ اقوام میں شرک کے رائج ہونے کی وجہ یہی ہوئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق ماننے کے باوجود اس کے رب ہونے کے منکر ہوئے ہیں اور دوسروں کو رب ماننے لگ جاتے رہے ہیں کبھی کسی انسان نے ان سے اپنے رب ہونے کا اقرار کر لیا ہے جیسے فرعون و نمرود وغیرہ نے اور کبھی مذہبی راہنماؤں کو انہوں نے رب مان لیا۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ توبہ، آیت ۳۱)

اور کبھی وہ اپنے بنائے ہوئے اصنام اور بتوں کو اپنا رب مان لیتے اور کبھی ان تمام کو رب خیال کرتے اور پھر ان کی عبادت کرتے۔

انبیاء و رسل علیہم السلام نے ہمیشہ ان کو اس باطل اور فاسد عقیدے سے منع کیا اور فرمایا کہ یہ شرک ہے اور تم پر لازم ہے کہ فقط اور فقط اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے قائل رہو، توحید در ربوبیت کے منکر مت بنو، نہ ہی توحید اور الوہیت کا انکار کرو، اس امر کا کوئی جواز نہیں کہ عبادت میں اللہ تعالیٰ کو وحدۂ لاشریک مانا جائے اور ربوبیت میں اسے وحدۂ نہ مانا جائے بلکہ توحید در ربوبیت کا ایمان ہی توحید در الوہیت کی بنیاد بنتا ہے خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں مکہ کے مشرکین بھی اسی فاسد عقیدے پر تھے۔ اپنا رب اصنام، ہبل، لات، منات اور عزیٰ اور دیگر بتوں کو مان لیتے، ان سے دعائیں کرتے اور ان کی عبادت کرتے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ، فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ○ (سورۂ عنکبوت، آیت۔ ۶۱)

اور اگر تو ان سے سوال کرے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا ہے اور سورج چاند کو کس نے تابع کر دیا ہے تو وہ جواب میں ضرور کہیں گے کہ وہ فقط اللہ تعالیٰ کا کام ہے تو پھر وہ کدھر بھٹک رہے ہیں۔

معلوم ہوا کہ عرب کے بت پرست خالق کائنات اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے لیکن (تدبیر کائنات) میں مشرک ہو گئے کیونکہ بعض کا نظریہ یہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے عالم کی تخلیق کے بعد اس کے امور کی تدبیر کو اپنی برتر مخلوقات کے سپرد کر دیا ہے اور خود ایک طرف ہو گیا ہے۔ اور وہ برتر مخلوق ان کی نگاہ میں فرشتے، جنات، ارواح اور سورج، چاند، ستارے وغیرہ تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے متعلق آیات بتاتی ہیں کہ ان کے زمانے کے لوگ سورج یا چاند یا ستاروں کی ربوبیت کو مانتے تھے اور اسی لئے حضرت ابرہیم علیہ السلام ان میں ہر ایک کے افول اور غروب کر جانے کو ان کے رب ہونے کی نفی کی علت کے طور پر بیان کرتے رہے۔ کچھ اقوام مزید پست ہو گئیں اور انہوں نے درختوں، پتھروں اور بتوں کو بھی رب تسلیم کر لیا اور ان کو عالم کائنات کے امور کی تدبیر میں دخیل ماننے لگ گئے۔ وڈ، سواع، یغوث، یعوق، نسر، ہبل وغیرہ ان کے نام رکھ لئے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ۔

(سورۃ یونس۔ آیت ۱۸)

اور وہ اللہ کے غیر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ ان کو نقصان دے سکتی ہیں اور نفع پہنچا سکتی ہیں اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہماری شفاعت کرنے والے ہیں۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰی (سورۃ الزمر، آیت۔ ۳)

(اور مشرک کہتے ہیں) کہ ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب کرتے ہیں۔

انبیاء و رسل اور معصومین علیہم السلام کیلئے تفویض کا عقیدہ رکھنا بھی شرک ہے:

تدبیر عالم اور کائنات کی ربوبیت میں توحید کا انکار کرنے والے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو فرقہ مفوضہ کا نام دیا گیا ہے وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خلق ورزق، موت وحیات اور کائنات کی تدبیر و ربوبیت کا معاملہ انبیاء و رسل یا محمد وآل محمد علیہم السلام کے سپرد کر دیا ہے اب ان تمام امور تکوینیہ کی ادائیگی یہ معصوم ہستیاں بجالاتی ہیں، تقدیر کے تمام معاملات ان کے دست قدرت میں ہیں اور اللہ تعالیٰ اس عالم کو خلق کرنے کے بعد اس سے لاتعلق ہو گیا ہے۔ (یہ تفویض استقلالی ہے)۔

اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اس حد تک تو تعلق ہے کہ وہ اپنی مشیت سے ان معصوم ہستیوں کو آگاہ کرتا رہتا

ہے اور پھر اس کی مشیت کے مطابق اس نظام عالم کا چلانا ان معصومین علیہم السلام کے اختیار میں ہے پس تدبیر امور عالم کی انجام وہی ان کے دست قدرت میں ہے البتہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور مشیت کے مطابق ہے (یہ تفویض غیر استقلالی ہے)۔

جبکہ آئمہ معصومین علیہم السلام کے نورانی ارشادات کے مطابق تفویض کی یہ دونوں قسمیں باطل اور فاسد ہیں ان کا معتقد مشرک ہے اور وہ معصوم ہستیاں اس عقیدے سے بیزار ہیں اور ان پر لعنت کرتے ہیں۔

ارشاداتِ معصومین علیہم السلام:

(۱) عیون الاخبار الرضا علیہ السلام کی جلد ۲ اور صفحہ ۱۵۸ پر وارد ہے:

وفیه ایضا باسناده عن أبی هاشم الجعفری قال سألت أبا الحسن الرضا علیه السلام عن الغلاة المفوضة فقال الغلاة كفار و المفوضة مشركون، من جالسهم أو خالطهم أو اكلهم او شاربهم او واصلهم أو زوجهم أو تزوج أليهم او آمنهم أو أتمنهم على أمانة أو صدق حديثهم او اعانهم بشطر كلمة خرج عن ولاية الله عز وجل و ولاية رسول الله و ولايتنا اهل البيت.

حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے ابو ہاشم جعفری نے غالی اور مفوضہ لوگوں کے بارے میں پوچھا تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: غالی کافر ہیں اور مفوضہ مشرک ہیں جو ان کے ساتھ بیٹھے، ان کے ساتھ رفت وآمد اور میل جول رکھے، ان کو کھلائے یا پلائے، ان سے ربط وتعلق قائم رکھے، ان کو رشتہ دے یا ان سے رشتہ لے، ان کا امین بنے یا ان کو اپنی امانت پر امین بنائے، ان کی باتوں کی تصدیق کرے یا ایک لفظ کے حصے کے ساتھ بھی ان کی اعانت کرے، وہ اللہ تعالیٰ کی ولایت سے خارج ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولایت سے باہر ہے اور ہم اہل بیت علیہم السلام کی ولایت سے بھی نکل گیا ہے۔

(منہاج البراعۃ شرح نہج البلاغہ۔ ج ۲۔ص ۱۰۹)

(۲) شیخ صدوق ؒ نے اپنے اعتقادیہ میں زرارۃ سے نقل کیا ہے زرارۃ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ عبداللہ بن سبا کی اولاد میں ایک شخص تفویض کا معتقد ہو گیا ہے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا:

وما التفويض؟

وہ تفویض سے کیا مراد لیتا ہے؟ تو میں نے عرض کیا کہ وہ کہتا ہے:

ان الله تبارك و تعالى خلق محمد أو عليا صلوات الله عليهما ففوض اليهما فخلقا و رزقا

و أماتا واحیا.

کہ اللہ تعالیٰ نے محمد مصطفیٰ ﷺ اور علی مرتضی علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر عالم دنیا کا معاملہ ان کے سپرد کر دیا لہٰذا ان دونوں بزرگوں نے اس عالم کو خلق کیا ہے اور وہی ان کو رزق دیتے ہیں، زندگی وہی دیتے ہیں اور موت بھی وہی دیتے ہیں۔

تو آپ نے فرمایا!

کذب عدو اللہ.

دشمن خدا جھوٹ بکتا ہے۔

جب اس کے پاس جاؤ تو اس کے سامنے یہ آیت تلاوت کر دینا جو سورۂ رعد میں ہے:

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ۭ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (سورہ رعد، آیت ۱۶)۔

کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایسے شریک بنا لئے ہیں جنہوں نے بھی کچھ چیزوں کو خلق کیا ہے جیسا اللہ تعالیٰ خلق کرتا ہے پھر ان لوگوں پر مخلوقات میں اشتباہ ہو گیا ہے۔ میرے رسول! کہہ دو، فقط اللہ تعالیٰ ہی ہر شئے کا خالق ہے وہی یکتا و یگانہ اور ہر شئے پر غالب ہے۔

زرارہ کہتے ہیں کہ جب میں واپس لوٹا تو اس شخص کے پاس گیا تو یہ سب کچھ اسے بتایا اور اس آیت کی تلاوت کی تو وہ اس طرح خاموش ہو گیا کہ گویا میں نے اس کے منہ میں پتھر ٹھونس دیا ہو یا وہ گونگا ہو گیا ہو۔

(۳) شیخ صدوقؒ اعتقادیہ میں فرماتے ہیں کہ:

غالی مفوضہ کے متعلق ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ وہ ملعون کافر باللہ ہیں، وہ یہود، نصاریٰ، مجوسی، قدریہ اور خارجیوں سے بھی بدتر ہیں۔ وہ بدعتی اور گمراہ کن لوگ ہیں، انہوں نے جس قدر عظمت الٰہی کی توہین کی ہے اتنی کسی نے نہیں کی۔ ان کے بارے میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام اپنی دعا میں فرماتے ہیں:

اللهم إني بريء إليك من الحول و القوة ولا حول و لا قوة إلا بك، اللهم إني أبرأ إليك من الذين قالوا فينا ما لم نقله في أنفسنا، اللهم لك الخلق و منك الرزق و إياك نعبد و إياك نستعين، اللهم أنت خالقنا و خالق آبائنا الأولين و آبائنا الآخرين، اللهم لا تليق الربوبية إلا بك و لا تصلح الإلهية إلا لك فالعن النصارى الذين صغّروا عظمتك و العن المضاهئين لقولهم من بريتك، اللهم إنا عبيدك و أبناء عبيدك لا نملك لأنفسنا نفعا و لا ضرّا و لا موتا و لا حياة و لا نشورا، اللهم من زعم أننا أرباب فنحن منه براء، و من زعم

أنّ إلينا الخلق و علينا الرّزق، فنحن منه براء كبراءة عيسى بن مريم من النّصارى، اللهم إنا لم ندعهم إلى ما يزعمون، رب لا تذر على الأرض من الكافرين و لا تدع على الارض منهم ديارا إنك إن تذرهم يضلّوا عبادك و لا يلدوا إلا فاجرا كفارا.

"اے میرے اللہ میں اس قوت و طاقت سے بری ہوں جو تیری جانب سے نہ ہو، کیونکہ کوئی قوت و طاقت ایسی نہیں ہوسکتی جو تیری طرف سے نہ ہو، اے میرے اللہ میں تیری بارگاہ میں ان لوگوں سے برأت کا اعلان کرتا ہوں جو ہمارے بارے میں ایسے دعوے کرتے ہیں جو ہمارے لئے حق نہیں ہیں، میں تیری درگاہ میں ان لوگوں سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں جو ہمارے بارے میں وہ کہتے ہیں جو ہم نے خود نہیں کہا ہے، اے میرے اللہ! خلق کرنا تیری شان ہے اور رزق تیری ہی جانب سے ہوتا ہے، ہم تو فقط تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد کے طلب گار ہیں، اے اللہ تو ہی ہمارا خالق ہے ہمارے پہلے اور آخری آباؤ اجداد کا خالق ہے۔ اے اللہ! ربوبیت (رب ہونا) فقط تیری ہی شان کے لائق ہے، معبود ہونا بھی فقط تیری ذات کیلئے ثابت ہے (تیرے علاوہ کوئی رب اور معبود نہیں ہوسکتا)، پس اے اللہ! لعنت کر نصارئ پر جنہوں نے تیری عظمت میں کمی کی ہے، ان کافروں پر لعنت کر جنہوں نے تجھے اجسام کے ساتھ تشبیہ دی ہے حالانکہ یہ سب اجسام تیری مخلوق ہیں، اے اللہ ہم سب تیرے بندے ہیں اور تیرے بندوں کے فرزندان ہیں، ہم تو اپنی ذات کیلئے بھی نفع کے مالک ہیں، نہ ضرر کے، نہ اپنی زندگی پر اختیار رکھتے ہیں اور نہ موت پر، نہ موت کے بعد دوسری زندگی پر، اے اللہ! جو کوئی یہ گمان کرے کہ ہم رب ہیں (یعنی اس نظام کائنات کے چلانے والے ہیں) تو ہم اس سے بری ہیں، جو کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ خلق کرنا ہمارا اختیار ہے اور رزق دینا ہماری ذمہ داری ہے، تو ہم اس سے اس طرح بیزار ہیں، جس طرح حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ان نصاریٰ سے بیزار ہیں، اے خداوندا! ہم نے ان کو ان فاسد عقائد کی طرف دعوت نہیں دی ہے، لہٰذا جو کچھ یہ کہتے ہیں اس کا مواخذہ ہم سے نہ فرما، جو کچھ وہ مانتے ہیں ہم اس کی تجھ سے معافی چاہتے ہیں، اے میرے رب ان کافروں کا کوئی گھرانہ اس زمین پر باقی نہ رکھ کیونکہ اگر ان کو رہنے دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور آئندہ کافر اور فاجر اولاد جنم دیں گے۔"

(۴) کتاب الاحتجاج للطبرسیؒ اور کتاب عیون الاخبار الرضا علیہ السلام میں یہ روایت موجود ہے کہ علی بن الدلال القمی کہتے ہیں کہ شیعہ کی ایک جماعت میں یہ اختلاف واقع ہوگیا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے خلق کرنے اور رزق دینے کا معاملہ آئمہ علیہم السلام کے سپرد کر دیا ہے یا نہیں؟ تو ایک گروہ نے کہا کہ یہ محال ہے اور ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اجسام کو خلق کرنے پر قادر کرے اور دوسرے گروہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آئمہ علیہم السلام کو اس امر پر قادر کر دیا ہے اور یہ معاملہ ان کے سپرد کر دیا ہے لہٰذا وہ خلق و رزق کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

ان دونوں کے درمیان اس معاملے پر سخت نزاع پیدا ہو گیا، تو ایک سمجھ دار شخص نے ان کو مشورہ دیا کہ تم اس بارے میں حضرت حجۃ ابن الحسن (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کے نائب ابو جعفر محمد بن عثمان کی طرف کیوں نہیں رجوع کرتے؟ ان سے سوال کرو اور حق کا جواب حاصل کرو، کیونکہ وہ حضرت حجۃ ابن الحسن (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) تک رسائی کا وسیلہ ہیں، تو وہ سارے لوگ اس پر راضی ہو گئے اور یہ مسئلہ تحریر کر کے بذریعہ ابو جعفر، حضرت حجۃ ابن الحسن (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی خدمت میں روانہ کیا، تو حضرت صاحب الزمان (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی طرف سے ان کے دستخط اور مہر کے ساتھ یہ جواب موصول ہوا!:

ان الله تعالى هو الذى خلق الاجسام و قسم الارزاق لانه ليس بجسم ولا حال فى جسم ليس كمثله شىء وهو السميع البصير فأما الائمة فأنهم يسئلون الله فيخلق ويسئلونه فيرزق ايجابا لمسئلتهم واعظاما لحقهم.

"کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے تمام اجسام کو خلق فرمایا ہے اور تمام ارزاق تقسیم کئے ہیں، کیونکہ وہ خود نہ جسم ہے اور نہ کسی جسم میں حلول کرتا ہے اس کی مثل کوئی شئے نہیں اور وہ سمیع و بصیر ہے، آئمہ علیہم السلام کی شان یہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے کسی شئے کو پیدا کرنے کا سوال کرتے ہیں تو وہ خلق کر دیتا ہے، جب وہ رزق دینے کا سوال کرتے ہیں تو وہ رزق دے دیتا ہے (کیونکہ وہ ان ہستیوں کی دعا ردّ نہیں کرتا) بلکہ وہ ان کی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور ان کے حق کی عظمت کو روشن کرتا ہے۔"

معجزات و کرامات برحق ہیں اور ان کا انکار کفر و ضلالت ہے:

واضح کیا گیا کہ تفویض وغلو پر عقیدہ رکھنا شرک و بدعت ہے اور موجب لعنت ہے لیکن اس بات پر ایمان رکھنا لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان معصوم بندوں کو جنہیں نبوت، رسالت اور امامت و ولایت کے عظیم الشان مناصب عطا کرتا ہے ان کی حقانیت کے ثبوت اور ان کی عظمت و شان کی بلندی کے اظہار کیلئے ان کو معجزات اور کرامات عطا کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اس نظام کائنات میں جاری و ساری عادات کے خلاف ہر اقدام کرتے ہیں اور ایسے افعال صادر کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام عالم میں جاری قوانین الٰہی کے خلاف عمل ہوا ہے۔ مثلاً آگ کا گلزار ہو جانا، عصا کا اژدھا بن جانا، بہتے دریا کے پانی کا رک جانا اور اس میں راستہ بن جانا، پتھر سے ناقہ کا نکل آنا، گائے کے گوشت کا ٹکڑا لگنے سے ایک مردہ انسان کا زندہ ہو جانا، انگلی کے اشارے سے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا اور ڈوبے ہوئے سورج کا واپس پلٹ آنا، ہاتھوں پر پتھر کے سنگ ریزوں کا تسبیح پڑھنا، ایک سوسمار جیسے جانور کا فصیح عربی زبان میں توحید و رسالت کی گواہی دینا، پاؤں کی ٹھوکر سے میت کا زندہ ہو کر اٹھ بیٹھنا اور ایک انگلی کی طاقت سے قلعہ خیبر کے وزنی ترین دروازے کو اکھاڑ لینا، دھوپ میں بدن کا سایہ نہ ہونا، بدن پر کسی مکھی کے بیٹھنے کی جرأت نہ کر سکنا، کپڑے پر بنی ہوئی تصویر کا زندہ

شیر میں بدل جانا، ایسے سینکڑوں معجزات و کرامات ہیں جو انبیاء و رسل اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی اہل بیت علیہم السلام کے آئمہ ہدیٰ علیہم السلام سے ثابت ہیں اور ان میں شک کرنا کھلی گمراہی، قرآن مجید کا انکار اور واضح کفر ہے۔

یہ بات عین حکمت الٰہی کے مطابق ہے، چونکہ اس نے جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کو مجبور نہیں بنایا بلکہ اگر کوئی ربوبیت و الوہیت، نبوت و رسالت اور امامت و ولایت کا جھوٹا دعویٰ کرے تو اس کا اختیار بحال رکھتا ہے نہ اس کی زبان بند ہوتی ہے نہ اس کی توانائی سلب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرعون و نمرود جیسے سلاطین نے اپنے رب العالمین ہونے کا دعویٰ کیا اور مسیلمہ کذاب اور سجاع نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور بہت سارے یزید صفت لوگ خلافت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور لوگوں کے امام ہونے کے مدعی بنے رہے اور لوگوں کو گمراہ کرتے رہے اور کفر و شرک کے اندھیروں میں دھکیلتے رہے لیکن نہ ان پر جلدی موت آئی اور نہ ہی ان کی طاقتیں اور قوتیں سلب ہوئیں۔

تو اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضہ یہ ہوا کہ وہ اپنے سچے اور برحق نمائندگان کو نبوت و رسالت کے ثبوت کیلئے معجزات کا مالک بناتا ہے اور ولایت و امامت کے اثبات کیلئے صاحب اعجاز قرار دیتا ہے جس سے ان کی شان و عظمت اس قدر بلند ہو جاتی ہے کہ وہ کائنات کی کسی شئے میں کسی تبدیلی کا امر کرتے ہیں تو وہ شئے ان کے امر کے مطابق اطاعت گذار ثابت ہوتی ہے اور جو کچھ وہ فرماتے ہیں وہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید نے ان معجزات کو آیاتِ بینات سے یاد کیا ہے اور گذشتہ انبیاء و رسل کے متعدد معجزات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور سید الرسل حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کی طرف توجہ دلائی ہے بلکہ خود قرآن مجید آپ کی صداقت و حقانیت کا ابدی معجزہ ہے اور اس کا چیلنج آج بھی زندہ ہے اور لاجواب رہا ہے اور اس طرح تا قیامت لاجواب رہے گا اور کتب سیرت و تاریخ میں آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کے معجزات و کرامات اس تواتر کے ساتھ منقول ہیں کہ ان میں شک کرنا گمراہی اور کفر کے برابر ہو سکتا ہے۔

یہ مسئلہ اگرچہ علماء و محققین کے درمیان زیر بحث رہا ہے اور دو قول سامنے آئے ہیں، کہ ان معجزات کی قدرت اللہ تعالیٰ معجز نما کو عطا کر دیتا ہے اور وہ پاک ہستیاں اپنے ارادہ و اختیار کی قوت کے ساتھ اس فعل کے فاعل بنتے ہیں اور معجزہ کو فعل معجز نما قرار دیا جا سکتا ہے (اور اس کو ولایت تکوینی سے بھی یاد کیا جاتا ہے) یا معجز نما اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے قلبی ارادے یا زبانی قول کے ساتھ، اسم اعظم کی تلاوت کے ساتھ یا اس کے بغیر اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ اس کی خواہش یا طلب کے مطابق یا اس کے بغیر اپنی مرضی و مصلحت کے مطابق اس خلاف عادت معجزے کو صادر کر دیتا ہے۔

اس بارے میں متقدمین شیعہ علماء کی اکثریت دوسرے قول کی قائل رہی ہے اور معجزہ کو فعلِ خدا مانتے رہے ہیں اور متاخرین شیعہ علماء کی ایک معتد بہ تعداد پہلے قول یعنی ولایت تکوینی کے قائل ہوئی ہے، دونوں قائلین کے ہاں قرآن و سنت اور عقل کے دلائل موجود ہیں اور اپنے اپنے نظریات پر استدلال کئے گئے ہیں اور ایک علمی بحث کے طور پر یہ

مباحثہ موجود ہے اور رہے گا۔

تاہم اس سے بنیادی عقیدۂ توحید پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نہ اس سے غلو و تفویض کے باطل و فاسد عقیدے پر کوئی فائدہ مرتب ہوتا ہے اور نہ ہی معجزات و کرامات کی حقانیت متاثر ہوتی ہے کیونکہ تفویض کا مطلب ہے کہ اس کائنات کا نظام اور ربوبیت کو غیر خدا کیلئے تسلیم کرنا اور یہ ماننا کہ اللہ تعالیٰ نے تدبیر کائنات اور رب عالمین ہونے کو محمد وآل محمد علیہم السلام یا کسی دیگر ہستی کے سپرد کر دیا ہے اور یہ باطل ہے اور شرک ہے۔ معجزات و کرامات دینے کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس نظام کائنات میں اپنے سچے نمائندگان کیلئے کسی تبدیلی کو خلافِ عادت جاری کرنے کی اجازت دیتا ہے تاکہ ان کی عظمت و حقانیت ثابت ہو سکے اور ان کا منجانب اللہ ہونا ثابت ہو خواہ ان کو قدرت دے کر یا کائنات کی اس جز کو ان کے ارادے کے ماتحت مسخر کر کے یا اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ، ان کی دعا کے نتیجہ میں یا اس کے بغیر اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق، بہر حال تفویض شرک و بدعت ہے اور معجزات و کرامات برحق اور جزوِ ایمان ہیں۔

توسل و استشفاع عین ایمان ہے:

جب ہم اس امر پر ایمان رکھتے ہیں کہ اس کائنات کا مدیر و مدبر اور رب العالمین اللہ وحدہ لاشریک ہے، اس نظام تکوین کے ساتھ ساتھ اس سے زیادہ اہم نظام ہدایت قائم فرمایا ہے، یہی نظام ہدایت دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں کامیابی و کامرانی اور ابدی سعادت کا ضامن ہے، جو کوئی اس نظام ہدایت پر ایمان اور اس کے مطابق اپنی زندگی میں عمل کرتا ہے تو اس کو اس دنیا اور ابدی آخرت میں سعادت ہی سعادت حاصل ہو جاتی ہے۔ جنت جو ابدی سعادت کا مرکز ہے وہ اس کا حقدار بن جاتا ہے جہنم جو ابدی شقاوت اور ہمیشہ کے عذاب و ذلت کا مرکز ہے وہ اس سے محفوظ و مصئون ہو جاتا ہے۔

تو ہم یقین کامل اور ایمان مستحکم کے ساتھ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس نظام ہدایت کیلئے جو دین حق بنایا ہے اس کا سربراہ انبیاء، مرسلین اور معصومین علیہم السلام کو قرار دیا ہے، ہر زمانے میں ایک ہادی و رہبر رہا ہے جو اس دین حق کی سربراہی کرتا رہا ہے۔ ان تمام انبیاء و مرسلین کے سید و سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنائے گئے ہیں اور ان کی خلافت و جانشینی اور پوری نوع انسانی کی امامت آپ کی اہل بیت کے آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کو عطا کی گئی ہے پس حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی سرداری و سربراہی محمد وآل محمد علیہم السلام کے سپرد کر دی ہے اور اسی کو احادیث میں یوں تعبیر کیا گیا ہے:

فوّض الیھم أمر دینه،

پھر ان دینی رہنماؤں، سربراہوں اور رہبروں کو یہ عظیم مقام و مرتبہ عطا کیا ہے کہ امور کائنات میں ان کو وسیلہ قرار دیا ہے اور حق شفاعت عطا فرما دیا ہے اور قرآن مجید میں فرما دیا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (سورۂ مائدہ۔آیت ۳۵)

اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور اس تک وسیلہ تلاش کرو۔

آئمہ ہدیٰ علیہم السلام نے فرمایا:

ونحن الوسيلة،

کہ ہم وہ وسیلہ ہیں۔

پس ہمارا ایمان ہے کہ جس طرح وہ ہم تک دین کے پہنچنے میں وسیلہ ہیں اسی طرح دنیاوی امور میں بھی ہمارے لئے بارگاہ الٰہی تک وسیلہ ہیں اور وہ ہمارے تمام امور میں شفیع ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے توسل کو قبول کرتا ہے اور ان کی شفاعت کو رد نہیں فرماتا۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس جو ذخیرہ ادعیہ معصومین علیہم السلام سے منقول و ماثور موجود ہیں اس میں بکثرت محمد وآل محمد علیہم السلام کے حق توسل اور ان کے اسماء و ذوات مقدسہ سے استشفاع واضح دکھائی دیتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک انبیاء اور ان کے پہلے وصی سے آخری وصی تک کے بارے میں روایات موجود ہیں کہ یہ سب ہستیاں ان کے اسماء مبارکہ سے توسل کرتی رہی ہیں اور روایات میں یوں موجود ہے:

اللهم بحق محمد و انت المحمود و بحق علي و أنت الاعلى و بحق فاطمه و انت فاطر السموات والارض و بحق الحسن و أنت المحسن و بحق الحسين و انت قديم الاحسان..... الخ اور اللهم بحق محمد سيد الانبياء و بحق علي سيد الاوصياء و بحق فاطمه سيدة النساء و بحق الحسن سيد الاولياء و بحق الحسين سيد الشهداء و بحق عترتهم سادة الاتقياء..... صلوات الله عليهم اجمعين.

بلکہ بعض اوقات خود ان معصوم ہستیوں کو خطاب کر کے ان سے توسل کی درخواست اور شفاعت کی اپیل کی گئی ہے جیسا کہ مفاتیح الجنان میں موجود دعاء توسل اس پر دلالت کرتی ہے اور مولا علی علیہ السلام سے مدد مانگنا اور حضرت امام زمان (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) سے اعانت کی اپیل کرنا بھی اس حقیقت سے عبارت ہے۔

پس توسل و استشفاع علماء و فقہاء امامیہ کے نزدیک نہ فقط جائز و صحیح بلکہ جزوِ ایمان ہے اور اس کے مقابلے میں بعض دوسرے مکاتب کا اس کی مخالفت کرنا اور اس کو شرک کے زمرے میں شمار کرنا ان کی کج فکری اور گمراہی ہے۔ ابن تیمیہ یا محمد بن عبدالوہاب جیسے دشمنانِ حق کے مزعومات و خیالات بالکل غلط اور فرسودہ خیالات ہیں۔ وہابیت ایک باطل اور فاسد نظریہ ہے جبکہ تشیع اور مذہب حق یہ ہے کہ توسل عین ایمان اور استشفاع (طلب شفاعت کرنا) عین حق ہے۔

یہی امر حضرت صاحب الامر علیہ السلام کی اس گذشتہ توقیع پاک میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ فرمایا:

أما الائمة فانهم يسئلون الله فيخلق و يسئلونه فيرزق ايجابا لمسئلتهم و اعظاما لحقهم.

اور ہم معصومین علیہم السلام کے بارے میں حیات بعد الموت کے قائل ہیں، ان کو شہید اور زندہ تسلیم کرتے ہیں اس لئے ان کو خطاب کرنا ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ ان کی خدمت میں اپنی حاجات پیش کر کے ان سے شفاعت کا طلب گار ہونا ہمارا شیوہ ہے اور زیارت نامے اس سے معمور ہیں اور وہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسی ایمان پر زندگی اور اسی پر موت عطا کرے۔ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔

سوالات وجوابات

(از مقالہ توحید در افعال۔قرآن، حدیث اور ارشاداتِ معصومین علیہم السلام کی روشنی میں)

از: علامہ سید محمد تقی نقوی

سوال نمبر(۱): .....کیا خلق، رزق، موت اور حیات وغیرہ خدا کے ساتھ مختص ہیں یا کسی اور کو بھی یہ اختیار ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ امور کسی اور کو تفویض کئے ہیں، احسن الخالقین، خیر الرازقین اور رب الارباب کے کیا معنی ہیں؟

جواب (۱): ..... یہ تمام امور ربوبیت کا حصہ ہیں کیونکہ اس نظام کائنات کا خلق کرنا ہر شئے کو وجود دینا اور اس کے وجود کو برقرار رکھنا ربوبیت کا حصہ ہے۔ رزق سے مراد یہی ہے کہ ہر شئے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کیلئے جن وسائل کی طرف محتاج ہے ان وسائل کا اس کو مہیا کرنا، مثلاً انسان کو وجود دیا، لیکن اپنے وجود کی بقاء کیلئے اسے ہوا کا محتاج کردیا، اشیاءخوردونوش کا محتاج کردیا، بیماری میں شفاء کیلئے ادویہ کا محتاج کردیا۔

پس ان تمام وسائل یعنی ہوا، مشروبات اور دواؤں وغیرہ کا مہیا کرنا رزق دینا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نظام تکوین میں ایک منظم سلسلہ بنایا ہے کہ ہر رزق کے خلق کرنے کا پروگرام بنادیا ہے۔ اس نے ہوا کو خلق کیا اور ہوا کو ضرورت مند تک پہنچایا، ضرورت مند کو اس ہوا سے استفادہ کرنے کیلئے نظام تنفس دے دیا، اس نے سمندروں میں پانی بھر دیا، پھر اس کھارے پانی کو صاف وشیریں پانی سے تبدیل کرنے کیلئے آفتاب کی تمازت سے اس کو بخارات میں بدلنے کا نظام بنادیا، پھر ان آبی بخارات کو بادلوں میں سمو کر برسانے کیلئے ہوا کے ذریعہ ضرورت مند مقامات پر لے جانے کا نظام بنادیا، نیز اس پانی کو برف کی شکل دے کر پہاڑوں کی بلندیوں پر ذخیرہ کرنے کا سسٹم بنادیا، پھر اس برف کو پگھلا کر دریاؤں کی شکل میں بہاؤ دے کر ضرورت مندوں کے قریب پہنچ جانے کا حکم دیا، ادھر ضرورت مندوں کو شعور دیا، طاقت دی، پیاس لگائی اور اس پانی کو تلاش کرنے کا جذبہ دیا، اس نے زمین کو روئیدگی کی صلاحیت دی، پانی کو نباتاتی اور حیوانی زندگی کی بنیاد بنایا تو اس کے زمین پر برسنے، دریاؤں اور سیلابوں کے ذریعہ زمین کو سیراب کرنے کا ماحول تیار کیا، بہت سارے پھل اور میوے وغیرہ خودرو بنائے تو بکثرت غلہ جات اور میوہ جات کی پیداوار اگانے کا

شعور و ادراک انسان کو دے دیا، پھر اس کے اندر رزق کے حصول کی ضرورت اور محبت کو خلق فرمایا، اپنے نمائندوں کے ذریعہ اس کو رزق کے جائز طریقوں سے حاصل کرنے کی ترغیب دی اور اس کو عبادت کا درجہ دیا، ارشاد ہوا:

أفضل الاعمال کسب الحلال.

یہ ساری تفصیل انسان کو سمجھاتی ہے کہ خلق و رزق دونوں ہی اس نظام کائنات کے اندر موجود ہیں، خلق میں رزق ہے اور رزق میں خلق ہے۔ اس نظام کا خالق، ناظم، مدیر اور مدبر وہی رب العزت ہے اس میں اس نے کسی کو اپنا شریک نہیں بنایا۔ ہاں اس نظام کو اس نے عالم اسباب بنایا ہے، فرمایا:

ابی اللہ ان یجری الامور الا باسبابھا

اور اسباب دو قسم کے بنائے ہیں، پہلی قسم وہ اسباب جو مجبور محض ہیں، ان کے اندر تاثیر اور سببیت تو موجود ہے لیکن وہ اختیار نہیں رکھتے، وہ اس نظام میں مشینری کے پرزوں کی طرح کام کرتے ہیں اور اپنا اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں تو نتیجہ ثمرہ مرتب ہوتا ہے، مثلاً سورج، چاند، ستارے، ہوائیں، بادل، زمین اور پانی وغیرہ بے اختیار اسبابِ کائنات ہیں اور دوسری قسم وہ اسباب ہیں جو اختیار رکھتے ہیں اور اپنے اختیار کے ساتھ سببیت کا فریضہ انجام دیتے ہیں جیسے والدین اولاد کیلئے، اساتذہ شاگردوں کیلئے، کاشتکار غلہ جات، میوہ جات کیلئے، ملائکہ کائنات کے بہت سارے امور کیلئے ہیں۔

اس قسم کے دیگر بااختیار اسباب جب تک یہ اپنی اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتے تو نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا، والدین اپنا فریضہ اپنے اختیار سے ادا کرتے ہیں تو اولاد پیدا ہوتی ہے، ماں اپنا دودھ اپنے اختیار سے فرزند کو پلاتی ہے تو وہ پروان چڑھتا ہے، باپ اپنے اختیار سے روزی کما کر گھر لاتا ہے تو غلہ اور پھل حاصل ہوتے ہیں، لیکن یہ دونوں قسم کے اسباب (بااختیار و بے اختیار) اگرچہ اس نظام کے خلق اور رزق میں موجود ہیں لیکن اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے یعنی اس نے ان اسباب کو اسباب بنایا ہے اور جب چاہے ان سے سببیت کو سلب کرسکتا ہے، اس لئے رب العالمین، خالق و رازق کائنات وہ خود ہے، اس معنی میں کوئی دوسرا نہ رب ہے اور نہ خالق و رازق، اگر کوئی کسی دوسری ذات کو اس معنی میں رب، خالق یا رازق تسلیم کرے گا تو وہ قرآن اور احادیث معصومین علیہم السلام کے مطابق شرک کا مرتکب ہے اور شرک کو ظلم عظیم قرار دے کر اس سے منع کیا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (سورۂ لقمان، آیت نمبر ۔ ۱۳)

اور

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ، (سورہ نساء آیت نمبر ۔ ۱۱۶)

احسن الخالقین یا خیر الرازقین کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے اللہ تعالیٰ دیگر خلق کرنے والوں سے احسن ہے یا دیگر رزق دینے والوں سے برتر ہے تو واضح ہے کہ اس سے یہ معنی مراد لینا کہ دیگر لوگ اللہ تعالیٰ کی مثل خلق کرنے والے ہیں یا اللہ

تعالیٰ کی مثل رزق دینے والے ہیں یہ ہرگز درست نہیں اور شرک ہے بلکہ اس خالق سے مراد ایجاد کرنے والے یعنی ایک جسم کو ایک شکل سے دوسری شکل کی طرف تبدیل کرنے والا یا چند اجسام کو ترکیب دے کر ایک مفید شئے بنانے والا، مثلاً معمار، مستری اور سائنس دان اور رازق سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کا رزق پہنچانے والا یا عطا کرنے والا باپ کو اپنی اولاد کیلئے، سید و سردار کو اپنے غلاموں اور کنیزوں کیلئے رزق مہیا کرنے والا کہہ دیا جاتا ہے جیسا کہ بعض اوقات کلام الٰہی یا کلام معصومین علیہم السلام یا کلام فصحاء و بلغاء عرب میں رب کے ایسے استعمال ملتے ہیں جن میں کسی شئے کے مالک یا سنبھالنے والے کو رب کہہ دیا گیا ہے مثلاً حضرت عبد المطلب علیہ السلام نے فرمایا:

أنا رب الابل وللبيت رب،

یا حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی عزیز مصر کے بارے میں کہا گیا:

انه ربي أحسن مثواى

یا قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کو احسن الخالقین اور خیر الرازقین کہا گیا تو کلام عرب یا قرآن مجید کے ان استعمالات میں خالق یا رازق یا رب کا استعمال دیگر افراد کیلئے ایک ایسا لغوی استعمال ہے جو کبھی بھی اس مفہوم اور معنی میں نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو مسبب الاسباب ہے ناظم و مدیر کائنات ہے، ہر سبب کو خلق کر کے اس کو اس کے کام لگانے والا ہے۔ اگر اس نے کسی کو اس نظام میں ایک پرزہ قرار دے کر اس کی ایک خصوصی ذمہ داری لگادی ہے جسے وہ مجبوراً یا اختیاراً انجام دیتا ہے اور اس سے تجاوز نہیں کر سکتا تو اسے کیا نسبت حاصل ہے اللہ تعالیٰ رب العالمین کے ساتھ مثلاً ہمارے اس نظام شمسی میں سورج کا ایک بڑا کردار ہے وہ اس منظومہ میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اس کی تمازت، حرارت اور روشنی اس کے ماتحت تمام سیارات میں اپنا اپنا اثر مرتب کرتی ہے اور نباتاتی یا حیوانی زندگی اس کی مرہون منت ہے لیکن کیا کوئی عقل مند اس کو رب العالمین کی مثل قرار دے سکتا ہے اور کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ سورج بھی ہمارا اسی طرح رب ہے جیسے اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے۔ یہ بات ایک دیوانے کی بڑھکی تو ہو سکتی ہے لیکن دانا اور عقل مند کی بات نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ ہے کہ گذشتہ اقوام میں جن لوگوں نے دھوکہ کھایا اور سورج یا دیگر ستاروں کو ربوبیت کا درجہ دینے لگے اور اس وجہ سے ان کی عبادت کرنے لگے وہ نادان، بے وقوف اور احمق قرار دیئے گئے، انبیاء و رسل نے ان کو مشرک قرار دے کر اس نظریئے سے باز رہنے کی دعوت دی اور عقلی دلائل پیش کر کے شرک کا بطلان اور توحید کی حقانیت کو ثابت کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں جو اندازِ بیان نقل کیا گیا ہے اس میں واضح اور روشن حقائق سامنے آجاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام کی آیت ۶۷ سے ۷۸ میں فرمایا کہ:

جب آپ نے کوکب کو دیکھا تو کہا

هٰذَا رَبِّيْ

اور جب وہ غروب کر گیا تو کہا ایسا رب نہیں ہوسکتا، جب چاند کو دیکھا تو کہا

هٰذَا رَبِّيْ، هٰذَآ اَكْبَرُ،

اور جب وہ غروب کر گیا تو کہا: غروب کرنے والے رب نہیں ہوسکتے،

اس سے واضح ہو رہا ہے کہ یہ سب اس نظام میں ایک ایسے سبب کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک حد تک اپنا کام کرتے ہیں لیکن یہ اس کمال کے مالک نہیں ہیں، وہ تو کائنات کے رب کی شان ہے۔ وہ رب العالمین اللہ تعالیٰ ہے جو خود بالذات کمال مطلق ہے، ہر ایک کو کمال دیتا ہے لیکن خود کسی سے کمال لیتا نہیں ہے، وہ غنی مطلق ہے ہر کوئی اس کا محتاج ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ

وہ ہر ایک کو اس نظام میں سبب قرار دیتا ہے لیکن ہر سبب صرف سبب ہوتا ہے مسبب الاسباب نہیں ہوتا، مخلوق اور مامور ہوتا ہے خالق اور رب نہیں ہوسکتا۔ اس مثال اور اس کی وضاحت کے بعد ہر عقل مند کیلئے یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ خلق و رزق، موت و حیات کا سلسلہ کیا ہے؟ ان امور تکوینیہ میں بنیادی با اختیار اور ناظم کائنات ذات کون ہے اور وہ فقط اللہ ہے اس کے اختیار میں کوئی شریک نہیں اور نہ ہوسکتا ہے۔ اگر اس نے اپنے اس نظام میں بے اختیار اور مجبور اسباب بنائے ہیں مثلاً سورج، پانی وغیرہ تو ان کا کردار اپنی اپنی حد تک ہے اسلئے ان کو ربوبیت میں شریک کہنے کی گنجائش نہیں ہے اور اگر اس نے بعض با اختیار اسباب کو بھی کچھ ذمہ داریاں دی ہیں مثلاً ملائکہ "والمدبرات أمرا" کی روشنی میں ملک الموت "تتوفاهم الملائكة" کی روشنی میں، ان کو بھی ربوبیت میں شریک کہنے کی کوئی گنجائش نہیں اور اگر کچھ لوگ احسن الخالقین، خیر الرازقین، رب الارباب کا یہ معنی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ ہستیاں ایسی بنائی ہیں جن کے سپرد نظامِ کائنات کو خلق کرنا گایا۔

پس انہوں نے اس نظام کو خلق کر دیا۔ وہ خالقین، رازقین، ارباب ہیں اور اللہ تعالیٰ چونکہ ان کا خالق ہے تو وہ احسن الخالقین ہوا اور وہ ان سب سے افضل ہے اسلئے خیر الرازقین ہوا اور وہ ان سب پر حاکم ہے اسلئے رب الارباب ہوا تو یہ نظریہ وہی تفویض استقلالی ہے جس کو معصومین علیہم السلام نے باطل اور شرک قرار دیا ہے اور اگر وہ ان الفاظ کا معنی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اس نظام کو خلق کر دیا منظم کر دیا پھر آئندہ کیلئے یہ نظام ان ہستیوں کے سپرد کر دیا اب وہ نظام کے چلانے والے مدیر ہیں۔

البتہ اپنا ہر فیصلہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مرضی کے مطابق کرتے ہیں اب وہ خالقین ہیں، رازقین ہیں اور ارباب ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو سپرد کرنے اور اپنی مشیت کا ان کو پابند بنانے کی وجہ سے احسن الخالقین، خیر الرازقین اور رب الارباب

ہے تو تفویض غیر استقلالی ہے، معصومین علیہم السلام کی نگاہ میں یہ بھی باطل اور شرک ہے اور متعدد آیات و احادیث اس کی تردید میں موجود ہیں۔

پس ان الفاظ کا صحیح مفہوم اور معنی یہی ہوسکتا ہے اور یہی ہے کہ اس نظام کائنات کے خالق ہونے اور اس کے مدیر و رب ہونے میں کوئی بھی کسی طرح اس کا شریک نہیں اور نہ ہوسکتا ہے۔ ہاں ہر سبب کو اللہ تعالیٰ نے جو حیثیت دی ہے اور اس کا جو دائرۂ کار معین کیا ہے اور وہ اسے غافل مجبور یا فاعل مختار ہونے کی حیثیت سے انجام دیتا ہے تو اسی حد تک ہوتا ہے مثلاً ہر انسان اپنے افعال و اعمال کا خالق ہے، ہر موجد اپنی ایجاد کا خالق ہے اور ہر مصور اپنی تصویر کی شکل کا موجد اور خالق ہے۔ ترکھان لکڑی کو ایک شکل دیتا ہے، معمار عمارت کو ایک شکل دیتا ہے، مالی باغ اور پھولوں کو ایک ترتیب دیتا ہے، گلدستہ بنانے والا اسے تیار کرتا ہے یا آج ہوائی جہاز، کاریں، بسیں، کمپیوٹر، بم، راکٹ اور سیٹلائٹ کے مصنوعی سیارے بنانے والے اپنی اپنی ایجادات کو ایک ترکیبی شکل دیتے ہیں وہ ان کے موجد اور خالق ہیں۔

لیکن ان میں سے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کی مثل نہیں اور نہ اسکی خالقیت و رازقیت اور ربوبیت میں شریک ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوت و طاقت، علم و فہم اور دیگر توانائیوں کے ساتھ تلاش کرتے ہیں، ترکیب دیتے ہیں اور کام لیتے ہیں نہ وہ خام مال کے خالق ہیں، نہ ہر شئے میں تاثیر پیدا کرنے والے ہیں اور نہ میوے اور ثمرات بنانا ان کے ذاتی اختیار میں ہے۔ یہ تلاش کرتے ہیں، ڈھونڈ نکالتے ہیں، اثرات پر آگاہی حاصل کرتے ہیں اور اس آگاہی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہر خام مال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اس میں ہر تاثیر کا خالق اللہ ہے، ہر ترکیب پر اثر مرتب کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اللہ کی کائنات میں تحقیق کر کے اشیاء کی تاثیرات کو ڈھونڈ لینا اور پھر ان سے استفادہ کر کے ایک مشینری کو ایجاد کرنا اور ہے۔

خود ہر شئے کو خلق کرنا اور اس میں خود تاثیر رکھنا اور پھر ہر شئے کو اپنی مشیت پر موقوف رکھنا اور ہے۔ فقط اللہ رب العالمین ہی ایسا خالق و رازق ہے نہ کوئی اس جیسا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ پس خالقین کا معنی ہے ایجاد کرنے والے، رازقین کا معنی ہے عطا کرنے والے اور ارباب کا معنی ہے ملکیت رکھنے والے، اسباب کو مسبب الاسباب سے اشتباہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ تمام ایجاد کرنے والوں کو موجد بنانے والا ہے اور ان تمام عطا کرنے والوں کو عطا کرنے والا ہے اور تمام مالکان کا مالک ہے اور وہ اپنی مثال آپ ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ، وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (سورۂ شوریٰ، آیت ۱۱)۔

سوال نمبر (۲):..... فانا صنائع ربنا والناس بعد صنائع لنا (مکتوب نمبر ۲۸) کا کیا معنی ہے؟

جواب (۲):..... یہ کلام حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے مکتوب بنام حاکم شام، نہج البلاغہ میں موجود ہے اور اس کا معنی ہے کہ ہم "اہل بیت" اپنے رب (اللہ تعالیٰ) کے ممنونِ احسان ہیں اور اس کے بعد پورے انسان ہم اہل بیت کے احسانات کے ممنون ہیں، جو لوگ اس کلام کو نظریہ تفویض کے حق میں ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں وہ بہت بڑی

خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں، کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم اہل بیت علیہم السلام کو ہمارے رب نے بنایا اور سارے انسانوں کو ہم نے بنایا ہے، جبکہ ان کا یہ من گھڑت معنی ہر لحاظ سے غلط اور حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کے تمام ارشادات اور قرآن مجید کے خلاف ہے جبکہ: علی مع القرآن و القرآن مع علی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نہج البلاغہ کے تمام مترجمین و شارحین نے وہی معنی لکھا ہے جو ہم نے اوپر عرض کیا ہے اور وہی حق ہے، اگر کوئی منصف مزاج شخص قرآن مجید کا ابتداء سے انتہاء تک اور نہج البلاغہ کا ابتداء سے آخر تک مطالعہ کرے تو وہ جگہ جگہ دیکھے گا کہ وہاں اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق و رازق اور مدیر و مدبر بتایا ہے اور علی علیہ السلام تو وہ عالم علم لدنی ہیں جنہوں نے اپنے خطبات میں ایسے ایسے تخلیقی راز اور عجائبات کو بے نقاب کیا ہے کہ جنہیں آپ علیہ السلام سے پہلے کسی نے اس طرح بیاں نہیں کیا، زمین و آسمان کے تخلیقی اسرار، کوہستانوں اور سمندروں کے عجائبات کو روشن کیا ہے اور پرندوں اور درندوں کے حیران کن امور بیان کئے ہیں اور ہر مرحلے پر عقلمندوں کو دعوت دی ہے کہ ان آثارِ قدرت میں غور وفکر کرو اور پھر تسلیم کرو کہ ان تمام کا خالق و مالک وہ اللہ تعالیٰ ہے جو قادرِ مطلق اور حکیم و علیم ہے، وہی وحدہٗ لاشریک ہے اور تفویض کا ماننا یعنی کسی کو شریک تسلیم کرنا باطل اور فاسد ہے۔

جو بات صحیح ہے اور اس کلام معصوم میں فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محمد و آل محمد علیہم السلام کو ایسی مخلوق قرار دیا ہے کہ ساری کائنات کو خلق نہ کرتا اگر ان کو خلق نہ کرتا کیونکہ مخلوق کائنات کا حقیقی مقصد معرفت اور عبادت ہے اور معرفت کے ساتھ عبادت کو جس معیار پر ان معصوم ہستیوں نے ادا کیا ہے وہ کسی نے نہیں کیا اسلئے کائنات کی علت غائی کی تکمیل ان سے ہوتی ہے۔ یہ کمالات و احسانات الٰہی ہیں جو ان پاکیزہ ہستیوں پر کئے گئے ہیں اسلئے وہ خود کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کے ممنون و اسیر اور پروردہ فرماتے ہیں جبکہ سارے انسانوں کے پاس جو کچھ ہے دنیا یا دین یہ سب کچھ ان کے وسیلے سے ملا ہے۔ تمام انسانی کمالات و صفات، اخلاق و بلندی سب کچھ محمد و آل محمد علیہم السلام کے صدقے سے ہے علم و حلم، صداقت و دیانت، خلوص و تقویٰ تمام اچھی صفات اگر اہل بیت علیہم السلام سے نہیں تو ہمیں کس سے ملی ہیں اس میں تو حضرت عمر بن خطاب بھی کہتے ہیں

لو لا علی لھلك عمر

شارحین نے لکھا ہے: صنائع جمع ہے صنیعۃ کی اور ہر بادشاہ جس شخص کو، جس شئے کو، اپنی ذات کے لئے مختص کر لے اور جس کی قدر و منزلت کو بلند کر دے وہ اس بادشاہ کی "صنیعۃ" کہلاتی ہے۔

و آل النبی أسراء احسان الله علیهم والناس أسراء فضلهم بعد ذالك،

آل محمد علیہم السلام، اللہ تعالیٰ کے احسانات کے اسیر و ممنون ہیں اور سارے لوگ اس کے بعد ان معصوم ہستیوں کے فضل کے ممنون و اسیر ہیں۔

قائد مرحوم علامہ مفتی جعفر حسین اعلی اللہ مقامہ (جن کا ترجمہ سب سے زیادہ مشہور ہے) وہ اس کا یوں ہی ترجمہ فرماتے ہیں۔

سوال نمبر (۳):..... و بیمنہ رزق الوریٰ و بوجودہ ثبتت الارض و السماء کا کیا معنی ہے؟

جواب (۳):..... ترجمہ یہ ہے کہ امام علیہ السلام کی برکت سے پوری کائنات کو رزق ملتا ہے اور آپ کے وجود کی برکت سے زمین و آسمان برقرار ہیں اور واضح ہے کہ یہ ہم سب کا عقیدہ اور ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر اس کائنات کو خلق فرمایا اور پھر اس کے رزق کا نظام قائم کیا تو ان معصوم ہستیوں کی محبت میں جن کو آیت تطہیر میں اہل البیت کہا گیا ہے:

لولاك لما خلقتُ الافلاك،

یا

ماخلقتُ سماء مبنية و لا أرضا مدحية و لا قمرا منيرا و لا شمسا مضيئة ولا فلكا يدور ولا بحر يجري و لافلكا تسرى الا فى محبة هولاء الخمسة الذين هم تحت الكساء.....

میں بھی اسی مضمون کو ادا کیا گیا ہے۔

اور اس طرح معصوم، امام زمانہ علیہ السلام حجت خدا ہیں اور حجت خدا کو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے برقرار رکھنے کی علت قرار دیا ہے اور حدیث میں ہے

لولا الحجة لساخت الارض بأهلها

"اگر حجت خدا نہ ہو تو زمین اپنی اہل سمیت تباہ ہو جائے۔" اس میں اصلی راز کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر حجت زمانہ کے وجود سے زمین کے وجود کو مربوط کر دیا ہے یا تخلیق کائنات کا مقصد چونکہ ان کے بغیر نامکمل رہتا ہے اسلئے اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ میں یہ نظام اس وقت ختم کر دیتا ہوں جب تکمیل مقصد کا وسیلہ امام زمان علیہ السلام اس کا حصہ نہ رہے

ولن تجد لسنة الله تبديلا

وہ اپنے حتمی قوانین و سنن کو تبدیل نہیں کرتا۔

یہ دونوں احتمالات قابل قبول ہیں اور ترجیح کیلئے دلائل کی ضرورت ہے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ معصوم کیلئے یہ دستر خوان نعمت بچھا ہے اور ہر کوئی ان کے طفیل اور ان کی برکت سے رزق پا رہا ہے اور زمین و آسمان برقرار ہے تو اس وجود معصوم علیہ السلام کی برکت سے ورنہ بے مقصد کائنات کو موجود رکھنا حکمت الٰہی کے خلاف ہے۔

خزینہ ایمانیہ

ترجمہ

حدیقہ سلطانیہ

(باب عدل)

عدل کے موضوع پر گرانقدر تصنیف

اکمل المحققین، فخر المتفقهین، افضل المتکلمین

آیت اللہ العظمیٰ السید حسین علیین مکان آلِ غفران مآب اعلی اللہ مقامہ

(متوفی ۱۲۷۲ھ مدفون آستانہ غفرانمآب لکھنو)

ترجمہ

سید المحققین عمدۃ الموحدین، استاذ العلماء

حضرت علامہ السید محمد تقی نقوی

مدیر اعلیٰ، جامعۃ العربیہ مخزن العلوم الجعفریہ، شیعہ میانی، ملتان

باب دوم:

عدل

اصول دین پانچ ہیں ان میں سے دوسرا "عدل" ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفاتِ فعل میں سے ایک "عدل" ہے اور معلوم ہے کہ اس کے صفاتِ فعل "عدل" میں منحصر نہیں ہیں لیکن چونکہ ایمان کے عمدہ ارکان کے بارے میں اسلام کے دو عظیم فرقوں میں اختلاف ہے، ایک فرقۂ ناجیہ "امامیہ" ہے جو اہل حق ہیں اور دوسرے مخالفین ہیں۔ ان دونوں کے درمیان اس بارے میں بہت زیادہ مباحث ہوئے ہیں جو علماء اسلام کی نظر میں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔

ہم جب توحید کے مباحث سے فارغ ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی خالقیت و رازقیت کو بیان کر چکے ہیں اور یہ ایسے مباحث تھے جن کے بارے میں اسلام کے ان فرقوں میں کوئی نزاع نہیں جو محکوم بالکفر نہیں ہیں تو اب اللہ تعالیٰ کے صفاتِ فعل میں سے ایک اہم صفت "عدالت" کو بیان کرنے کیلئے یہ باب مختص کیا ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ عادل ہے یعنی وہ کوئی فعل قبیح انجام نہیں دیتا اور کسی واجب فعل کو ترک نہیں کرتا (کوئی برائی کرتا نہیں اور کوئی اچھائی چھوڑتا نہیں) اور اس عقیدے کی تحقیق کیلئے مباحث کو چند فصلوں میں بیان کیا جائے گا۔

فصل اول:

افعال کے حسن وقبح کا عقلی ہونا

امامیہ کا مذہبِ حق یہ ہے کہ افعال کا حسن و قبح عقلی ہے۔

حُسن:

اس فعل کو کہتے ہیں کہ جسے اس پر قدرت رکھنے والا فاعل انجام دے تو وہ عقلاء کی نظر میں تعریف و ستائش کا مستحق ہو۔

قبیح:

اس فعل کو کہتے ہیں جب کوئی اپنی قدرت و اختیار سے اس کو انجام دے تو عقلاء کی نگاہ میں مذمت و ملامت کے لائق ہو۔ حسن و قبح اپنے اس مفہوم کے ساتھ اللہ تعالیٰ جیسی قادر علی الاطلاق ذات کے افعال کو بھی شامل ہے۔

حسن و قبح کے معنی میں بعض اوقات ثواب و عقاب کے استحقاق کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، ایسی صورت میں یہ مفہوم انسانوں کے افعال سے مختص ہو جاتا ہے (اور اللہ تعالیٰ کے افعال کو شامل نہیں ہوسکتا) اور اہل حق کے نزدیک حسن و قبح عقلی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ ہر فعل اپنی ذاتی حیثیت میں حسن و قبح کی دو صفتوں میں سے کسی ایک صفت کو رکھتا ہے اور شریعت میں اس فعل کے بارے میں کیا حکم ہے اس سے قطع نظر وہ خود حَسَن ہوتا ہے یا قبیح (اچھا فعل ہے یا برا) اور اسی لئے اس کا فاعل مستحق تعریف و ثواب ہے یا لائق مذمت و عقاب قرار پاتا ہے۔ پھر اس اعتبار سے ان افعال کی کئی اقسام بنتی ہیں۔

فعل کی اقسام:

(۱) کچھ افعال ایسے ہیں کہ ہم اپنی عقل کے ساتھ بدیہی طور پر اس کے اچھے یا برے ہونے کو دریافت کر لیتے ہیں اور زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اس کا یہ وصف اس قدر روشن ہوتا ہے کہ ہر شخص اس کا ادراک کر لیتا ہے مثلاً سچ بولنا، جبکہ اس کا فائدہ بھی ظاہر ہو اس کا نیکی ہونا اور حُسن پر مشتمل ہونا واضح اور روشن ہے اور اسی طرح جھوٹ بولنا جبکہ

اس کا ضرر بھی ظاہر ہو اس کا برائی ہونا اور قبح رکھنا بھی مخفی نہیں ہے۔

(۲) کچھ افعال ایسے ہیں جن کا حسن و قبح غور و فکر کے بعد دریافت ہوتا ہے۔

(۳) کچھ افعال ایسے ہیں جن کا حسن و قبح ہماری ناقص عقول کی پہنچ سے باہر ہے اور ان کا حسن و قبح شارع کے بیان کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے مثلاً ماہِ رمضان کی آخری تاریخ کو روزہ رکھنا نیکی ہے اور ماہِ شوال کی پہلی تاریخ کو روزہ رکھنا برائی ہے اور قبیح فعل ہے اور اس قسم کی مثالیں کثیر ہیں۔

افعال کے حسن و قبح کے عقلی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر ان اشیاء کے اندر بذاتِ خود یا ان کے صفات و عوارض لازمہ یا مفارقہ کی وجہ سے ان میں حسن و قبح نہ ہوتا اور شریعت کے حکم سے قطع نظر یہ ذاتی طور پر اچھی یا بری نہ ہوتیں تو شارع مقدس کا ان کے بارے میں امر و نہی کرنا ترجیح بلا مرجح کو مستلزم ہوتا۔

افعال کے بارے میں اشاعرہ کا نظریہ:

اشاعرہ ایسے لوگ ہیں جو عقل سے بے بہرہ ہو کر اہل حق کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ افعال ذاتی طور پر کوئی حسن و قبح نہیں رکھتے بلکہ ہر شئے کا حسن و قبح شارع کے امر و نہی کے تابع ہے۔ جس کا امر شارع کی طرف سے ہو گا وہ حسن ہو جائے گا اور جس کی نہی فرما دے گا وہ قبیح ہو جائے گا۔ بنابریں اگر وہ ضرر دینے والے جھوٹ کا حکم دے تو وہ جھوٹ حسن ہو کر واجب ہو جائے گا اور اگر وہ ناحق قتل و خون ریزی کرے، پیغمبرانِ حق اور ان کے ایسے اطاعت گزار بندوں کو عذاب دے جن کی ساری زندگی اطاعت کی مشقت برداشت کرتے، صبر کی تکالیف اٹھاتے اور مصائب پر تحمل کرتے ہوئے گذری ہو حق تعالیٰ ایسے کاموں کا امر فرما دے تو یہ سارے کام حَسَن ہوں گے اور نیکی قرار پائیں گے پس اگر وہ ظالموں، سرکشوں، نافرمانوں پر انواع و اقسام کی نوازشات و عنایات فرما دے تو یہ سب کچھ مستحسن اور صحیح اقدام ہوگا۔ مختصر یہ کہ ان لوگوں کے نزدیک کوئی چیز از خود اچھائی یا برائی، نیکی یا بدی سے موصوف نہیں ہے۔ یہ فیصلہ شارع کے حکم کو دیکھنے کے بعد کیا جا سکتا ہے (اپنی عقل سے نہیں)۔

اشاعرہ کے نظریہ کا بطلان:

اشاعرہ کا یہ نظریہ عقل و نقل دونوں اعتبار سے باطل ہے اور اس پر کئی وجوہ سے دلالت ہو سکتی ہے ان میں سے چند ایک کو بیان کیا جاتا ہے:

دلیل اول:

بعض اشیاء اور افعال کا حسن و قبح اس قدر روشن اور واضح ہے کہ کسی بھی عقل مند پر مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے حتیٰ کہ

دین حق اور شریعت کے منکرین بھی اس کے معترف ہیں۔ وہ اگرچہ شرعی احکام اور دینی اطوار کے تابع اور پابند نہیں ہیں تاہم وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے مثلاً نقصان دینے والے جھوٹ کا قبیح ہونا، نفع دینے والے سچ کا حَسَن ہونا، انصاف اور امانت کی واپسی، دریا میں غرق ہونے والے شخص کو بچانا بالخصوص جبکہ وہ بزرگانِ دین، انبیاء و اوصیاء علیہم السلام میں سے ہو اور بچانے والے کو اس سے کوئی نقصان بھی نہ ہوتا ہو، اسی طرح مستحق کے ساتھ احسان کرنا، ان سب افعال کے حَسَن ہونے میں کوئی شک نہیں کرسکتا۔

اور در مقابل ظلم کرنا، اہل حق کو ناحق قتل کرنا، ایک معذور اور زمین پر پڑے ہوئے اپاہج شخص کو ہوا میں پرواز کرنے کی تکلیف دینا یا چلنے اور دوڑنے کا حکم دینا، یہ سب ایسے امور ہیں جن کے قبیح ہونے اور برائی قرار دیئے جانے پر کوئی پردہ نہیں ہے۔ اگر ان بدیہی امور کا کوئی شخص انکار کرے تو اس کی بات قابل توجہ نہیں ہوسکتی۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی عقلمند دور اُفتادہ پہاڑی اور کوہستانی علاقے میں آباد ہو، دین و اہل دین کی آواز بھی اس تک نہ پہنچی ہو ایسے ہی ماحول میں اس کی نشوونما ہوئی ہو، جب وہ عقل وتمیز کی عمر کو پہنچے اور اس کو کہا جائے کہ اگر تو صحیح اور درست بات کرے گا تو تجھے چند دینار انعام ملے گا تو وہ سچ کو کذب پر ترجیح دے گا حالانکہ وہ شخص شریعت کے احکام سے بالکل نابلد ہے۔ معلوم ہوا کہ اشیاء کی خوبی و بدی شریعت سے قطع نظر خود فعل کے ذریعہ بھی ثابت ہوتی ہے۔

دلیل دوم:

اگر سارے افعال برابر ہوتے اور کسی کو دوسرے پر کوئی ترجیح نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کام کا حکم دینا اور کسی سے روک دینا بے معنی ہوجاتا اور کس کو کسی پر بلا وجہ اور بغیر کسی مرجح کے ترجیح دینا لازم آجاتا۔

دلیل سوم:

اگر حُسن و قبح کو سمعی اور نقلی باتوں پر موقوف کردیا جائے تو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کے ہاتھ پر معجزات کا ظاہر ہونا جائز ہوگا اور سچے نبی اور جھوٹے شخص کے درمیان حقیقی پیغمبر اور من گھڑت نبی بننے والے کے درمیان تمیز نہیں ہو سکے گی۔ پس نبوت کا اثبات ناممکن ہوجائے گا اور اس قسم کی بہت ساری ذلت آمیز اور قبیح باتیں ان اشاعرہ کے پسندیدہ نظریئے کو مستلزم ہیں لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے کہ وہ لوگ اس قدر غیر معقول ہیں کہ وہ ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور ہر قبیح کے حَسَن ہونے کو قبول کرلیتے ہیں۔

دلیل چہارم:

قرآنِ مجید، فرقانِ حمید کی بہت ساری آیات ان کے قول کی تکذیب کرتی ہیں، ارشاد خداوندی ہے:

وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ ۭ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ (سورہ اعراف، آیت۔۲۸)

اور جب وہ کوئی برائی کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہمارے آباؤ اجداد نے ہمیں یہی حکم دیا تھا اور اللہ نے بھی ہمیں یہی امر فرمایا ہے، ان کو کہو: بے شک اللہ تعالیٰ کسی برائی کا حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ تعالیٰ کی طرف قبیح اور بری باتوں کی نسبت دیتے ہو جن کا تمہیں کوئی علم ہی نہیں ہے۔

اور دوسری آیت میں فرماتا ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (سورہ اعراف، آیت۔۳۳)

اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہو: سوائے اس کے نہیں کہ میرے رب نے تمام قبیح امور کو حرام قرار دیا ہے خواہ ان کا قبح ظاہر اور روشن ہو یا پوشیدہ اور مخفی ہو۔

اور اس قسم کی بہت ساری آیات کریمہ نصًا اور صراحۃً اس مقصد پر دلالت کرتی ہیں اور اسی طرح آئمہ علیہم السلام کی متعدد احادیث بھی اہل حق کے نظریئے کی تائید پر موجود ہیں اور اگرچہ ابھی ہم نقلی اور سمعی ثبوت پیش کرنے کے مقام میں نہیں ہیں لیکن فقط اہل سنت اشاعرہ پر اتمام حجت کرنے کیلئے چند باتیں بیان کردی ہیں جبکہ ابھی تو ہم عقلی دلائل پیش کررہے ہیں۔

اشاعرہ کو اپنے اس ضعیف اور سخیف قول پر جس بات نے برانگیخت کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ چند ایک آیات کے سطحی معانی و غلط فہمی کی وجہ سے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ انسان اپنے افعال میں مجبور ہے اور چونکہ ان کے خیالِ وہم میں یہ سطحی معنی اللہ تعالیٰ کیلئے ظلم و عدوان ثابت کرتا ہے اور کئی قسم کے قبائح اس ذات کی طرف نسبت پاتے ہیں تو اس سے نجات حاصل کرنے کیلئے وہ لوگ اس گھٹیا اور پست نظریئے کے قائل ہو گئے ہیں اور ایک فاسد اور باطل بنیاد پر غلط اور فاسد عمارت کھڑی کردی ہے اور عنقریب ہم اس حقیقت کو پوری طرح روشن کردیں گے۔

فصل دوم:

اللہ تعالیٰ عادل ہے

اللہ تعالیٰ عادل ہے، نہ ظلم کرتا ہے، نہ فعل قبیح، وہ کسی واجب کو ترک نہیں کرتا اور نہ کسی کو محال کام کی تکلیف دیتا ہے اور کوئی عبث وفضول فعل بھی صادر نہیں کرتا:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ (سورۂ آل عمران، آیت۔۱۸)

اللہ تعالیٰ خود گواہ ہے اس کا کہ اس کے علاوہ کوئی لائق عبادت نہیں اور سارے ملائکہ اور صاحبانِ علم بھی اس کے گواہ ہیں وہ اللہ عدل کو قائم کرنے والا ہے کوئی لائق عبادت نہیں مگر وہ اللہ جو غالب اور حکیم ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدوس ذات سے فعل قبیح کا صادر ہونا اور واجب کو ترک کرنا محال ہے کیونکہ فعل قبیح کا فاعل ایک عقلمند اور حکیم کی نگاہ میں مستحق مذمت اور ملامت ہوتا ہے اور واجب کا فاعل عقلاء کی نظر میں لائق مدح وستائش ہوتا ہے جبکہ واجب کا تارک قابل مذمت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام و اوامر کی اطاعت اور تابعداری کرنے والوں کے ساتھ اجر جزیل اور ثواب جمیل کا وعدہ فرمایا ہے۔ پس اگر وہ اس وعدہ کی وفاداری نہ کرے تو ہر عاقل اور حکیم کی نگاہ میں مذمت کا موجب بنے گا اور اگر اپنے وعدے کی وفا کرے تو مدح وستائش کا مستحق قرار پائے گا لہٰذا حضرت باری تعالیٰ سے اس قسم کا کام اس کی حکمت کے مدنظر محال ہے اور کسی قبیح فعل کا صدور اس سے ممکن نہیں ہے۔

عدل الٰہی کے عقلی دلائل:

اور اس بات کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اس ذات والا صفات سے کسی واجب کا ترک ہونا یا کسی فعل قبیح کا صادر ہونا ان چند صورتوں سے باہر نہیں ہوسکتا۔

صورت (۱):..... کہ وہ اس قبیح کی قباحت اور برائی سے آگاہ نہ ہو اور ایسے جاہل کی مانند ہو جو غفلت اور جہالت کی وجہ سے کسی غلط کام کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

صورت (۲):..... یہ کہ اسے اس کی بدی اور قباحت کا علم تو ہے لیکن وہ اس قبیح فعل کے ترک کرنے پر قادر نہیں اور ایسا فاعل موجب ہے کہ اس کا فعل واثر اس سے جدا نہیں ہو سکتا اور ایسا مجبور ہے کہ اس سے بالاکراہ یہ قبیح عمل صادر ہو جاتا ہے۔

صورت (۳)..... یہ کہ وہ علم وقدرت دونوں رکھتا ہے لیکن ایسا محتاج ہے کہ اس فعل قبیح کو انجام دیئے بغیر اپنی احتیاج دور نہیں کر سکتا مثلاً ایسا بھوکا اور محتاج شخص جس کے پاس طعام نہ ہو اور اپنی بھوک مٹانے کیلئے چوری کی طرف محتاج ہو جائے۔

صورت (۴):.....وہ ایسا محتاج تو نہیں لیکن بے مقصد عبث طور پر ایسا فعل انجام دے دیتا ہے۔

واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ ساری صورتیں باطل ہیں کیونکہ پہلی صورت میں اس کا جاہل ہونا لازم آتا ہے اور دوسری صورت میں اس کا عاجز ہونا اور تیسری صورت میں اس کا محتاج ہوتا اور چوتھی صورت میں اس کا بے عقل اور سفیہ ہونا لازم آتا ہے۔ حالانکہ یہ سارے امور اس عظیم ذات کیلئے محال ہیں لہٰذا اس سے کوئی قبیح صادر نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی واجب اور لازمی امر کو وہ ترک کرتا ہے، نتیجہ یہ کہ لامحالہ وہ عادل ہے اور یہی ہمارا مطلوب ومقصود ہے۔

اشاعرہ کی نافہمی:

اور اشاعرہ اپنی کم شعوری کی وجہ سے چونکہ کسی چیز کو ذاتی طور پر نیک و بد نہیں مانتے، ہر امر کو حکم شارع پر موقوف کرتے ہیں اسلئے وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت کے قائل نہیں ہوتے اور اسکی ذاتِ والا صفات سے ہر قسم کے قبیح کے صدور کو جائز مانتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا یقین اور ان کی شریعت کے صحیح ہونے کا علم حاصل نہیں ہو سکے گا اور اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ وعید فرمائے ہیں وہ برقرار نہ رہ سکیں گے اور دین کی بہت ساری ضروریات و مسلمات درہم برہم ہو جائیں گی۔

اور اس کی وضاحت یہ ہے کہ اگر باری تعالیٰ عدالت کی صفت سے متصف نہ ہو تو انبیاء کرام میں سے کسی بھی نبی کی نبوت ثابت نہ ہو سکے گی کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات سے قبائح کا صدور روا ہوگا تو یہ بھی ممکن ہوگا کہ وہ کسی جھوٹے مدعی نبوت کی تصدیق اپنے معجزات کے ساتھ کر دے اور اس احتمال وامکان کے ساتھ کسی کی نبوت کے حق ہونے کا یقین کیسے حاصل ہو سکتا ہے؟ اور ایسے میں تمام شریعتوں کی صحت، ساری نقل شدہ تکالیف کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ وعید کی حقیقت پر کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ان آیات کا مقصد ومطلوب صحیح طور پر مرتب نہ ہو سکے گا کہ فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (سورہ ذاریات، آیت ۵۶)

اور میں نے ہر جن وانس کو فقط اسلئے خلق کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں اور فرمایا:

لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ الرُّسُلِ، (سورہ نساء، آیت ۔ ۱۶۵)

تا کہ رسولوں کے آجانے کے بعد لوگ اللہ تعالیٰ پر حجت قائم نہ کرسکیں۔

اگر وہ اشاعرہ یوں جواب دیں: ہم اگر چہ کذب اور قبیح فعل کا صدور عقلی طور پر اس ذات سے جائز مانتے ہیں لیکن اس بلند ذات کی عادت اس کے برخلاف پر جاری اور قائم ہے (یعنی وہ کبھی ایسا غلط کام کرتا نہیں ہے)، تو ہم کہیں گے یہ یقین کہاں سے حاصل ہوا کیونکہ یہ تو موقوف ہے اس بات پر کہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے اس وقت تک جس قدر انبیاء ورسل مبعوث ہوئے ہیں وہ سب صادق تھے کیونکہ تبھی یہ عادت کا استمرار ثابت ہوگا جبکہ یہی تو اوّلین نزاع ہے (کہ آپ کا امکان صدور کذب ہی تمام انبیاء کی صداقت کو مشکوک بنادیتا ہے)۔

علاوہ ازیں یہ کہ جب تک افعال کا قبیح اور سقیم ہونا تسلیم نہ ہوگا کیسے مانا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس عادت کو ترک نہیں کرتا اور کسی وقت بھی اپنی عادت کے خلاف عمل نہیں کرتا۔

عدل الٰہی پر نقلی دلائل:

اور اللہ تعالیٰ کے عادل ہونے کے اثبات میں دلائل سمعیہ ونقلیہ بہت زیادہ ہیں اس بارے میں قرآنی آیات بکثرت موجود ہیں۔ وہ تمام آیات جن میں اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کا بیان ہے کہ قسط بمعنی عدل ہے اور اسی طرح وہ تمام آیات جن میں اس کی حکمت والی صفت بیان کی گئی ہے اور اس پر اس کی تعریف ہوتی ہے اور

فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ

کہ حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی قبیح اور عبث فعل صادر نہیں ہو سکتا۔

(۱) ارشادِ الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ، یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (سورۂ نحل، آیت ۔ ۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ امر فرماتا ہے عدل واحسان کا اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا اور ہر قسم کی فحاشی، برائی اور بغاوت سے منع کرتا ہے، وہ تم سب کو نصیحت کرتا ہے تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔

توجب اللہ تعالیٰ عوام کو عدل وانصاف کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحاشی اور برائی وغیرہ سے روکتا ہے تو کیسے ممکن ہے

کہ وہ خود عدل و انصاف کے خلاف عمل کرے اور منکرات کو بجا لائے حالانکہ یہ انتہائی قبیح اور گھٹیا بات ہے جبکہ وہ دوسروں کو اس قسم کے اعمال سے منع کرتا ہے۔

(۲) اور فرماتا ہے:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (سورہ بقرہ، آیت۔ ۴۴)

کیا تم لوگوں کو نیکی کرنے کا حکم دیتے ہو اور خود کو اس سے بھلا دیتے ہو۔

تو کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوسرے لوگوں کو کسی عمل پر سرزنش فرمائے اور خود اس عمل کو انجام دے کر

تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ

کا خود مصداق قرار پائے،

تَعٰلَى اللّٰهُ عَنْ ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيْراً

اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے بہت ہی بلند و برتر ہے۔

(۳) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (سورۃ آل عمران، آیت ۱۸۲)

بے شک اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

ظلم عدل کے خلاف ہے۔ عدل سے مراد ہے کسی شئے کو اس مقام پر رکھنا جس کے وہ لائق ہے اور ظلم سے مراد ہے کسی شئے کو ایسے مقام پر رکھنا ہے جس کے وہ لائق نہیں اور جو ظلم نہیں کرتا وہ حتماً عادل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ عادل ہے اور یہی مطلوب ہے اور اس مطلوب پر احادیث بھی بکثرت موجود ہیں۔

(۱) چنانچہ کتاب توحید اور دیگر کتب میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ دین کی بنیاد توحید اور عدل ہے اور عدل کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

أَمَّا الْعَدْلُ فَأَنْ لَا تَنْسُبَ إِلَى خَالِقِكَ مَا لَامَكَ عَلَيْهِ

عدل یہ ہے کہ تو اپنے خالق کی طرف کسی ایسے عمل کو نسبت نہ دے جس عمل کے کرنے پر اللہ تعالیٰ نے تیری ملامت کی ہے۔

(۲) بہت سی منقول دعاؤں میں جابجا یہ بات ملتی ہے:

عَدْلٌ فِي الْحُكْمِ قَائِمٌ بِالْقِسْطِ لَا جَوْرَ فِي حُكْمِهِ وَلَا حَيْفَ.

وہ اپنے فیصلہ میں عادل ہے وہ قسط کو قائم کرتا ہے اس کے حکم میں بھی زیادتی نہیں اور نہ ہی کوئی بے جا

اقدام ہوتا ہے۔

عدالت کا اصل پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایسے افعال کی تکلیف نہیں دیتا جو محال ہوں اور بندگان کی قدرت و اختیار سے باہر ہوں کیونکہ محال و ناممکن کام کی تکلیف دینا قبیح ہے اور اس کی حکمت کے مدنظر محال ہے کہ وہ اپنے بندوں پر ایسی ذمہ داری عائد کر دے جس کی ادائیگی ان کی قدرت کے دائرہ کے اندر نہ ہو، وہ خود فرماتا ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ، (سورۂ بقرہ، آیت۔۲۸۶)

اور اللہ تعالیٰ کسی کو نہیں تکلیف دیتا مگر اتنی جتنی اس کی وسعت کے اندر ہو۔

حالانکہ اشاعرہ کے ہاں ایسا کرنا جائز ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ناممکن کام کی تکلیف دے سکتا ہے لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کی اپاہج کو جو زمین سے اٹھنے پر قادر نہ ہو اسے آسمان پر پرواز کرنے کی تکلیف دے تو جائز ہے یا وہ کسی کو یوں فرمائے کہ وہ دو متقابل اطراف یعنی مشرق و مغرب کی طرف بیک وقت حرکت کرے اور مردوں کو زندہ کرے اور آفتاب کو زمین پر لے آئے اور پورے دریا کے پانی کو ایک گھونٹ میں لے کر پی لے اور کوہِ قاف کو سوئی کے سوراخ سے گزارے اور اگر تم نے یہ اقدام نہ کئے تو تمہیں سخت ترین سزا اور عذاب میں ڈال دوں گا، حالانکہ ان سب باتوں کے بطلان کے واضح اور روشن ہونے پر کوئی پردہ نہیں ہے۔

فصل سوم:

بندگان کو تکلیف دینا حسَن ھے

انسانوں کو ان کے اختیاری افعال کے بارے میں امر و نہی کرنا اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی تکلیف دینا ایک مستحسن اقدام ہے کیونکہ یہ اقدام ان کو ثواب کی طرف آمادہ کرنے، عذاب سے ڈرانے اور رب الارباب کا تقرب حاصل کرنے کا موجب بنتا ہے بلکہ ان کیلئے آدابِ زندگی سیکھنے، ایمانی معارف حقہ کے حاصل کرنے اور ربانی عقائد کی تکمیل کرنے کا وسیلہ بنتا ہے اور حکمت کا تقاضہ یہی ہے کہ کوئی شخص ان امور سے جاہل اور غافل نہ رہے پس بندوں کو ان امور کی تکلیف دینا واجب ہے اور واجب کا ترک کرنا ایک حکیم و علیم ذات سے قبیح ہے اور اس تکلیف کا فائدہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو بالذات غنی ہے کسی فائدے کا محتاج نہیں بلکہ ان تکالیف کا فائدہ خود ان بندوں کو حاصل ہوتا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے آباؤ اجداد کے وسیلہ سے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام سے روایت نقل کی ہے، ان کی فرمائش کا خلاصہ یہ ہے کہ "باری تعالیٰ کا تفضّل و احسان اور اس کی بے پایاں رحمت ہے کہ اس نے اپنے بندگان پر کچھ فرائض عائد فرمائے ہیں۔ یہ تکلیف اور عبادت اسلئے نہیں کہ وہ ذات اس کی محتاج ہے بلکہ مصلحت وحکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ تکلیف ہو، تا کہ سب کے سامنے خبیث اور طیب کے درمیان امتیاز ہو جائے اور سب لوگوں کے باطنی حالات اس امتحان کے ذریعہ ظاہر ہو جائیں اور لوگ رحمت پروردگار کمانے میں سبقت لینے کی کوشش کریں اور یہ بات ان کیلئے بہشت کے درجات میں تفاضل اور ترقی کا موجب ہے۔"

اس طرح امیر المومنین علیہ السلام کے کلام مبارک کا ایک اور حصہ بھی حسن تکلیف پر دلالت کرتا ہے اور اس کی مصلحتوں کو روشن فرماتا ہے:

"جب حضرت علیہ السلام کو خبر ملی کہ حضور کے کچھ اصحاب حق تعالیٰ کی عدالت و جور کے بارے میں غور وخوض کر رہے ہیں تو آپ منبر پر تشریف لائے حمد وثناء الٰہی فرمائی اور خطبہ ارشاد فرمایا جس کا خلاصہ کلام یہ ہے:

واضح باد کہ حق تعالیٰ نے ساری کائنات کو کتم عدم سے منصۂ وجود بخشا تو مشیت الٰہی کا تقاضہ ہوا کہ اسکے بندے آدابِ رفیعہ اور اخلاق شریفہ سے آراستہ ہوں اور وہ اپنے علم ازلی سے جانتا تھا کہ یہ عظیم مقصد تب تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک یہ لوگ مفید اور مضر کی شناخت حاصل نہ کریں اور یہ شناخت تبھی حاصل کر سکتے ہیں کہ ان کو امر و نہی کی جائے اور امر و نہی بھی تب موثر ہوسکتی ہے کہ ان کو اس پر وعد و وعید کی جائے اور ترغیب و ترھیب کا راستہ اختیار کیا جائے۔"

ہمارے والد مرحوم اعلی اللہ درجتہ (اپنی کتاب صوارم) میں فرماتے ہیں: ہم پہلے یہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال حَسَن اور درست ہیں اسلئے کہ وہ صحیح مصالح و مقاصد پر مشتمل ہوتے ہیں اور اس سے ہمیں یقینی علم حاصل ہوتا ہے کہ تمام تکالیف الٰہی حَسَن ہیں اور اعلیٰ اہداف رکھتی ہیں البتہ ہم یہ دعویٰ کر سکتے کہ ہمیں تمام الٰہی اعلیٰ اہداف کا تفصیلی علم حاصل ہے یا ان تفاصیل کو جاننے کی پوری قدرت رکھتے ہیں۔

چنانچہ عیون الاخبار اور علل الشرائع میں ان کے سلسلہ سند کے ساتھ یہ روایت منقول ہے کہ: "فضل بن شاذان نے کہا: اگر کوئی سوال کرے، کیا جائز ہے کہ حکیم اپنے بندے کو ایسے افعال کی تکلیف دے جو بے مقصد اور فضول ہوں؟ تو ہم جواب دیں گے: کہ نہ یہ جائز نہیں کیونکہ جو حکیم ہے وہ عبث کام کرنے والا اور جاہل نہیں ہے۔ پس اگر کوئی پوچھے: کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو یہ تکالیف کیوں دی ہیں؟ تو جواب ہوگا: ان پر متعدد اہداف اور بکثرت اغراض مرتب ہوئے ہیں۔ پھر اگر کوئی کہے: کہ چاہئے تھا کہ وہ ہمیں ان اہداف و غایات سے آگاہ کرتا تاکہ ہمارے لئے یہ سب اغراض معلوم و معروف ہوتیں تو جواب ہوگا: ہاں، اہل علم و کمال کے ہاں یہ سب معلوم و معروف ہیں اور اگر وہ کہے: کیا آپ کو ان تمام کا علم حاصل ہے یا نہیں؟ تو جواب ہوگا کہ ہم بعض حکمتوں کا علم رکھتے ہیں اور بعض کا نہیں۔"

اور اتنی مقدار دلائل مخالفین کے خیالات کو غلط ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں۔

مندرجہ بالا گفتگو کا یہ پہلو کہ ان احکام شریعت میں سے کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے محاسن کا ادراک ہمیں حاصل ہو سکتا ہے اس کی وضاحت کیلئے کچھ گذارشات عرض ہیں۔

مدنی بالطبع مخلوق:

(۱) انسان ایک مدنی بالطبع مخلوق ہے لیکن اس کو ایسی طبیعت دی گئی ہے کہ وہ اپنی معاشی گزران کیلئے دیگر بنی نوع انسان کی طرف محتاج ہے اور اعوان و انصار کے بغیر اس کا گذارا نہیں ہوسکتا کیونکہ بدیہی طور پر معلوم ہے کہ ایک انسانی فرد کیلئے ممکن نہیں ہے کہ خود ہی زراعت کرے، خود ہی آٹا چکی چلائے، خود ہی اپنا مکان تعمیر کرے، خود ہی اپنا لباس بنے اور پھر خود ہی اس کی سلائی کرے اور ان تمام امور میں استعمال ہونے والے آلات اور برتن وغیرہ بھی خود ہی تیار کرے

اور قطعی طور پر ثابت ہے کہ ہمارا معاشرہ اور باہمی معاملات اگر نسبی نہ ہوں اور ہر کوئی اپنی اپنی نسبت سے ان کاموں میں حصہ نہ لے تو باہمی تنازع اور جھگڑے وجود میں آئیں گے۔

اسی لئے حکمت الٰہی کا تقاضہ یوں ہوا ہے کہ وہ اپنے رسول مبعوث فرمائے اور ان پر وحی نازل کرے اور اس وحی کے ذریعہ شریعت کے قوانین اور مکلفین کی ذمہ داریاں انہیں بتائے اور ان بندوں کو اجازت نہ ہو کہ وہ ان معاملات میں ان حدود سے تجاوز کریں اور ان پر واضح فرمائے کہ جو لوگ ان حدود سے تجاوز کریں گے وہ سزاؤں اور دنیا و آخرت کی تعزیرات کا مستوجب قرار پائیں گے جب یہ صورت ہے تو لاریب ولاشک کہ تکلیف کا معین کر دیا جانا باہمی تجاوز و تعدی سے مانع ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے کی حق تلفی نہیں ہوتی۔ اس سے ثابت ہوا کہ تکلیف ایک حسن اور اچھا اقدام ہے۔

تکلیف معرفت الٰہی میں ترقی کا موجب ہے:

(۲) لوگوں کو احکام کی تکلیف کے حسن ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس سے انسان اللہ سبحانہ تعالیٰ کی معرفت میں ترقی کرتا ہے صفات ثبوتیہ وسلبیہ سے آگاہی پاتا ہے تو اس قدر مضبوط ہو جاتا ہے کہ اس کی ایسی خلوت میں جہاں عالم السر والخفیات ذات توحید کے علاوہ کوئی اس کے حالات پر مطلع نہیں ہوتا وہاں بھی وہ قبیح امور کے ارتکاب سے اجتناب کرتا ہے وہ ہر وقت اور ہر مقام پر اللہ تعالیٰ کو اپنا مراقب پاتا ہے اور ناشائستہ حرکات سے باز رہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بندوں کو تکالیف دینا حسن ہے۔

فخرالدین رازی کی گفتگو اور اس کا جواب:

ہمارے والد گرامی نے فرمایا: کہ فخرالدین رازی نے کہا ہے: اگر اللہ تعالیٰ اس شخص کو ایمان لانے کی تکلیف دے جس کے بارے میں وہ خود علم رکھتا ہے کہ یہ بندہ ایمان نہیں لائے گا تو یہ تکلیف مالا یطاق قرار پائے گی جو کہ قبیح ہے اور اگر تسلیم کریں کہ اس کے ایمان نہ لانے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا علم رکھنا اس کو ایمان لانے کی تکلیف کے محال ہونے کا موجب نہیں تاہم یہ تکلیف قباحت سے خالی نہیں اور اس کی وضاحت یہ ہے اگر کسی فاعل کو یہ معلوم ہو کہ وہ جس غرض کیلئے کسی کو ایک فعل کی تکلیف دے رہا ہے وہ غرض حاصل نہیں ہوگی بلکہ معاملہ برعکس ہوگا تو اسے فعل کی تکلیف دینا عقلاء کے نزدیک قبیح ہے۔

سوال:..... مثلاً اگر کوئی شخص اپنے غلاموں اور کنیزوں کو جمع کرے اور کہے کہ ان کو جمع کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنی شہوت متحرک کریں لیکن باہم فعل بد کرنے سے گریز کریں تاکہ وہ اس قبیح فعل سے پرہیز کر کے بہت زیادہ اجر و تعظیم کے مستحق قرار پائیں۔ ادھر اس آقا کو علم الیقین حاصل ہو کہ یہ غلام اور کنیزیں میرے حکم کی اطاعت نہیں کریں

گے اور زنا و فحشاء کے ضرور مرتکب ہوں گے لیکن بایں ہمہ وہ ایسا کرے تو کیا عقلاء اس کے اس اقدام کو حسن قرار دیں گے، ہرگز نہیں وہ یقیناً اس اقدام کو قبیح قرار دیتے ہیں۔

جواب:.....ان کا یہ خیال مسترد ہے کیونکہ مذکورہ علم تکلیف کے حسن یا قبیح ہونے کا باعث نہیں بن سکتا کیونکہ جب تکلیف احکام ایسے عظیم مصالح پر مشتمل ہے جن میں نظام کی حفاظت اور آداب کی تربیت بھی ہے اور تابعداری کرنے والوں کیلئے ابدی سعادت پر فائز ہونا بھی ہے تو ایسی تکلیف عمومی کو فقط اس لئے قبیح قرار نہیں دیا جاسکتا کہ چند کفار دیدہ و دانستہ اپنے آپ کو جہنم میں جھونک دیں گے جبکہ ان کیلئے یہ احسان بھرا راستہ بھی کھلا ہے جس کے ذریعہ وہ ابدی ثواب بھی حاصل کر سکتے ہیں تو ایسی حسن تکلیف فقط اس وجہ سے قبیح بن جائے کہ وہ عمداً راہِ ضلالت پر چل کر عذاب پائیں گے عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی ہے۔

اور رازی کی تمثیل جس میں اس نے اس بات کو دلیل بنایا کہ اس طرح بندوں اور کنیزوں کا اجتماع کرنا فعل قبیح ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تمثیل غلط قیاس پر مشتمل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق کو تکلیف دینے اور اس کی اس مثال کے درمیان کئی وجوہ سے فرق موجود ہیں۔

پہلا فرق تو یہ ہے کہ اس نے اپنے اس اجتماع زن و مرد کا فائدہ اس کے ممتنع ہونے اور تعظیم کے لائق ہونے میں منحصر کیا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی مخلوق کے ذکور و اناث کو پیدا کرنے کی مصلحت مذکورہ بات تک محدود نہیں کیونکہ تخلیق انسان تو بہت زیادہ مصالح وعنایات پر مشتمل ہے۔

(۱) یہ تخلیق انسان میں ودیعت کردہ کمال قدرت وصنعت کا اظہار ہے اسی لئے انسان کو عالم اصغر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) نیز یہ انسان کے ملائکہ مقربین پر فضیلت رکھنے کا اظہار ہے کیونکہ ان میں سے نفوس قدسیہ رکھنے والے افراد جب خود کو اپنی شہوانی قوت کے باوجود حرام کھانے، لباسِ حرام پہننے اور ناجائز جنسی تعلقات قائم کرنے جیسے غیر مشروع اقدامات سے باز رکھتے ہیں تو حق تعالیٰ ایسے بندوں کے ذریعہ ملائکہ مقربین پر فخر و مباہات کرتا ہے اور اپنے اس فرمان میں پوشیدہ نکتہ کو روشن کرتا ہے جو اس نے ملائکہ کیلئے فرمایا تھا کہ

إِنِّيٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (سورہ بقرہ، آیت ۳۰)

کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ہو۔

(۳) اور ایک غرض یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مقصود اپنے بندوں کو ان لاتعداد نعمتوں سے استفادہ کا حق دینا ہے کہ اگر تمام دریا سیاہی بن جائیں اور تمام اشجار قلمیں بن جائیں تو اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے اور اس کی مثل دیگر اغراض انسان کو خلق کرنے کی اغراض قرار دی جاسکتی ہیں۔

اور دوسرا فرق یہ ہے کہ: رازی نے اپنے غرض میں یہ قرار دیا ہے کہ تمام کے تمام افراد فواحش کے مرتکب ہوں جبکہ بندگانِ خدا کی صورت حال یوں نہیں ہے کیونکہ تمام انبیاء اور اکثر صالحین مومنین ایسے نتائج کے ارتکاب سے منزہ لوگ ہوتے ہیں اگر کبھی ان سے کوئی قبیح فعل سرزد ہو بھی جائے تو بھی افعال حسنہ بہت زیادہ مقدار میں ان سے صادر ہوتے ہیں اور پھر وہ لوگ اپنی غلطیوں کا تدارک توبہ کے ساتھ کر لیتے ہیں اور توبہ کے حسن ہونے میں شک نہیں۔

اور تیسرا فرق یہ ہے کہ اس نے اپنی تمثیل میں اس مرد و زن کے اجتماع میں شہوات سے محفوظ رہنے کیلئے کوئی راہ معین نہیں کی، بخلاف اللہ تعالیٰ کے ایجاد کردہ نظام کے، کیونکہ حق تعالیٰ نے جب ذکور و اناثِ بشر کو خلق فرمایا ہے تو ان کیلئے حلال کی راہ بھی ایجاد کی ہے اور شہوت دور کرنے کیلئے حلال مباشرت کا راستہ مفتوح رکھا ہے نیز یہ کہ کسی ایک کمرہ میں غلاموں اور کنیزوں کو فقط شہوات کو ہیجان میں لانے کے سوا اور کوئی غرض و غایت نہ ہو تو یقیناً عادات جاریہ کے مدنظر یہ عمل سخت کراہت رکھتا ہے لیکن روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا انسانی ذکور و اناث کو خلق کرنا کبھی بھی اس قبیل سے قرار نہیں دیا جا سکتا، لہٰذا ان تمام فوارق کے باوجود ایسا دور کا قیاس اشاعرہ کے کسی رہبر کا کام ہو سکتا ہے، کوئی حکیم و دانا ایسا قیاس نہیں کر سکتا۔

پس اگر چاہتے ہو کہ اس کیلئے کوئی حقیقی اور واقع کے مطابق تمثیل تلاش کرو تو ذرا اپنے کان میری طرف کرو اور پنبۂ غفلت اس سے نکال لو اور سنو وہ مثال یوں ہو سکتی ہے کہ ایک حکیم وخبیر بادشاہ ہے اس کے ہزاروں بندگان ہیں ان میں سے کچھ تعداد ایسے بندوں کی ہے جو یہ قابلیت رکھتے ہیں کہ بادشاہ ان کو اپنے حضور میں طلب کرتا ہے اور انہیں ایسے احکام کی تکلیف دیتا ہے جو ان کے نفوس میں کمال ایجاد کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

ایسے اعتقادات حقہ، اخلاق حمیدہ اور اعمال پسندیدہ کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ اس کے تمام اوامر و نواہی کی اطاعت کرنے سے وہ بندگان ترقی کریں گے، اس بادشاہ کے ہاں تقرب پائیں گے، اس کے کارخانہ جات کے لئے مدارالمہام اور سرکردہ اکابرین بن جائیں گے۔ ان کو ظاہری و معنوی کمالات کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملے گا جس سے سارے خورد و بزرگ، دور اور نزدیک والے بادشاہ کی حسن تربیت کے ساتھ صاحبان معرفت بن جائیں گے اور یہ کمال بھی ان غیر متناہی کمالات میں سے ایک معمولی حصہ ہوگا جو ان غلاموں کو اس شاہی صحت کے فیض سے حاصل ہو سکتا ہے۔

جبکہ علاوہ ازیں اس عظیم بادشاہ کے گھر میں انواع و اقسام کے کھانے، نفیس قسم کے لذائذ، آراستہ قیام گاہیں، گھنے باغات، بہتی ہوئی بے شمار نہریں، فاخرہ لباس اور گوناگوں نعمتیں وغیرہ بھی مہیا اور آمادہ ہوں۔

وہ بادشاہ ان تمام نعمتوں سے بذاتِ خود غنی اور بے نیاز ہو اور دیگر جن لامتناہی نعمتوں، حکمتوں اور صنعتوں پر وہ بادشاہ قدرت رکھتا ہے ان بندگان کے علاوہ کوئی ان کا قدر دان نہ ہو اور ان کے علاوہ کوئی دوسرا ان عظیم نعمتوں سے استفادہ کرنے کی لیاقت بھی نہ رکھتا ہو۔ البتہ وہاں کچھ نعمتیں ایسی بھی ہوں جو زیادہ وقعت اور رتبہ والی نہ ہوں ان سے

استفادہ کرنا کسی کسب کمال پر بھی موقوف نہ ہو اور کسی اطاعت اور تابعداری سے بھی مشروط نہ ہو۔

نیز کچھ انعامات ایسے ہوں جو سابقہ استحقاق رکھنے، مشقتوں کو تحمل کرنے اور بادشاہ کے اوامر و نواہی کی اطاعت کرنے سے مربوط ہوں اور ان سے فیض یاب ہونا اس کی حکمت و مصلحت میں ان شرائط کے بغیر ممتنع اور محال ہو اور ان غلاموں اور بندگان کے اندر کچھ تعداد ایسے افراد کی بھی ہو جو بادشاہ کے حال کی بدنی اور خارجی و دنیوی نعمات سے استفادہ کرنے کی قابلیت تو رکھتے ہیں لیکن تنبیہ و اعلان کے باوجود وہ اپنے سوءِ اختیار کے ساتھ ان ابدی و جاودانی نعمات سے ہاتھ کھینچے رہیں، دور ہٹے پھریں اور بادشاہ کے منع کرنے کے باوجود وہ لوگ عمداً زہریلی اشیاء کو کھانے کے لئے مبادرت کریں اور اپنے اعمال کی شامت کے سبب ان زہریلی غذاؤں کے مضر نتائج میں مبتلا ہو جائیں۔ بادشاہ بھی اپنے علم ذاتی کے ساتھ ان سب لوگوں کے حال و مستقبل سے آگاہ ہو اور اسے یہ علم حاصل ہو کہ اگر وہ ان دو اقسام کے غلاموں اور بندوں میں سے ایک قسم کے غلاموں کو اپنے حضور میں طلب نہ کرے۔

تو دوسری قسم والے غلام اپنے کسی قصور کے تا حال ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے بادشاہ پر الزام لگائیں گے کہ اس نے ظلم کا راستہ اختیار کیا ہے اور چونکہ وجود پانے کا استحقاق اخیار و ابرار دونوں کے اکٹھے ہونے پر موقوف ہے اسلئے اگر دونوں کو وجود نہ دیا گیا تو قسم اول کے اخیار بھی اس فیض وجود سے محروم رہیں گے اور ان عظیم ابدی نعمتوں سے بھی محروم ہو جائیں گے جو دنیوی نعمتوں کے پہلو میں تھیں کہ جن دنیوی نعمتوں سے مستفیض ہونے کیلئے کسی استحقاق کی شرط کو پورا کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اس طرح ابدی نعمتیں بھی حکم عدم کا شکار ہو جائیں گی۔

اب اس تمثیل میں غور کریں اور بتائیں کیا مناسب یہ ہے کہ اس دوسری قسم کے نالائق غلاموں کی وجہ سے ان انبیاء و اوصیاء اور مقربانِ درگاہ کو بھی محروم کر دیا جائے جو جوہر قابل بھی ہو سکتے ہیں اور ان کے ذمہ کوئی سابقہ قصور بھی نہیں ہے اور ان تمام محاسن کو ترک کر دیا جائے جن کا ذکر کیا گیا ہے۔

یا یوں مناسب ہے کہ ان مقربان حضرت حق تعالیٰ کی خاطر اور ان محاسن کے مدنظر جو منظور نظر الٰہی ہیں ان سب کو وجود بخشے اور ان پر تکلیف کی ذمہ داری ڈالے اگرچہ اسے یہ علم ازلی حاصل ہے کہ کفار و عاصیان اپنے ذاتی غلط اختیار اور قدرت کی وجہ سے تمام احسانات کو ضائع کریں گے اور خود کو جہنم کی آگ کا ایندھن بنائیں گے۔

تکلیف کے حسن ہونے بلکہ اس کے لازم و واجب ہونے پر عقل و نقل سے بہت زیادہ دلائل موجود ہیں۔ ہمارے والد بزرگوار مرحوم و مغفور اعلی اللہ درجتہ نے اپنی کتاب صوارم میں ان تمام امور کو پوری تفصیل کے ساتھ درج فرمایا ہے اور مخالفین کے شبہات و اعتراضات کو بھی احسن طریقے سے رڈ فرمایا ہے۔ جو بھی اس سے آگاہی چاہتا ہو وہ اس کا مطالعہ فرمائے۔ ہم یہاں جن چند موضوعات کو اہم سمجھتے ہیں ان کو چند مباحث میں بیان کرتے ہیں:

فصل چہارم:

بندگان کے اختیاری افعال کا بیان

مسئلہ جبر و اختیار:

مذہب حق، مذہب امامیہ کے مطابق بندگانِ خدا اپنے بہت سے افعال میں بااختیار ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کے ساتھ الٰہی احکام کی شرعی تکلیف بھی مربوط ہوتی ہیں، ان تمام افعال پر انسان اپنی قدرت ذاتیہ مستقلہ کے ساتھ قادر ومختار ہے بلکہ یہ قدرت اسے خود حق تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اور اسے اعضاء و جوارح اور قوی آلات مرحمت کئے ہیں اور اگر وہ ان سے قدرت و اختیار کو سلب کر لیتا تو ان کے پاس کوئی توانائی نہ ہوتی اور اگر وہ ان کو ایمان یا کفر پر اکراہ و جبر کے ذریعہ آمادہ کرتا تو یہ اس کی کسی طرح مدافعت نہ کر سکتے لیکن حق تعالیٰ نے اپنی حکمت و مصلحت اور لطف و کرم کے ساتھ ان کی آزمائش کی خاطر ان کو اپنے افعال پر قدرت و اختیار بخش دیئے ہیں اور اسی کے مطابق ان کو مکلف قرار دیا ہے۔ پس مستحق قرار پانے والوں کو توفیق و تسدید سے سرفراز کرتا ہے اور ان کی تائید فرماتا ہے اسی لئے وہ لوگ بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں:

اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ (سورۂ فاتحہ آیت ۔ ۵)

کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔

یعنی وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے امیدوار اور اس سے وجود و قدرت کے برقرار رکھنے کے طلبگار ہوتے ہیں۔

اور جو لوگ کفر و معصیت پر اصرار کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید سے محروم رہتے ہیں نہ یہ کہ انہیں کفر و عصیان پر مجبور کیا گیا ہے۔ (العیاذ باللہ)

اشاعرہ کا نظریہ:

اشاعرہ اسی نظریئے تک محدود ہو گئے ہیں کہتے ہیں کہ بندوں کے تمام افعال کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور بندوں کو مطلقاً کوئی اختیار حاصل نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ان کے ہاتھوں پر یہ افعال جاری کر دیتا ہے لہٰذا بندے اپنے افعال میں مجبور ہیں۔

شاہ عبد العزیز دہلوی کا قول:

بیسواں عقیدہ: یہ ہے کہ "جو کچھ انسان یا حیوانات سے صادر ہوتا ہے خیر ہو یا شر، کفر ہو یا ایمان، اطاعت ہو یا معصیت، یہ سب اللہ تعالیٰ کی پیداوار اور اس کی ایجاد ہے، انسان اس کی ایجاد پر قدرت نہیں رکھتا البتہ عمل اور کسب بندے کی طرف سے ہوتا ہے اور اسی عمل و کسب پر وہ جزا پاتے ہیں اور یہی ان تمام کا مذہب ہے۔"

اس کلام میں صراحت سے انسان میں قدرت کی نفی کی گئی ہے اس کو مجبور قرار دیا گیا ہے فقط عمل و کسب کو ان کی طرف نسبت دی گئی ہے جس کا کوئی مفہوم نہیں بنتا اور اس عمل کسب کے معنی و مفہوم کی وضاحت میں ان کا کلام مضطرب نظر آتا ہے۔

ان میں سے ایک گروہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ بندہ غیر موثر قدرت رکھتا ہے اور عمل کے ساتھ ساتھ بندے کا ارادہ ملتا ہے تو بندہ سے فعل ظہور پاتا ہے لیکن اس میں قدرت و ارادہ کا مطلق دخل نہیں ہوتا بلکہ بندے کی خواہش کے مطابق اللہ تعالیٰ اس فعل کو صادر کر دیتا ہے بندے کی خواہش نیک کام کی ہو یا برے کام کی، گناہ و معاصی وغیرہ ان سب میں مکلف کو آسانی فراہم کرتے ہوئے وہ خود ہی اس فعل کو صادر کر دیتا ہے۔

اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بندوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے محل اطاعت و معصیت ہونا اس کا نام کسب ہے، جو اسی مخالف عقیدہ حق کا قائل ہے اس کے کلام سے یہ نظریہ ظاہر ہوتا ہے۔

حنفی قاضی محب اللہ بہاری کی گفتگو:

قاضی محب اللہ بہاری نے مسلم میں جو لکھا ہے اس کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ: "ان میں سے جسمیہ جو کہ خالصتاً جبریہ ہیں ان کے نزدیک بندہ میں اصلاً کوئی قدرت نہیں ہے۔ آدمی تو جمادات کی مثل ہے، لیکن ان لوگوں کا یہ خیال محض سفسطہ اور وہم ہے۔ اہل حق (جو محب اللہ بہاری کے نزدیک اشاعرہ و حنفیہ ہیں) کے نزدیک بندگان کے ہاں سبب فعل ہونے کی قدرت موجود ہے لیکن اشاعرہ کی نگاہ میں کسب سے مراد بندہ کے اندر فعل کے وقت ایک موہوم قدرت کا وجود ہونا ہے جو فعل میں کوئی مداخلت نہیں رکھتی اور وہ کہتے ہیں کہ جواز تکلیف کیلئے اتنی سی قدرت کا حاصل ہونا کافی ہے۔ کہتا

کافی ہے۔ کہتا ہے کہ:

"حق یہ ہے کہ یہ نظریہ بھی جبر کے مساوی ہے یعنی یہ قول بھی جبر محض کے ہم پلہ ہے اور حنفیہ کے نزدیک کسب سے مراد بندہ کے اندر پائی جانے والی وہ قدرت ہے جس کا اثر عزم و ارادہ ہے پس بندہ جب اپنے مقصود فعل کیلئے عزم و ارادہ کرتا ہے تو حسب عادت خدا خود اس فعل کو خلق کر دیتا ہے" (انتہی محصل کلامہ)۔

اس کا بطلان:

قاضی محب حنفی المذہب کے کلام سے ظاہر ہے کہ اشاعرہ کسبیہ کا نظریہ بھی مُجَبِّرہ کے قول کے مساوی ہے اور ایک غیر موثر سی قدرت کا قائل ہو جانا انہیں کوئی خاص فائدہ نہیں دے سکتا لیکن خود حنفیہ نے جو کسب والا نظریہ اپنایا ہے اس کی حالت بھی یہی ہے بلکہ یہ تو "عذر گناہ بدتر از گناہ" کے مترادف ہے اور جبر کو دور کرنے کا موجب نہیں۔ چنانچہ اس کا قول نحیف بھی چند وجوہ کے ساتھ باطل ہے۔

اشاعرہ کے بطلان کی پہلی وجہ:

عقل مستقیم اور وجدان سلیم یہ تسلیم کرتا ہے کہ ہم بندوں کے افعال اختیاریہ و غیر اختیاریہ کے درمیان واضح فرق ہے مثلاً ایک کاتب اپنے اختیار سے کتابت کر رہا ہے تو اس کے ہاتھ کی حرکت اور ایک رعشہ کے مریض کے ہاتھ کی حرکت جو بے اختیار حرکت ہے دونوں میں واضح فرق ہے اس طرح ایک شخص چھت سے بلا اختیار نیچے گر پڑتا ہے اور جو شخص اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ چھت سے نیچے اترتا ہے ان دونوں کی حرکت میں واضح اور روشن فرق ہے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ ان دونوں مفروضوں میں ایک صورت میں ہمارے قدرت و اختیار کا کوئی عمل دخل نہیں اور دوسری صورت میں ہم خود فاعل و مختار ہیں اور اگر ہمارے افعال میں سے کوئی فعل بھی ہمارے اختیار سے نہ ہوتا تو ان دونوں مثالوں میں پہلی صورت اور دوسری صورت کے درمیان کوئی فرق تسلیم نہ کیا جاتا حالانکہ ہر عاقل اپنے اختیاری اور غیر اختیاری افعال کے درمیان فرق کو بدیہی طور پر تسلیم کرتا ہے اور اس دعویٰ پر کوئی دلائل قائم کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

ابو الھذیل معتزلی کی حکایت:

منقول ہے کہ ابو الھذیل معتزلی نے بشر اشعری سے کہا تھا کہ اس کا گدھا زیادہ عاقل و دانا ہے کیونکہ اگر اس کے گدھے کو کسی ایسی نہر کے کنارے لے آؤ جس کی چوڑائی بہت بڑی ہو اور اب اس گدھے کو خوب مارو تا کہ وہ اس نہر سے عبور کرے وہ کبھی اطاعت نہیں کرے گا کیونکہ جانتا ہے کہ اتنی بڑی نہر کو عبور کرنا میری قدرت و اختیار سے خارج ہے لیکن اگر اسی گدھے کو کسی چھوٹی سی نہر پر لا کر عبور کرانے کیلئے مارو تو وہ بڑی آسانی سے عبور کر جائے گا پس ظاہر ہوا کہ

مقدور وغیر مقدور فعل کے درمیان فرق کو وہ بھی سمجھتا ہے لیکن اس گدھے کا مالک بشر اشعری اپنے اختیاری اور غیر اختیاری امور کے درمیان فرق کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور تمام امور میں خود کو مجبور تسلیم کرتا ہے پس اس کا گدھا خود اس سے زیادہ عقل مند ہے۔

حضرت بہلول کا مناظرہ:

یہاں حضرت بہلولؒ کی ایک انتہائی لطیف حکایت زیادہ موزوں اور مناسب مقام معلوم ہوتی ہے جس میں انہوں نے ابوحنیفہ کوفی کے ساتھ ایک دلچسپ مناظرہ کیا ہے۔

قاضی نور اللہ شوستری نور اللہ مرقدہ مجالس المومنین میں یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ: ایک روز حضرت بہلولؒ ابوحنیفہ کے دروازے سے گذر رہے تھے تو اس نے سنا کہ ابوحنیفہ اپنے شاگردوں سے کہہ رہا تھا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تین باتیں ایسی فرماتے ہیں جو مجھے پسند نہیں ہیں:

اول:..... یہ کہ شیطان کو جہنم کی آگ سے عذاب دیا جائے گا لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کیونکہ شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے تو آگ کو آگ سے کیسے عذاب دیا جاسکتا ہے۔

دوم:..... یہ کہ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی لائق دیدار و رؤیت نہیں ہے (نہ دنیا میں نہ آخرت میں) لیکن یہ صحیح نہیں، کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی شئے کا وجود ہو اور وہ کبھی دکھائی نہ دے سکے؟

سوم:..... یہ کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہر بندہ اپنے افعال کا خود فاعل ہے لیکن چونکہ اس بات کے خلاف نصوص موجود ہیں اسلئے میری نظر میں یہ صحیح نہیں۔

جب بہلولؒ نے ابوحنیفہ کوفی کی یہ بات سنی تو اس نے زمین سے ایک مٹی کا ڈھیلا اٹھایا اور ابوحنیفہ کو مار دیا اور بھاگ گیا۔ ادھر یہ ڈھیلا ابوحنیفہ کی پیشانی پر جالگا اور اسے کافی تکلیف ہوئی چنانچہ ابوحنیفہ اپنے شاگردوں سمیت بہلول کے پیچھے دوڑے اور اسے پکڑ لیا چونکہ بہلولؒ خلیفۂ وقت کے قبیلہ کا فرد تھا اسلئے اسے کوئی سزا وغیرہ تو نہ دے سکے لیکن پکڑ کر خلیفۂ وقت کے ہاں لے آئے اور وہاں اپنی شکایت پیش کر دی۔ بہلولؒ نے ابوحنیفہ پر سوال کیا آپ کو مجھ سے زیادہ تکلیف پہنچی ہے کہ مجھے پکڑ لائے ہو، تو ابوحنیفہ بولے، تو نے میری پیشانی پر ڈھیلا مارا ہے اور میرا سر درد کر رہا ہے۔ بہلولؒ کہنے لگا: درد مجھے دکھاؤ۔ ابوحنیفہ کہنے لگا: درد کو دکھایا نہیں جاسکتا وہ تو دکھائی دینے کے لائق نہیں ہے تو بہلول گویا ہوئے پھر تو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام پر کیوں اعتراض کر رہا تھا کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہو اور وہ دکھائی نہ دے، اور تو کہہ رہا ہے کہ مجھے بڑی تکلیف پہنچی ہے حالانکہ وہ ڈھیلا بھی مٹی سے تھا اور تو بھی ایک خاکی انسان ہے اور خاک سے ہے تو خاک کو خاک سے متاثر نہیں ہونا چاہئے اور کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہئے جیسا کہ تو امام علیہ السلام پر اعتراض کر

رہا تھا کہ کیسے ہوسکتا ہے کہ شیطان کو آگ میں عذاب دیا جائے کہ وہ خود آگ سے ہے۔ اور تو ایک اعتراض یہ بھی کر رہا تھا کہ امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہر بندہ اپنے فعل کا خود فاعل ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے یعنی بندہ مجبور ہے تو پھر مجھے کیوں پکڑ کر خلیفہ کے ہاں لے کر آئے ہو اور بدلے کا تقاضہ اور سزا کی درخواست کر رہے ہو حالانکہ تیرے بقول میں نے تو کچھ نہیں کیا، جو ڈھیلا مارا ہے وہ خود خدا نے مارا ہے۔

بہلولؒ کے ان وزنی دلائل کے جواب میں ابوحنیفہ کوئی معقول جواب نہ دے سکا اور شرمندہ ہو کر اس مجلس خلیفہ سے اٹھ آیا۔

اشاعرہ کے بطلان کی دوسری وجہ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے اوامر کی اطاعت کا حکم دے کر اس پر ثواب مقرر کیا اور معصیت سے نہی فرما کر اس پر عذاب و عقاب کی وعید جاری فرمائی ہے چنانچہ قرآن مجید کی متعدد آیات اس پر گواہ ہیں، فرمایا:

(۱) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (سورۂ بقرہ، آیت ۴۳)

ترجمہ: نماز قائم کرو (پابندی سے ادا کرو) زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ شامل ہو کر رکوع بجالاؤ۔

اس آیت سے نماز باجماعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(۲) فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ، (سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۵)

ترجمہ: تم میں جو بھی اس ماہ رمضان میں گھر پر ہو، سفر میں نہ ہو اسے روزہ رکھنا چاہیے۔

(۳) ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ، (سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۷)

ترجمہ: روزے رات تک مکمل کرو۔

(۴) وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۷)

ترجمہ: کھاؤ، پیو، تا آنکہ صبح صادق کی سفیدی نمودار ہو کر سیاہ رات سے جدا ہو جائے۔

(۵) وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا، (سورۂ آل عمران، آیت ۹۷)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کو لوگوں پر حق ہے کہ جو شخص بھی اللہ کے گھر (خانہ کعبہ) تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے وہ اس گھر کے حج کو آئے۔

(۶) هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ (سورۂ رحمٰن، آیت ۶۰)

ترجمہ: نیکی کی جزاء نیکی کے سوا اور کچھ نہیں۔

(۷) مَنۡ جَآءَ بِالۡحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا ۚ (سورہ انعام، آیت ۱۶۰)

ترجمہ: جو ایک نیکی کرے گا اس کے لئے اس کے دس برابر (اجر) ہوگا۔

(۸) وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيۡلًا (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۳۲)

ترجمہ: اور زنا کے قریب ہرگز نہ جانا یہ برائی ایک فحاشی ہے اور برا راستہ ہے۔

(۹) وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ (سورۂ نساء، آیت ۹۳)

ترجمہ: اور جو کوئی کسی مومن کو دیدہ دانستہ قتل کرے گا اس کی جزا جہنم (عذاب) ہے۔

(۱۰) يَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡيَتٰمٰى ظُلۡمًا (سورۂ نساء، آیت ۱۰)

ترجمہ: اور یتامیٰ کا مال ناجائز طریقے اور ظلم سے مت کھاؤ۔

(۱۱) لَا تَاۡكُلُوا الرِّبٰٓوا (سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۰)

ترجمہ: اور سود مت کھاؤ۔

(۱۲) اِنَّمَا الۡخَمۡرُ وَالۡمَيۡسِرُ وَالۡاَنۡصَابُ وَالۡاَزۡلَامُ رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ (سورۂ مائدہ، آیت ۹۰)

ترجمہ: یقیناً شراب، جوا، انصاب اور ازلام (بت پرستی اور ان کے اوپر کے چڑھاوے) یہ سب پلید اور شیطانی عمل ہیں۔

(۱۳) مَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا يُّجۡزَ بِهٖ (سورۂ نساء، آیت ۱۲۳)

ترجمہ: جو بھی عمل بد انجام دے گا اس کی سزا پائے گا۔

اور مزید ایسی آیات کثیر تعداد میں موجود ہیں جن میں اطاعت کا امر اور اس کی جزاء، معصیت کی نہی اور اس کی سزا کی صراحت موجود ہے۔

پس اگر تمام انسانوں کے افعال ان کے اختیار میں نہ ہوتے تو ان تمام افعال کی انہیں تکلیف دینا اور پھر ثواب و عذاب کی بات کرنا قبیح اور فضول قرار پاتا، یہ ایسے ہے جیسے کوئی مالک یا سردار اپنے کسی غلام کے ہاتھ پاؤں باندھ دے اور پھر اسے حکم دے کہ فلاں شئے اٹھاؤ اور پھر اسے اس شئے کے اٹھا نہ لانے پر سزا دے یا کسی حیوان کو کسی کام کا حکم دے اور پھر اس حیوان کو اسلئے مارنے لگے کہ تو سمجھتا کیوں نہیں اور میرے حکم کو انجام کیوں نہیں دیتا، اس اقدام سے قبیح تر اقدام اور کیا ہوسکتا ہے؟

پس وہ اللہ تعالیٰ جو ایک معمولی فعل قبیح بھی نہیں کرتا وہ اتنا قبیح ترین کام کیسے کرسکتا ہے؟ اس سے زیادہ اور کون سا

ظلم ہوسکتا ہے کہ جو ذات اپنے بے اختیار بندوں کے دل و زبان پر خود ہی کفر و معصیت کے کلمات و اقدامات جاری کرے اور پھر اس کفر و معصیت کے جرم میں ان بندوں کو ابد الآبدین تک جہنم کی آگ میں جلائے حالانکہ وہ خود قرآن مجید کی کثیر آیات میں فرماتا ہے:

(۱) وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (سورۂ فصلت، آیت ۴۶)

اور تیرا رب اپنے بندوں پر ظلم کرنے والی ذات نہیں۔

(۲) وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (سورۂ غافر، آیت ۳۱)

اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے کا ارادہ بھی نہیں کرتا۔

(۳) وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (سورۂ نحل، آیت ۱۱۸)

اور ہم (اللہ تعالیٰ) نے ان لوگوں پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود اپنے نفسوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔

(۴) وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (سورۂ انعام، آیت ۱۶۴)

اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

علامہ حلی علیہ الرحمہ کا ارشاد:

علامہ حلی علیہ الرحمہ کشف الحق میں فرماتے ہیں: اس سے بالاتر ظلم اور کونسا ہوسکتا ہے؟ کہ خداند عالم اپنے بندے کے اندر خود ہی اپنی معصیت کو خلق کرے اور پھر خود اس معصیت پر اسے سزا دے یا خود ہی اپنے سیاہ پوست خلق کرے اور پھر سیاہ پوست ہونے پر اسے عذاب میں ڈالے یا کسی کو دراز قد والا پیدا کرے اور پھر اسی دراز قامتی پر اسے عذاب میں گرفتار کر دے یا اس قسم کے دیگر لاتعداد محلات، تو کیا کسی عاقل منصف شخص کیلئے جائز ہے؟

کہ وہ اپنے پروردگار کی طرف ان قبیح امور کو منسوب کرے حالانکہ ایسے افعال بد میں سے کسی ایک فعل کو بھی اپنے لوگوں میں کسی ایک کی طرف منسوب نہیں کرتے مثلاً یوں کہے کہ اپنے غلام کو قید کرلو، پھر اسے عذاب دے اس بات پر کہ وہ کام کرنے کیوں نہیں گیا تو جب کوئی ایسے قبیح عمل کو اپنی طرف منسوب کرنے پر راضی نہیں ہے تو اپنے اور کائنات کے خالق کی طرف ایسی قبیح نسبت پر کیوں راضی ہو سکتے ہیں جو شئے اپنے لئے پسند نہیں وہ دوسروں کیلئے مت پسند کرو۔

ابوحنیفہ اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا مکالمہ:

ہمارے والد بزرگوار علیہ الرحمہ، شیخ صدوق ؒ سے نقل کرتے ہیں انہوں نے اپنی کتاب توحید میں اپنی سند کے ساتھ حضرت سید عبدالعظیم حسنیؒ سے، انہوں نے حضرت امام علی النقی علیہ السلام سے، انہوں نے اپنے والد ماجد حضرت امام محمد

تقی علیہ السلام سے، انہوں نے اپنے والد بزرگوار امام علی رضا علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ ایک روز ابوحنیفہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے حضور میں سے باہر نکلا۔ راہ میں حضرت امام موسیٰ بن جعفر الکاظم علیہما السلام کی زیارت سے مشرف ہوا تو آپ سے سوال کر دیا!

مِمَّنِ الْمَعْصِيَةُ؟

نافرمانی کون کرتا ہے؟ معصیت کس سے ہوتی ہے؟

اور احتجاج طبرسیؒ میں روایت یوں ہے کہ ایک دن ابوحنیفہ مدینہ منورہ میں آئے۔ عبداللہ بن مسلم بھی ساتھ تھے۔ ابوحنیفہ نے عبداللہ سے کہا: اس شہر میں آل محمد علیہم السلام کے علماء میں سے ایک شخصیت حضرت جعفر بن محمد علیہ السلام تشریف رکھتے ہیں، مجھے ان کی خدمت میں لے چلو، میں ان سے علمی فیض حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ پس وہ دونوں امام جعفر صادق علیہ السلام کی رہائش گاہ پہنچے تو دیکھا کہ حضور کے شیعہ کی ایک جماعت آپ کے باہر تشریف لانے کا انتظار کر رہی ہے۔

إِذَا خَرَجَ غُلَامٌ حَدَثٌ

ناگاہ طور پر اس دولت کدہ سے ایک نوخیز نوجوان برآمد ہوا۔ اس کی ہیبت اور رعب سے تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت ابوحنیفہ اس عبداللہ بن مسلم کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا یہ نوخیز نوجوان کون ہیں؟ تو ابن مسلم نے کہا کہ یہ نوجوان حضرت موسیٰ بن جعفر علیہما السلام ہے جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے فرزند ارجمند ہے تو ابوحنیفہ کہنے لگا:

وَاللّٰهِ لَاُجْبِهَنَّهُ بَيْنَ يَدَيْ شِيْعَتِهٖ

قسم بخدا! میں اسے اس کے شیعہ کے سامنے مغلوب کر دوں گا، جبکہ یہ ابوحنیفہ کی کم عقلی اور غلط گوئی تھی تو ابن مسلم بولے:

مَهْ لَنْ تَقْدِرَ عَلٰى ذٰلِكَ

خاموش رہو، تمہاری بساط میں کچھ نہیں؟

لیکن ابوحنیفہ اس بات پر اصرار کرنے لگا اور کہنے لگا:

وَاللّٰهِ لَاَفْعَلَنَّهٗ

قسم بخدا! میں ایسا کر کے دکھاؤں گا۔ اتنا بڑا دعویٰ کرنے کے بعد وہ امام علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو کر انتہائی گھٹیا سمجھتے ہوئے کہنے لگا:

يَا غُلَامُ اَيْنَ يَضَعُ الْغَرِيْبُ حَاجَتَهٗ

کہ ایک مسافر اس شہر میں قضاء حاجت کیلئے کہاں جائے؟ تو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا:

يَتَوَارىٰ خَلْفَ الْجِدَارِ وَ يَتَوَقّٰى اَعْيُنَ الْجَارِ وَ شُطُوطَ الْاَنْهَارِ وَ مَسْقَطَ الثِّمَارِ وَ لَا يَسْتَقْبِلُ الْقِبْلَةَ وَ لَا يَسْتَدْبِرُهَا فَحِينَئِذٍ يَضَعُ حَيْثُ شَاءَ.

اسے چاہئے کہ کسی دیوار کے پیچھے چھپ جائے، دیکھنے والوں کے سامنے ہونے سے پرہیز کرے، نہروں کے کنارے اور میوہ جات اور پھلوں کے گرنے کے مقامات سے اجتناب کرے، نہ قبلہ رخ ہو اور نہ ہی قبلہ کو پشت کرے، ان شرائط کی پابندی ملحوظ خاطر رکھنے کے بعد اسے اجازت ہے جہاں مناسب ہو اپنی ضرورت پوری کرلے۔

جب ابوحنیفہ نے جوابِ شافی سن لیا تو اپنے خیال کے مطابق اس سے باریک ترین مسئلہ کی طرف عدول کیا اور بولا:

يَا غُلَامُ مِمَّنِ الْمَعْصِيَةُ؟

اے فرزند: یہ فرمائیے معصیت کس سے ہوتی ہے، کس کا فعل ہے؟ تو حضرت نے جواب میں ارشاد فرمایا: "یہ بات تین حالتوں سے خارج نہیں:

(۱) معصیت یا تو خداوند تعالیٰ کا فعل ہے اور بندہ کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے اگر ایسا ہے تو پھر پروردگار کریم کے لئے بھی سزاوار نہیں کہ وہ اس معصیت کی سزا اس بندہ کو دے جس کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں اور فعل اس سے صادر نہیں ہوا۔

(۲) اور یا یہ معصیت اللہ تعالیٰ اور انسان دونوں کے شراکت سے صادر ہوتی ہے اگر ایسا ہے تو بھی اللہ تعالیٰ کیلئے مناسب اور روا نہیں کہ وہ انسان کو اس کی سزا دے کیونکہ قوی ترین شریک کا ضعیف اور کمزور ترین شریک کو سزا دینا ظلم ہے۔

(۳) آخری صورت یہ ہے کہ یہ معصیت خود انسان سے ہی صادر ہوتی ہے، وہ انفرادی طور پر اس کا فاعل ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔

پس اگر حق تعالیٰ اس عاصی انسان کو اس کے گناہ کی شامت پر اسے سزا دے تو حق ہے اور اگر چاہے تو اسے معاف کردے کہ یہ اس کے جود و کرم کا تقاضہ ہے۔

اس کے بعد احتجاج کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فَاَصَابَتْ اَبَا حَنِيفَةَ سَكْتَةٌ كَاَنَّمَا اُلْقِمَ فُوهُ الْحَجَرَ قَالَ فَقُلْتُ لَهُ اَلَمْ اَقُلْ لَكَ لَا تَتَعَرَّضْ لِاَوْلَادِ رَسُولِ اللّٰهِ.

کہ اس جواب کو سن کر ابوحنیفہ پر سکتہ طاری ہوگیا، ایسا خاموش ہوا کہ گویا اس کے منہ میں پتھر پڑ گیا ہے۔

سبحان اللہ، جب کسی شخص کی حیثیت یہ ہو کہ وہ اہل بیت علیہم السلام کے انوار سے فیض یاب ہونے والے بہلولؒ جیسے شاگردوں کے مقابلے میں ساکت و عاجز ہو جاتا ہو تو اس کیلئے اس سے زیادہ بے عقلی اور کیا ہو سکتی ہے کہ پھر وہ الامام بن الامام کے ساتھ مناظرہ کی ہوس اپنے ذہن میں پالتا پھرے اور پھر لاف و گزاف ان کی بارگاہ میں زبان پر لے آئے تو ملاءِ عام میں رسوا ہونا ہی اس کا مقدر ہوتا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

چنانچہ ابن مسلم نے اسے کہا: میں نے نہ کہا تھا کہ اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے در پے نہ ہو تیرے اندر ان ہستیوں کا مقابلہ کرنے کی لیاقت نہیں ہے۔

اشاعرہ کے بطلان کی تیسری وجہ:

اللہ تعالیٰ نے کثیر مقامات پر اطاعت و فرمان برداری کرنے والوں کی مدح و ستائش فرمائی ہے اور انہیں مقربانِ درگاہِ احدیت قرار دیا ہے اور کفر معصیت کرنے والوں کی مذمت فرمائی ہے اور انہیں مردودانِ درگاہِ عزت قرار دیا ہے اگر یہ لوگ اپنے افعال کے خود فاعل نہ ہوں تو ان کی مدح و ستائش اور مذمت دونوں بے محل اور ناروا ہو جائیں گی۔

اشاعرہ کے بطلان کی چوتھی وجہ:

حق تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

(۱) وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (سورۃ کہف، آیت ۲۹)

اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دو! کہ حق تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر کرے ہم نے ظالموں کے لئے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کے شعلوں نے ان سب کو احاطہ کر رکھا ہے۔

(۲) اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ إِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (سورۂ فصلت، آیت ۴۰)

ترجمہ: جیسے چاہتے ہو عمل کرتے رہو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال پر آگاہ ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

(۳) نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ﴿۳۶﴾ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ أَنْ يَّتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ﴿۳۷﴾ (سورۂ مدثر، آیت ۳۶ تا ۳۷)

ترجمہ: وہ دوزخ سے ہر بشر کو ڈرانے والا ہے اب جو تم سے چاہے خیر و اطاعت کیلئے آگے بڑھے یا شر و معصیت سے بچنے کیلئے پیچھے ہٹے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمام مکلفین کو خوف عذاب دلا کر خیر و شر کی باگ ڈور ان کے اپنے ہاتھ میں دے دی ہے اب

چاہیں تو طاعات وخیرات کا اقدام کریں اور آگے بڑھیں اور اگر چاہیں تو پیچھے رہیں اور معاصی اور برائیوں کا ارتکاب کرتے پھریں۔

(۴) فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾ (سورۂ مزمل، آیت ۱۹)

ترجمہ: پس جو چاہے اپنے رب کی راہ کو اختیار کرے۔

ایسی بہت ساری آیات ہیں جو بڑی صراحت کے ساتھ دلالت کرتی ہیں کہ بندگان اپنے عمل میں خودمختار ہیں اور جو کچھ عمل کرتے ہیں اپنی مشیت اور اپنے ارادہ واختیار کے ساتھ خود کرتے ہیں۔

اشاعرہ کے بطلان کی پانچویں وجہ:

وہ تمام آیات جو کفار کو سرزنش اور تہدید کرتی ہیں اور بیان کرتی ہیں کہ ان کو ایمان لانے سے کوئی رکاوٹ موجود نہیں اور وہ لوگ کفر کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔

(۱) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا (سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۹۴)

ترجمہ: اور لوگوں کو کس چیز نے روک رکھا ہے ایمان لانے سے؟

(۲) فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ (سورۂ مدثر، آیت ۴۹)

ترجمہ: ان کو کیا ہوا ہے کہ وہ نصیحت حاصل کرنے سے روگردانی کرتے ہیں۔

(۳) لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (سورۂ آل عمران، آیت ۷۱)

ترجمہ: تم لوگ حق کو باطل کے ساتھ کیوں مشتبہ کرتے ہو۔

(۴) لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (سورۂ آل عمران، آیت ۹۹)

ترجمہ: تم لوگ کیوں لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے ہو۔

(۵) يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ (سورۂ ص، آیت ۷۵)

ترجمہ: اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا ہے اس سے کہ تو اس کا سجدہ کرے جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے۔

یہ تمام آیات صراحت کر رہی ہیں کہ تمام بندگان اختیار رکھتے ہیں اور اشاعرہ کا مذہب باطل ہے کیونکہ اشاعرہ کا مذہب صحیح ہوتا تو بندگان یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ! تو نے خود ہمیں ایمان لانے سے روک لیا ہے اور ہمارے دل میں خود تو نے کفر خلق کر دیا ہے اور اپنے ہی عمل پر ہمیں سرزنش کرتا ہے اور عتاب فرماتا ہے اور اس طرح شیطان بھی جواب

شیطان بھی جواب میں کہتا، تو نے خود ہی مجھے آدم کے سجدہ سے روک رکھا ہے اور پھر خود ہی سجدہ نہ کرنے پر میری ملامت کرتا ہے۔

شارحِ مقاصد کا جواب:

کہ ان آیات سے مراد یہ ہے کہ چونکہ ظاہراً کوئی مانع موجود نہیں ہے تو پھر ایسے میں تم لوگ کیوں ایسا کر رہے ہو یا کیوں ایسا نہیں کرتے ہو؟

اس جواب کا ردّ:

عجیب جواب ہے جس کا کوئی نتیجہ اور مقصد نہیں بنتا کیونکہ مانع ظاہر ہو یا مخفی ہو اس ذات سے تو پوشیدہ نہیں جو آشکار و پنہاں سب کچھ جانتا ہے خصوصاً جو خود اس ذات کا اپنا ہو تو پھر ظہور و خفاء کا اس میں کیا دخل ہو سکتا ہے البتہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندگان پر کوئی اعتراض وارد نہ ہو سکے گا اور اگر خداوند تعالیٰ نے ایک حجت ثابت کی جو ظاہر میں درست ہو اور باطن میں نادرست تو یہ تدلیس ہوگی اور کچھ نہ ہوگا، ایک قسم کا دھوکہ بن جائے گا اور اس سے الزام دور نہ ہو سکے گا جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ (سورۂ انعام، آیت ۱۴۹)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی حجت قائم ہے جو کامل حجت ہے۔

یہ فرمان حق و صدق پر مشتمل ہے لیکن آپ کے اس نظریے پر یہ قول حق و صدق پر مشتمل نہ ہو سکے گا (کیونکہ آپ تو ظاہر و باطن میں فرق کو تسلیم کرتے ہیں)۔

اشاعرہ کے بطلان کی چھٹی وجہ:

وہ آیات ہیں جو بیان کرتی ہیں کہ خود کفر و عصیان کرنے والے اعتراف کرتے ہیں کہ یہ کفر اور تمام نافرمانیاں ہم نے خود کئے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس پر گواہ ہے، فرمایا:

(۱) مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ﴿۴۴﴾

(سورۂ مدثر، آیت ۴۲ تا ۴۴)

تمہیں کس چیز نے جہنم پہنچایا ہے تو کہیں گے ہم نمازی نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہیں دیتے تھے۔

(۲) كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ﴿۸﴾ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا

وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ (سورۂ ملک، آیت ۸ تا ۹)

ترجمہ: جب بھی اس دوزخ میں کوئی گروہ پھینکا جائے گا تو دوزخ کے نگہبان ان سے سوال کریں گے کیا تمہارے پاس کوئی عذابِ خدا سے ڈرانے والا نہیں آیا تھا، تو وہ جواب دیں گے ہاں، یقیناً ہمارے ہاں عذاب سے ڈرانے والا تو آیا تھا لیکن ہم نے اس کو جھوٹا قرار دے دیا تھا اور ہم کہتے تھے اللہ تعالیٰ نے کوئی پیغام نازل نہیں کیا۔

(۳) وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿٦٧﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿٦٨﴾ (سورۂ احزاب، آیت ۶۷ تا ۶۸)

ترجمہ: کافروں نے کہا: ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی اطاعت کی تو انہوں نے ہمیں راہ سے گمراہ کر دیا، اے ہمارے پروردگار! ان سب کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت نازل کر۔

اشاعرہ کے بطلان کی ساتویں وجہ:

وہ آیات ہیں جو بیان کرتی ہیں کہ شیطان اعتراف کرے گا کہ اس نے کفار کو گمراہ کیا تھا اور باری تعالیٰ بھی اس امر پر گواہی دیتا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:

(۱) وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ؕ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ

(سورۂ ابراہیم، آیت ۲۲)

ترجمہ: اور شیطان اس وقت کہے گا جب سارا معاملہ تمام ہو جائے گا (یعنی نافرمانیاں اور معصیت ہو چکی ہو گی) کہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں سے حق کا وعدہ کیا تھا اور میں نے تم سے جو وعدہ کیا تھا تو میں نے اس کی خلاف ورزی کی اور مجھے تم پر کوئی تسلط اور غلبہ نہ تھا مگر یہی تھا کہ میں نے تم سب کو دعوت دی تو تم نے میری دعوت کو قبول کر لیا پس اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

(۲) اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ؕ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿٢٥﴾ (سورۂ محمد، آیت ۲۵)

ترجمہ: جو لوگ دین سے مرتد ہو گئے ہیں (دین حق کو چھوڑ کر پچھلے باطل دین کی طرف چلے گئے ہیں) جب کہ ان کیلئے ہدایت روشن ہو چکی تھی شیطان نے ان کے سامنے ان کے قبیح اعمال کو خوبصورت بنا کر پیش کر دیا تھا اور ان کی امید و آرزو کو بہت دراز کر دیا تھا۔

اس آیت میں مشہور قرائت کے مطابق

"أَمْلٰی"

کا صیغہ واحد مذکر غائب از فعل ماضی معروف ہے اور اس کی ضمیر شیطان کی طرف راجع ہے اور غیر مشہور قرائت کے مطابق "أُمْلِیْ" باب افعال سے فعل مضارع کا صیغہ واحد متکلم ہے اور اس کا قائل و متکلم خدائے تعالیٰ ہے اس صورت میں معنی یہ ہے کہ "میں نے ان لوگوں کو مہلت دے دی" اور ایک تیسرا احتمال یہ ہے کہ یہ لفظ "أُمِلِّیَ" فعل ماضی مجہول کا صیغہ ہے یہ بھی ایک قرائت میں موجود ہے اور اس صورت میں اس کا اسناد حق تعالیٰ کی طرف ہوگا اور معنی یہ ہوگا کہ "ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت دے دی گئی"۔ واللہ اعلم۔

ان آیات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اشاعرہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو رد کر دیتے ہیں اور شیطان کو ان تمام قبیح اقدامات سے منزہ اور پاک قرار دے دیتے ہیں اور اس کی مدد کرتے ہیں کہ کفار کو گمراہ کرنے والا اقدام تو درحقیقت اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اس کا یہ ارشاد کہ

"اَلشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ"

شیطان نے ان کو بھٹکایا اور ورغلایا ہے،

سارا جھوٹ اور کذب ہے، شیطان تو بالکل بے قصور ہے (سارا قصور تو خداوند تعالیٰ کا ہے) (نعوذ باللہ من ذالک)۔

اشاعرہ کے بطلان کی آٹھویں وجہ:

وہ آیات ہیں جن میں فعل کے اسناد اور ایجاد کی نسبت، بندگان کی طرف دی گئی ہے جس سے روشن ہوتا ہے کہ انسان اپنے فعل کا فاعل اور موجد خود ہی ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:

(۱) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ (سورۂ بقرہ، آیت ۷۹)

ترجمہ: پس پھٹکار اور ملامت ہے ان لوگوں کیلئے جو کتاب کو (اپنی طرف سے بنا کر) اپنے ہاتھوں سے لکھ دیتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ یہ از جانب خداوند متعال ہے۔

(۲) ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (سورۂ انفال، آیت ۵۳)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا کفار کے ساتھ یہ سلوک اسلئے ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم پر کوئی نعمت نازل کرتا ہے تو اس کو تب تک تبدیل نہیں کرتا جب تک وہ قوم والے اپنے حالات کو خود تبدیل نہیں کرتے۔

(۳) كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿۲۱﴾ (سورۂ طور، آیت ۲۱)

ترجمہ: ہر انسان اپنے کئے ہوئے اعمال کا گروی ہے۔

(۴) اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ ﴿ (سورۂ غافر، آیت ۱۷)

ترجمہ: آج (بروزِ جزاء) ہر نفس کو ان افعال کی جزاء دی جائے گی جو اس نے خود کئے ہیں۔

اس آیت میں "کسب" کے لفظ سے مراد ایجاد افعال ہے، نہ وہ معنی جو اشاعرہ نے "کسب" کے مفہوم کیلئے خود ہی گھڑ لیا ہے۔ دراصل یہ اختراع ابوالحسن اشعری نے کی پھر اس کے دور سے آج تک کی اس دراز مدت میں اشاعرہ کے فضلاء اسی پر اندھی تقلید کرتے چلے آرہے ہیں اور جس قدر بھی اس کا صحیح مفہوم بنانے کے لئے انہوں نے ہاتھ پاؤں مارے ہیں کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

ہمارے والد ماجد اعلی اللہ مقامہ کا اس پر تبصرہ:

آپ نے اپنی کتاب صوارم میں فرمایا: کہ ابوالحسن اشعری اپنی کم عقلی کی وجہ سے کچھ ایسے شبہات کا شکار ہوا جن کا حل پیدا نہ کرسکا اگر وہ عترت وآل رسول علیہم السلام کے افضل واکمل بزرگان میں سے کسی ایک کی خدمت میں حاضر ہوتا اور ان اشکالات کا حل دریافت کرتا تو اس مشکل سے چھٹکارا حاصل کر لیتا لیکن اس نے ایسا نہ کیا اور ان اشکالات سے متاثر ہوکر اس بات کا قائل ہوگیا کہ بندوں کے تمام افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہے پھر جب چند ایک اہل درایت نے اسے متنبہ کیا کہ بندوں کے دوقسم کے افعال ہوتے ہیں اختیاری اور اضطراری اور ان دونوں میں فرق ہے تو اس نے اپنے قولِ فاسد کی اصلاح کیلئے ایک نئی اختراع بنام "کسب" ایجاد کر لی اور اس کا معنی ومفہوم سمجھے بغیر اسے ان دونوں افعال کے درمیان "فارق" تسلیم کرلیا اور اپنے مریدوں کو اس کی تحقیق میں ایسا سرگردان کر دیا کہ وہ قیامت تک اس میں بھٹکتے رہیں گے جن میں سے بعض کی گفتگو نقل کی جاتی ہے۔

صاحب مواقف کی گفتگو پر تبصرہ:

صاحب مواقف کہتے ہیں کہ انسان کے اختیاری اور اضطراری افعال کے درمیان فرق تسلیم ہے لیکن ہمارے خیال میں اس فرق کا نام کسب ہے اور ہم اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔

سبحان اللہ: عجیب تقلید ہے شیخ ابوالحسن اشعری کی وہ جو کچھ ارشاد فرمادیں گو اس کا معنی سمجھ نہ آئے پھر بھی اس کو تسلیم کرنا ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ خود جناب ابوالحسن اشعری صاحب کو بھی اس کا معنی ومفہوم سمجھنے میں کامیابی نہیں ہوئی (انتہیٰ)۔

صاحب مواقف نے جو بات تسلیم ہونے کی فرمائی ہے یہ بات فقط احکام تعبدیہ میں شارع کی بہ نسبت تسلیم کرنا صحیح

ہے کہ اگر ہمیں ان تعبدی احکام کی حکمت پر آگاہی نہ ہوتو بھی اس لئے تسلیم کرتے ہیں کہ شارع حکیم مطلق ہے اور حکیم کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ ان احکام میں ضرور کوئی حکمت و مصلحت موجود ہے اگر چہ ہمیں معلوم نہیں لیکن ایسے افراد جن سے خطا اور غلطی ممکن ہو وہ اگر کوئی ایسا کلمہ زبان پر لائیں جس کا کوئی محصول و مفہوم نہ بنتا ہو، عقل و نقل اس کی مساعدت نہ کرتے ہوں تو کیسے صحیح ہے کہ انسان اس کلمہ کے سامنے دل و دماغ کو جھکا دے اور اس کے صحیح ہونے پر عقیدہ رکھ لے اور اگر ایسا اقدام جائز ہوسکتا تھا تو پھر جب روافض سبّ کرتے ہیں تو وہاں بھی تسلیم کرلیں کہ اگر چہ عقل اس اقدام کی حقیقت سے آشنا نہیں لیکن یہ بھی صحت و مصلحت سے خالی نہیں۔ پس سوال یہ ہے کہ جب آپ کو "کسب" کی معرفت نہیں، اس کا مفہوم معلوم نہیں تو آپ کس بنیاد پر اس کے گرویدہ ہو گئے ہیں؟ ایسے میں تسلیم ہونا صحیح نہیں، تنقید کرنا صحیح ہے۔

ہمارے والد علام مرحوم اعلی اللہ مقامہ فرماتے ہیں:

اگر ان کے شیخ اشعری فرما دیتے کہ اختیاری اور اضطراری افعال کے درمیان فرق ہاتھی والی خرطوم (سونڈ) ہے تو بھی ان کے مرید تسلیم کر لیتے اور کہتے یقیناً ایسا ہی ہے لیکن ہمیں اس خرطوم کا معنی معلوم نہیں۔ اے کاش! اشعری ابتداء سے ہی یوں کہہ دیتا کہ یہ بداہۃً معلوم ہے کہ ان کے درمیان فرق ہے لیکن وہ فرق کیا ہے؟ یہ مجھے معلوم نہیں، تو یہ بات درست ہوتی لیکن بظاہر وہ ایسے اعتراف کو اپنی کسر شان خیال کرتا تھا اسلئے اس مہمل نظریہ کو اختراع کر کے کام نکالنے کی کوشش کی۔

شارح مواقف اور علامہ قوشجی کی ناکام کوشش:

اس کے مریدان میں سے شارح مواقف اور علامہ قوشجی نے اس لفظ کا معنی مراد تعیین کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگے کہ "کسب" سے مراد قدرت غیر موثر اور فعل واقع کے درمیان والی مقاومت ہونا ہے جبکہ ان دونوں کا خالق خدا ہے۔ ہم کہیں گے کہ بات کوئی نئی تو نہ بن سکی وہی آش اور وہی کاسہ، جب قدرت بھی مخلوق خدا ہے اور فعل بھی اور قدرت فعل میں اصلاً موثر نہیں تو وہی جبر و اضطرار بنا جس جبر و اضطرار سے آپ فرار کرنا چاہتے ہیں۔

مولوی کمال الدین حنفی کا تبصرہ:

یہی وجہ ہے کہ مولوی کمال الدین حنفی اپنی کتاب عروۃ الوثقیٰ میں کہتے ہیں کہ اشاعرہ کے نظریہ کے مطابق ظلم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف لازم آجاتی ہے کیونکہ یہ لوگ ایک قدرت وہمیہ کے قائل ہیں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ قدرت بھی جبر کی کفو و ہمسر ہے۔

شرح مواقف کے بعض محشی:

کہتے ہیں: ابوالحسن اشعری کا قول سفسطہ ہے یعنی ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے، بہرہ قوت سماعت رکھتا ہے لیکن اس سے سن نہیں سکتا، نابینا قوت بصارت رکھتا ہے لیکن اس سے دیکھ نہیں سکتا۔

فخرالدین رازی کی کوشش:

فخرالدین رازی نے "کسب" کا معنی واضح کرنے میں دیگر تمام ماموین سے زیادہ وقت سے کام لیا ہے اور یوں گویا ہوئے ہیں: کہ نفس فعل تو باری تعالیٰ سے صادر ہوتا ہے لیکن صفت فعل بندہ سے صادر ہوتی ہے مثلاً نماز اور قتل یہ دونوں فعل حرکت کی قسم ہیں لیکن دونوں میں باہمی امتیاز ہے اس طرح کہ ایک اطاعت ہے اور دوسرا معصیت پس اصل حرکت تو حق تعالیٰ کا فعل ہے اور اس کی طرف سے ہوتی ہے لیکن اس کی خصوصیت (اطاعت یا معصیت ہونا) یہ بندہ کی طرف سے ہے (یہ بات ان سے شارح المقاصد نے نقل کی ہے)۔

علامہ والد ماجدؒ فرماتے ہیں:

فخر الدین رازی یہ نہ سمجھ سکے کہ اشاعرہ کے سارے تکلفات اور حیلہ گری فقط اس لئے ہے کہ تعدد خالق لازم نہ آئے اور چونکہ رازی کے مطابق فعل کے وصف کی تخلیق بندہ کی طرف سے ہے تو کیا اس سے آپ کے امام ابوالحسن اشعری کی کوشش نامشکور اور لاحاصل ہونے سے محفوظ ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ چنانچہ والد علام مرحوم نے اس خیال کو بھی اور اس کے متعدد احتمالات کو متعدد وجوہ کے ساتھ مردود قرار دیا ہے (اور ثابت کیا ہے کہ اس سے بھی آپ کی مشکل آسان نہیں ہوتی)۔

کچھ دیگر صاحبان نے اس "کسب" کی تفسیر طبعی میلان سے کی ہے لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ اگر یہ بھی خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہے تو اختیاری و اضطراری کے درمیان فرق پیدا کرنے میں موثر نہیں اور اگر بندہ کی طرف سے ہے تو فعل کے خلق کرنے کو غیر خدا کی طرف نسبت دینا پڑے گی (جو تمہیں منظور نہیں ہے)۔

فضل بن روز بہان اصفہانی کی ناکام محنت:

اس نے بھی اسلاف کی حیرانی و سرگردانی کا علاج کرنے کیلئے یہ راہ نکالی کہ چونکہ قدرت و اختیار نے بندے کو فعل ایجاد کرنے پر آمادہ کیا ہے اور اسے یہ استعداد ملی ہے تو اگرچہ اس کے اثر نے قدرت و ارادۂ الٰہیہ کے قہر و جبر کے سبب ظہور نہیں پایا لیکن اس استعداد کے سبب بندے کی قدرت اور فعل کے درمیان ایک خاص قسم کا تعلق پیدا ہو گیا ہے اسی

تعلق کو شیخ نے کسب کا نام دے دیا ہے اور چونکہ بندہ اس فعل کا محل ہوتا ہے اسلئے ثواب وعقاب کا دارومدار بھی یہ محل قرار پاتا ہے جیسے کہ خشک لکڑی خشکی کا محل ہونے کی وجہ سے آگ میں جلتی ہے اسی طرح خالق کائنات کے فعل کفر ومعصیت کے محل کو جہنم کی آگ میں جلایا جائے گا (یعنی کفر ومعصیت والا فعل اللہ تعالیٰ کا فعل ہے) اور چونکہ یوں اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ خشک ایندھن کس گناہ میں جلتا ہے؟

اسی طرح یہ سوال بھی نہیں ہوسکتا کہ حق تعالیٰ نے کیوں کفر کو کافر میں خلق کیا ہے اور پھر اسے اس کفر کے سبب ابدالآباد تک جہنم میں جلاتا ہے خود ہی اس کو استعداد وقوت بخشتا ہے اور پھر خود ہی اس کے آثار ظاہر کرتا ہے (اس کلام کا خلاصہ تمام ہوا)۔

مختصر یہ کہ ان حضرات کا کلام اس مقام میں انتہائی مضطرب اور کمزور ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہیں کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ، ہر کوئی اپنے فہم کے مطابق "کسب" کا معنی تراشنے کی زحمت کرتا ہے اور پھر کوئی دلیل و برہان قائم کئے بغیر دور کی کوڑی لانے کی سعی کرتا ہے لیکن ان کی کوئی کوشش بارآور ثابت نہیں اور جبر کے الزام سے خلاصہ پانے اور اس عار سے دامن بچانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

اس کا جواب:

ہمارے والد ماجد علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب "صوارم" میں فضل بن روز بہان کے جواب میں متعدد وجوہ بیان کی ہیں جن کا خلاصہ پیش ہے۔

عجیب بات ہے کہ اصفہان کے اس بے وقعت شخص نے کہا: کہ بندوں کو فقط عصیان کا محل ہونے کی وجہ سے عذاب دینا ایک مستحسن اقدام ہے اور پھر اسے اس ایندھن پر قیاس کرتا ہے جسے زیادہ خشک ہونے کے سبب نذر آتش کردیا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کسی کو حق نہیں یہ سوال کرے کہ اس ایندھن کو کیوں جلاتے ہو لہٰذا اگر خدا تعالیٰ کسی کافر کو جلائے تو اس پر بھی استبعاد نہیں ہونا چاہئے اور اس سوال کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس کافر کو کیوں جلا رہے ہو؟

حالانکہ حس وادراک کے حامل حیوانات کے عذاب دینے کو ایندھن جلانے پر قیاس کرنا جو کہ جمادات میں سے ہے ایسا قیاس ہے کہ ابلیس بھی اس سے عار محسوس کرے حالانکہ قیاس کا بانی ابلیس ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جو انسان تدلیس (دھوکہ دہی) وتلبیس (فریب کاری) کو اپنا شعار بنا لے وہ ابلیس سے بھی بازی لے جاتا ہے اور شیطنت ومکاری میں بڑا ماہر ہوجاتا ہے۔

حالانکہ ان کی توجیہات کا انتہائی رکیک اور کمزور ہونا واضح ہے۔ حنفیہ نے ارادہ کو مخلوق انسان قرار دے کر چاہا ہے کہ جبر سے چھٹکارا حاصل ہوجائے لیکن ان کے اس نظریئے کو طاق نسیان کے حوالے کردیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی

کسی چیز کا خالق نہیں ہوسکتا اگر ایک بندہ ارادہ کا خالق ہوسکتا ہے تو اس کی طرف کسی فعل کے خالق ہونے کی نسبت دینا کیوں غلط ہے؟ (لیکن وہ لوگ یہ بات تسلیم نہیں کر سکتے)۔

ان کی طرف سے پیش کردہ آیات پر ایک نظر:

واضح باد کہ انہوں نے اس نظریئے پر بہت سی آیات پیش کی ہیں جو ان کے خیال میں جبر جیسے قبیح اور رسوا کن نظریئے پر داعی بنتی ہیں اور رب العالمین جیسی عادل ہستی کے حق میں انواع واقسام کے ظلم وعدوان اور قبیح اقدامات کو جائز قرار دیتی ہیں۔

ان آیات کی دو قسمیں ہیں:

پہلی قسم میں وہ آیات ہیں جو ان کیلئے شبہات اور مغالطات کی حیثیت رکھتی ہیں اگر ان آیات کی اس تفسیر کو اتمام مان لیا جائے جو اشاعرہ لوگ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جو قادر علی الاطلاق ذات ہے اس کیلئے قدرت واختیار کا راستہ مسدود ہوجاتا ہے۔

(۱) مثلاً وہ کہتے ہیں: اگر وہ فاعل مختار ہو تو اس کیلئے فعل یا ترک کو ترجیح دینے کیلئے مرجح کی ضرورت ہوگی چنانچہ راجح کا وجود ثابت نہ ہوگا تو مرجوح کو وجود میں لانا محال ہوجائے گا اور انسان اپنے عمل میں مجبور ہوجائے گا۔

(۲) ایک اور مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں: کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات ان کے افعال کے وقوع سے قبل سے جانتا ہے اسے علم ہے کہ فلاں شخص سے فلاں وقت میں فلاں نیک یا بد عمل صادر ہوگا اب اس کے خلاف ہونا محال ہے ورنہ حق تعالیٰ کے علم کا غلط ہونا اور اس کا جاہل ہونا لازم آتا ہے۔

اور یہ دونوں تقریریں بعینہٖ خود افعالِ باری تعالیٰ کے بارے میں بھی جاری ہوتی ہیں لہٰذا انہیں چاہئے کہ ذاتِ خداوندی کے بارے میں بھی یہی نظریہ نہیں کہ وہ بھی قدرت واختیار نہیں رکھتا بس وہ ایک عاجز اور مجبور ذات ہے (کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے)

ذهب الحمار يستفيد لنفسه * قرنا ناب رساله اذنان

ترجمہ: "گدھا گیا تھا کہ اپنے لئے سینگ لائے گا جب واپس آیا تو دونوں کان بھی نہ تھے۔"

یہ اشاعرہ جانتے تھے کہ انسان سے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ قدرت واختیار سلب کریں لیکن نوبت باینجا رسید کہ انہیں خود باری تعالیٰ کی قدرت واختیار کی نفی کرنا پڑ رہی ہے جو فحش ترین غلطی ہے۔

دوسری قسم میں ایسی آیات وروایات متشابہات ہیں جن کا صحیح معنی ومفہوم سمجھنے سے یہ لوگ قاصر رہے ہیں اور اشتباہ

کا شکار ہو گئے ہیں بلکہ اپنی قلبی کجی کی وجہ سے ایک فاسد معنی اور غلط تاویل پر بنیاد رکھ لی ہے اور اس آیت کریمہ کا مصداق بن گئے ہیں۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ
(سورۂ آل عمران، آیت ۷)

اور جن لوگوں کے قلوب میں کجی ہوتی ہے وہ اس فرمان کی اتباع کرتے ہیں جو متشابہ ہوتا ہے اسلئے کہ یہ لوگ فتنہ کے طلب گار اور تاویل کے خواہشمند ہیں۔

آیت سے استدلال:

(۱) اس قسم کی آیات میں سے ایک آیت یہ ہے:

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (سورۂ ابراہیم، آیت ۴)

ان لوگوں نے اس آیت کا ظاہری معنی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ خداوند عالم جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت کر دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ کی حقیقت تک وہ رسائی حاصل نہ کر سکے اور یوں گمان کرلیا کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے بندوں کے دلوں میں ہدایت، ضلالت یا کفر، ایمان پیدا کر دیتا ہے اور انکار و جحود یا ایمان و تصدیق کے کلمات بھی ان بندوں کی زبانوں پر خود ہی جاری فرما دیتا ہے اور پھر خود ہی ان بندوں کو اس کی سزا و جزاء اور عذاب و ثواب دیتا ہے۔

وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ (سورۂ فصلت، آیت ۲۳)

تمہارا اپنا گمان ہے جو تم نے اپنے رب کے بارے میں بتایا ہے اس ظن نے تمہیں تباہ کر دیا ہے پس تم سب خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گئے ہو۔

یہ لوگ خداوند کریم و قہار کے بارے میں کس قدر بدگمانی کا شکار ہو گئے اور اس کی وجہ سے اس ذات قدوس پر انواع و اقسام کے ظلم کے اقدامات کرنا جائز مان چکے ہیں (العیاذ باللہ۔۔۔ اللہ تعالیٰ تو اس قسم کی باتوں سے پاک اور بلند ذات ہے)۔

جواب:

اس آیت کریمہ سے ان کے استدلال کا جواب چند وجوہ پر مشتمل ہے۔

پہلی وجہ:

اگر ان کا مزعوم معنی صحیح مانا جائے تو کفر و ایمان پر سارے لوگ مجبور ہوں گے اور ایسے مجبور کفار کی مذمت ناروا ہوگی حالانکہ بہت زیادہ آیات میں کفار کی مذمت اور عتاب وارد ہے مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے!

(۱) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (سورہ بقرہ، آیت ۱۶)

ترجمہ: یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو خرید لیا تھا پھر ان کی یہ تجارت نفع آور ثابت نہ ہوئی اور یہ لوگ ہدایت یافتہ نہیں تھے۔

(۲) فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ (سورہ نساء، آیت ۱۶۰)

ترجمہ: پس ان یہودیوں کے ظلم کی بنا پر ہم نے جن پاکیزہ چیزوں کو حلال کر رکھا تھا ان پر حرام کر دیا۔

(۔۔۔۔ متعدد اشیاء) اور اس طرح مجبور مومنین کی مدح بھی غلط قرار پائیگی حالانکہ قرآن مجید میں بیشتر آیات میں مومنین و متقین کی تعریف اور ان کیلئے ثواب کا ذکر فرمایا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (سورہ بقرہ، آیت ۵)

ترجمہ: یہی وہ لوگ ہیں جو (آخرت میں) فلاح و کامیابی پانے والے ہیں۔

دوسری وجہ:

اس بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ظلم صریح کرنا لازم آئے گا کہ وہ خود کفار میں کفر پیدا کرتا ہے اور پھر اس کفر کی وجہ سے انہیں دوزخ کی آگ میں جلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کیلئے ظالم ہونا کیسے صحیح مانا جاسکتا ہے؟ جبکہ وہ خود قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (سورہ آل عمران، آیت ۱۸۲)

بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کبھی بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

لہذا تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مذکورہ آیت سے مراد ایسا معنی ہے جو بالکل صحیح ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کا ظالم ہونا لازم نہیں آتا اور ہم عنقریب وہ معنی واضح کریں گے۔

تیسری وجہ:

حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی مقامات پر گمراہ کرنے کی نسبت دیگر افراد کی طرف دی ہے چنانچہ سورہ یٰسین میں

یہ نسبت شیطان کی طرف دی ہے، فرمایا ہے:

(۱) وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ، (سورۂ یٰسین، آیت ۶۲)

ترجمہ: اور شیطان نے تم میں سے بہت زیادہ تعداد کو گمراہ کر دیا تھا۔

(۲) وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ (سورۂ طٰہ، آیت ۷۹)

ترجمہ: اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کر دیا تھا۔

(۳) وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (سورۂ طٰہ، آیت ۸۵)

ترجمہ: اور سامری نے ان لوگوں کو گمراہ کر دیا تھا۔

(۴) ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا (سورۂ نساء، آیت ۱۶۷)

ترجمہ: اور وہ کفار بہت سخت گمراہ ہو گئے۔

ان آیات میں شیطان، فرعون، سامری اور کفار کی طرف گمراہ کرنے کی نسبت دی گئی ہے چنانچہ یہ بات تو صحیح نہ ہوگی کہ اضلال (گمراہ کرنے کی نسبت خدا اور غیر خدا دونوں کی طرف حقیقت ہو کیونکہ یہ تبھی ہوسکتا ہے جب اللہ تعالیٰ اور مخلوقات دونوں ہی اضلال کے حقیقی فاعل ہوں جو بالاتفاق باطل ہے کیونکہ سارے شیعہ بھی قبیح فعل کا فاعل اللہ تعالیٰ کو تسلیم کرنا غلط قرار دیتے ہیں تو وہ بھی غیر خدا، مخلوقات خدا کو ان افعال کا حقیقی فاعل تسلیم نہیں کرتے لہٰذا گمراہ کرنے والے فعل کا فاعل (خدا و مخلوق خدا) دونوں کو تسلیم نہ کرنے پر اجماع مرکب ہے۔ پس یہ احتمال اجماع مرکب کے ذریعہ باطل ہو گیا اور بالآخر لامحالہ یہی نتیجہ نکلا کہ ان دو میں کسی ایک کی طرف نسبت حقیقی ہے اور دوسرے کی نسبت مجازی ہے اور یہ کہنا کیوں لازمی اور ضروری سمجھا جائے کہ اضلال کا حقیقی فاعل اللہ تعالیٰ ہے اور مخلوق خدا مجازی ہے جبکہ صحیح یہ ہے کہ معاملہ برعکس ہے یعنی حقیقی فاعل مخلوقِ خدا ہے اور خداوند تعالیٰ کی طرف یہ نسبت مجازاً ہوتی ہے۔

چوتھی وجہ:

ہدایت و اضلال کے معانی متعدد ہیں اور ہر معنی کا اپنا ایک مناسب مقام ہے اور ہر جگہ پر معنی مراد لینا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان معانی میں سے کچھ معانی کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا جائز ہے اور کچھ دیگر معانی کو حق تعالیٰ کی طرف نسبت دینا جائز نہیں بلکہ ان معانی کو شیاطین اور ان جیسے دیگر اغوا کنندگان کی طرف نسبت دینا مناسب اور جائز ہے۔ پس کس قدر حماقت و سفاہت ہے کہ جن معانی کی نسبت شیاطین کی طرف صحیح ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیا جائے اور شیاطین کو ان سے مکمل طور پر بری قرار دیا جائے لیکن جو لوگ عقل سے دست بردار ہو جائیں اور کہیں کہ دینی امور میں عقل کو مداخلت کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، ایسے لوگوں سے اس قسم کی بات بعید نہیں ہے۔

ہدایت وضلالت کے معنی:

ان الفاظ کے کئی ایک معنی ہیں:

معنی اول:

ہدایت وضلالت کا ایک معنی راہ پر لانا اور راستہ ہٹانا ہے، مولانا طبرسیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد
يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۶)
کا معنی ہے:
فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ عَنْ طَرِيْقِ الْجَنَّةِ اِذَا كَانُوْا مُسْتَحِقِّيْنَ لِلْعِقَابِ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى طَرِيْقِ الْجَنَّةِ فِي الْاٰخِرَةِ،
یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو عقاب کے مستحق ہوتے ہیں انہیں چاہتا ہے تو جنت کی راہ سے ہٹا دیتا ہے اور جن کو چاہتا ہے آخرت میں جنت کی راہ کی طرف لے جاتا ہے۔

معنی دوم:

فرمایا کہ اضلال کا ایک معنی ہے ہلاک کرنا، عذاب دینا، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہی معنی مراد ہے:
اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (سورۂ قمر، آیت ۴۷)
ترجمہ: بے شک مجرم لوگ ہلاکت اور عذاب جہنم میں ہوں گے
اور دوسری آیت میں یہی معنی ہے:
وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ۝ سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝ (سورۂ محمد)
ترجمہ: اور جو لوگ راہ خدا میں قتل کئے گئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو کبھی بھی تباہ اور باطل نہیں کرے گا ان کو اچھی جزاء کی طرف ہدایت کرے گا اور ان کے معاملہ کو درست کرے گا۔

پس علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں کہ زیر بحث آیت کا صحیح معنی یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید کے ذریعہ یا قرآن مجید میں پیش کردہ مثال کے ذریعہ ان لوگوں کو جو کفر کرتے ہیں ان کے کفر کے سبب جنت اور ثواب کی راہ سے ہٹا دیتا ہے اور جو لوگ ایمان اختیار کرتے ہیں ان کو ایمان کے سبب بہشت اور ثواب کی راہ پر لے آتا ہے۔

ابوعلی جبائی کہتے ہیں کہ اضلال بمعنی ہلاک کرنا و عذاب دینا قرآن مجید کی اس آیت سے ثابت ہوتا ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ (سورہ بقرہ، آیت ۲۶)

ترجمہ: "اور وہ اس کے ذریعہ ضلالت میں نہیں ڈالتا مگر صرف فاسق لوگوں کو۔"

آیت سے واضح ہو رہا ہے کہ اضلال سے قبل ایک فسق متحقق ہوتا ہے جو اضلال کا موجب ہوتا ہے اس متقدم فسق کو فعل خدا قرار نہیں دیا جاسکتا ورنہ تسلسل لازم آجائے گا کیونکہ اس آیت کے مطابق ہر اضلال فقط فاسق کیلئے ہوتا ہے اب اگر وہ فسق فعل خدا مانا جائے تا کہ ایک اضلال ہو تو اس سے قبل ایک دوسرا فسق ماننا پڑے گا جو اس فعل خدا کا سبب بنا اور وہ بھی اضلال بنے گا تو اس سے قبل ایک اور فسق موجود ماننا پڑے گا تو یہ تسلسل بن جائے گا اور اگر قبل ازیں فسق کا موجود ہونا قبول نہ کیا جائے تا کہ تسلسل نہ بن سکے تو پھر غیر فاسق کو اضلال کرنا لازم آئے گا جبکہ یہ بات اس حصر کے منافی ہے جو آیت میں موجود ہے (کہ اضلال تو فقط فاسقین کیلئے ہوتا ہے کسی غیر کیلئے نہیں) پس یہی ماننا پڑے گا کہ بندہ کا اپنا فعل خداوند تعالیٰ کے فعل کا سبب بنتا ہے یعنی بندہ فسق کرتا ہے تو اس پر اضلال مرتب ہوتا ہے اور یہ اضلال عذاب کرنا ہے اور جنت سے دوزخ کی طرف لے جانا ہے یعنی جو لوگ فاسق ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دیتا ہے اور دوزخ کی طرف لے جاتا ہے۔

معنی سوم:

ایک اور معنی سخت امتحان و آزمائش لینا ہے یعنی جس کسی سے سخت آزمائش لی جاتی ہے اور اس کے پایۂ ثبات میں لغزش آنے لگتی ہے جیسے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے زمانے میں جب حضرت ہارون علیہ السلام کو خلیفہ و وصی بنا کر گئے تو سامری کے گوسالہ والے فتنے کی وجہ سے امت موسیٰ علیہ السلام کے ہزاروں افراد مرتد ہو گئے اور اسی طرح حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کرامت میں جب حضرت علی علیہ السلام کو شاہِ ولایت قرار دیا گیا اور وصی بنایا گیا تو اس امت کے سامری اور گوسالہ کے سبب صغیر و کبیر افراد کا ایک جم غفیر خدا و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے سرتابی کرتے ہوئے دین حق سے منحرف ہو گیا

الا من عصمه الله

فقط وہی لوگ محفوظ رہے جن کو اللہ تعالیٰ نے حفاظت میں رکھا اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ (سورہ عنکبوت، آیت ۲)

ترجمہ: کیا لوگوں نے یہ گمان کرلیا ہے کہ وہ فقط یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لائے ہیں چھوڑ دیئے جائیں گے اور لوگوں کی آزمائش نہ ہوگی۔

چنانچہ جب ہماری امت کو اس سخت و سنگین امتحان و آزمائش میں ڈالا گیا تو اس گروہ کے ہر بدبخت کے قدم ڈگمگا گئے (اور وہ منحرف ہو گئے)، چنانچہ علامہ طبرسیؒ فرماتے ہیں:

جب محبت و زحمت سخت ترین ہوتی ہے تو راہیں گم ہوتی ہیں اور لوگ لغزش کا شکار ہوتے ہیں اس کو ضلال کہتے ہیں اور جب امتحان آسان ہوتا ہے تو لوگ راہ حق پر ہوتے ہیں اور اسے ہدایت کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۚ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۶)

اس بارے میں ایک احتمال یہ ہے کہ یہ کفار کے قول کی حکایت ہے اور ظاہراً یہی ہے اس احتمال کے مطابق کوئی اشکال قائم نہیں ہوتا (کہ کفار تو ایسی غلط باتیں کرتے رہتے ہیں) اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ کفار کا قول نہیں، قول خداوند متعال ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ جب قرآن مجید نازل ہوا اور اس نے ان کے بارے میں حق کی مثال قائم کی تو کفار نے اس میں تردید کی اور انکار کر دیا

اور یہ کفر چونکہ نزول قرآن کے ساتھ ساتھ ظہور پذیر ہوا تو اب یہ بات صادق آنے لگی کہ وہ لوگ قرآن کے نزول کے سبب کافر ہوئے لیکن انہوں نے قرآن کا انکار کیا تو کافر ہوئے اور ادھر اہل ایمان نے قرآن کی تصدیق کی تو یہ بات صادق آئی کہ اہل ایمان قرآن مجید کے سبب راہ راست پر آ گئے کیونکہ اضافت معمولی اور ادنیٰ قسم کی ملابست کے ساتھ بھی جائز ہوتی ہے اسلئے آیت میں فرمادیا گیا۔ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔

معنی چہارم:

ایک اور معنی یہ ہے کہ حق تعالیٰ لطف و کرم فرمانے والا ہے جو ایمان کی صلاحیت رکھتے ہیں تو اس لطف کے سبب وہ ایمان کے زیادہ قریب آجاتے ہیں اور جن افراد میں جاہلیت راسخ ہو جاتی ہے وہ الطافِ کبریائی کے لائق نہیں رہتے تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور ان سے اعراض کر لیتا اور بے توفیق چھوڑ دیتا ہے اور جو نوازشات مومنین کرام کیلئے ہوتی ہیں انہیں ان سے دور رکھتا ہے اور الطاف و مراحم سلب کر لیتا ہے لیکن انہیں اضطرار نہیں ہوتا۔ پس خداوند متعال کی تائید کے ساتھ ایمان سے مشرف ہوتے ہیں اور جنت کے ثوابوں پر فائز ہوجاتے ہیں اور کفار کو چونکہ مالک کائنات قہری طور پر منع نہیں کرتا وہ اپنے سوء اختیار کے سبب کفر و انکار میں گرفتار ہوجاتے ہیں اور عذابِ جہنم کے مستحق قرار پاتے ہیں چونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۵۶)

ترجمہ: دین میں کوئی مجبور کر دینے والی بات نہیں ہے۔

اسلئے اللہ تعالیٰ مومنین کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کرتا اور نہ ہی کفار کو کفر کرنے پر مجبور کرتا ہے:

ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ (سورہ ص، آیت ۲۷)

ترجمہ: یہ ان لوگوں کا گمان ہے جو کافر ہیں۔

یعنی یہ گمان کہ اللہ تعالیٰ مومنین کو ایمان پر اور کفار کو کفر پر مجبور کرتا ہے یہ کافروں کا گمان ہے یہ حق والوں کا عقیدہ نہیں ہے۔

یہ ہیں وہ معانی جو اللہ رب العالمین کی شان کے شایان ہیں اور ہر فعل کی نسبت اس کے فاعل کی طرف صحیح ہے اور اضلال کے چند ایک معانی ایسے ہیں جو پروردگار عالم کے شان کے لائق نہیں۔ مثلاً:

(۱) اضلال بمعنی تغلیط (غلط باتیں کرنا)

(۲) اضلال بمعنی تلبیس (دھوکہ دینا)

(۳) اضلال بمعنی تمویہ (گمراہ کرنا)

(۴) اضلال بمعنی تشکیک (شک میں ڈالنا)

(۵) اضلال بمعنی اغواء (ورغلانا)

(۶) اضلاء بمعنی اغراء بالقبیح (بری بات پر اکسانا)

یہ سب معانی خالق کائنات کے شایان شان نہیں ہیں بلکہ یہ تو شیاطین جن و انس کی شان کے لائق ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات اسی بات پر معمول ہیں۔

(۱) وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ (سورۂ طہٰ، آیت ۷۹)

ترجمہ: اور فرعون نے اپنی قوم کو غلط راہ پر لگایا۔

(۲) وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ (سورۂ طہٰ، آیت ۸۵)

ترجمہ: اور سامری نے اس قوم کے افراد کو دھوکہ دیا۔

(۳) وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا، (سورۂ یٰسین، آیت ۶۲)

ترجمہ: اور اس شیطان نے تم میں سے ایک کثیر تعداد کو گمراہ کر دیا۔

پس اس قسم کے اضلال کو ذات ایزد متعال کی طرف نسبت دینا کسی بھی عقل مند اور دانشمند کے نزدیک ممکن نہیں ہے۔ اس قسم کی ناپسندیدہ خصلت اور مکاری کرنا شیطان اور اس کے تابعین کی شان کے مطابق ہیں اور وہی اغواء کرتے اور گمراہ کرتے ہیں۔

تعجب انگیز بات اور لطیفہ یہ ہے کہ اگر ان معانی میں اضلال استعمال ہو تو بھی مجبور کر دینے کو مستلزم ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں شیطان کے زبانی منقول ہے کہ وہ آخرت میں یوں کہے گا:

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ، فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا

اَنْفُسَكُمْ ۔ (سورۂ ابراہیم، آیت ۲۲)

ترجمہ: مجھے تم پر کوئی تسلط حاصل نہ تھا مگر یہ تھا کہ میں نے تم کو دعوت دی تو تم نے میری بات کو مان لیا لہٰذا اب مجھے ملامت مت کرو، اپنی ملامت کرو۔

پس جو اجباری اضلال کو خداوند عالم کی طرف نسبت دیتے ہیں یہ اس شیطانی اضلال سے بھی چند درجہ بلند ہیں،

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (سورۂ توبہ، آیت ۳۰)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ان کو مارے یہ کیا کیا جھوٹ باندھتے ہیں؟

خلاصہ:

اور ان کے مزعومہ کے مطابق شیطان معذور اور پروردگار عالم کے خلاف حجت تمام ہے۔ پس عاقل ومنصف لوگوں کو چاہئے کہ اپنی آنکھوں سے تعصب کے پردے ہٹا کر بنظر انصاف جائزہ لیں اور اشاعرہ کے فاسد مذہب کے مفاسد کو ملاحظہ کریں اور دیکھیں کہ اہل البیتؑ کے شیعیان وموالیان کا عقیدہ کس قدر عظیم محاسن پر مشتمل ہے۔

آیا کفر ومعصیت کے خلق کرنے اور زندقہ وضلالت کی نسبت خداوند عالم کی طرف دینا اور اس کے بعد یہ بدگمانی کرنا کہ وہ حکیم وعلیم اللہ ضلالت واضلال ومعاصی وقبائح کا ارتکاب خود کرتا ہے لیکن خلافِ واقع اس فعل کو دیگر بندوں اور شیاطین کی طرف نسبت دے دیتا ہے اور پھر ان ناکردہ جرائم پر انہی کو ابدی عذابِ الیم اور نارِ جہنم میں جھونک دیتا ہے، کیا یہ صحیح عقیدہ ہے یا یہ اعتقاد صحیح ہے کہ حق تعالیٰ قادر علی الاطلاق وحکیم مطلق ہے۔

اس نے اپنے بندوں کو اعضاء وجوارح اور ان کی طاقتیں دیں، ان کو افعال پر قدرت واختیار عطا فرمایا، عقل وفہم کے نور سے نوازا، راہِ راست اور راہِ بد کی معرفت بخشی، رسولوں کو منصوب فرمایا، روشن دلائل کے ذریعہ وضاحت فرمائی، حقیقت امر کو ان پر روشن کیا، حجت پر حجت قائم کی، تاکیدوں پر تاکیدیں فرمائیں، ان کو ایمان اختیار کرنے کا مکلف بنایا، کفر وعدوان کے ترک کرنے کا حکم دیا، شریعت کے احکام پر اوامر ونواہی کے ذریعہ مامور ٹھہرایا اور قرآن میں ارشاد کیا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورۂ ذاریات، آیت ۵۶)

ترجمہ: اور میں نے تمام جن وانس کو نہیں پیدا کیا مگر اسلئے کہ وہ میری عبادت کریں۔

لیکن اس سلسلہ تکالیف کی غرض وغایت اپنی مخلوق کا امتحان لینا اور آزمائش کرنا ہے۔ نیک وبد کی سب کے سامنے تمیز کرنا ہے، تاکہ تکلیف دینے اور حجت قائم کرنے کے بعد جو کوئی واجب الادغان فرامین کی اطاعت کرے وہ نیک جزاء کا مستحق قرار دیا جائے، اس حسن اختیار کے باعث ابدی اور دائمی اخروی ثواب پر فائز ہو سکے، اور جو کوئی اطاعت

کے جادۂ مستقیم اور راہِ حق سے منحرف ہو جائے اور خلاف ورزی کرنے لگے تو اسے شامت اعمال و پستی خصال کا مستوجب ومورد عقاب قرار دے کر متعدد اقسام کے عذاب ونکال کا شکار کر دیا جائے جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۞ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۞ (سورۂ زلزلت، آیت ۷ تا ۸)

ترجمہ: پس جوشخص ذرہ کے وزن برابر نیکی کرے گا وہ اس عمل خیر کو دیکھے گا اور جوشخص ذرہ کے وزن برابر برائی کرے گا وہ اس برے عمل کو بھی دیکھے گا۔

اللہ تعالیٰ توفیق عطا کرتا ہے یا سلب توفیق کرتا ہے:

اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف کرے گا چونکہ اس نے دارِ دنیا میں آزمائش کو مطمع نظر قرار دیا ہے اسلئے کسی کو کفر کرنے یا ایمان لانے پر مجبور نہیں کرتا، نہ ہی اس بارے میں ظلم واکراہ وقہر سے کام لیتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے امتحان کا تقاضہ پورا نہیں ہوسکتا ہاں البتہ ہمارے گذشتہ بیان کے مطابق ہدایت یا ضلالت کے اسباب بعیدہ اس کی طرف سے ظہور پذیر ہوتے ہیں یعنی جو حق کو اختیار کرنے کی صلاحیت واستعداد رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ترغیب دینے، برانگیخت کرنے کیلئے توفیقات والطاف جاری فرماتا ہے اور موانع کو دور کر کے ان کی مساعدت فرماتا ہے لیکن جو اپنی خبیث طبیعت اور سوء نیت کے سبب حق سے دور تر ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سے اپنے الطاف ونوازشات کو سلب کر کے رسوائی کی راہ پر ڈال دیتا ہے، ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے (اور توفیق نازل نہیں کرتا)۔

پس چونکہ اللہ تعالیٰ توفیق دینے یا سلب کرنے والا ہے اسلئے بعض اوقات اضلال جیسے فعل، یا ہدایت بمعنی ایصال کو خود اپنی طرف مجازی طور پر نسبت دے دیتا ہے اور کلام عرب میں اس قسم کی مجازی نسبت معمولی تعلق اور ادنیٰ ملابست کے ساتھ واقع ہوتی رہتی ہے مثلاً کہا جاتا ہے

بَنَى الۡاَمِيۡرُ الۡمَدِيۡنَةَ

کہ حکمران نے شہر بنایا، حالانکہ شہر کو بنانے والے درحقیقت معمار اور مزدور ہوتے ہیں نہ کہ حکمران لیکن چونکہ اس کے حکم سے بنایا گیا ہوتا ہے اسلئے نسبت اس کی طرف کر دی جاتی ہے یا مثلاً کوئی مالک اپنے کسی نافرمان غلام سے کسی مصلحت کے تحت اعراض کر لیتا ہے تو عوام یوں کہہ دیتے ہیں کہ اس مالک نے اپنے اس غلام کو ایسے ناشائستہ افعال پر لگا دیا ہے حالانکہ ان غلط افعال کو اس غلام نے اپنے اختیار کے ساتھ انجام دیا ہوتا ہے۔

پس پروردگار عالم اپنے بندوں کے افعال میں مذکورہ حد تک مداخلت کرتا ہے جو کوئی ممنوع امر نہیں بلکہ ایسا کرنا مصلحت وحکمت کے عین مطابق ہے کیونکہ مستحقین کی تائید اور غافلین کی تنبیہ مطلوب کے حصول میں تاکید کا موجب بنتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا اہل ایمان اور معصیت کے درمیان اس حد تک حائل ہونا ایک مستحسن اور بجا اقدام ہے اور

راسخین فی الکفر

افراد کے بارے میں ان کے کفر وضلالت کرنے پر چشم پوشی کرنا اور اعانت کو سلب کئے رکھنا کوئی نامناسب اور مستبعد اقدام نہیں ہے کہ اس سے اس ذاتِ اقدس کے ناراض ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی لئے وہ خود فرماتا ہے:

اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۷۸)

ترجمہ: تحقیق ہم ان کو مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ گناہ کرلیں۔

توفیق و اختیار:

واضح باد کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کو ایمان و اطاعت پر توفیق دینا اور اہل کفر کے عصیان کرنے پر ان سے سلب توفیق کرنا اس سے بندوں کا اختیار برطرف نہیں ہوجاتا اور حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو قدرت و طاقت عطا فرمائی ہے لیکن اگر وہ ان کو یہ قدرت نہ دیتا یا فی الحال ان سے یہ قدرت سلب کرلیتا تو ان بندوں کے ہاں طاقت و توانائی بحال نہ رہ سکتی اور اگر وہ لوگوں کو کفر یا ایمان لانے پر مجبور کرتا تو کوئی اس کے مقابلے میں دفاع نہ کرسکتا لیکن وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ جس کو صالح تر پاتا ہے اپنی توفیقات کے ساتھ اس کی اعانت کرتا ہے اور جس کو اس لائق نہیں پاتا اس کی مدد نہیں کرتا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ سارے مومنین ہر حال میں اس کی اعانت کے امیدوار ہوتے ہیں اور اپنی قوت و طاقت کے برقرار رہنے کی امید لگائے ہوئے یہی دعا کرتے رہے ہیں:

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (سورۂ فاتحہ، آیت ۵)

ترجمہ: اور فقط تجھ سے ہی مدد کے طلبگار ہیں۔

اور چونکہ مومنین کرام کو ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری شامت اعمال کے نتیجے میں ہم سے اپنی توفیق سلب کرلے گا اور ہمیں اپنے حال پر چھوڑ دے گا اس لئے وہ ہمیشہ یہ دعا مانگتے رہتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ وَلَا تَكِلْنِيْ إِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ اَبَداً.

ترجمہ: اے اللہ! مجھے ہمیشہ چشم زدن کی حد تک بھی میرے اپنے نفس کے حوالے نہ فرما (یعنی ایک لحہ کیلئے مجھے اپنے حال پر مت چھوڑ)۔

اور معصوم علیہ السلام کے فرمان:

لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِيضَ بَلْ اَمْرٌ بَيْنَ اَمْرَيْنِ

سے یہی معنی مراد ہے۔ ترجمہ: نہ جبر ہے اور نہ تفویض بلکہ ان دونوں امروں کے درمیان کا معاملہ ہے۔

جبر وتفویض کی نفی اور بین الامرین کا اثبات:

اللہ تعالیٰ نے نہ تو بندوں کو مجبور بنایا ہے اور نہ ہی سب کچھ ان کے سپرد کر کے خود مجبور ہو گیا ہے بلکہ حقیقت اور واقعیت ان دونوں امور کے بین بین ہے۔ انسان نہ اس قدر مجبور ہے کہ اختیار سے بالکل خالی ہو، نہ اس قدر مختارِ مطلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مقابلے میں عاجز ہو، بلکہ وہ ایک حد تک بااختیار اور ایک حد تک مجبور ہے۔ وہ اپنے دائرہ اختیار کے اندر بااختیار ہے اور اس سے باہر کے امور میں مجبور و بے اختیار ہے، اس کی تائید میں امام علی رضا علیہ السلام کا ارشاد موجود ہے۔

(۱) ابراہیم سے مروی ہے اس نے عباس سے نقل کیا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے سوال کیا، کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے امور کی تکلیف دیتا ہے جن کو کرنے کی طاقت ان کے پاس نہ ہو تو امام علیہ السلام نے فرمایا:

هُوَ اَعْدَلُ مِنْ ذَالِكَ

یعنی اللہ تعالیٰ کی عدالت ایسا کرنے سے بلند ہے (ایسا اقدام اللہ تعالیٰ کی عدالت کے خلاف ہے) پھر اس شخص نے پوچھا: تو کیا لوگ ہر محل کے اوپر اس طرح قادر ہیں کہ جو چاہیں کریں، تو امامؑ نے فرمایا:

هُوَ اَعْجَزُ مِنْ ذَالِكَ

یعنی انسان ایسا کرنے سے عاجز تر ہے۔

(۲) اور اسی طرح حضرت امیر المومنینؑ کا ارشاد بھی اسی کی تائید کرتا ہے:

عَرَفْتُ رَبِّي بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ،

ترجمہ: میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے فسخ ہو جانے سے پہچانا ہے۔

یعنی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی ایک کام کر دینے کو چاہتا ہے اور عزم رکھتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا سبب پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ آدمی اس کام سے باز رہ جاتا ہے یا کوئی ایسا مانع پیدا ہو جاتا ہے وہ اس کام میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ انسان کی قدرت ایک ناقص قدرت ہے اللہ تعالیٰ کی مثل قدرتِ تامہ نہیں ہے کہ کوئی اس کا معارض و مقابل نہ ہو بلکہ جس کام پر انسان قدرت رکھتا ہے اسے تائید مشیت الٰہی اور رفع موانع سے مشروط کر دیا گیا ہے پس جس فعل پر اسے قدرت نہ ہو اس کے صادر ہونے کی جس قدر بھی خواہش کرے وہ فعل اس سے صادر نہیں ہو سکتا، اسی سے انسان کو یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ میرا ایک قادر و توانا پروردگار ہے اس کی قدرت تمام قدرتوں سے اوپر ہے اگر وہ

اللہ انسان اور اس کے مقدور کے درمیان حائل ہو جائے تو بندہ عاجز ہو جاتا ہے اور اسے مراد حاصل نہیں ہو سکتی لیکن اللہ تعالیٰ خود کسی بھی کام سے عاجز نہیں ہو سکتا۔

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ اور توفیق و خذلان کی وضاحت:

علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ حق الیقین میں فرماتے ہیں: بہت ساری احادیث میں وارد ہوا ہے، نہ جبر ہے نہ تفویض یعنی یہ لوگ اپنے افعال پر مجبور ہیں اور نہ ہی ان کو مکمل طور پر خود ان کے حوالے کر دیا گیا ہے بلکہ معاملہ ان دو امروں کے درمیان ہے۔ اکثر حضرات اس بارے میں یہی کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو مجبور نہیں کیا ہے بلکہ بندہ اپنا کام اپنے ارادہ کے ساتھ کرتا ہے البتہ اس کے سارے اسباب اللہ تعالیٰ نے اس کو دیئے ہیں مثلاً اعضاء، جوارح، بدنی قویٰ، روحانی طاقتیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور امر بین الامرین بھی یہی ہے۔

لیکن حق یہ ہے کہ بندوں کے اعمال میں اللہ تعالیٰ کا دخل اس سے کچھ زیادہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سلسلہ خصوصی ہدایات و توفیقات کا بھی ہے جو ان کیلئے ہوتا ہے جو اس کے مستحق ہوتے ہیں وہ اپنے نیک یا بد اعمال کے سبب ان امور کے مستحق قرار پاتے ہیں یعنی جو افراد اطاعت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق کے حق دار ہو جاتے ہیں اور جو لوگ معصیت کا ارتکاب کرتے ہیں وہ خذلان کے لائق ہو جاتے ہیں۔

یعنی ایسے افراد کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور ہر قسم کی توفیقِ خدا سے محروم ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی اس حد تک نہیں پہنچتا کہ اس کا اختیار سلب ہو جائے اور وہ کسی کام کے فعل یا ترک پر مضطر اور مجبور ہو جائے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک مالک و آقا ہو اس کے دو غلام ہوں وہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو ایک فعل کا امر جاری کرے مثلاً وہ ہر ایک کو حکم دے کل جاؤ اور تم میں سے ہر ایک میرے لئے فلاں سامان کی خریداری کرے جو بھی یہ کام کرے گا وہ ایک صد دینار کا مستحق ہوگا اور جو یہ کام نہ کرے گا وہ دس تازیانوں کا حقدار قرار پائے گا۔ اب اگر وہ اسی مقدار پر اکتفاء کرے تو دونوں میں سے جو بھی کرے گا یا نہ کرے گا وہ اس جزا و سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔

یعنی جو کام کرے گا وہ صد دینار کا مستحق بنے گا اور جو نہ کرے گا وہ دس تازیانوں کا حقدار بنے گا لیکن اگر وہ مالک یہ دیکھتے ہوئے کہ فلاں غلام زیادہ فرماں بردار اور اکثر خدمت میں مصروف رہتا ہے اور اسی لئے وہ اسے زیادہ محبوب لگتا ہے اس غلام کو تنہائی میں بلا لیتا ہے اور اس سے خصوصی اظہارِ محبت و نوازش فرماتا ہے اور خصوصی ہدایت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ کل یہ کام ضرور انجام دینا۔ پھر رات کو اس کے لئے کھانا بھی روانہ کر دیتا ہے اور اس طرح کی مزید خصوصی مہربانی اس پر کرتا ہے۔ اب دوسرے دن یہ غلام وہ کام کر دیتا ہے لیکن دوسرا غلام اس کام کو انجام نہیں دیتا۔ اب اگر یہ مالک اس تابعدار غلام کو صد دینار کا انعام دے دیتا ہے اس نافرمان غلام کو دس تازیانے کی سزا جاری کر دیتا ہے تو کوئی شخص اس

مالک کی مذمت نہیں کرے گا کیونکہ دونوں غلام مجبور نہیں تھے۔ نہ پہلا غلام کام کرنے پر مجبور ہوا تھا اور نہ ہی دوسرا غلام کام نہ کرنے پر مجبور ہوا تھا۔

دونوں نے اپنا اپنا فیصلہ اور اقدام اپنے اپنے اختیار کے ساتھ کیا ہے اور آقا کی طرف سے ان دونوں پر حجت تمام ہو چکی تھی۔ یہی وہ مدخلیت ہے جس کے بارے میں آیات و احادیث سے ثابت ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال میں اس حد تک دخل رکھتا ہے اور ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ اس مسئلہ میں اس سے زیادہ غور وخوض نہ کرے بلکہ اسی حد تک پر اکتفاء کرے کیونکہ اس موضوع میں قدم لغزش کھاتے ہیں اور مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اور احادیث میں وارد ہے کہ اس مسئلہ میں اس سے زیادہ تفکر سے پرہیز کرو اور اس بارے میں نہی بھی وارد ہوتی ہے (کلام علامہ مجلسی ختم ہوا)۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی ہدایات اور توفیقات ایسے اطاعت گذار اور تابعدار بندوں کو نصیب ہوتی ہیں جو نیک اعمال کے ساتھ خود کو اس کا مستحق ثابت کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علم قدیم میں یہ امر ثابت ہو چکا ہوتا ہے کہ اس شخص کو سبحانی ہدایات اور ربانی توفیقات کا شامل حال ہونا اطاعت اوامر اور معاصی سے اجتناب برتنے میں نفع بخش ثابت ہوگا اور یہ امر فقط ممکن ہی نہیں، واقع بھی ہے چنانچہ کثیر احادیث اور متعدد آیات سے یہی کچھ سمجھ آتا ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ ترجیح اور استحقاق کا سبب موجود ہونے پر اپنی حکمت و مہربانی کے تحت ایک شخص کو دوسرے پر ترجیح دے، اپنے لطف وکرم اور عنایت میں اضافہ فرمادے، تو مقام تعجب نہیں اور اسی طرح اگر وہ کچھ افراد کو ان کے قبیح افعال کی وجہ سے دھتکار دے اور دور کر دے اور اپنی عدالت وحکمت کے تقاضوں کے تحت ان سے اپنی توفیقات کو سلب کر لے تو اس سے کوئی مانع بھی نظر نہیں آتا کیونکہ حق تعالیٰ سے ممتنع اور محال ہے کہ وہ کسی کو دوسرے پر بغیر کسی مرجح کے ترجیح دے یا قدرت و اختیار سلب کر کے غیر مقدور امر کی تکلیف دے کیونکہ یہ دونوں افعال قبیح ہیں اور قبیح فعل اللہ تعالیٰ سے کبھی بھی صادر نہیں ہوسکتا لیکن ہماری مفروضہ صورت میں ایسا نہیں ہے (یعنی توفیق دینے یا اس کے سلب کرنے میں نہ ترجیح بلا مرجح ہے اور نہ غیر مقدور کام کی تکلیف ہے)۔

ان لوگوں کا اپنے فاسد عقیدہ پر آیات سے استدلال:

انہوں نے بھی اپنے فاسد خیالات کیلئے چند آیات سے استدلال پیش کرنے کی سعی کی ہے:

(۱) قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (سورۂ رعد، آیت ۱۶)

ترجمہ: اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہہ دو کہ ہر شئے کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

(۲) خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ (سورۂ بقرہ، آیت ۷)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

اور اس قسم کی متشابہ آیات سے وہ اپنا مطلوب ثابت کرنا چاہتے ہیں اور ان معارض آیات کی طرف توجہ کئے بغیر اپنے غلط عقیدے کے گرویدہ بن گئے ہیں۔

اس استدلال کا جواب:

اس قسم کی تمام آیات کے استدلال کا جواب چند وجوہ سے دیا گیا ہے:

اول:

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو تمام اشیاء کا خالق فرمایا گیا ہے لیکن اس سے مراد خالق کا عام معنی ہے یعنی بالواسطہ خلق کرے یا بلاواسطہ خلق کرے دونوں کو شامل ہے اور اس عموم سے کوئی مانع نہیں ہے (یعنی وہ اللہ تعالیٰ بندوں کے افعال کا بالواسطہ خالق ہے اور وہ واسطے خود بندے ہیں چونکہ بندوں کو قدرت و اختیار دے دیا ہے اسلئے ان افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جائز ہے لیکن اس سے بندوں کا بے اختیار ہونا ثابت نہیں ہوتا)۔

دوم:

اس آیت سے مراد مخصوص معنی ہے یعنی کل شیئ سے مراد دلائل تخصیص کے مدنظر جواہر، اجسام اور اعراض عینیہ کا خلق کرنا ہے کیونکہ خلق کے عمدہ ترین افراد جواہر و اجسام کو خلق کرنا ہے اور افعال کو دراصل حرکات و سکنات کی قبیل سے ہوتے ہیں اور ان کا وجودِ عینی ثابت نہیں ہے اور اگر ان کے وجود کو عینی وجود کہہ دیا جائے تو بھی وہ ضعیف ترین وجود ہے کیونکہ حرکت ایسا کمال اول ہے جو

ماھو بالقوۃ من جھۃ ماھو بالقوۃ

ہے اور سکون یا تو عدمی ہوتا ہے کیونکہ اس کی تعریف ہے

عدم الحرکۃ عما من شانہ الحرکۃ

یعنی جس کو حرکت والا ہونا چاہئے اس کا حرکت والا نہ ہونا پس سکون وجودی نہیں عدمی ہے۔

سوم:

اگر تسلیم کرلیا جائے کہ آیت کریمہ سے عام معنی مراد لیا گیا ہے اور بندوں کے افعال کو بھی شامل ہے تو چونکہ اس عموم سے اللہ تعالیٰ کے حق میں جبر و ظلم ثابت ہوتا ہے، اور باری تعالیٰ کی شان اس سے ارفع اور بلند ہے کہ وہ جبر و ظلم کرے،

اسلئے آیہ کریمہ کی تخصیص کا قائل ہونا پڑے گا جیسا کہ قرآن مجید کی اکثر آیات کے عمومات کی تخصیص کی جاتی ہے بلکہ مشہور ہے کہ

ما من عام الا وقد خُصّ

یعنی کوئی عام ایسا نہیں جس کی تخصیص نہ ہو چکی ہو اور ان کا قول کہ ارادہ عبد کی مخلوق ہے تو ضروری ہے کہ وہ یہاں تخصیص کے قائل ہوں اور جو "کسب" کے قائل ہیں ان کیلئے بھی یہی ضروری ہے کیونکہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر خلق کی نسبت غیر خدا کی طرف دی گئی ہے مثلاً ارشادِ خداوندی ہے:

وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ (سورہ مائدہ، آیت ۱۱۰)

ترجمہ: اور جب آپ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) خلق کرتے ہیں، مٹی سے ایک پرندے کی شکل کی مثل کو۔

چہارم:

ممکن ہے کہ یہ نظریہ اختیار کیا جائے کہ آیت کریمہ میں ذکر شدہ خلق سے مراد خلق تکوینی نہیں بلکہ خلق تقدیری ہے کیونکہ بعض اوقات تقدیر کو بھی خلق سے تعبیر کر دیا جاتا ہے (تکوینی سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ کسی شئے کو وجود بخشے اور خلق کر دے جیسا کہ فرماتا ہے:

اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (سورہ یٰسین، آیت ۸۲)

اور تقدیری سے مراد یہ ہے کہ اس نے اپنے تقدیر میں یہ فیصلہ کیا ہوتا ہے کہ ایسا ہوگا اگر چہ وہ کسی بندے کی قدرت واختیار سے صادر ہوگا چنانچہ اعمش کی ایک روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ فرمایا:

اَفْعَالَ الْعِبَادِ مَخْلُوْقَةٌ لِلّٰهِ خَلْقَ تَقْدِیرٍ لَا خَلْقَ تَکْوِینٍ وَ اللهُ خالِقُ کُلِّ شَیْءٍ.

(بحار، ج۵، ص ۳۰، باب نفی الظلم والجور)

یعنی بندوں کے افعال مخلوق خدا ہیں لیکن خلق تقدیری کے عنوان سے نہ کہ خلق تکوینی کے عنوان سے اور اللہ تعالیٰ ہر شئے کا خالق ہے۔

پنجم:

خَتَمَ اللهُ ....

والی آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ جب کفار نے کفر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے اعراض کر لیا اور اس اعراض کی وجہ سے کفر اُن کے قلوب میں مزید راسخ ہو گیا اور اُن کے ایمان لانے کی امید ختم ہوگئی اسلئے اس کیفیت کو مہر لگانے سے

تشبیہ دی گئی اور خَتَمَ سے تعبیر کر دیا گیا اور یہی مفہوم خاصہ و عامہ کے مفسرین نے بھی بیان کی ہے (یعنی خَتَمَ سے مراد کفار کو کفر پر مجبور کرنا نہیں ہے بلکہ ان کے کفر و عصیان کو اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کا ان سے اعراض کرنا مراد ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب وہ پختہ کافر ہو گئے اور مومن ہونے کی امید ختم ہو گئی)۔

ششم:

تمام منقولہ عبارات کے ظاہری معانی اس وقت تک معتبر نہیں ہوتے جب تک وہ عقلی اور نقلی دلائل کی مخالفت سے محفوظ نہ ہوں اور اگر کسی منقول کلام کے بارے میں ثابت ہو کہ وہ عقلی دلائل کے مخالف ہے اور منقول دلائل بھی اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں تو لازم ہوتا ہے کہ ان کو ظواہر سے ہٹا کر تاویل کیا جائے اور خلافِ ظاہر پر محمول کیا جائے لہٰذا تمام ایسی آیات جن کا ظاہر جبر پر دلالت کرتا ہے ان سے خلافِ ظاہر معنی مراد لیا جائے گا تا کہ جبر ثابت نہ ہو جیسا کہ

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (سورۂ طہٰ، آیت ۵)

ترجمہ: وہ رحمان عرش پر اختیار و اقتدار رکھنے والا ہے۔

اس کے ظاہری معنی سے اللہ تعالیٰ کیلئے جسم ثابت ہوتا ہے لیکن تمام مسلمان اس کیلئے جسم تسلیم نہیں کرتے کیونکہ یہ بات عقلی و نقلی دلائل کے خلاف ہے اسلئے آیت کریمہ کی تاویل کرتے ہیں (اور استویٰ کا معنی "غالب آیا" کیا جاتا ہے) پس لازم ہے کہ ان آیات کی بھی تاویل کی جائے اور ایسا معنی تسلیم نہ کیا جائے جس سے جبر لازم آتا ہو، تو ہمارے برادران ایسا کیوں نہیں کرتے؟

فصل پنجم:

قضاء وقدر کا بیان

قضاء اور قدر، ان دونوں الفاظ میں سے ہر ایک کے متعدد معانی ہیں بالخصوص قضاء کے بہت زیادہ معانی ہیں۔ چنانچہ شیخ صدوقؒ نے کتاب توحید میں بعض اہل علم سے نقل کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ قضاء کے دس معانی ہیں:

(۱) علم (۲) حکم (۳) قول (۴) ختم (۵) امر (۶) اعلام (۷) فعل (۸) اتمام (۹) خلق (۱۰) فراغ۔

پھر انہوں نے ہر معنی کیلئے قرآن مجید سے شاہد پیش کئے ہیں لیکن بظاہر قضاء کو ان مذکورہ معانی تک محدود کرنا بھی صحیح نہیں ہے البتہ بعض علماء نے ان میں چند ایک معانی تک اقتصار بھی فرمایا ہے اور بعض اہل علم کے نزدیک قضاء اور قدر مترادف ہیں اگرچہ ان میں سے بعض معانی کی حد تک یا تمام معانی کے لحاظ سے ہے، قدر و تقدیر کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی مذکورہ معانی تک منحصر نہیں ہیں کیونکہ تقدیر کا ظاہری معنی تعیین بھی ہے، اور اسی طرح قضاء بھی اس معنی میں استعمال ہے۔ اب ہم ان معانی میں سے اہم کے بیان پر اکتفاء کریں گے۔

(۱) قضاء بمعنی خلق، چنانچہ ارشاد خداوندی:

فَقَضٰهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوَاتٍ (سورۂ فصلت، آیت ۱۲)

کا مفہوم تفسیر میں یہی بتایا گیا ہے کہ پس اللہ تعالیٰ نے ان کو سات آسمانوں کے طور پر خلق کیا۔

(۲) قضاء یعنی حکم، فرمان الٰہی ہے:

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ (سورۂ اسراء، آیت ۲۳)

ترجمہ: اور تیرے رب نے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہ کرو۔

(۳) قضاء یعنی اعلام و اخبار (خبر دینا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَضَيۡنَاۤ اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ فِى الۡكِتٰبِ (سورۂ اسراء، آیت ۴)

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبر دی اس کتاب میں۔

قضاء بمعنی علم، اور اس کی کئی صورتیں ہیں یا تعقل و تصور میں کسی شئے کا تعین کرنا ہوتا ہے کہ دو شئے فلاں طرز پر وقوع پذیر ہو، اور ایسا اللہ تعالیٰ کے افعال میں ہوتا ہے اور یا مراد یہ ہوتا ہے کہ جو شئے وقوع پذیر ہو چکی ہے اس سے آگاہ ہونا یا کسی چیز کی خصوصیات کا علم حاصل ہونا جیسا کہ غیر اللہ کے فعل کے بارے میں ہو یا اس کی تائید کا علم کہ اللہ تعالیٰ اپنے الطاف کے ساتھ تائید کرے اور اس سے منع نہ کرے یا اس سے تائید کو سلب کرے اور اس سے منع کر دے اور اس کی مانند۔

حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد:

منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا: کہ اعمال کی تین قسمیں ہیں: فرائض، فضائل، معاصی۔

فرائض:

یہ تو اللہ تعالیٰ کے امر حتمی اور اس کی رضا و قضاء کے مطابق واقع ہوتے ہیں یعنی اس کے حکم اور اس کی تقدیر و تعیین اور اس کی مشیت و ارادہ کے مطابق اور اس کے علم کے ساتھ ہم آہنگ۔

فضائل:

یہ اللہ تعالیٰ کے امر یعنی اس کے حتمی حکم کے ساتھ وقوع پذیر نہیں ہوتے لیکن اس کی مرضی کے مطابق اور اس کی قضاء و علم و مشیت کے ساتھ ہوتے ہیں اور ارادۂ الٰہی کی بحث میں یہ امر واضح کیا جا چکا ہے کہ غیر خدا کے افعال کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کا ارادہ ان کا طلب کرنا یا ان سے منع نہ کرنا ہے یا اس کی مانند مفہوم مراد ہے۔

معاصی:

یہ سارے اصلاً امر خدا کے ساتھ نہیں ہوتے لیکن قضاء و قدر الٰہی اور اس کی مشیت و علم کے ساتھ ہوتے ہیں۔

شیخ صدوقؒ کی فرمائش:

معاصی کے قضاء الٰہی کے ساتھ ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہ اس کی نہی سے ملے ہوتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہوتا ہے کہ ان افعال سے باز رہیں پھر قدر الٰہی کے ساتھ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام افعال کی مقدار اور کیفیت سے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے، (انتهى مُلَخِّصُ كلامه اعلى الله مقامه)۔

واضح باد کہ "بندوں کے افعال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا امر و نہی تو ہوتا ہے لیکن اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کو ان کی

خصوصیات کا علم، ان کے بارے میں امداد و اطاعت یا سلب توفیق اور مانع ہونے کا بھی علم ہوتا ہے۔" اس نکتے کی اگرچہ شیخ صدوق ؒ نے صراحت نہیں فرمائی۔

لیکن قضاء بمعنی علم کی تفسیر و تفصیل میں جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اس بارے میں حضرت امیرالمومنینؑ کی ایک اور روایت منقول ہے کہ ایک سائل نے عرض کیا:

فَمَا الْقَضَاءُ وَ الْقَدَرُ الَّذِیْ ذَکَرْتَهٗ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ!

وہ قضاء وقدر کیا ہے جو امیرالمومنینؑ آپ نے ارشاد فرمائی ہے، تو آپؑ نے فرمایا:

اَلْاَمْرُ بِالطَّاعَةِ وَ النَّهْیُ عَنِ الْمَعْصِیَةِ وَ التَّمْكِینُ مِنْ فِعْلِ الْحَسَنَةِ وَ تَرْكِ السَّیِّئَةِ وَ الْمَعُونَةُ عَلَى الْقُرْبَةِ إِلَیْهِ وَ الْخِذْلَانُ لِمَنْ عَصَاهُ وَ الْوَعْدُ وَ الْوَعِیدُ وَ التَّرْغِیبُ وَ التَّرْهِیبُ كُلُّ ذٰلِكَ قَضَاءُ اللهِ فِی اَفْعَالِنَا وَ قَدَرُهٗ لِاَعْمَالِنَا فَاَمَّا غَیْرُ ذٰلِكَ فَلَا تَظُنَّهٗ فَإِنَّ الظَّنَّ لَهٗ مُحْبِطٌ لِلْاَعْمَالِ فَقَالَ الرَّجُلُ فَرَّجْتَ عَنِّی یَا اَمِیرَ الْمُؤْمِنِینَ فَرَّجَ اللهُ عَنْكَ.

ترجمہ: اطاعت کا امر دینا اور معصیت سے نہی کرنا، نیکی کی قدرت دینا اور معصیت کے ترک کو ممکن بنانا، اللہ تعالیٰ کے تقرب والے افعال پر اعانت کرنا اور نافرمانی کی مدد نہ کرنا، نیک اعمال پر جزاء کا وعدہ کرنا اور ترغیب دینا اور برے اعمال پر سزا کی دھمکی دینا اور ان سے ڈرانا یہ سارے امور ہمارے افعال کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی قضاء اور ہمارے اعمال کے متعلق قدر ہے اور اس کے علاوہ اور کسی بات کا گمان تمہیں نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ایسا گمان اعمال کے تباہ کرنے کا موجب ہوتا ہے، اس جواب کو سن کر وہ سائل بولا: یا امیرالمومنینؑ: آپؑ نے میری مشکل کو آسان کر دیا اللہ تعالیٰ آپ کی مشکل آسان کرے۔

ظاہر ہے کہ آپ کے اس کلام سے مراد ان تمام مدارج کا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان تمام امور کا علم ہے، چنانچہ حکماء کے اقوال میں جو حقائق بیان ہوئے اور نقل کئے گئے ہیں ان سب کی بازگشت بھی اسی مفہوم کی طرف ہے، کہ قضاء سے مراد موجودات کے بارے میں یہ علم رکھنا ہے کہ ان کو احسن نظام کے مطابق کیسا ہونا چاہئے اور وہ ایسے ہی ہیں۔ حکماء کی اصطلاح میں اس علم موجودات کو "العنایة الازلیة" کا نام دیا گیا ہے اور" تقدیر" کا اطلاق بھی تقریباً اسی معنی پر ہوتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ حدیث میں وارد ہے:

اَلتَّقْدِیْرُ وَاقِعٌ عَلَى الْقَضَاءِ بِالْاِمْضَاءِ

کہ تقدیر واقع ہوتی ہے قضاء پر اجراء کے ساتھ، اس سے دو چیزوں کی طرف اشارہ ہے: اوّل یہ کہ قضاء ان تمام تفاصیل پر مشتمل ہے جو خارج میں موجود ہیں اور دوم یہ کہ تقدیر واسطہ ہے قضاء اور امضاء (اجراء) کے درمیان۔

بعض کہتے ہیں کہ:

القدر عبارة عما قضاه الله تعالی و حکم به من الامور

کہ قدر سے مراد ہے وہ امور جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا اور حکم دیا ہو۔

شیخ صدوق ؒ کے کلام سے معلوم ہوا ہے کہ قدر کسی شئ کے مبلغ و مقدار کا علم ہے اور فیروز آبادی نے قاموس (کتاب لغت) میں فرمایا ہے:۔

القدر حرکة القضاء و الحکم و مبلغ الشیء

کہ قدر ہے قضاء کو حرکت دینا، حکم دینا اور شئ کی مقدار و مبلغ کا فیصلہ دینا اور تقدیر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کا معنی ہے "تدبیر الامر" کسی امر کی انجام دہی کرنا۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا ارشاد:

اس کی تائید اس کلام سے ہوتی ہے جو شیخ کلینیؒ نے الکافی میں علی بن ابراہیم ہاشمی کے ذریعہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے نقل فرمایا ہے۔ راوی کہتا ہے میں نے عرض کیا:

مَا مَعْنَى الْقَدْرِ؟

قدر کا معنی کیا ہے؟ تو امامؑ نے فرمایا:

تقدیر الشیء من طوله و عرضه

کسی شئ کے طول و عرض کی مقدار کا تعیین کرنا، پھر فرمایا:

مَامَعْنَى الْقَضَاءِ؟

قضاء کا معنی کیا ہے؟ تو آپؑ نے فرمایا:

إِذَا قَضٰى اَمْضَاهُ فَذٰلِكَ الَّذِيْ لَا مَرَدَّ لَهٗ.

جب وہ قضاء کرتا ہے تو اس کو نافذ کر دیتا ہے، پھر اس کو ردّ نہیں کیا جا سکتا۔

اسی روایت میں گویا طول و عرض کا ذکر تمثیل کے طور پر ہے اور قضاء کا معنی یہاں "حتم" ہے یعنی حتمی فیصلہ۔

شیخ مفید کا کلام: فرماتے ہیں کہ قدر سے مراد "ایقاع کل شئی موقعه علی ما ینبغی"

ہر شئ کو اس کے صحیح موقع پر اس طرح واقع کرنا جس طرح اسے ہونا چاہئے۔

سید نور اللہ شوستریؒ نے فرمایا:

کہ قدر بمعنی "کتاب و اِخبار آیا ہے یعنی لکھنا اور اطلاع دینا اور بمعنی اشیاء کو اپنے صحیح مقامات پر رکھنا بغیر کسی زیادتی یا کمی کے" بھی آیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کی آیت کریمہ میں ہے:

وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَاتَهَا (سورۂ فصلت، آیت ۱۰)

ترجمہ: اور ہم نے اس زمین میں ان کی غذاؤں کو رکھا ہے۔

اور قدر کا ایک معنی یہ بھی آیا ہے "اشیاء کی مقداروں کی تفاصیل کو روشن کرنا"۔ معلوم ہوا کہ جب بھی قضاء و قدر کا اعلان کرتے ہیں تو اس سے مراد "ان کے تعیین کے مدارج اور علمی تعینات کا اعلان" ہوتا ہے پس گویا جو کچھ لوح محفوظ یا لوح محو و اثبات میں تقدیر کی قلم کے ساتھ ذاتِ علیم وخبیر کے علم کے مطابق منقوش کیا گیا ہے وہ تقریر کی مرتبہ ثانیہ ہے جو کہ علمی تقدیر کے مرتبہ سے متاخر ہے۔

پھر جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملائکہ کو حقیقت تقدیر سے آگاہ کرنے کیلئے بتایا جاتا ہے یا انبیاء و اوصیاء علیہم السلام کو اس کی اطلاع دی جاتی ہے یہ تقدیر کا مرتبہ ثالثہ ہوتا ہے۔ پس احادیث میں جو یہ مضمون وارد ہے کہ ہر چیز قضاء و قدر کے مطابق وقوع پذیر ہوتی ہے اس سے مراد یہی معنی ہے کہ ہر چیز کا وقوع اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق ہے یا اس اطلاع کے مطابق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی تعیین و تقدیر ربانی کے مطابق دی ہے، نہ یہ کہ کائنات کے تمام واقعات و حادثات حتیٰ کہ بندوں کے تمام افعال اللہ تعالیٰ نے خلق و ایجاد کئے ہیں اور اس طرح وجود میں آئے ہیں۔

پس اشاعرہ کا یہ قول کہ بندوں کے تمام افعال قضاء و قدر کے ساتھ واقع ہوتے ہیں تو اگر ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خلق و ایجاد کے ساتھ واقع ہوتے ہیں تو یہ نظریہ بالکل غلط اور فاسد ہے اور مسئلۂ جبر و اختیار میں ہم اس کی مکمل وضاحت کر چکے ہیں اور اگر ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کے علمی تعیین کے مطابق واقع ہوتے ہیں تو صحیح ہے کیونکہ واضح ہو چکا ہے کہ کوئی شئے اللہ تعالیٰ سے مخفی و پوشیدہ نہیں ہے اور اس کا علم اس کے اپنے افعال اور غیر کے افعال سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے لہٰذا تمام افعال میں سے کوئی فعل بلکہ تمام امور میں سے کوئی امر اللہ تعالیٰ کے علم کے دائرے سے باہر نہیں ہے لیکن اس صحیح معنی کا نتیجہ جبر کو مستلزم نہیں ہے۔

اشاعرہ کا اعتقادِ جبر اور اس کی دلیل:

لیکن اشاعرہ جبر کے معتقد ہو گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا نتیجہ جبر و اختیار اور سلب اختیار بنتا ہے اور خیال کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ تمام کلیات و جزئیات کا عالم ہے، گذشتہ اور آئندہ کی ساری تفاصیل سے آگاہ ہے، تمام اشیاء کو ان کے

وجود میں آنے سے قبل سے جانتا ہے اور اس ذات کیلئے جہل امر محال ہے اور پھر جو کچھ اس کے علم میں ہے اس کے خلاف وقوع پذیر ہونا محال ہے ورنہ اس کا علم واقع کے مطابق نہ رہے گا لہٰذا کوئی بندہ اس کے علم کے خلاف کرنے پر قادر نہیں ہے ورنہ تو علم الٰہی جہالت سے تبدیل ہوجائے گا۔

لہٰذا علم الٰہی میں جو کچھ ہے اطاعت یا معصیت، کفر یا ایمان، ایسا ہی ہوتا ہے اور بندگان سے وہی کچھ ہو کر رہتا ہے، اس کے خلاف ہونا ممتنع ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ابوجہل ایمان نہیں لائے گا تو اب اس کیلئے محال ہے کہ وہ ایمان لائے ورنہ اللہ تعالیٰ کا علم جہالت سے تبدیل ہوجائے گا اور یہ بات محال ہے اور اسی کو جبر کہتے ہیں: **تعالی اللہ عما یقولون الظالمون علوا کبیرا**، حالانکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے الزامات سے بلند ترین ذات ہے وہ جبر و ظلم سے پاک ہے۔

شارح مقاصد نے اس دلیل پر بھروسہ کیا ہے اور فخر الدین رازی نے کہا ہے کہ اگر تمام عقلاء جمع ہوسکیں تو اس بات پر قادر نہ ہوں گے کہ اس دلیل کے بارے میں کوئی قدح و جرح کرسکیں اور اس کے کمزور ہونے کے بارے میں کوئی حرف زبان پر لاسکیں، ہاں اگر کوئی بات کریں گے تو وہی جو ہشام جیسے افراد نے کی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کے بارے میں ان کے وجود میں آنے سے قبل علم نہیں رکھتا حالانکہ اس کی بات بالکل غلط ہے (انتہی محصل کلامہ)۔

اشاعرہ کی دلیل جبر کا ردّ:

ان کی یہ دلیل علیل ہے اور اس کا جواب نقضی و حلّی دونوں طرح سے موجود ہے۔

نقضی جواب:

جو معارضہ پر مشتمل ہے وہ یہ ہے کہ اگر علم الٰہی کی تاثیر یہ ہو کہ تمام فاعل اپنے افعال میں مجبور و مضطر قرار پائیں اور افعال موجب ہوجائیں تو لازم ہے کہ خود اللہ تعالیٰ بھی اپنے افعال میں مجبور ہو اور اس کا اختیار بھی سلب ہو کیونکہ حق تعالیٰ جہاں اپنے بندگان کے افعال کو ان کے وقوع سے قبل جانتا ہے وہاں خود اپنے افعال کا بھی بطریق اولیٰ علم رکھتا ہے پس اگر اسے علم حاصل ہے کہ وہ فلاں سال میں زید کو خلق کرے گا تو سوال ہے کہ کیا وہ قدرت رکھتا ہے کہ اس سال زید کو خلق کرے یا نہیں۔ اگر کہا جائے کہ ہاں وہ اس پر قادر ہے تو اب تمہارے بقول اس کے علم کا جہالت سے تبدیل ہونا لازم آجائے گا اور اگر کہا جائے کہ نہ وہ اب قادر نہیں کہ (اس کو اس سال خلق نہ کرے) تو اس سے اللہ تعالیٰ کا مضطر و مجبور ہونا لازم آئے گا اب جو جواب آپ کا ہوگا وہی ہمارا ہوگا۔

سبحان اللہ! معلوم ہوا کہ بندگان کے اضطرار کو ثابت کرنے کے پردے میں پروردگار عالم کے مجبور و مضطر ہونے کو

ثابت کرنا چاہتے ہیں، تعالی اللہ عن ذلك علوا کبیرا، اللہ تعالیٰ تو اس قسم کے ہر عیب سے پاک و بلند ترین ذات ہے۔

اب کہاں ہیں، جناب فخر الدین رازی کہ اس معارضہ کا جواب دیں، وہ تو کیا اگر کائنات کے سارے غیر امامیہ اجتماع فرمائیں تو اس معارضہ کا جواب دینے پر قادر نہ ہوسکیں گے۔ اب اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ امامیہ کے برحق اعتقاد کی طرف رجوع کریں اور اس کی حقانیت کو تسلیم کریں۔

وَيُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ (سورۂ یونس، آیت ۸۲)

اللہ تعالیٰ خود اپنی حکمت کے ذریعہ حق کی حقانیت کو قائم کرتا ہے اگرچہ مجرم لوگ پسند نہ بھی کرتے ہوں۔

حَلّی جواب:

اشاعرہ کی دلیل کا حلّی جواب یہ ہے کہ علم حکایت ہوتا ہے معلوم کی اور معلوم محکی عنہ ہوتا ہے اگرچہ وہ علم مقدم اور قبلی ہی کیوں نہ ہو۔ علم ہر حال میں حکایت ہوتا ہے کہ معلوم کے تابع ہوتا ہے برعکس نہیں ہوتا (یعنی معلوم علم کے تابع نہیں ہوتا)۔ پس جو کچھ واقع میں ہونے والا ہوتا ہے اسی کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے نہ یہ کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے وہی واقع ہونا ہوتا ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہوتا ہے، اور ان دونوں باتوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہے اور کسی پختہ فکر اور سدید رائے والی شخصیت سے یہ بات پوشیدہ نہیں۔

پس لاریب کہ علم خدا واقع کے مطابق ہوتا ہے لیکن جو علم واقع کے مطابق ہو وہ معلوم کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی تاثیر نہیں رکھتا اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں مثلاً ہم سب علم رکھتے ہیں کہ قیامت برحق ہے:

وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا (سورۂ حج، آیت ۷)

ہمارا یہ علم واقع کے مطابق ہے لیکن ہمارے اس علم کو قیامت کے واقع ہونے میں کیا دخل ہے؟ (کچھ بھی نہیں)۔

خلاصہ یہ کہ تمام مسبّبات اپنے اپنے اسباب کے آثار ہیں نہ کہ علم کے آثار، ورنہ لازم آئے گا کہ تمام علل ایک ہی واحد فردِ معلوم پر توارد کریں اور یکدم جمع ہو جائیں حالانکہ خداوند عالم کے علم میں ہے کہ میں فلاں کام کو بااختیارِ خود انجام دوں گا یا فلاں بندہ بااختیارِ خود فلاں/اطاعت یا معصیت انجام دے گا اب اگر علم خدا میں ہونا اضطرار کا باعث بنے (اور وہ فعل بالاختیار ہو) تو اس کے علم کی مخالفت لازم آئے گی کیونکہ اس کے علم میں تو یہ تھا کہ وہ فعل بااختیارِ خود وقوع پائے گا اور اگر بالاضطرار وقوع پائے تو علم جہالت سے منقلب ہو گیا (جو کہ محال ہے) پس لامحالہ اختیار اور علم بالاختیار کیلئے مستمر ہونا ضروری ہے۔

وھو المطلوب، لا اکراہ فی الدین، و لا جبر و لا ظلم فی حکمہ رب العالمین، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ وحدۃ.

حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا فصیح و بلیغ کلام:

اس بارے میں حضرت علی علیہ السلام کا فصیح ترین ارشاد موجود ہے جس میں یہ امر انتہائی خوبصورت طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ خاصہ اور عامہ کے راویان نے اسے نقل کیا ہے۔ ہمارے والد علام (غفران مآبؒ) نے عماد الاسلام میں، شارح شرح تجرید نے اور عبدالحمید بن ابی الحدید (معتزلی) نے اپنی شرح نہج البلاغۃ میں اور شیخ صدوقؒ (محدث شیعہ امامیہ) نے التوحید میں اور دیگر بہت سارے مصنفین نے اپنی اپنی کتب میں (بہت تھوڑے فرق کے ساتھ) اصبغ بن نباتہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام واقعہ صفین سے واپس آرہے تھے تو آپ کی خدمت میں ایک بوڑھا مرد حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا: کیا ہم قضاء وقدر الٰہی کے ساتھ شام کو گئے تھے؟ یعنی آپ کے لشکر کے مجاہدین کا یہ سفر جنگ قضاء وقدر الٰہی کے ساتھ تھا یا نہیں؟ تو آپ نے فرمایا:

وَ الَّذِی فَلَقَ الْحَبَّةَ وَ بَرَاَ النَّسَمَةَ

(قسم اس ذات کی جو دانے کو پھاڑتا اور حیوان کو پیدا کرتا ہے)

ہم نے کوئی قدم اٹھایا نہیں، کسی منزل پر اترے نہیں، کسی ندی نالے سے گزرے نہیں مگر یہ سب کچھ قضاء وقدر الٰہی کے ساتھ تھا تو وہ بزرگ کہنے لگا تو پھر تو ہماری تھکاوٹیں اور حرکتیں سب فضول ہوگئیں ہمیں اس پر کوئی جزاء تو نہ ملے گی؟

تو آپ نے فرمایا: بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس راہ میں جانے پر تمہارے لئے اجر عظیم معین کیا ہے کیونکہ تم باغیوں کے مقابلے میں جنگ لڑنے گئے تھے اور اسی طرح تمہارے واپس آنے پر بہترین انعام ہے کہ تم حالت اکراہ میں نہ تھے اور نہ تم پر کوئی اضطرار تھا (تم اپنی پسند و اختیار کے ساتھ اس جنگ کی طرف گئے اور واپس آئے ہو) اس پر وہ بوڑھا کہنے لگا: آخر یہ کیسے ہے (ہم کیسے با اختیار ہیں) جبکہ ہمیں تو قضاء وقدر الٰہی لے گئی تھی اور ہم اس کے مطابق گئے، جہاں اس نے چاہا وہ لے گئی۔

تو حضرت نے فرمایا: افسوس تجھ پر، کیا تو نے اس سے وہ قضاء وقدر مراد لے لی ہے جو حتمی اور لازمی ہوتی ہے (ایسا نہیں) کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو بندگان کے افعال پر ثواب وعقاب دیا جانا بالکل باطل ہوتا، ثواب کا وعدہ اور عقاب کی وعید اور امر و نہی کا سلسلہ بالکل غلط ہوجاتا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی گناہ گار کی مذمت و ملامت اور کسی نیکوکار اور اطاعت شعار کی تعریف وثناء خوانی نہ کی جاسکتی، کوئی نیک کسی گناہ گار سے زیادہ ستائش کے لائق نہ ہوتا۔ خبردار! ایسا نظریہ تو بت پرستوں اور شیطان کے لشکریوں کا نظریہ ہے۔ یہ قول تو دل کے اندھوں اور دھوکہ بازوں کا قول ہے یہ لوگ ثواب کی وجوہ کا

ادراک کرنے سے قاصر رہے ہیں یہ لوگ ہماری اس امت کے قدر یہ اور ہماری اس شریعت کے مجوس ہیں۔

ان اللہ تعلی أمر تخییرا و نهی تحذیرا و کلف یسیرا،

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی اطاعت کا حکم دیا ہے تو ان کو اس پر اختیار دے کر حکم فرمایا ہے اور ان کو اپنی معصیت سے نہی کی ہے تو فقط برائی سے دور رکھنے اور خوف دلانے کیلئے ہے نہ کہ انہیں مجبور کرنے اور مضطر بنانے کے ساتھ ہے اور جس جس کو تکلیف دی ہے تو اس کو دی ہوئی طاقت سے کم تر کی تکلیف دی ہے اور وہ اسے برداشت کر سکتا ہے تکلیف مالا یطاق (مقدور سے زیادہ کی تکلیف) نہیں دی تو مخالف حق لوگوں کے خیالات ہیں اور بدگمانی پر مشتمل ہیں

لَمْ یعص اللہَ مغلوبا ولم یطع مکرها

اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو اسلئے نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو مغلوب کر چکا ہوتا ہے اور اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے تو اسلئے نہیں کہ اسے مجبور کر دیا گیا ہوتا ہے

و لم یرسل الرسل عبثًا،

اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو فضول اور عبث نہیں بھیجا،

وَ لَمْ یَخْلُقِ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا - ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِینَ کَفَرُوا فَوَیْلٌ لِّلَّذِینَ کَفَرُوا مِنَ النَّارِ.

اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین اور ان کے مابین ساری موجوات کو باطل اور ناحق پیدا نہیں کیا، بے مقصد خلق نہیں کیا، یہ خیال تو کافروں کا خیال ہے اور ایسے کافروں کیلئے جہنم کا عذاب ہے۔

اب وہ بزرگ سال مرد کہنے لگا: تو وہ قضا وقدر کیا ہے جس کے بغیر ہم نہیں گئے؟ (یعنی یہ جو آپ نے فرمایا تھا ہماری اس میں ہر حرکت قضاء وقدر کے ساتھ تھی اس سے کیا مفہوم مراد ہے؟)

تو حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا: اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا امر اور حکم ہے (یعنی قضاء وقدر سے مراد اللہ تعالیٰ کا حکم ہے) پھر آپؑ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی:

وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ (سورۂ اسراء، آیت ۲۳)

یہ سن کر وہ مرد بزرگ بہت خوشحال ہو گیا اور یہ اشعار کہنے لگا۔

أَنْتَ الْإِمَامُ الَّذِیْ نَرْجُوْ بِطَاعَتِهٖ یَوْمَ النُّشُوْرِ مِنَ الرَّحْمٰنِ رِضْوَانًا
أَوْضَحْتَ مِنْ دِیْنِنَا مَا کَانَ مُلْتَبِسًا جَزَاكَ رَبُّكَ عَنَّا فِیْهِ إِحْسَانًا
فَلَیْسَ مَعْذِرَةٌ فِیْ فِعْلِ فَاحِشَةٍ قَدْ کُنْتُ رَاکِبَهَا فِسْقًا وَ عِصْیَانًا

لَا لَا وَ لَا قَائِلًا نَاهِيهِ اَوْقَعَنِیْ   فِيْهَا عَبَدتُ إذا يَا قَوْمِ شَيْطَانَا
وَ لَا تُحِبُّ وَ لَا شَاءَ الْفُسُوْقَ وَ لَا   قَتَلَ الْوَلِیَّ لَهٗ ظُلْمًا وَ عُدْوَانَا
اَنّٰی يُحِبُّ وَ قَدْ صَحَّتْ عَزِيْمَتُهٗ   ذُو الْعَرْشِ اَعْلَنَ ذَاكَ اللّٰهُ إعْلَانَا

ترجمہ:

(۱) آپ ہی وہ امام ہیں جن کی اطاعت کر کے ہم بروز حشر اپنے رحمٰن اللہ سے رضا وخوشنودی کی امید رکھ سکتے ہیں۔

(۲) آپ نے ہمارے دین کے وہ حصے روشن کر دیئے جو ہم پر چھپے ہوئے تھے اللہ تعالیٰ آپ کا رب، آپ کو ہمارے اوپر اس احسان کے بدلے بہترین جزاء عطا فرمائے۔

(۳) میرے پاس میرے اس برے فعل اور فحش اقدام کا کوئی عذر نہیں جس کو میں نے فسق وعدوان کرتے ہوئے انجام دیا تھا۔

(۴) نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ اس بات کے قائل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس فعل میں ڈال دیا تھا ایسا قول اپناؤں تو اے قوم! میں نے شیطان کی عبادت کی ہے۔

(۵) نہ اللہ تعالیٰ ایسے برے افعال سے محبت رکھتا ہے اور نہ وہ انہیں چاہتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے کسی دوست کو ظلم وعدوان کرتے ہوئے قتل کر دیتا ہے۔

(۶) وہ کیسے ایسے کام سے محبت رکھ سکتا ہے جبکہ اس کا ارادہ تو صحیح اور پاکیزہ ہوتا ہے اور اس عرش والے نے اس بات کا واضح اعلان کر دیا ہے۔

واضح باد کہ حضرتؑ کا یہ ارشاد کہ

تلك مقالة عبدة الأوثان، وقدرية هذه الأمة ومجوسها،

اس میں صراحت کے ساتھ قدریہ سے مراد وہی لوگ ہیں جنہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متفق علیہ حدیث میں کہا گیا ہے: **القدرية مجوس امتي**، کہ قدریہ لوگ میری امت کے مجوس ہیں اور ایک دوسری روایت میں ہے:

لعن الله القدرية على لسان سبعين نبيا،

کہ اللہ تعالیٰ نے قدریہ کو ستر انبیاء علیہم السلام کی زبان پر ملعون قرار دیا ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث:

حضرت صادق آل محمد علیہ السلام نے اپنے آباؤ اجداد علیہم السلام سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے، فرمایا:

قَالَ النَّبِیُّ (ص): صِنْفَانِ مِنْ اُمَّتِیْ لَا نَصِیْبَ لَهُمَا فِی الْإِسْلَامِ الْغُلَاةُ وَ الْقَدَرِیَّةُ.

میری امت کے دو قسم کے لوگ ایسے ہیں جن دونوں کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے غلاۃ (غلو کرنے والے) اور قدریہ (اللہ تعالیٰ اور بندوں کو مجبور ماننے والے) اور ان قدریہ سے مراد اہل سنت کا ایک گروہ اشاعرہ ہیں۔

اشاعرہ اور معتزلہ ایک دوسرے کو قدریہ قرار دیتے ہیں:

اشاعرہ کہتے ہیں کہ قدریہ سے مراد معتزلہ ہیں جو خیر و شر میں سے کسی کے اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت کے ساتھ ہونے کی نفی کرتے ہیں اور اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی اس نفی میں مبالغہ کرتے ہیں لیکن اشاعرہ کا یہ خیال غلط ہے درست نہیں ہے اور معتزلہ نے اشاعرہ کے جواب میں کہا ہے کہ ان قدریہ سے مراد اشاعرہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہر خیر و شر اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کی مشیت سے وقوع پذیر ہوتا ہے اور یہ کہ اس بات کی نفی کرنے والوں کو قدریہ قرار دیا جائے، غلط اور خلافِ ضابطہ ہے بلکہ قدریہ ہونے کی نسبت اس بات کا اثبات کرنے والوں کی طرف دینا صحیح اور اولیٰ ہے اور محاورات میں شہرت بھی اسی کو حاصل ہے کہ جو خیر و شر کو تقدیر الٰہی کے ساتھ مربوط کرتے ہیں وہی قدریہ ہیں۔

حضرت امیر المومنینؑ کی گذشتہ نص بھی اسی قول کو ترجیح دے رہی ہے اور لاریب کہ اس متفق علیہ حدیث کا مصداق اشاعرہ ہیں اور ان کی مجوس کے ساتھ مشابہت بھی چندین وجوہ کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔

(۱) مجوس کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ایک چیز کو پیدا کر کے پھر اسی سے بیزاری کر لیتا ہے اور اشاعرہ کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ خود کفر کو خلق کرتا ہے اور پھر اس سے برأت کر لیتا ہے۔

(۲) مجوس کہتے ہیں کہ خواہران و مادران کے ساتھ نکاح اللہ تعالیٰ کی قضاء وقدر کے ساتھ وقوع پاتا ہے تو یہ جبریہ کہتے ہیں کہ مجوس کا انہی خواہران و مادران کے ساتھ نکاح الٰہی قدر و قضاء کے ساتھ واقع ہوتا ہے اور اس کی مثال دیگر بہت سارے رکیک اور پست اقوال ان کے ہاں موجود ہیں۔

علامہ اردبیلیؒ کا کلام:

علامہ احمد اردبیلیؒ حدیقۃ الشیعہ میں فرماتے ہیں کہ بہت ساری کتب تاریخ میں یہ واقعہ مسطور ہے کہ جبری اعتقاد رکھنے والا ایک مرد اپنے گھر آیا، تو دیکھا کہ ایک اجنبی مرد اس کی دختر کے ساتھ (غلط حال میں) بیٹھا ہوا ہے اس مرد نے تلوار نکالی اور اس مرد اور دختر کے چار ٹکڑے کرنے کا ارادہ کیا تو اسکی زوجہ دوڑ کر آگے آ گئی اور اس سے تلوار چھین لی اور

کہنے لگی تجھے شرم نہیں آتی کہ تو نے اپنے دین و مذہب کو چھوڑ دیا اور صاحب بن عباد جیسے رافضی مذہب کو خوش کر رہا ہے اور ایک مسلمان مرد اور ایک بے گناہ دختر کو رنجیدہ کر رہا ہے اور اپنے آپ کو بھی معصیت میں ڈالنے لگا ہے تو اس شخص نے کہا: الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسی بیوی عطا کی ہے جو شرعی مسائل سے خوب آگاہ ہے اور مجھے بچا لیا ہے کیونکہ میں تو دو بے گناہوں کا خون اپنی گردن میں ڈالنے لگا تھا اور رافضیوں کے گروہ میں شامل ہو رہا تھا۔

یہ حالت ہے ان لوگوں کی کہ تمام قبیح اور شنی افعال کو قضاء و قدر الٰہی کے ذمہ لگا کر خوش دل بیٹھے ہیں اور خیال کئے ہوئے ہیں کہ ہم بالکل بے گناہ ہیں۔

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (سورۂ توبہ، آیت ۳۰)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ان کو تباہ کرے، کدھر بھٹک گئے ہیں۔

معتزلہ کے نظریۂ تفویض کا بطلان:

معتزلہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو استقلال والی قدرت عطا فرمائی ہے لیکن پھر اس کے قائل ہو گئے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے سارے اعمال و افعال بندوں کو تفویض کر دیئے ہیں اور اب ان میں دخل نہیں دیتا بلکہ کوئی دخالت کر ہی نہیں سکتا (یعنی ان سے یہ قدرت سلب نہیں کر سکتا)۔

ان کا یہ نظریہ تفویض بھی جبریہ کے قول کی مثل باطل ہے، اور اس تفویض سے مراد وہ تفویض نہیں جو گزشتہ مباحث توحید و شرک میں زیر بحث رہی ہے (کیونکہ اس تفویض سے مراد یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام، خلق و رزق و اماتت و احیاء کا نظام، ربوبیت کا نظام، انبیاء، ائمہ ہدیٰ اور اولیاء خدا (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآلِ محمد علیہم السلام) کے تفویض کر دیا ہے اور خود اس ربوبیت سے دستبردار ہو گیا ہے یہ عقیدہ شرک اور باطل ہے) لیکن معتزلہ کا نظریہ تفویض کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو ان کے اعمال پر قادر کر دیا اور پھر خود عاجز ہو گیا ہے نہ ان کو روک سکتا ہے اور نہ ان سے قدرت واپس لے سکتا ہے یہ بھی باطل تفویض ہے اور جبریہ کے قول کے مثل غلط ہے۔ بنابریں معتزلہ بھی گذشتہ مذمت و نفرین کے لائق قرار پاتے ہیں۔

علامہ مجلسیؒ فرماتے ہیں: آپ کیلئے یہ امر واضح ہو جائے گا کہ اشاعرہ و معتزلہ میں سے ہر ایک ضال و گمراہ ہے اور ایک دوسرے کے بارے میں دونوں صادق ہیں لیکن دونوں ناحق ہے اور حق یہ ہے کہ "الامر بين الأمرين"

نہ جبر نہ تفویض بلکہ "الامر بین الامرین" ہے۔ البتہ یہ بات بھی یاد رہے کہ معتزلہ اور سارے ہی اس تفویض کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان میں سے کچھ لوگ اس اعتقاد پر ہیں جو امامیہ نے اختیار کیا ہے اور تسلیم کرتے ہیں کہ بندوں کی عبادت غیر مستقل ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان سے یہ قدرت سلب کر سکتا ہے البتہ جو کام بندہ کرتا ہے وہ اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے کرتا ہے۔

انسان کے قادر ہونے کے بارے میں احادیث:

بندوں کے قادر اور استطاعت والا ہونے کے بارے میں مختلف احادیث موجود ہیں بعض میں استطاعت کی نفی ہے اور بعض سے اس کا اثبات، لیکن شاید عددی اکثریت اثبات کرنے والی احادیث کو حاصل ہے پس جن میں نفی ہے اس سے مراد اس قدرتِ مستقلہ کی نفی ہے (یعنی انسان اس طرح قادر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر ہو گیا ہے) اور جن احادیث میں اثبات ہے اس سے مراد اس غیر مستقل قدرت کا اثبات ہے (یعنی انسان اپنے افعال پر قادر کیا گیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باہر نہیں ہے)۔

(۱) حلبیؒ نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تفسیر بیان کی:

وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ (سورۂ قلم، آیت ۴۳)

ترجمہ: اور ان لوگوں کو سجدہ کی دعوت دی جاتی تھی اور وہ صحیح سالم تھے۔

امامؑ نے فرمایا:

وَهُمْ مُسْتَطِيعُونَ يَسْتَطِيعُونَ الْأَخْذَ بِمَا أُمِرُوا بِهِ وَ التَّرْكَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَ بِذٰلِكَ ابْتُلُو.

کہ وہ لوگ مستطیع اور قادر تھے، جن کاموں کا انہیں امر کیا گیا تھا ان کو انجام دینے کی قدرت و استطاعت رکھتے تھے، اور جن کاموں سے ان کو روکا گیا تھا اس کو ترک کرنے کی استطاعت رکھتے تھے اور انہیں اس آزمائش میں ڈالا گیا تھا۔

پس اس آیت کریمہ کا مرادی مفہوم یہ ہوا کہ ان کافروں کو سجدہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی اور وہ تندرست اور سالم تھے، اور اس کی تفسیر یوں بیان کی گئی کہ ان کو سجدہ کی تکلیف دی گئی جبکہ وہ اس امر کی استطاعت اور قدرت رکھتے تھے کہ اس فرمان کی اطاعت کریں اور نواہی کو ترک کریں اور چونکہ انہیں یہ قدرت و اختیار دیا گیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاء و آزمائش کا مورد قرار پائے تھے (یعنی اگر قدرت نہ ہوتی تو محل ابتلاء نہ بنائے جاتے)۔

(۲) محمد بن ابی عمیر نے بعض اصحاب کے توسط سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے، فرمایا کہ کوئی بندہ فاعل نہیں بنتا مگر استطاعت سے اور ایسا ہوسکتا ہے کہ مستطیع لیکن فاعل نہ بنے لیکن ہر فاعل کا مستطیع ہونا ضروری ہے۔

(۳) علی بن یقطین حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں: فرمایا کہ حضرت امیر المومنینؑ ایک دن اہل کوفہ کی ایک جماعت سے گذرے وہ لوگ مسئلہ قدر کے بارے میں باہم مخاصمت میں مصروف تھے، آپؑ نے ان کے متکلم کو خطاب کیا اور فرمایا:

اَبِاللّٰهِ تَسْتَطِيعُ اَمْ مَعَ اللّٰهِ اَمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ؟

کیا تو اللہ تعالیٰ کے ذریعہ استطاعت رکھتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ یا اللہ کے بغیر؟ وہ شخص آپ کے اس سوال کا جواب نہ دے سکا تو آپ نے فرمایا: اگر تیرا گمان یہ ہو کہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ اپنے افعال پر قدرت و استطاعت رکھتا ہے تو پھر تجھے کسی شئے پر بالاستقلال قدرت حاصل نہیں (یعنی ہر حال میں اس کا محتاج ہے اور چاہے تو تجھ سے یہ قدرت سلب کرسکتا ہے) اور اگر تیرا گمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ استطاعت رکھتا ہے تو پھر تو اللہ تعالیٰ کے ملک میں اس کا شریک ہے اور اگر تیرا گمان یہ ہے کہ تو بغیر اللہ تعالیٰ کے مستطیع ہے تو پھر تو نے ربوبیت کا دعویٰ کر دیا ہے تو اب وہ عرض کرنے لگا۔ نہیں مولیٰ! میں ایسا گمان نہیں رکھتا، میں تو یہی کہتا ہوں کہ

باللہ استطیع،

کہ میں تو اس کے ذریعہ قادر ہوا ہوں اسی ذات نے مجھے توانائی عطا فرمائی ہے ان اسباب اور آلات کے ذریعہ جو اس نے مجھے دیئے ہیں تو حضرت نے فرمایا: آگاہ ہو اگر تو اس کلام کے خلاف دوسری بات کہتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔

(۴) شیخ محمد بن یعقوب کلینیؒ روایت کرتے ہیں: کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں سوال کیا، کیا اللہ تعالیٰ نے بندوں پر جبر کیا ہے؟ تو فرمایا: نہیں، پھر پوچھا! کیا اس نے سارا معاملہ خود بندوں کے حوالے کر دیا ہے اور انہیں آزاد چھوڑ دیا ہے تو فرمایا: نہیں ایسا بھی نہیں، پھر اس نے سوال کیا: تو اللہ تعالیٰ نے کیا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا! تیرے اللہ کا لطف و کرم ان دونوں باتوں کے درمیان ہے۔

(۵) اخوند مجلسیؒ اپنے رسالۂ مفردہ میں فرماتے ہیں کہ شیخ صدوق محمد بن بابویہ قمیؒ کتاب توحید اور کتاب عیون اخبار الرضا علیہ السلام میں بسند صحیح روایت کرتے ہیں کہ سلیمان جعفری نے حضرت ابوالحسن الرضا علیہ السلام کے متعلق ذکر کیا ہے کہ جب امام کے سامنے جبر و تفویض کے مذہب کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا: کیا میں تمہیں ایک ایسا قاعدہ کلیہ دے دوں کہ جب کوئی مخالف اس باب میں تمہارے ساتھ اختلاف اور مخاصمت کرے گا تو یہ قاعدہ اس کا منہ توڑ دے گا اور اسکی محبت کو باطل کر دے گا تو میں نے عرض کیا اگر مصلحت ہو تو شفقت فرمایئے، تو حضرت نے فرمایا! اللہ تعالیٰ کی اطاعت با اکراہ نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنی اطاعت پر مجبور کرتا ہو، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی معصیت ہوتی ہے غلبہ پا کر، کہ عاصی اس پر اس قدر غالب آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس معصیت سے باز نہیں رکھ سکتا اور مغلوب ہو چکا ہوتا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ملک میں بندوں کو مہمل چھوڑ رکھا ہے۔

وہ ہر شئے کا مالک ہے اور اسی نے ان کو مالک بنایا ہے وہی ہر شئے پر قادر ہے اور اسی نے ہر بندے کو جس پر چاہا ہے قادر بنا دیا ہے اگر یہ لوگ اس کے فرمان بردار اور مطیع بنتے ہیں تو ایسی اطاعت نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اعراض کر لیا ہو اور اگر یہ لوگ اس کی معصیت کا ارادہ کرتے ہیں تو اگر وہ چاہے کہ ان کے اس معصیت کے درمیان حائل ہو جائے تو ہو سکتا ہے اور اگر چاہے کہ حائل نہ ہو تو حائل نہیں ہوتا اور یہ لوگ معصیت کر لیتے ہیں پس اس وقت اللہ تعالیٰ

نے اس کام میں دخل نہیں دیا ہوتا۔

پھر فرمایا کہ جو کوئی اس کلام کو اس کی صدور کے مطابق ضبط کر لے، یاد رکھے اور تحقیق کرے تو مخالفین کے ساتھ ہر مباحثے اور ہر مخاصمے میں غالب رہے گا۔

(۶) کراجکیؒ نے کتاب کنز الفوائد میں روایت لکھی ہے کہ حسن بصری نے ایک عریضہ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ التحیۃ والثناء کی خدمت میں روانہ کیا اور اس میں لکھا کہ ہمارے ہاں لوگوں کے درمیان اعمال کی تقدیر اور بندوں کی استطاعت کے بارے میں اختلاف وجود پا چکا ہے (آپ ارشاد فرمائیے) تو حضرت امام حسن علیہ السلام نے لکھا کہ میں اور میرے والد گرامی اور ہمارے پدر گرامی (رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جس عقیدے پر ہیں وہ یہ ہے کہ جو کوئی یہ نظریہ رکھے کہ ہر جبر و شر تقدیر خدا کے ساتھ نہیں وہ کافر ہے اور جو کوئی اپنے گناہوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرے وہ فاجر ہے پھر آپ نے وہی مضمون لکھا جو گذشتہ حدیث میں ذکر کیا گیا (یعنی الامر بین الامرین ہے) پھر مکتوب کے آخر میں مزید اضافہ کرتے ہوئے لکھا بلکہ آپ نے اس پر حجت تمام کر دی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں سے جو کچھ کرنے کا مطالبہ کیا ہے وہ سب کام ان کو سمجھائے اور بتائے ہیں اور پھر ان کو ان کاموں کے کرنے کا راستہ دیا ہے (یعنی قادر بنایا ہے) اور جن کاموں کی ان کو نہی کی ہے تو اس کے نہ کرنے کا بھی راستہ دیا ہے (اور اس پر قادر بنایا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے صحیح طور سے اپنے بندوں پر حجت تمام کی ہے، والسلام۔

جبر کے قائلین کے دلائل:

بعض نے جبر کو ثابت کرنے کیلئے بعض آیات کریمہ سے تمسک کیا ہے مثلاً:

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (سورۂ رعد، آیت ۱۶)

اللہ تعالیٰ ہر شئے کا خالق ہے۔

اور اسی طرح انہوں نے چند ایک روایاتِ شیعہ سے تمسک کیا ہے جو کہ درحقیقت متشابہ ہیں۔

(۱) مثلاً ایک روایت کلینیؒ نے محمد بن مسلم کے ذریعہ امام ابو جعفر علیہ السلام سے نقل کی ہے کہ فرمایا:

إِنَّ فِي بَعْضِ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فِي كُتُبِهٖ إِنِّي اَنَا اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اَنَا خَلَقْتُ الْخَيْرَ وَخَلَقْتُ الشَّرَّ فَطُوبٰى لِمَنْ اَجْرَيْتُ عَلٰى يَدَيْهِ الْخَيْرَ وَوَيْلٌ لِمَنْ اَجْرَيْتُ عَلٰى يَدَيْهِ الشَّرَّ.

اللہ تعالیٰ نے اپنی جن کتب کو نازل فرمایا ان میں سے بعض میں یہ فرمایا کہ میں اللہ ہوں، میں ہی لائق عبادت ہوں، میرے علاوہ کوئی معبود نہیں، میں نے ہی خیر و شر کو خلق کیا ہے پس خوشخبری ہے اس شخص کیلئے جس کے ہاتھ پر میں نے خیر کو جاری کر دیا اور ملامت ہے اس شخص کیلئے جس کے ہاتھ پر میں نے شر کو

جاری کر دیا۔

(۲) قمیؒ نے حضرت ابوعبداللہ صادقِ آلِ محمد علیہ السلام سے روایت کی ہے آپ نے فرمایا:

قَالَ رَبُّنَا عَزَّ وَ جَل اَنَا اللهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا خَالِقُ الْخَيْرِ وَ الشَّرِّ،

ہمارے رب عزوجل نے فرمایا ہے: میں اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی لائق عبادت مگر میں خیر اور شر کا خالق ہوں۔

(۳) ایک روایت معاویہ بن وہب نے ابی عبداللہ علیہ السلام سے کی ہے کہ آپ فرمایا کرتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو وحی ہوئی اور آپ پر جو توراۃ نازل ہوئی اس میں یہ موجود ہے۔

اِنِّیْ اَنَا اللهُ............(سابقہ حدیث کے الفاظ)۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کا ان روایات پر تبصرہ:

وہ ان روایات میں سے چند ایک کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ ان روایات میں آئمہ حضرات نے کتب سماوی اور کلام الٰہی سے اس مضمون کو نقل کیا ہے لیکن امامیہ اور کیسانیہ فرقوں کے لوگ ان روایات سے چشم پوشی کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شر و معاصی، کفر اور فسق، سارے افعال، ابلیس، بنی آدم اور جنات کی اولاد کے مخلوق ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ دیگر فاعل افراد کو شریک قرار دے دیتے ہیں۔

سید کاظم رشتی کا بوگس خیال:

مجھے عبدالعزیز دہلوی کے ان روایات سے استدلال کرنے پر کوئی تعجب نہیں، وہ تو اپنے مزاج اور خیال کے مطابق ہر شئے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں تعجب انگیز باتیں تو ہمارے ہم عصر فاضل سید کاظم رشتی کی ہیں جو ایک طرف اپنے شیعہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر مراتب توحید کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: **الثالثة توحيد الافعال، یعنی تمام** افعال اس خداوند تعالیٰ سے ہیں اس کائنات میں اس کے علاوہ کوئی دوسرا فاعل نہیں ہے،

قال جو الداء العقول ومزالى أقدام الرجال ذأنكر هذا التوحيد طائقة زعما منهم انه ينافى الاختيارى افعال العباد،

یہ سنگین بیماری ہے اور مردوں کے قدم پھسلنے کا مقام ہے اور ہمارے اس نظریہ توحید کو ایک گروہ والے تسلیم نہیں کرتے اور خیال کرتے ہیں کہ یہ نظریہ بندوں کے افعال پر اختیار رکھنے سے منافات رکھتا ہے۔

تو کاظم رشتی کا یہ بیان اسی طرز پر ہے جو مخالفین حق نے اختیار کر رکھا ہے کیونکہ وہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ اللہ ہی ہر شئے کا خالق ہے لہٰذا اگر بندوں کو ان کے اپنے افعال کا خالق مانا جائے تو شرک لازم آجائے گا۔

کاظم رشتی کے شاگرد کی تاویل علیل:

پھر کاظم رشتی کے تابعدار شاگردوں میں سے ایک نے اپنے استاد کی اصلاح کرتے ہوئے کہا کہ احادیث میں جو کہا گیا ہے کہ خیر و شر کا خالق حق تعالیٰ ہے اس سے مراد خلق تکوینی نہیں، خلق تقدیری ہے اور یہی امر اعمش کی روایت میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے اور ہمارے استاد اجل سید محمد کاظم رشتی نے اپنے رسالہ بہبہانیہ میں توحید افعال خداوند متعال کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے یہی معنی مراد لیا ہے اور جو کوئی ان کے کلام بلاغت نظام سے اس کے علاوہ کوئی معنی سمجھا ہے اس کا فہم ناقص اور مریض ہے (انتھی کلامہ)۔

اس تاویل علیل کا غلط ہونا:

واضح باد کہ کاظم رشتی کا کلام جس نے ملاحظہ کیا ہے وہ یقین رکھتا ہے کہ اس میں ایسی کسی تاویل کی گنجائش موجود نہیں ہے کیونکہ اس نے توحید مذکور کو دو عنوان سے بیان کیا ہے ایک بیان کہ یہ عنوان شیعہ اصول کے مطابق ہے اور توحید عوام کے رتبہ میں قرار پاتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

و بیانه علی مایقرب الی الافهام ورتبة العوام هو ان یوحّد الله فی افعاله بان لا یشار که أحد فی فعله ولا یستعین بعد فی انشاء خلقه وهذا فی اذهاله الخاصة وان کان لغیره أیضا فعل باعانته تعالی واقداره ایاه کما فی الافعال الاختیاریة للعباد.

ترجمہ: اور اس توحید کا بیان جو اذہان کے زیادہ قریب ہے اور عوام کے رتبہ کے مطابق ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اس کے افعال میں واحد اس طرح مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فعل میں کوئی اس کا شریک نہیں اور وہ اپنی مخلوق کو پیدا کرنے میں کسی سے مدد نہیں لیتا اور یہ توحید اسے اپنے خصوصی افعال میں حاصل ہے اگرچہ غیر خدا کیلئے بھی فعل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کو قدرت دینے کے ساتھ ہوتا ہے جیسا کہ بندوں کے اپنے افعال اختیاریہ میں ہے۔

پھر بعد ازاں لکھتا ہے: یہ بیان ان علماء کے مذاق کے مطابق ہے جو ذوات و صفات کے درمیان فرق کرتے ہیں اور بندگان کے افعال اختیاریہ اور غیر اختیاریہ کے درمیان فرق مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ کچھ افعال بندگان سے اپنے اختیار کے ساتھ صادر ہوتے ہیں اور کچھ افعال ان سے غیر اختیاری طور پر سرزد ہوتے ہیں مثلاً رعشہ کی وجہ سے ہاتھ کی حرکت، نیند میں کسی شخص کی حرکت اور اس قسم کے دیگر افعال جن میں انسان کے اپنے اختیار کا دخل نہیں ہوتا، لیکن اس توحید کا ایک دوسرا بیان ان علماء کے ذوق کے مطابق ہے جو ذوات و صفات میں فرق نہیں کرتے اور حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں:

قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (سورۂ رعد، آیت ۱۶)

ترجمہ: کہہ دو کہ اللہ ہر شئے کا خالق ہے۔

اور اسی طرح قول خداوندی ہے:

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (سورۂ لقمان، آیت ۲۸)

اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ (سورۂ فاطر، آیت ۴۰)

ترجمہ: اور تمہارا خلق کرنا اور تمہیں دوبارہ اٹھانا نہیں ہے مگر ایک نفس کو خلق کرنے کی مثل۔

اور مجھے دکھاؤ جو کچھ انہوں نے زمین سے خلق کیا ہے۔

یہ علماء ان آیات کی تصدیق کرتے ہیں اور ان روایات میں اقوال آئمہ علیہم السلام کی بھی تائید کرتے ہیں کہ ان میں آیا ہے کہ ہر چیز الٰہی مشیت و ارادہ اور اس کی قضاء وقدر کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے اور اس حدیث قدسی میں جو کچھ آیا ہے اس کو مانتے ہیں کہ

اَنَا اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اَنَا خَلَقْتُ الْخَيْرَ فَطُوبٰى لِمَنْ اَجْرَيْتُهٗ عَلٰى يَدَيْهِ وَ خَلَقْتُ الشَّرَّ فَوَيْلٌ لِمَنْ اَجْرَيْتُهٗ عَلٰى يَدَيْهِ۔

پس یہ علماء ذوات وصفات کے درمیان تفرقہ نہیں کرتے اور متممات وشرائط میں جدائی نہیں مانتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے خداوند عالم کے فضل سے ہے اور وہ اس کو اس عنوان سے جاری فرماتا ہے کہ اضطرار لازم نہیں آتا کیونکہ خداوند عالم خود اس کو جاری کرتا اور عطا فرماتا ہے اور ہر کسی کو وہی دیتا ہے جس کا وہ اپنی زبان حال کے ساتھ اپنی استعداد کا مطلق مطالبہ کرتا ہے اور یہ استعدادات بھی اس کو فیض الٰہی کے ساتھ حاصل ہوئی ہوتی ہیں:

ترجمہ: پس تمام اشیا علی الاطلاق اللہ تعالی کے امر "کن" کے ساتھ موجود ہوتی ہیں اور ان اشیاء کے اختیارات اور ان کی قابلیتیں "فیکون" کے وقت پیدا ہوئی ہیں پس الأمر بین الأمرین کا راز یہی ہے اور اس مسئلہ کی حقیقت کو اس طرح بیان کرنا کہ اصلی مراد سے پردہ ہٹ جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس کا اصلی مفہوم سمجھانے کا فیصلہ کر رکھا ہے کیونکہ انسانی عقول اس کو برداشت نہیں کر سکتے اور اسی لئے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے اس وقت جب ان سے اس امر کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا "یہ ایک گہرا سمندر ہے اس میں داخل نہ ہونا" اور جب آپ سے دوبارہ اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا "یہ ایک تاریک راستہ ہے اس میں قدم نہ رکھنا" (انتھی)۔

نظر انصاف:

اگر کاظم رشتی کی اس عبارت پر انصاف کی نظر ڈالی جائے اور ملاحظہ کیا جائے کہ اس نے اس دوسری تقریر میں جس کو

جس کو وہ عوام کے فہم سے بالاتر قرار دیتا ہے اس میں افعال اختیاریہ اور افعال غیر اختیاریہ کے درمیان فرق کو ختم کرتا ہے اور استعداد کے فرق کو سامنے لاتا ہے جو بعینہٖ وہی کسب ہے جو فضل بن روز بہان کی تصریحات کے مطابق اُن کی اختراع ہے اور وہ جبر کو لازم آنے سے فرار کرتے ہوئے اس کا سہارا لینے پر مجبور ہوئے ہیں اور اپنے خیال میں اس طریقے سے بندوں کے اضطرار کو دور کرتے ہیں۔ واضح ہے کہ کاظم رشتی کا نظریہ اہل سنت کے اس نظریہ سے کوئی تفاوت نہیں رکھتا۔

میرے خیال میں کوئی شیعہ ایسا نہیں ہوسکتا جو اس قسم کے کلمات کو اپنی زبان پر لائے کیونکہ اس نظریہ کا شیعہ کے عقائد کے مخالف ہونا مکمل طور پر روشن ہے۔

اب اگر کوئی کہے کہ اس کی مراد خیر وشر کے خلق سے خلق تقدیری ہے خلق تکوینی نہیں تو وہ اس کو توحید افعال کیسے قرار دیں گے؟ کیونکہ اس سے یہ توحید تقدیر بنے گی نہ کہ توحید افعال (کیونکہ تقدیر کا مرحلہ اور عمل کا مرحلہ فرق رکھتا ہے) اور اسی طرح اس کی بعد والی یہ عبارت "کہ تمام اشیاء علی الاطلاق اس کے امر "کن" کے ساتھ موجود ہوئی ہیں" اس عبارت کا کیا مصرف بنے گا؟

اور پھر اس نے تمام شیعہ کے اس عقیدے پر جو طعن وتعریض کی ہے جو کہتے ہیں کہ اختیاری اور غیر اختیاری فعل میں فرق ہے اور وہ طعن کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس عقیدے والے قول خداوندی:

اللہ خالق کل شیء

اور حدیث: کل شیء بمشیة اللہ و قضائہ

کی تصدیق نہیں کرتے یہ طعن واعتراض کیسے درست بنے گا؟ کیونکہ شیعہ نے تقدیر کے عموم سے انکار نہیں کیا (یعنی وہ تسلیم کرتے ہیں کہ تقدیر اختیاری وغیر اختیاری دونوں کو شامل ہے) ان کے نزدیک دونوں افعال کے درمیان فرق خلق تکوینی میں ہے اب ہمارا رشتی سے سوال ہے کیا یہ فرق آپ کو تسلیم ہے؟ اگر ہے تو آیت وحدیث مذکور وتصدیق نہ کرنے والا طعن دونوں پر وارد ہوتا ہے آپ بھی اس میں شریک ہیں اور اگر آپ اس فرق کو تسلیم نہیں کرتے تو اے شیعہ پر طعن کرنے والے، آپ خود حریم تشیع سے خارج ہیں؟

(کیونکہ شیعہ تو اختیاری وغیر اختیاری افعال کے درمیان خلق تکوینی میں فرق کے قائل ہیں اور آپ ان پر قرآن و حدیث کی مخالفت کرنے کا طعن کرتے ہیں، تو آپ شیعہ امامی نہیں ہیں) لہٰذا رشتی کا ان کلمات کو اس طرح بیان کرنا کہ وہ بہت بڑے فضل وعلم کا مالک ہے اور معرفت اسرار میں بلند مقام رکھتا ہے سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ خود کو دیگر متکلمین مذہب امامیہ سے بلند اور اونچا دکھانا چاہتا ہے یا وہ ان غلاۃ کی طرف میلان رکھتا ہے جو بعض احادیث کے مضمون کے مطابق ان کے ہم نظر اور ہم قول ہوتے ہیں اور یہ کہ حضرت امیر علیہ السلام نے اس مسئلہ میں داخل ہونے اور قدم بڑھانے

سے نہی فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امام چاہتے ہیں کہ چونکہ یہ مقام بہت زیادہ دقیق مطالب پر مشتمل ہے اسلئے عوام اہل جبر کے باطل اقوال میں گرفتار ہونے سے محفوظ رہیں تو ایسی صورت میں رشتی صاحب کو لازم تھا کہ عوام کے اشتباہات کو دور کریں نہ یہ کہ عوام کے شبہات میں مزید اضافہ کرتے پھریں اور اسے زیادہ تقویت دیتے نظر آسکیں۔

دلائل قول جبر کے جوابات:

اب ہم برادران اور ان کے تابعداروں کے دلائل کے جوابات کا آغاز کرتے ہیں۔

آیت کریمہ سے استدلال کا جواب:

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ

والی آیت کریمہ کا تفصیلی جواب بیان ہو چکا ہے لیکن ہم دوسرے انداز سے اس کو یوں بیان کئے دیتے ہیں، کہ حنفیہ، زیدیہ قائل ہیں کہ ارادہ بندگان کی مخلوق ہے تو ان پر لازم ہوگا کہ اس آیۃ کی تخصیص کریں (یعنی ارادہ بندگان کو مخلوق خدا سے خارج تسلیم کریں اور غیر خدا کو خلق میں شریک خدا مانیں حالانکہ خداوند عالم نے خود فرمایا ہے؟

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (سورۂ مومنون، آیت ۱۴)

ترجمہ: برکتوں والا ہے وہ اللہ جو سارے خلق کرنے والوں سے بہترین ہے۔

تو اس آیت میں خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کو خالقوں میں سے بہترین خالق فرمایا ہے پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا خالق بھی ہے چنانچہ ان دونوں آیات کے درمیان جمع کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ (سورۂ زمر، آیت ۶۲)

والی آیت کریمہ سے مراد یہ ہے کہ تمام جواہر و اجسام کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اور کوئی غیر خدا کی صغیر یا کبیر جواہر یا اجسام کے خلق کرنے پر قادر نہیں ہے اور یہی بات اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ، (سورۂ حج، آیت ۷۳)

ترجمہ: وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کو پکارتے ہیں وہ ایک مکھی تک کو بھی خلق نہیں کر سکتے اگرچہ سارے اس مقصد کیلئے جمع ہو کر اس کام کو انجام دینے کی کوشش کریں۔

اس آیت کریمہ کے مفہوم سے بھی واضح ہو رہا ہے کہ خداوند عالم کے ساتھ اختصاص رکھنے والا امر جواہر و اجسام کا خلق کرنا ہے نہ کہ حرکات وسکنات اور ان کے تابع دیگر اعراض کا پیدا کرنا (یعنی یہ امور بندگان کے اختیار میں دیئے گئے ہیں) اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا ہے:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (سورۂ کہف، آیت ۲۹)

ترجمہ: پس جو چاہے مومن ہو جائے اور جو چاہے کافر بن جائے۔

نیز فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ، (سورۂ حجر، آیت ۸۵)

ترجمہ: اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان والی تمام اشیاء کو خلق نہیں کیا مگر سب کو برحق پیدا کیا ہے۔

اور معلوم ہے کہ کفر حق نہیں ہے پس کفر مخلوق خدا نہیں ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ (سورۂ حج، آیت ۷۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو۔

کسی بھی مکلف سے کسی فعل کو انجام دینے کا مطالبہ کرنا دلالت کرتا ہے کہ اس فعل پر اسے قدرت دی گئی ہے پس کوئی اس قدرت کی نفی کیسے کرسکتا ہے؟ اور کیسے درست ہے کہ

اللہ خالق کل شیء

سے مراد میں اللہ تعالیٰ نے ہر شئے کو "بلا واسطہ" اپنی مخلوق قرار دیا ہو (پس افعال بندگان خود بندگان کی مخلوق ہیں) اور ایسا نہیں ہے کہ اس نے بندگان کو مجبور خلق کیا ہے اور کوئی قدرت نہ دی ہے)۔

روایات کا جواب:

جبر کے قائلین نے جو روایات پیش کی ہیں ان کا جواب چند وجوہ سے دیا جاتا ہے۔

اول:

جبر کی نفی پر دلالت کرنے والی روایات پیش کی گئی ہیں اور ان روایات کی تائید عقلی دلائل اور قرآن مجید کی ایسی آیات کریمہ کے ساتھ کی گئی ہے جو آیات محکم اور قطعی ہیں لہٰذا تمام ایسی روایات جو ان کے مخالف مفہوم رکھتی ہیں ان سب کو یا تو مطروح قرار دیا جائے گا کیونکہ ان کے موضوع ہونے کا احتمال دیا جائے گا اور یہی امر بعض دیگر روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے (یعنی ان روایات کے موضوع ہونے پر روایات موجود ہیں) چنانچہ شیخ صدوقؒ نے کتاب توحید میں اور عیون اخبار الرضا علیہ السلام میں اپنی سند کے ساتھ حسین بن خالد سے روایت نقل کی ہے کہ میں نے حضرت امامؑ کی خدمت میں عرض کیا اے فرزند رسولؐ! کچھ لوگ اہل بیت علیہم السلام کی طرف تشبیہ اور جبر کا قول منسوب کرتے ہیں اسلئے کہ ان کے آباء طاہرین علیہم السلام سے ایسی روایات نقل کی گئی ہیں جو اس قول پر دلالت کرتی ہیں تو حضرتؑ نے فرمایا: اے فرزند خالد!

بتاؤ میرے آباء سے تشبیہ کے بارے میں جو روایات نقل کی گئی ہیں وہ زیادہ ہیں یا جو روایات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں نقل کی گئی ہیں وہ زیادہ ہیں تو عرض کیا کہ جناب رسالت مآبؐ سے اس باب میں روایت کی گئی روایات کی تعداد زیادہ ہے،

تو حضرتؑ نے فرمایا: تو پھر اس قول کو خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کیوں منسوب نہیں کرتے؟ میں نے عرض کیا: اسلئے کہ وہ گمان کرتے ہیں کہ ایسی روایات آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر افتراء اور بہتان ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان میں سے کوئی بات ارشاد نہیں فرمائی ہے تو حضرتؑ نے فرمایا: کہ میرے آباء طاہرین علیہم السلام کا معاملہ بھی اسی طرح ہے کہ انہوں نے ان کلمات کو ارشاد نہیں فرمایا، لوگوں نے ان حضرات پر افتراء باندھ رکھا ہے اور افتراء و بہتان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ تشبیہ اور جبر کا قول درحقیقت ان غالیوں کی مکاری ہے جو عظمت الٰہی کو سبک کرتے ہیں پس جو کوئی ان غالیوں کو دوست رکھے گا وہ ہمارا دشمن ہے اور جو ان سے دشمنی کرے گا وہ ہمارا دوست ہے۔ تا آنکہ حضرتؑ نے فرمایا:

يَا ابْنَ خَالِدٍ مَنْ كَانَ مِنْ شِيعَتِنَا فَلَا يَتَّخِذَنَّ مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيرًا.

اے فرزند خالد! جو ہمارے شیعہ میں سے ہے وہ ان لوگوں میں سے کسی کو نہ دوست رکھتا ہے اور نہ ناصر ومددگار سمجھتا ہے۔ (وسائل الشیعہ)

دوم:

اور ایسی روایات کو مطروح قرار دینے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان میں تقیہ کا احتمال موجود ہے کیونکہ روایات عامہ کے نظریئے سے موافقت رکھتی ہیں اور انہوں نے ایسی روایات نقل کی ہیں چنانچہ وہ اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتا ہے اور ابن ماجہ نے بھی عامہ سے یہ بات نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

أَنَا خَلَقْتُ الْخَلْقَ وَ خَلَقْتُ الْخَيْرَ وَ الشَّرَّ فَطُوْبٰى لِمَنْ قَدَّرْتُ عَلٰى يَدِهِ الْخَيْرِ وَ وَيْلٌ لِمَنْ قَدَّرْتُ عَلٰى يَدِهِ الشَّرِّ.

ترجمہ: میں نے ساری مخلوق کو خلق کیا میں نے خیر وشر کو خلق کیا پس بشارت ہے اس کیلئے جس کے ہاتھ پر میں نے خیر کو مقدر کیا اور ملامت ہے اس کیلئے جس کے ہاتھ پر میں نے شر کو مقدر کیا۔

(معلوم ہوا کہ یہ عامہ کا نظریہ ہے، پس اگر امامؑ سے ایسی روایت آئے جو ان کے نظریہ کے موافق ہو تو اس روایت کے بارے میں احتمال غالب ہوسکتا ہے کہ آپؑ نے یہ بات حالت تقیہ میں کہی ہوگی)۔

سوم:

اور ان روایاتِ جبر کے بارے میں تیسرا جواب یہ ہے کہ ان کی تاویل کی جائے گی اور مراد خلق تقدیری لیا جائے گا اور مذکورہ بالا روایت میں "قَدَرْتُ عَلَىٰ يَدِهٖ" کے الفاظ اس معنی کے مراد ہونے کی تائید کرتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہر شئے کی تقدیر میں نے کی ہے، خیر کی اور شر کی دونوں کی تقدیر میں نے کی ہے، خلق سے مراد تقدیر کرنا ہے) لیکن خلق تقدیری سے بندگان کے خیر و شر کا فاعل ہونے کی نفی نہیں ہوتی اور نہ ہی بندگان کی طرف سے خیر و شر کے خلق تکوینی کی مخالفت ہوتی ہے اور افعال عباد کی فاعلیت اس سے سلب نہیں ہوتی۔ لہٰذا حق یہ ہے کہ بندگان کے افعال اختیاری اور امور اضطراریہ کے درمیان فرق ہے بندگان اپنے اختیاری افعال کے تکوینی خالق ہیں اور اضطراری افعال کے تکوینی خالق نہیں ان میں مجبور ہیں۔

آیت اور روایت جو عموم رکھتی ہیں اور تمام اشیاء کے خلق تقدیری کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتی ہیں وہ اس حق کے منافی نہیں ہیں تمام اشیاء کی تقدیر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے لیکن بندگان اپنے افعال کے خود تکوینی خالق ہیں اور ان دونوں باتوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

لیکن کاظم رشتی پر سخت تعجب ہے کہ اس نے تمام اشیاء کے ساتھ خلق تقدیری کے تعلق رکھنے کو مندرجہ بالا فرق کے منافی قرار دیا اور جو اس فرق کے قائل ہوتے ہیں ان کو اس نے آیت کی تصدیق کرنے والوں اور حدیث کی تائید کرنے والوں سے خارج قرار دیا،

ان هذا لشیء عجائب،

اس کی یہ باتیں یقیناً عجیب وغریب باتیں ہیں۔

گویا اس نے ان احادیث اور آیات کو جو اس فرق پر دلالت کرتی ہیں اور عقیدہ جبر کو رڈ کرتی ہیں تصدیق نہیں کی ہے اور ان کی مخالفت کی راہ پر چلا ہے

سامحه الله بالمغفرة ان کان من اهل ایمان و القصور راجعا الی البیان

(یعنی اگر وہ اہل ایمان سے تھا تو اللہ تعالیٰ اس کو مغفرت دے پھر ہم یہ قصور اس کے بیان کا قصور مانیں گے نہ کہ اس پر اعتراض کرنے والوں کے فہم و عقل کا قصور اور اگر وہ آنحضرت علیہ السلام کی نہی کی تصدیق کرتا اور اس مسئلہ میں بے جا دخل نہ دیتا (یعنی معصومؑ نے فرمایا تھا کہ یہ گہرا سمندر ہے اس میں داخل نہ ہونا) تو اس کو چاہیے تھا کہ اس نہی پر عمل کرتا، قدم نہ بڑھاتا تو اس کا قدم بیان واقعی سے لغزش نہ کھاتا۔

فصل ششم:

اللہ تعالیٰ حکیم ہے

اللہ تعالیٰ حکیم ہے اس کے سارے کام حکمت اور مصلحت کے مطابق ہیں کوئی عبث اور بے فائدہ فعل اس سے صادق نہیں ہوتا اس کے تمام افعال میں صحیح اغراض و مقاصد اور عظیم حکمتیں ملحوظ ہوتی ہیں لیکن الٰہی افعال کی تمام اغراض بندگان کی طرف عود کرتی ہیں اللہ تعالیٰ کی غرض کبھی بھی اپنی ذات کیلئے کسی نفع کا حصول نہیں ہوتی (اس کے افعال کے تمام منافع اور مفادات بندوں کیلئے ہوتے ہیں، اس کی مقدس ذات ہر قسم کے نفع سے غنی اور بے نیاز ہے) اور یہ بات شیعہ مذہب کے ضروریات و بدیہیات میں سے ہے اور اس پر تمام کا اجماع ہے۔

اہل سنت میں سے معتزلہ نے شیعہ کی موافقت کی ہے لیکن اشاعرہ نے حکماء کی اتباع کرتے ہوئے کہا ہے کہ افعال خدا کبھی بھی اغراض و مقاصد کے تحت نہیں ہوتے اگرچہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے افعال میں سے ہر فعل انواع و اقسام کی حکمت اور ثمرات پر مشتمل ہوتا ہے لیکن گمان کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا مقصود ان افعال سے یہ ثمرات نہیں ہوتے اگرچہ یہ ثمرات ان افعال پر مترتب ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فعل ان ثمرات سے خالی ہو اور بظاہر اہل اسلام میں سے کوئی ایک اس امر سے انکاری نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے افعال مصالح و حِکَم پر مشتمل ہوتے ہیں اگرچہ اشاعرہ ان مصالح کو غایات و اغراض قرار دینے سے منکر ہیں۔

والد مرحوم علامہ غفر انمآب اعلی اللہ مقامہ کا ارشاد:

آپ اپنی کتاب صوارم میں فرماتے ہیں کہ بعض اشاعرہ نے جب اپنے قول کے پست اور کمزور ہونے کا مشاہدہ کیا تو اپنے امام کے ناموس کے تحفظ کیلئے کہنے لگے کہ ابوالحسن اشعری حق تعالیٰ کے افعال کو اعراض کے ساتھ متصل و مربوط نہیں مانتا لیکن ان کے حکمت و مصلحت پر مشتمل ہونے سے انکاری نہیں ہے۔

حالانکہ ان کا یہ دعویٰ دروغ محض ہے اور ہم نے اس کی وضاحت کتاب عماد الاسلام میں کردی ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا

ہے کہ دروغ نہ ہو؟ حالانکہ اس نے اور اس کے اتباع میں سے فخر الدین رازی و شارح مواقف اور شارح مقاصد جیسے حضرات نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ دی ہے کہ کفار کو مکلف بنانے اور ان کو جہنم میں ہمیشہ کیلئے عذاب دینے میں کون سی مصلحت و غایت ہوسکتی ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ خود جانتا ہے کہ وہ تکلیف دینے کے باوجود ایمان نہیں لائیں گے چنانچہ بعض حضرات نے یہ یوں کہا ہے:

انّ بعض افعال اللہ تعالیٰ غیر مدلل بالغایۃ اصلا، مثل تخلید الکفار فی النار اذ لا نفع فیہ لا حدّ.

اور عبد العزیز دہلوی کہتا ہے کہ شیطان کو پیدا کرنا، اسے لمبی مہلت دینا، اسے بنی آدم کو گمراہ کرنے اور اغوا کرنے پر قدرت دے دینا، اور ہر ایک انسان کے دل پر تصرف کرنے کا اختیار عطا کرنا یہ اصلح (زیادہ صالح) کے مادہ کو جڑ سے اکھاڑ دینے والا عمل ہے (انتہی بلفظہ)۔

اس قسم کے تمام کلمات سخیفہ سے نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان کا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کے تمام افعال میں سے ہر فعل حکمت ومصلحت پر مشتمل ہوتا ہے یہ فقط زبانی باتیں ہیں، یہ لوگ باطنی طور پر ربانی مصالح وحکمت کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف فضول اور قبیح کی نسبت کو درحقیقت جائز مانتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ تو فرما رہا ہے:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا (سورہ مومنون، آیت ۱۱۵)

ترجمہ: کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہم نے تم سب کو عبث (فضول) خلق کیا ہے۔

اور حق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے کوئی فعل خالی از حکمت اور عاری از مصلحت نہیں ہے اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ ہمارے ناقص عقول اس کے ہر ایک فعل کی حکمت تک پہنچ جائیں لیکن جن افراد نے اپنے گھٹیا عقول پر تکیہ کر رکھا ہے اور رکیک اوہام پر اعتماد کئے ہوئے ہیں وہ رجماً بالغیب (اندھیرے میں نشانہ بناتے ہوئے) اس مدبر صانع کی تدبیر اور اس کے مصالح وغایات کا انکار کر دیتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد:

توحید مفضل میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

إِنَّ الشُّكَّاكَ جَهِلُوا الْأَسْبَابَ وَ الْمَعَانِيَ فِي الْخِلْقَةِ وَ قَصُرَتْ أَفْهَامُهُمْ عَنْ تَأَمُّلِ الصَّوَابِ وَ الْحِكْمَةِ فِيمَا ذَرَأَ الْبَارِي جَلَّ قُدْسُهُ وَ بَرَأَ مِنْ صُنُوفِ خَلْقِهِ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ السَّهْلِ وَ الْوَعْرِ فَخَرَجُوا بِقَصْرِ عُلُومِهِمْ إِلَى الْجُحُودِ وَ بِضَعْفِ بَصَائِرِهِمْ إِلَى التَّكْذِيبِ وَ الْعُنُودِ حَتّٰى أَنْكَرُوا خَلْقَ الْأَشْيَاءِ وَ ادَّعَوْا اَنَّ تَكَوُّنَهَا بِالْإِهْمَالِ لَا صَنْعَةَ فِيهَا وَ لَا تَقْدِيرَ وَ لَا حِكْمَةَ مِنْ مُدَبِّرٍ وَ

لَا صَانِعَ تَعَالَى اللهُ عَمَّا يَصِفُونَ وَ قَاتَلَهُمُ اللهُ اَنّٰى يُؤْفَكُونَ فَهُمْ فِي ضَلَالِهِمْ وَ غَيِّهِمْ وَ تَجَبُّرِهِمْ بِمَنْزِلَةِ عُمْيَانٍ دَخَلُوا دَاراً قَدْ بُنِيَتْ اَتْقَنَ بِنَاءٍ وَ اَحْسَنَهُ (الی آخر التمثیل من کلامه الشریف).

ترجمہ: ذات باری کے صانع عالم ہونے میں شک رکھنے والے تخلیق کے اسباب و معانی سے جاہل ہیں ان کے افہام اس بارے میں صحیح فکر اور حکمت کے ادراک سے قاصر ہیں اللہ تعالیٰ جل قدسہ نے جو کچھ بنایا ہے اور بر و بحر، میدانوں اور پہاڑوں میں انواع و اصناف کی مخلوقات کو خلق فرمایا ہے۔

یہ لوگ اس میں غور و فکر کرنے اور اس کی حکمتوں کے ادراک سے غافل ہیں اسی لئے ان کی یہ کم علمی انہیں اس ذات کے انکار کی طرف لی گئی ہے اور بے بصیرتی نے تکذیب و عناد بازی تک پہنچا دیا ہے تا آنکہ وہ کائنات کی اشیاء کے خلق ہونے کے بھی منکر ہو گئے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ساری مخلوق مہمل ہے اس میں نہ کاریگری ہے، نہ تقدیر، نہ کسی مدبر کی حکمت ہے اور نہ کوئی بنانے والا حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے خیالات سے بلند ہستی ہے اور ہر قسم کے عیب سے پاک ہے اللہ ان کو تباہ کرے کدھر کو بھٹک رہے ہیں؟

یہ لوگ اپنی گمراہی، اندھے پن اور حیرانگی کی وجہ سے ایسے نابینا افراد کی مثل ہیں جو کسی ایسے سرائے میں داخل ہوں جو انتہائی منظم اور مستحکم ہو اس میں فاخرہ قالین گسترده ہوں، انواع و اقسام کے ماکولات، مشروبات اور ملبوسات موجود ہوں انسان کی ہر طرح کی ضرورت کا سامان مہیا ہو اور ہر چیز اپنے صحیح مقام اور موزوں محل پر سجائی گئی ہو، خوب سلیقے اور درست تدبیر کے ساتھ رکھی گئی ہو۔

پھر یہ اندھے اور نابینا اس میں آئیں اور اس عظیم الشان عمارت کے اندر دائیں بائیں دوڑنے لگیں اس کے کمروں میں داخل ہوں نہ انہیں اس عظیم عمارت کا مشاہدہ ہو پائے اور نہ اس کے اندر موجود ساز و سامان کی خبر ہو سکے یہ کورانہ ہاتھ پاؤں ماریں اور برتن یا دیگر اشیاء کے بارے میں کچھ سمجھ نہ پائیں کہ یہ یہاں کیوں رکھے گئے ہیں حالانکہ درحقیقت ان کو بالکل صحیح اور مناسب مقام پر رکھا گیا تھا اب یہ اندھے جو اس کی حقیقت کا ادراک نہ کر پائیں تو غضبناک ہو جائیں اور اس سرائے کے بنانے والے اور اس کو سجانے والے کی مذمت کرنے لگیں۔

بعینہ یہی صورت ان منکرین و ملحدین کی ہے جو معبود برحق کی تقدیر کے حسن اور اس عالم کی تدبیر کے کمال کے اسلئے انکاری ہو گئے ہیں کہ خود ان کے اذہان ان اسباب و علل اور فوائد کے ادراک سے عاجز آئے ہیں جو خالق کائنات نے اس عالم امکان کی اشیاء میں ملحوظ خاطر رکھے ہیں۔ یہ خود نادان، حیران اور نافہم لوگ ہیں وہ اس کائنات کے اتقان خلقت، حسن صنعت اور درستی نظام کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں جب یہ کسی چیز کے سبب کو نہیں سمجھ پاتے اور اس کی حکمت کے ادراک تک ان کی عقل کو رسائی نہیں ہوتی تو اس چیز کی مذمت شروع کر دیتے ہیں اور اس شئے کو خطاء اور قلت تدبیر

سے موصوف کرنے لگتے ہیں۔

پس اشاعرہ جو فلاسفہ کے تابعدار اور ان جیسے لوگوں کے پیروکار ہیں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ باری تعالیٰ کے افعال، اغراض و غایات پر مشتمل نہیں ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ کے افعال کی کوئی غرض و غایت ہو تو لازم آئے گا کہ وہ ذات خود ناقص ہو اور اپنے غیر سے طلب کمال کرے اور اس غیر کے ذریعہ کامل بنے کیونکہ یہ غرض و غایت فاعل کے حق میں اصلح اور اولیٰ قرار پائے گی اور کمال کا معنی بھی یہی ہے (پس وہ اس غرض کے ذریعہ کمال تک پہنچ سکتا ہے)۔

حالانکہ ان شاعرہ کو یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ باری تعالیٰ کی ذات حقہ جمیع الجہات کامل ہے اور کامل بالذات ہستی کا مقتضیٰ یہ ہوتا ہے کہ اپنے غیر کو نفع پہنچانے اور شرائط کے متحقق ہونے اور موانع کے دور ہونے کی صورت میں دوسروں کو نفع پہنچانے سے خود کو باز نہ رکھے پس اگر قدرت ہو اور موانع بھی نہ ہوں پھر بھی نفع نہ دے یہ نقص ہے (اور وہ ذات ہر نقص سے پاک ہے)۔

نیز اگر حق تعالیٰ کوئی کام بغیر غرض و غایت کے واقع کرے تو لازم آئے گا کہ وہ اپنے افعال میں لاعب (کھیلنے والا اور عابث (فضول اقدام کرنے والا) ہے اور عبث کام کرنا سفاہت اور بے عقلی کا لازمہ ہے۔

جبکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (سورۂ ذاریات، آیت ۵۶)

ترجمہ: میں نے انسانوں اور جنات کو فقط اس لئے خلق کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

نیز فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (سورۂ دخان، آیت ۳۸)

اگر اللہ تعالیٰ کی ذات کی نسبت سے دوسروں کو نفع پہنچانا اس کے عدم (نہ پہنچانے) سے اولیٰ ہے تو اس میں کوئی عیب اور کوئی نقص نہیں ہے کیونکہ یہ تمام امور صفات فعل میں سے ہیں البتہ اس فرق کے ساتھ کہ کبھی اس ذات کیلئے کسی فعل کے انجام دینے میں حکمت ہوتی ہے اور وہ فعل اولیٰ اور الیق ہوتا ہے پھر بھی اس فعل کے ترک کرنے میں مصلحت ہوتی ہے اور ترک اولیٰ والیق ہوتا ہے کیونکہ یہ سارے امور اعتباری اور اضافی ہیں اس میں تغیر کا آنا لازمی ہے۔

اور جو امر اس ذات کامل کیلئے کبھی روا نہیں ہوتا وہ یہ ہے کہ وہ اپنے صفاتِ کمالیہ میں کسی دوسرے کا کبھی محتاج نہیں ہوتا اور یہ سارے اعتباری امور اور اضافی اسماء جو افعال کے صدور کے لحاظ سے اس کی ذات کی طرف منسوب ہوتے ہیں جب کبھی نامناسب اور غیر اصلح ہوتا ہے اس وقت اس ذات کا ان سے خالی ہونا نہ نقص ہوتا ہے نہ عیب اور اسی طرح مناسب اور اصلح وقت میں وہ ذات ان صفات سے متصف ہوتی ہے تو یہ اتصاف استکمال اور طلب کمال نہیں ہوتا بلکہ یہ

ایسا کمال ہوتا ہے جو اس کی ذات سے صادر ہوتا ہے اور اگر اشاعرہ اسی کو استکمال کہتے ہیں تو یہ ان کی اپنی اصطلاح ہے اور اصطلاح میں کوئی بحث و نزاع نہیں ہوتی اور نہ کوئی عیب ہوتا ہے کیونکہ کمال عقلی پر کمال ذاتی کا حکم جاری نہیں ہوتا۔

اور ان اشاعرہ کے عقیدہ قاعدہ کے بطلان کو زیادہ واضح اور ظاہر کرنے والا ایک نکتہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے افعال میں جو جمیع منافع اور وجوہِ حکمت جمع ہیں ان کے نظریہ کے مطابق لازم آئے گا وہ سب مقصود خدا افعال خدا نہ ہوں مثلاً حیوانات کو آنکھیں دینا رؤیت کیلئے نہیں یا حق تعالیٰ کو ان آنکھوں کی عطا پر آمادہ کرنے والا مقصد وہ سارے عظیم منافع نہیں جو رؤیت اشیاء پر مترتب ہوتے ہیں اسی طرح کانوں کا پیدا کرنا، کلام سننے اور ان کے مطالب پر آگاہ ہونے کیلئے نہیں، اور نہ ہی طیور و وحوش کی آوازیں اور دیگر الحان طیبہ کے سننے کیلئے ہے، اسی طرح دانت سخت غذا کو چبانے کیلئے نہیں، ہاتھوں کی تخلیق غلبہ پانے کیلئے نہیں، قدموں کی تخلیق راہ چلنے کیلئے نہیں۔

دیگر تمام اعضاء و جوارح کی تخلیق کا کوئی ملحقہ نہیں، آگ میں حرارت جلانے کیلئے نہیں، پانی میں برودت ٹھنڈک پہنچانے کیلئے نہیں، شمس و قمر و نجوم روشنی کیلئے نہیں اور نہ روز و شب، ماہ و سال کے حساب کیلئے ہیں، دوائیں بیماری کے علاج کیلئے نہیں، یہ کتنی گھٹیا اور سخیف بات ہے کہ اس علیم حکیم ذات نے منافع جلیلہ پر مشتمل عظیم افعال فوائد و منافع پہنچانے کے قصد کے بغیر صادر کر دیئے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے افعال کی تعلیل جو خود بیان فرمائی ہے وہ ساری باطل اور غلط ہے اور وہ اس کی تاویل کیلئے انتہائی دور از کار باتوں کا سہارا لیتے ہیں۔

اگر ہم اشاعرہ کے اس قول سخیف کے لوازم کو پوری طرح واضح کریں تو کلام بہت زیادہ طویل ہو جائے گا لہٰذا ہم اس مختصر کتاب میں اسی مقدار کے بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی اکثر آیات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ طاہرین علیہم السلام کی بکثرت احادیث کا بیان اس حقیقت سے مملو ہے کہ حق تعالیٰ کے افعال ان کی اغراض و غایات کے قصد سے مدنظر وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ (البتہ ان اغراض کی بازگشت مخلوق کی طرف ہے، خالق کی طرف نہیں)۔

فصل ہفتم:

لطف، توفیق، خذلان، ابتلاء، تمحیص، محق

(اور استدراج کے معانی کا بیان)

لطف:

امامیہ اور معتزلہ کے اکثر متکلمین کہتے ہیں کہ عقلی طور پر اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ لطف کرے یا تو اپنے عدل کی وجہ سے یا کرم کی وجہ سے یا ان دونوں کی وجہ سے لیکن اس کیلئے کچھ شرائط ہیں جن کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔

لطف سے مراد یہ ہے جو امر مکلف کو اطاعت کے نزدیک کرے اور معصیت سے دور کرے جبکہ مکلف کا اختیار بھی باقی رہے مثلاً انبیاء بھیجنا، آئمہ منصوب کرنا، ثواب کا وعدہ کرنا، عقاب کی وعید کرنا اور اسی طرح دیگر الطاف ہیں از قبیل نعمات ہوں یا از قبیل آلام، عدمی ہوں یا وجودی۔

توفیق:

پس اگر حاصل ہونے والا واجب یا مطلقاً فعل حسن ہو، تو اس کو توفیق کہتے ہیں اور اگر اس سے معصیت کو ترک کرنا حاصل ہو تو اسے عصمت کہتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو اسے مقرب کہتے ہیں بعض حضرات نے مقرب بالمعنی الاعم کی دو قسمیں قرار دی ہیں ناجع اور غیر ناجع، وہ کہتے ہیں اگر لطف ناجع ایسا ہو کہ اس سے واجب وقوع پذیر ہوتا ہو (کہ اگر وہ نہ ہوتا تو وہ واجب واقع نہ ہوتا) ایسے لطف ناجع کو توفیق کہتے ہیں اور ایسا لطف کہ جس سے قبیح مرتفع ہوتا ہو (کہ اگر یہ نہ ہوتا تو قبیح مرتفع نہ ہوتا) ایسے لطف کو عصمت کہتے ہیں۔

خذلان:

اور جب ایسا لطف نہ کیا جائے اس سے منع برتی جائے تو اسے خذلان کہتے ہیں اور قابل ذکر ہے یہ بات کہ علماء

اعلام کی اکثریت کا کلام لطف کے وجوب کی وضاحت کے بارے میں خالی از اجمال نہیں ہے البتہ ان میں سے محققین کرام مثلاً علامہ مجلسیؒ نے بحار میں اور ہمارے والد ماجد علامہ غفران مآب (قدس اللہ ارواحہما) نے اپنی کتاب صوارم اور عماد الاسلام میں اس بارے میں خوب تحقیق و تنقیح فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ لطف کا اطلاق علماء دین کے کلام میں چند وجوہ سے آیا ہے۔

اوّل: لطفِ ممکن: وہ ہوتا ہے جو مامور بہ کوانجام دینے پر تمکین میں دخل رکھتا ہو۔

دوّم: وہ لطف جسے تمکین واقتدار میں دخل نہ ہو۔

اور لطف کا یہی مفہوم امامیہ متکلمین کے ہاں مشہور ہے وہ کہتے ہیں:

اللّطف ما يقرّب الى اللطف و يبعّده عن المعصية و لا يكون له حظ فى التمكين و لا يبلغ حد الإلجاء.

لطف وہ ہے جو اطاعت کے قریب کرے، معصیت سے دور کرے، اسے تمکین میں کوئی حصہ نہ ہو اور وہ الجاء (مجبور کر دینے) تک نہ پہنچے۔

سوم: لطف جو ایک معنی عام ہے سابقہ دونوں معانی کو شامل ہے یعنی جو اطاعت کے قریب کرے، معصیت سے دور کرے، عام اس سے کہ وہ تمکین میں دخل رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

علامہ مجلسیؒ کا ارشاد:

علامہ مجلسیؒ حق الیقین میں فرماتے ہیں: لطف کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، بحسب عقل اور لطف وہ امر ہوتا ہے جو مکلف کو اطاعت کے قریب کرے اور معصیت سے دور کرے مثلاً پیغمبروں کا روانہ کرنا، آئمہ کو منصوب کرنا، ثواب کا وعدہ اور عقاب کی وعید کرنا (وامثال ذالک)۔

شارح مقاصد کا کلام:

وہ کہتے ہیں: لطفِ مُقرّب کی مثال ہے، ارزاق پیدا کرنا، اجل (یعنی موت) کا فیصلہ دینا، قویٰ عطا کرنا، عقل کو کمال بخشنا، ادلہ قائم کرنا اور اس کی مثل دیگر بہت سارے امور ہیں۔

علامہ حلیؒ کا کلام:

کتاب الفین میں علامہ صراحت سے فرماتے ہیں کہ عقلی قویٰ کا عطا کرنا بھی لطف الٰہی ہے۔

سید مرتضیٰؒ کا کلام:

اس میں بھی بڑی صراحت موجود ہے کہ لطف کی معرفت عام ہے اور بہت سارے دلائل سے ثابت ہے کہ لطف عام ہے لہٰذا جو اطاعت پر تمکین اور قدرت عطا کرے اور سیئات کے ترک پر قادر بنائے، وہ لطف ہے یعنی تمام ایسے اسباب و آلات جن کے بغیر انسان کو اطاعات پر قدرت وتوانائی اور معاصی کو ترک کرنے پر طاقت حاصل نہیں ہوتی وہ لطف ہیں مثلاً زبان اور دیگر اعضاء و جوارح کو اطاعت اور شکر کیلئے خلق کرنا، عقل کو کمال دینا اور اس کی مثل تمام ایسے امور کی تکالیف کی ادائیگی اور تابعداری کا انجام دینا ان پر موقوف ہے (اگر وہ نہ ہوتے تو ایسا نہ ہوسکتا) تو ان تمام امور کا بندگان کو عطا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کیونکہ اس کے بغیر تکلیف دینا بے جا اور قبیح قرار پاتا ہے اور شاید یہ وجوب اس وجوب مشروط سے زیادہ مشابہ ہے جو اکثر موضوعات میں اور بالخصوص جزئی مواد میں بیان کیا جاتا ہے۔

اور بعض حضرات نے لطف کو غیر ممکن کے ساتھ مختص کیا ہے اس کی نظر اس امر کی طرف ہے کہ تکلیف دراصل تمکین کی فرع ہے (جب تک تمکین نہ دے لیکن کسی کام کے کرنے کی قدرت نہ دے اس وقت تک اس کام کی تکلیف دینا جائز نہیں) اور تمکین دینا ابتداء میں تفضّل خداوندی ہے۔

لیکن تکلیف کے اصول کے بیان میں ہے کہ حکمت کے مدنظر تکلیف واجب ہے لہٰذا وہ سب امور بھی واجب ہیں جن پر تکلیف موقوف ہے ورنہ لازم آئے گا کہ اپنی غرض کے حصول میں خود نقض کیا جائے (خود ہی رکاوٹ ڈال دی جائے اور لطف کی فہرست میں ہے انبیاء بھیجنا، ان کے ہاتھوں پر معجزات کا ظاہر کرنا، حق کے عقائد کی حقانیت پر دلائل قائم کرنا کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ تکالیف کے شرائط میں سے ایک ہے مکلف کا اس سے عالم ہونا اور اس چیز کے علم کا متمکن ہونا جس کی اسے تکلیف دی گئی ہے اور اس فعل پر قدرت رکھنا اور یہ شرائط انبیاء کی بعثت اور رسل کی روانگی کے بغیر متحقق نہیں ہوسکتی لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ امور واجب ہیں اگرچہ بحسب اصطلاح ان امور کو لطف کا نام نہیں دیتے۔

بہر حال وہ تمام امور جو اطاعات کے قریب کریں گناہوں سے دور کریں اگرچہ ممکن اور قدرت عطا کرنے میں ان کا کوئی دخل نہ ہو اور اطاعت کرنا اور معصیت کا ترک کرنا ان کے بغیر ممکن ہوسکتا ہو تو ان امور کا وجوب بھی فی الجملہ ثابت ہے اور اس بارے میں امامیہ متکلمین کے درمیان کوئی معروف اختلاف موجود نہیں ہے اگرچہ علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں اس امر کے ازروئے عقل ثابت ہونے پر ایک اشکال فرمایا ہے اور ملا طاہر نے بظاہر یکبارگی اس کا انکار کر دیا ہے لیکن اس کا یہ انکار شاذ ہونے کے سبب معتبر نہیں اور ساقط ہے جبکہ ممکن ہے کہ اس انکار کو وجوب علی الاطلاق کے انکار پر حمل کر دیا جائے۔

اور علامہ مجلسیؒ کا اشکال بھی قابل اعتناء نہیں کیونکہ انہوں نے حق الیقین میں اس وجوبِ لطف کا اعتراف کرلیا ہے

جبکہ حق الیقین ان کے بعد کی تصنیف ہے نیز یہ کہ وجوب پر از روئے عقل اشکال قائم ہونا اصل وجوب میں اشکال ہو جانے کو مستلزم نہیں کیونکہ دلیل نقلی یا اجماع کے ساتھ بھی یہ وجوب ثابت ہوسکتا ہے۔

لطف کے وجوب کی دلیل:

لطف کے وجوب پر مشہور دلیل یہ ہے کہ اگر خداوند عالم کو اپنے بندگان سے اطاعت مطلوب ہے اور پھر وہ اس اطاعت کے قریب کرنے والے لطف پر عمل نہ کرے تو اپنی غرض کے توڑنے کا اقدام ہوگا (جو قبیح ہے)۔

ملا طاہر کا اشکال:

اور ملا طاہر نے کہا ہے: ہمیں تسلیم نہیں کہ اس کی غرض اطاعت اور ثواب کی پیشکش دونوں ہیں بلکہ اس کی غرض فقط ثواب کی پیش کرنا ہے لہٰذا لطف کو ترک کرنا اپنی غرض کے منافی نہیں۔

جواب:

اس کا جواب یہ ہے کہ تکلیف دینے کی غرض اطاعت اور ایصال ثواب ہے علی الاطلاق اور اس کو تسلیم نہ کرنا ممنوع ہے اور اسکی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ ثواب کی پیشکش کی غایت بھی ایصال ثواب ہے کیونکہ تکلیف کا فائدہ خداوند عالم کی طرف عائد نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو مستغنی ذات ہے اسلئے فائدہ خود بندگان کیلئے عائد ہوتا ہے البتہ یہ صحیح ہے کہ کفار کی نسبت سے تکلیف کی غرض محض ثواب کی پیشکش ہے لیکن یہ مومنین کیلئے نہیں۔

شیخ مفیدؒ کا کلام:

اور شیخ مفید علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے کہ لطف کا وجوب اسلئے نہیں کہ وہ منافی عدل ہے اسلئے ہے کہ وہ منافی کرم ہے (یعنی اگر وہ لطف نہ کرے یہ خداوند کریم کے کرم کے موافق نہیں) پس قرب اطاعت بخشنے والے لطف کے وجوب کا مطلقاً منکر ہونا اللہ تعالیٰ کے کرم اور حکمت کی عظمت کے مدنظر کوئی جواز نہیں رکھتا اور ہشام کا عمرو بن عبید کے ساتھ مناظرہ بھی اس کی تائید کرتا ہے جس کی تفصیل بیان ہوگی لیکن یہ بھی لازم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ بھی اس امر کو ترک نہ کرے کیونکہ اس لطف کا وجوب ایسا لازم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ بھی اس امر کو ترک نہ کرے کیونکہ اس لطف کا وجوب از لحاظ حکمت تمام مکلفین کے حق میں پایۂ ثبوت تک نہیں پہنچ سکا اور علماء شیعہ نے اس عموم کے نہ ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔

خلاصہ یہ کہ امامیہ کا مذہب مختار لطف کا وجوب ہے اسی طرح ان کا مذہب مختار یہ بھی ہے کہ استدراج ختم، طبع اور اضلال کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا یہی حکم رکھتا ہے مولانا طبرسیؒ قول خداوندی:

یضل بہ کثیراً

کے ذیل میں فرماتے ہیں: کہ

اِضلال

کبھی بمعنی

تخلیۃ

بھی آتا ہے (عقاب کی خاطر کسی کو اپنی حالت پر خالی چھوڑ دینا) یعنی اللہ تعالیٰ جو الطاف مومنین پر ان کے ایمان کی جزاء کے طور پر فرماتا ہے وہ کفار پر نہیں کرتا (پس کفار پر الطاف نہ کرنا اضلال ہے) (انتہیٰ ملخص کلامہ)۔

معلوم ہوا کہ اس قسم کے الطاف اس قسم کے مکلفین کیلئے نہیں ہوتے وہ مومنین کیلئے ہیں کفار کیلئے نہیں) اور ایسا کیوں نہ ہو؟ جبکہ کفار اور فساق الطاف ربانی کی اہلیت ہی نہیں رکھتے ان پر ان الطاف کا نازل کرنا مناسب ہی نہیں لہٰذا لطف عام نہیں بلکہ مشروط ہے اور رفع موانع پر موقوف ہے اور اگر کلیہ قاعدہ یوں بیان کیا جائے کہ لطف ان لوگوں کیلئے ہوتا ہے جن میں شرائط موجود ہوں تو یہی صحیح ہے اور شاید یہی اطلاق کہنے والوں کی مراد ہے۔

شرائط وجوبِ لطف:

(۱) سابقہ گفتگو سے واضح ہوا کہ وجوبِ لطف کی شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ باری تعالیٰ کو علم ہو کہ لطف کے حصول سے مکلف اس کام پر اقدام کرے گا جو اس کا مکلف بہ ہے پس جہاں اس کے علم میں ہو کہ وہ شخص الطاف کے باوجود بھی کچھ نہ کرے گا اور الطاف اس کو کوئی فائدہ نہ بخشیں گے وہاں لطف کرنا لازم نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہاں اتمام حجت کرنا اور بندوں کیلئے عذر ختم کرنا مقصود ہو یا اس طرح دوسری مصلحتیں درکار ہوں۔

(۲) ایک دوسری شرط استحقاق کا سبقت رکھنا ہے ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔ سید مرتضیٰ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اس میں شک و شبہ نہیں کہ نعمات خداوندی ساری مخلوق کیلئے ثابت ہیں لیکن اس کی کچھ نعمتیں ایسی ہیں جو مخصوص بندگان کیلئے مختص ہوتی ہیں یا تو ان کے استحقاق کی وجہ سے یا کسی اور ایسے سبب کی وجہ سے جو اختصاص کا مقتضی ہوتا ہے اور چونکہ اس کے اسباب متفاوت ہیں اسلئے لطف کے درجات میں بھی تفاوت ہوتا ہے چنانچہ جو الطاف انبیاء و اوصیاء کیلئے ہوتے ہیں وہ دیگر عوام کیلئے لازم نہیں ہوتے۔

(۳) ایک تیسری شرط یہ ہے کہ لطف منافی تکلیف نہ ہو ورنہ اپنی غرض کو خود خراب کرنا لازم آئے گا چونکہ غرض امتحان لینا اور آزمائش کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ دنیا خانۂ آزمائش و امتحان ہے اور نیک و بد کی تمیز کا مرکز ہے پس اگر خداوند عالم ان دونوں کی اقسام کو ایک جیسا قرار دے تو امتحان لینے والا مقصود اصلی برطرف ہوجائے گا کیونکہ ایک قسم ان

لوگوں کی ہے جو اطاعت والی طبیعت رکھتے ہیں، اس دارالمحن میں نفسانی خواہشات اور طبعی مرغوبات سے دور رہتے ہیں یادِ خدا کو کبھی بھی دل و دماغ سے محو نہیں کرتے، مصائب، بلایا اور تکالیف سے دل تنگ نہیں ہوتے، اطاعت بجالانے اور معاصی سے اجتناب کرنے میں کبھی غفلت نہیں برتتے، حکمت ربانی کے تقاضہ کے مطابق امور کو اپنی طبیعت کے تقاضوں پر ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا مطلوب بھی یہ ہے کہ قربانِ درگاہ احدیت کے مراتب کو ظاہر کرے اور ان کی شان کی بلندی کو روشن کرے تو ایسے لوگ ان دوسری قسم کے لوگوں کی مثل کیسے ہو سکتے ہیں؟ جن کی حالت یہ ہے کہ وہ نفسانی خواہشات کی اطاعت کو اطاعت رب العزت پر مقدم رکھتے ہیں اگر ظاہری اسباب ان کی نفسانی خواہشات کے مطابق بن جائیں تو اطاعت الٰہی ان کو لاحق ہوجاتی ہے اور بڑے تابعدار نظر آتے ہیں اور اگر کبھی خداوند عالم اپنے بالاتر علم کے مطابق ان کے مطلوب و مرغوب کے مطابق اسباب نہ بنائے تو ان کی اطاعت میں سستی، کسالت اور نفور پیدا ہوجاتا ہے۔

وہ قضاء الٰہی پر راضی نہیں ہوتے، اب اگر وہ مستحق اور غیر مستحق کی تمیز نہ کرے گذشتہ امتحان کو بنیاد نہ بنائے ہر ایک کو اس کی تمنا کے مطابق اس کی عبادت کے اسباب کو مہیا کردے بلکہ اللہ تعالیٰ پر لازم ہے کہ سب کو یہ اسباب برابر مہیا کرے تو نفوسِ قدسیہ اور نفوسِ خبیثہ وخسیسہ کے درمیان تمیز کیسے ہوگی؟ اور دونوں باہم جدا کیسے نظر آئیں گے؟ بنابریں حق تعالیٰ کی حکمت و رأفت یہ قرار پائی ہے کہ مکلف بہ پر تمکین اور قدرت تو سارے مکلفین کو عطا کرے اور سب کو اس میں سہیم اور شریک ٹھہرائے تاکہ کسی ایک کو حجت قائم کرنے اور بات بنانے اور عذر پیش کرنے کا موقع نہ ملے لیکن مزید امتحان و آزمائش لینے کیلئے سب کی نظر میں مستحق کو غیر مستحق سے ممتاز کرنے کیلئے، عالی و سافل کے درمیان فرق واضح کرنے کیلئے، اس نے مشقت والے امور کو برداشت کرنے اور منافی طبع اشیاء انجام دینے کا راستہ اختیار کیا ہے؟

پس اگر ان میں سے کوئی ان امور کو تحمل کرے گا، رضائے الٰہی کو رضائے نفس پر مقدم رکھے گا، راہِ خدا میں زیادہ سے زیادہ رنج و الم برداشت کرے گا اسے اجر عظیم اور ثواب کثیر عطا کرے گا اور جو نفس شوم کی رضا کو رضائے الٰہی پر مقدم کرے گا، اطاعت شیطان کا طوق اپنی گردن میں ڈال لے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو فقط ایسے ممکنہ امور کی تکلیف دی تھی جو اس کیلئے انجام دینا محال نہ تھے، اللہ تعالیٰ اس پر اپنی حجت تمام کر چکا ہے اسکے لئے بات کرنے اور عذر پیش کرنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ ہاں اگر ان میں سے کوئی شخص مرحمت و رأفت، مہربانی وعنایت کے لائق ہو اور مطلوب خیر کے اسباب کی طرف راہنمائی مناسب ہو تو از روئے استحقاق یا بنا بر تفضل اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ امور ظہور پاتے ہیں اور اس پر پھر بھی نوازش ہوتی ہے لیکن اگر کوئی اپنی شقاوت نفسانی اور خواہشات کی برائی کی وجہ سے ان عنایات کے لائق نہ رہے تو حکیم وعلیم ذات اپنا لطف و کرم اور اپنی مہربانی اس سے سلب کر لیتا ہے، اس سے محروم رہتا ہے جیسا کہ گذشتہ بیانات میں اس کا اجمالی بیان ہو چکا ہے اور امام المتقین امیرالمومنینؑ کے کلمات سمات میں اور نہج البلاغہ کے

خطبات میں ان صدق آگین مضامین پر کلام موجود ہے اور دیگر ائمہ کرام علیہم السلام کے مضامین بھی دیگر کتب میں مذکور ہیں علماء اعلام کے ارشادات بھی اس پر دلالت کرتے ہیں، اگر ان سب کا بالاستیعاب ذکر کیا جائے تو کلام بہت زیادہ طویل ہوجائے گا لیکن مناسب ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ کے خطبۂ قاصعہ کے چند ایک فقرات کا ترجمہ بطورِ تبرک و تاکید حجت ذکر کردیا جائے جیسا کہ علامہ مجلسیؒ نے عین الحیات میں ارشاد فرمائے ہیں، تھوڑے سے تصرف کے ساتھ اور ان اصلی عبارات کے ساتھ جو اس خطبۂ مبارکہ میں موجود ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے خطبۂ قاصعہ سے اقتباسات:

آپؑ نے فرمایا:

(۱) وَ اسْتَعِيذُوا بِاللهِ مِنْ لَوَاقِحِ الْكِبْرِ كَمَا تَسْتَعِيذُونَهُ مِنْ طَوَارِقِ الدَّهْرِ فَلَوْ رَخَّصَ اللهُ فِي الْكِبْرِ لِاَحَدٍ مِنْ عِبَادِهِ لَرَخَّصَ فِيهِ لِخَاصَّةِ اَنْبِيَائِهِ وَ اَوْلِيَائِهِ وَ لٰكِنَّهُ سُبْحَانَهُ كَرَّهَ إِلَيْهِمُ التَّكَابُرَ وَ رَضِيَ لَهُمُ التَّوَاضُعَ فَاَلْصَقُوا بِالْاَرْضِ خُدُودَهُمْ وَ عَفَّرُوا فِي التُّرَابِ وُجُوهَهُمْ وَ خَفَضُوا اَجْنِحَتَهُمْ لِلْمُؤْمِنِينَ وَ كَانُوا قَوْمًا مُسْتَضْعَفِينَ قَدِ اخْتَبَرَهُمُ اللهُ بِالْمَخْمَصَةِ وَ ابْتَلَاهُمْ بِالْمَجْهَدَةِ وَ امْتَحَنَهُمْ بِالْمَخَاوِفِ وَ مَخَضَهُمْ بِالْمَكَارِهِ فَلَا تَعْتَبِرُوا الرِّضٰى وَ السُّخْطَ بِالْمَالِ وَ الْوَلَدِ جَهْلًا بِمَوَاقِعِ الْفِتْنَةِ وَ الِاخْتِبَارِ فِي مَوْضِعِ الْغِنٰى وَ الِاقْتِدَارِ فَقَدْ قَالَ سُبْحَانَهُ وَ تَعَالٰى۔ اَ يَحْسَبُونَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مالٍ وَ بَنِينَ نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَلْ لَا يَشْعُرُونَ.

ترجمہ: لوگو! تکبر کا شکار ہونے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرو۔ اگر تکبر کرنے کی رخصت کسی کو دی جاتی تو اللہ تعالیٰ یہ رخصت اپنے انبیاء ورسل کو دے دیتا لیکن حق سبحانہ تعالیٰ نے ان ہستیوں سے بھی تکبر پسند نہیں فرمایا اور تواضع و انکساری کو ان سے پسندیدہ قرار دیا اسی لئے وہ سب خدا کیلئے اپنے رخسارے زمین پر رکھ دیتے تھے، اپنے چہرے خاک سے آلودہ کرتے تھے اور اپنے بال و پر مومنین کیلئے زمین پر بچھا دیتے ہیں وہی ایسی جماعت تھے کہ ان کو زمین میں ضعیف افراد شمار کیا جاتا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان سے بھوک کا امتحان لیا اور انہیں مصائب میں مبتلا کیا، دشمنوں کے خوف و ہراس سے انہیں آزمایا اور سختیوں سے گزار کر انہیں خالص اور مصفّٰی بنایا لہٰذا تمہیں اللہ تعالیٰ کی رضا مندی و ناراضگی کا معیار مال و اولاد کی کثرت وقلت کو نہ بنانا چاہیۓ کیونکہ غنیٰ وتونگری یا فقر و افلاس دونوں ہی الٰہی آزمائش و امتحان ہیں یہی بات اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں فرمائی ہے: اَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا...الخ) ترجمہ: کیا لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو ان کی مدد مال وفرزندان کے ساتھ کرتے ہیں تو ان کیلئے خیرات و نیکی میں زیادہ اضافہ کررہے ہوتے

ہیں بلکہ وہ سمجھتے نہیں۔

(۲) فَإِنَّ اللهَ سُبْحَانَهُ يَخْتَبِرُ عِبَادَهُ الْمُسْتَكْبِرِينَ فِي أَنْفُسِهِمْ بِأَوْلِيَائِهِ الْمُسْتَضْعَفِينَ فِي أَعْيُنِهِمْ وَ لَقَدْ دَخَلَ مُوسَى بْنُ عِمْرَانَ وَ مَعَهُ أَخُوهُ هَارُونُ علیهما السلام عَلَى فِرْعَوْنَ وَ عَلَيْهِمَا مَدَارِعُ الصُّوفِ وَ بِأَيْدِيهِمَا الْعِصِيُّ فَشَرَطَا لَهُ إِنْ أَسْلَمَ بَقَاءَ مُلْكِهِ وَ دَوَامَ عِزِّهِ فَقَالَ أَلَا تَعْجَبُونَ مِنْ هٰذَيْنِ يَشْرِطَانِ لِي دَوَامَ الْعِزِّ وَ بَقَاءَ الْمُلْكِ وَ هُمَا بِمَا تَرَوْنَ مِنْ حَالِ الْفَقْرِ وَ الذُّلِّ فَهَلَّا أُلْقِيَ عَلَيْهِمَا أَسَاوِرَةٌ مِنْ ذَهَبٍ إِعْظَامًا لِلذَّهَبِ وَ جَمْعِهِ وَ احْتِقَارًا لِلصُّوفِ وَ لُبْسِهِ.

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں سے تکبر کرنے والوں کا امتحان اپنے ایسے اولیاء و دوستان کے ذریعہ لیتا ہے جن کو ضعیف اور حقیر سمجھ لیا گیا ہوتا ہے حضرت موسیٰ بن عمران علی نبینا و آلہ علیہم السلام اور ان کے بھائی حضرت ہارون جب فرعون کے پاس تشریف لائے تھے تو ان دونوں کے پیراہن اون کے تھے اور دونوں کے ہاتھوں میں عصا تھے، انہوں نے فرعون کو شرطیہ پیشکش کی کہ اگر وہ مسلمان ہو جائے تو اس کی شاہی اور عزت ہمیشہ باقی رہے گی۔ فرعون کہنے لگا: لوگو! کیا تمہیں ان دونوں کی حالت پر تعجب نہیں کہ میرے لئے حکومت اور عزت کی بقاء و دوام کی شرط لگاتے ہیں حالانکہ ان کی حالت تو دیکھو کس فقر و ذلت اور بدحالی کا شکار ہیں کیوں ان کے ہاتھوں میں سونے کے کنگن نہیں ہیں، وہ یہ باتیں اسلئے کر رہا تھا کہ اس کی نگاہ میں سونا اور اس کا جمع کرنا ہی عظیم تھا اور اون کے لباس اس کے ہاں حقیر و پست تھے۔

(۳) وَ لَوْ أَرَادَ اللهُ جَلَّ ثَنَاؤُهُ بِأَنْبِيَائِهِ حَيْثُ بَعَثَهُمْ أَنْ يَفْتَحَ لَهُمْ كُنُوزَ الذِّهْبَانِ وَ مَعَادِنَ الْعِقْيَانِ وَ مَغَارِسَ الْجِنَانِ وَ أَنْ يَحْشُرَ طَيْرَ السَّمَاءِ وَ وَحْشَ الْأَرْضِ مَعَهُمْ لَفَعَلَ وَ لَوْ فَعَلَ لَسَقَطَ الْبَلَاءُ وَ بَطَلَ الْجَزَاءُ وَ اضْمَحَلَّتِ الْأَنْبَاءُ وَ لَمَا وَجَبَ لِلْقَائِلِينَ أُجُورُ الْمُبْتَلَيْنَ وَ لَا لَحِقَ الْمُؤْمِنِينَ ثَوَابُ الْمُحْسِنِينَ.

ترجمہ: اور اگر اللہ سبحانہ تعالیٰ یہ چاہتا کہ جس وقت اس نے انبیاء کو مبعوث فرمایا تو ان کیلئے سونے کے خزانوں اور خالص طلاء کی کانوں کے منہ کھول دیتا، اور باغوں کے کشت زاروں کو ان کیلئے مہیا کر دیتا، اور فضا کے پرندوں اور زمین کے صحرائی جانوروں کو ان کے ہمراہ کر دیتا، تو ایسا کر سکتا تھا اور اگر وہ ایسا کرتا تو پر آزمائش ختم، جزاء و سزا بیکار اور آسانی خبریں ضائع ہو جائیں اور آزمائش میں پڑنے والوں کا اجر ماننے والوں کیلئے ضروری نہ رہتا، اور نہ ایمان لانے والے نیک کرداروں والی جزاء کے مستحق قرار پاتے۔

(۴) وَ لَا لَزِمَتِ الْأَسْمَاءُ مَعَانِيَهَا (اس فقرے کا ترجمہ اخوند علیہ الرحمہ کے کلام میں دریافت نہیں ہو سکا) لیکن بظاہر معنی یہ ہے کہ اگر مومن تصنع کرنے والے ہیں بناوٹی ممتاز نہ ہو سکتا تو مومن و محسن والے

اسماء ان مخلصین کے ساتھ اختصاص نہ پا سکتے جو درحقیقت ان اسماء کے زیادہ حقدار ہیں یعنی لازم نہ ہوتا کہ مومن کا اسم بامسمّٰی ہوجائے (اور الفاظ اپنے معانی کے ساتھ نہ دیتے) (ترجمہ: علامہ مفتی جعفر حسین قائد ملت جعفریہ اعلی اللہ مقامہ)۔

(۵) وَلٰكِنَّ اللّٰهَ جَلَّ ثَنَاؤُهُ جَعَلَ رُسُلَهُ أُولِيْ قُوَّةٍ فِيْ عَزَائِمِ نِيَّاتِهِمْ وَ ضَعَفَةً فِيْمَا تَرَى الْأَعْيُنُ مِنْ حَالَاتِهِمْ مِنْ قَنَاعَةٍ تَمْلَأُ الْقُلُوْبَ وَ الْعُيُوْنَ غَنَاؤُهُ وَ خَصَاصَةٍ تَمْلَأُ الْأَسْمَاعَ وَ الْأَبْصَارَ أَذَاؤُهُ.

ترجمہ: لیکن اللہ تعالیٰ وسبحانہ اپنے رسولوں کو ارادوں میں قوی بناتا ہے اور آنکھوں کو دکھائی دینے میں بظاہر کمزور ان کی قاعت ایسی ہوتی ہے کہ آنکھوں کو اور قلوب کو بے نیازی سے بھر دیتی ہے اور ایسا افلاس ان کے دامن سے وابستہ کرتا ہے کہ آنکھوں کے دیکھنے اور کانوں کو سننے سے اذیت ہوتی ہے۔

(۶) وَلَوْ كَانَتِ الْأَنْبِيَاءُ أَهْلَ قُوَّةٍ لَا تُرَامُ وَ عِزَّةٍ لَا تُضَامُ وَ مُلْكٍ يُمَدُّ نَحْوَهُ أَعْنَاقُ الرِّجَالِ وَ يُشَدُّ إِلَيْهِ عُقَدُ الرِّحَالِ لَكَانَ أَهْوَنَ عَلَى الْخَلْقِ فِي الْإِخْتِبَارِ وَ أَبْعَدَ لَهُمْ فِي الْإِسْتِكْبَارِ وَ لَآمَنُوا عَنْ رَهْبَةٍ قَاهِرَةٍ لَهُمْ أَوْ رَغْبَةٍ مَائِلَةٍ بِهِمْ فَكَانَتِ النِّيَّاتُ مُشْتَرَكَةً وَ الْحَسَنَاتُ مُقْتَسَمَةً.

ترجمہ: اگر انبیاء ایسی قوت رکھتے جسے کوئی دبانے کا ارادہ نہ کرسکتا اور ایسا تسلط وغلبہ رکھتے کہ کوئی ان پر تجاوز نہ کرسکتا اور ایسی سلطنت کے مالک ہوتے کہ لوگوں کی گردنیں اس کی طرف مڑتیں اور اس کے رخ پر سواریوں کے پالان کسے جاتے تو لوگوں پر ان کی اطاعت بہت آسان ہوجاتی اور ان کا انکار وسرتابی کرنا بہت دور کی بات ہوجاتی اور لوگوں کا ان پر ایمان لانا یا اس خوف کی وجہ سے ہوتا جو چھایا جاتا اور یا ایسے اسباب رغبت کی وجہ سے ہوتا جو مائل کرنے والے ہوتے پس اس صورت میں ان کی نیتیں خالص نہ ہوتیں اور نیکیاں رضائے الٰہی اور خواہشاتِ نفس کے درمیان مشترک ہوتیں اور تقسیم ہوچکی ہوتیں۔

(بعض مترجمین نے ان آخری دوسطروں کا ترجمہ یوں لکھا ہے: لوگوں کی نیتیں یکساں ہوتیں اور راست روی تمام ہوجاتی)۔

(۷) وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ أَرَادَ أَنْ يَكُوْنَ الْإِتِّبَاعُ لِرُسُلِهٖ وَ التَّصْدِيْقُ بِكُتُبِهٖ وَ الْخُشُوْعُ لِوَجْهِهٖ وَ الْإِسْتِكَانَةُ لِأَمْرِهٖ وَ الْإِسْتِسْلَامُ لِطَاعَتِهٖ أُمُوْرًا لَهٗ خَاصَّةً لَا تَشُوْبُهَا مِنْ غَيْرِهَا شَائِبَةٌ وَ كُلَّمَا كَانَتِ الْبَلْوٰى وَ الْإِخْتِبَارُ أَعْظَمَ كَانَتِ الْمَثُوْبَةُ وَ الْجَزَاءُ أَجْزَلَ.

ترجمہ: لیکن اللہ سبحانہ نے چاہا کہ اس کے رسولوں کی تابعداری اور اس کی کتابوں کی تصدیق اور اس کے

سامنے فروتنی اور اس کے اوامر کی فرمانبرداری اور اس کی اطاعت یہ سب امور اس ذات کیلئے مخصوص ہوں اس میں کوئی دوسرا شائبہ تک نہ ہو، پس جس قدر آزمائش و اختیار عظیم تر ہو اسی قدر ثواب و جزاء کثیر تر ہو۔

(۸) اَلَا تَرَوْنَ اَنَّ اللهَ جَلَّ ثَنَاؤُهُ اخْتَبَرَ الْاَوَّلِيْنَ مِنْ لَدُنِ آدَمَ إِلَى الْآخِرِيْنَ مِنْ هٰذَا الْعَالَمِ بِأَحْجَارٍ لَا تَضُرُّ وَ لَا تَنْفَعُ وَ لَا تُبْصِرُ وَ لَا تَسْمَعُ فَجَعَلَهَا بَيْتَهُ الْحَرَامَ الَّذِي جَعَلَهُ لِلنَّاسِ قِيَامًا.

ترجمہ: کیا تم نہیں دیکھ رہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تمام اولین و آخرین کا امتحان لیا اس طرح کہ چند ایسے پتھروں کو جو نہ نفع و نقصان دیتے ہیں اور نہ ہی بصارت و سماعت رکھتے ہیں اپنا خانۂ محترم اور عزت والا گھر قرار دے دیا، لوگوں کیلئے موجب قیام بنا دیا اور عبادت کیلئے جائے امین فرما دیا (اور لوگوں کو اس کے ذریعہ آزمایا)۔

(۹) ثُمَّ وَضَعَهُ بِأَوْعَرِ بِقَاعِ الْاَرْضِ حَجَراً وَ اَقَلِّ نَتَائِقِ الدُّنْيَا مَدَراً وَ اَضْيَقِ بُطُونِ الْاَوْدِيَةِ قُطْرًا بَيْنَ جِبَالٍ خَشِنَةٍ وَ رِمَالٍ دَمِثَةٍ وَ عُيُونٍ وَشِلَةٍ وَ قُرًى مُنْقَطِعَةٍ لَا يَزْكُو بِهَا خُفٌّ وَ لَا حَافِرٌ وَ لَا ظِلْفٌ.

ترجمہ: پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس گھر کو ایسے پتھریلے کوہستانی علاقے میں قرار دیا ہے جو پوری زمین میں سب سے زیادہ ناہموار ہے جس میں چٹانوں اور پتھروں کو الٹ پلٹ کر کے کچھ حاصل کرنے کی صلاحیت ساری دنیا سے کمتر ہے وہ ایک ایسا تنگ ترین درہ ہے جس میں انتہائی معمولی چوڑائی والی وادی ہے، درشت ترین پہاڑوں میں گھری ہے نرم ترین ریت پر مشتمل ہے (کہ اس سے گذرنا سخت مشکل ہوتا ہے) ایسے چشموں اور کنوؤں والی ہے جس میں پانی بہت کم ملتا ہے جس کی آبادیاں ایک دوسرے سے دور ہیں وہاں کوئی حیوان، اونٹ، گھوڑا، گدھا وغیرہ کوئی بھی نشوونما نہیں پا سکتا۔

(۱۰) ثُمَّ اَمَرَ سُبْحَانَهُ آدَمَ وَ وُلْدَهُ اَنْ يَثْنُوا اَعْطَافَهُمْ نَحْوَهُ فَصَارَ مَثَابَةً لِمُنْتَجَعِ اَسْفَارِهِمْ وَ غَايَةً لِمُلْقَى رِحَالِهِمْ تَهْوِي إِلَيْهِ ثِمَارُ الْاَفْئِدَةِ مِنْ مَفَاوِزِ قِفَارٍ سَحِيقَةٍ وَ مَهَاوِي فِجَاجٍ عَمِيقَةٍ وَ جَزَائِرِ بِحَارٍ مُنْقَطِعَةٍ حَتّٰى يَهُزُّوا مَنَاكِبَهُمْ ذُلُلًا يُهَلِّلُوْنَ لِلّٰهِ حَوْلَهُ وَ يَرْمُلُوْنَ عَلٰى اَقْدَامِهِمْ شُعْثًا غُبْرًا لَهُ قَدْ نَبَذُوا السَّرَابِيلَ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَ شَوَّهُوا بِإِعْفَاءِ الشُّعُورِ مَحَاسِنَ خَلْقِهِمْ ابْتِلَاءً عَظِيمًا وَ امْتِحَانًا شَدِيدًا وَ اخْتِبَارًا مُبِينًا وَ تَمْحِيصًا بَلِيغًا جَعَلَهُ اللهُ تَعَالٰى سَبَبًا لِرَحْمَتِهِ وَ وُصْلَةً إِلٰى جَنَّتِهِ.

ترجمہ: پھر حق سبحانہ تعالیٰ نے آدم اور اس کی اولاد کو امر فرمایا کہ وہ اس خانۂ خدا کی طرف آئیں۔ جہاں بھی ہوں۔ دل کی گہرائی کے ساتھ اس کی طرف سفر کریں۔ خالی بیابانوں سے اور گہری وادیوں سے

گزریں، سمندر کے بکھرے ہوئے جزائر کو عبور کریں، سخت ترین راستوں کو روندیں، اللہ تعالی کی تہلیل کی آوازیں بلند کریں، ان کے قدم خاک آلود ہوں، بال غبار آلود اور بکھرے ہوئے ہوں، اس کے گھر کے گرد طواف کریں درحالیکہ اپنے عادی لباس میں مایوس نہ ہوں (سلے ہوئے پارچات اتار چکے ہوں) فقط دو چادریں اوڑھے ہوئے ہوں، اپنے لمبے بالوں کو سنوارے بغیر اس طرح کھلے چھوڑے ہوئے ہوں کہ اپنے محاسن کو بگاڑ چکے ہوں یہ عظیم آزمائش ہے، سخت امتحان ہے، واضح اختیار ہے اور پوری طرح پرکھنا ہے اللہ تعالی نے اس کو اپنی رحمت کا سبب اور جنت کا وسیلہ بنایا ہے۔

(۱۱) وَلَوْ اَرَادَ سُبْحَانَهٗ اَنْ يَضَعَ بَيْتَهُ الْحَرَامَ وَ مَشَاعِرَهُ الْعِظَامَ بَيْنَ جَنَّاتٍ وَ اَنْهَارٍ وَ سَهْلٍ وَ قَرَارٍ جَمَّ الْاَشْجَارِ دَانِيَ الثِّمَارِ مُلْتَفَّ الْبُنٰى مُتَّصِلَ الْقُرٰى بَيْنَ بُرَّةٍ سَمْرَاءَ وَ رَوْضَةٍ خَضْرَاءَ وَ اَرْيَافٍ مُحْدِقَةٍ وَ عِرَاصٍ مُغْدِقَةٍ وَ زُرُوعٍ نَاضِرَةٍ وَ طُرُقٍ عَامِرَةٍ لَكَانَ قَدْ صَغُرَ قَدْرُ الْجَزَاءِ عَلٰى حَسَبِ ضَعْفِ الْبَلَاءِ،

ترجمہ: اگر اللہ تعالی چاہتا کہ اس بیت حرام اور ان مشاعر عظام کو ایسے باغات، نہروں، نرم زمینوں اور ہموار علاقوں میں قرار دے جہاں درختوں کے جھنڈ ہوں، جھکے ہوئے میوے ہوں، قریب قریب عمارتیں ہوں، آبادیاں متصل ہوں، زرخیز زمینیں ہوں، سرسبز کھیتوں، گہرے سیاہی مائل باغوں، تروتازہ فصلوں اور آباد راستوں نے اسے احاطہ کیا ہوا ہو، تو وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن یوں آزمائش اور امتحان کمزور ہوتا، جزاء وثواب بھی اسی قدر کمتر ہو جاتا۔

(۱۲) وَ لَوْ كَانَتِ الْاَسَاسُ الْمَحْمُوْلُ عَلَيْهَا وَ الْاَحْجَارُ الْمَرْفُوْعُ بِهَا بَيْنَ زُمُرُّدَةٍ خَضْرَاءَ وَ يَاقُوْتَةٍ حَمْرَاءَ وَ نُورٍ وَ ضِيَاءٍ لَخَفَّفَ ذٰلِكَ مُصَارَعَةَ الشَّكِّ فِي الصُّدُوْرِ وَ لَوَضَعَ مُجَاهَدَةَ اِبْلِيْسَ عَنِ الْقُلُوْبِ وَ لَنَفٰى مُعْتَلَجَ الرَّيْبِ مِنَ النَّاسِ،

ترجمہ: اور اگر خانۂ کعبہ کی اساس اور اس کی عمارت کے پتھر سبز زمرد، سرخ یاقوت کے ہوتے اور نور و روشنی میں گھرا ہوا ہوتا تو دلوں میں شک کی راہ بند ہو جاتی اور شیطان ابلیس کی قلوب پر اثر انداز ہونے کی کوشش ختم ہو جاتی اور لوگوں کے اندر شک کا پیدا ہونا بھی برطرف ہو جاتا۔

(۱۳) وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَخْتَبِرُ عِبَادَهٗ بِاَنْوَاعِ الشَّدَائِدِ وَ يَتَعَبَّدُهُمْ بِاَلْوَانِ الْمَجَاهِدِ وَ يَبْتَلِيْهِمْ بِضُرُوْبِ الْمَكَارِهِ اِخْرَاجًا لِلتَّكَبُّرِ مِنْ قُلُوْبِهِمْ وَ اِسْكَانًا لِلتَّذَلُّلِ فِيْ نُفُوْسِهِمْ وَ لِيَجْعَلَ ذٰلِكَ اَبْوَابًا فُتُحًا اِلٰى فَضْلِهٖ وَ اَسْبَابًا ذُلُلًا لِعَفْوِهٖ،

ترجمہ: لیکن حق سبحانہ وتعالی اپنے بندوں کا گونا گوں سختیوں کے ساتھ امتحان لیتا ہے اور رنگارنگ مجاہدت کے ذریعہ ان سے بندگی کا مطالبہ کرتا ہے اور مختلف اقسام کی مشکلات میں انہیں مبتلا کرتا ہے تاکہ ان کے قلوب

سے تکبر کو دور کرے اور تابعداری اور خود کو ذلیل قرار دینے کا جذبہ ان کے نفوس میں راسخ کرے اور ان ذرائع کو اپنے فضل تک پہنچنے کے دروازے بنائے اور عفو و درگذر کے حصول کے اسباب قرار دے۔

خطبہ قاصعہ تو بہت طویل ہے ہم نے بطور خلاصہ مختصر طور پر اس کے چند ایک اقتباسات عبارات لطیفہ سمیت پیش کردئے ہیں۔

ابتلاء و تمحیص اور محق و استدراج کا بیان:

ابتلاء:

کا معنی امتحان لینا اور آزمائش کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں ہے:

لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ،

ترجمہ: تا کہ اللہ تعالیٰ آزمائے اسے جو آپ کے سینوں میں ہے تمہارے اعمال کے ذریعہ اگرچہ خداوند عالم علم غیب کے ساتھ ہر شئے کے حالات کو جانتا ہے اور فرماتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اور بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم ان خیالات کو جانتے ہیں جو انسان کا نفس اس کے اندر وسوسوں کے طور پر ڈالتا ہے اور ہم انسان کی شہ رگ سے زیادہ اس کے قریب ہیں۔[1]

لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے چاہا ہے کہ انسان کے حالات کا معائنہ کرے، اسلئے ان کے ساتھ آزمائش لینے والا معاملہ کرتا ہے تا کہ وہ ان کے حالات کو ان کے اپنے ہم نوع افراد پر ظاہر کرے ورنہ خود ذات متعال کو اس آزمائش کی کوئی ضرورت نہیں (وہ تو ہر شئے کی حقیقی حالت کو ازل سے جانتا ہے اور اس کا علم بھی غلط نہیں ہوسکتا)۔

تمحیص:

کا معنی ہے، خالص کرنا اور

محق:

سے مراد ہے کسی کو فنا کرنا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف۔ ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] سورۂ ق، آیت ۱۶

وَلِيَعْلَمَ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ..... وَلِيُمَحِّصَ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۰ تا ۱۴۱)

ترجمہ: تا کہ اللہ تعالیٰ جان لے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں (یعنی ان کو آزمائش میں ڈالے)...اور تا کہ خالص کرے ان ایمانداروں کو ان گناہوں سے (بذریعہ اس آزمائش کے)...اور تا کہ ہلاک کرے کافروں کو (ان کے گناہوں کے سبب) یعنی بذریعہ آزمائش اس وقت اس کے اور ان کے خواہشات کے درمیان تخلیہ اور جدائی ڈال دے۔

ارشاد خداوندی ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۴۲)

ترجمہ: کیا تم لوگوں نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں جاؤ گے حالانکہ (یہ اس وقت تک نہیں ہوگا) جب تک اللہ تعالیٰ تمہیں (آزمائش میں ڈال کر) یہ جان نہ لے کہ تم میں سے وہ کون ہیں جو جہاد کرتے ہیں اور کون ہیں جو صبر کرتے ہیں۔

علامہ طبرسیؒ: ولیعلم اللہ الذین آمنوا،

کی تفسیر میں لکھتے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: اس اختیار اور ابتلاء سے اللہ تعالیٰ کی غرض یہ ہے کہ مومنین کو ایمان کے ساتھ آراستہ اور ممتاز دیکھے اور مشاہدہ کرے، فرماتے ہیں: کہ حق تعالیٰ اگر چہ ان لوگوں کے ایمان لانے سے قبل ان کو شناخت کرتا اور پہچانتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح ایمان لانے کے بعد ان کو جانتا ہے یعنی وہ ان کے ایمان لانے سے قبل بھی جانتا ہے کہ عنقریب یہ لوگ ایمان لا کر دیگر لوگوں سے ممتاز ہوں گے پھر جب وہ ایمان لے آئے تو اس نے جان لیا کہ ان کا ایمان قوت سے فعل کی طرف امتیاز پا گیا ہے لہٰذا یہ تغیر اور تبدل در اصل معلوم میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ ذات عدم میں لیکن ان کے سبب علم ذاتی متغیر ہوتا ہے اور اس میں کوئی ضرر نہیں ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ: مراد یہ ہے تا کہ دوستان خدا جان لیں کہ وہ لوگ ایمان کے ساتھ ممتاز ہو چکے ہیں پس یہ اظہار حال ملائکہ اور دیگر غیر ملائکہ کیلئے ہوتا ہے تا کہ اپنی حجت قائم کرے کہ ثواب کے مستحق کو ثواب دینا اور عذاب کے مستحقین کو عذاب دینا سب کی نظر میں روشن ہو جائے اور مشاہدہ کے مرتبہ میں عیاناً واضح اور روشن قرار پائے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی ذات کی طرف فقط اسلئے دی ہے تا کہ ان کی رسوائی کا اظہار زیادہ سے زیادہ ہو جائے۔ اور یہ دونوں مرادیں صحیح ہیں۔

استدراج:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ کسی مرد نے آپ سے استدراج کے معنی کے بارے میں سوال کیا: تو حضرت نے فرمایا: یہ ایک بندے کی طرف سے نسبت ہے کہ جب وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو حق تعالیٰ اسے مزید مہلت دے دیتا ہے اور اپنی نعمت کا اضافہ کر دیتا ہے پس وہ استغفار کرنے اور گناہ کی معافی مانگنے سے زیادہ غافل ہو جاتا ہے تو اسے استدراج کہتے ہیں اور یہی معنی قرآن مجید میں ارشاد کیا گیا ہے:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ (سورۂ کہف، آیت ۲۸)

ترجمہ: اور اتباع نہ کر اس کی جس کے دل کو ہم نے غافل کر دیا ہے، یعنی حق تعالیٰ نے اس کو استدراج کیا ہے اس طرح کہ وہ نہیں سمجھا۔

الکافی میں سفیان السمط سے مروی ہے کہ حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ: جب خداوند عالم چاہتا ہے کہ اپنے بندوں میں سے کسی بندے کو لطف و رحمت پہنچائے تو اسے کسی آزمائش میں ڈال دیتا ہے تا کہ وہ اس کو یاد کرے اور اس سے گناہوں کی معافی مانگے اور اگر وہ کسی بندے پر ناراض ہوتا ہے اور وہ بندہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر مزید نعمت نازل کرتا ہے تا کہ اس کے دل سے استغفار بھول جائے اور وہ اس کی معصیت میں زیادہ مصروف ہو جائے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں اس امر کو بیان کیا ہے، فرماتا ہے:

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (سورہ قلم، آیت ۴۴)

ترجمہ: اور ہم ان کو استدراج کریں گے ایسے انداز سے جسے وہ نہیں جانتے (یعنی ہم ان سے ایسا سلوک کریں گے کہ وہ معافی مانگنے اور استغفار کرنے سے بے پراوہ ہو جائیں گے لیکن وہ ہمارے اس سلوک کی حقیقت کے ادراک سے غافل رہیں گے)۔

فصل ہشتم:

مسئلہ اَصْلَحْ کا بیان

(زیادہ مصلحت پر مشتمل امر)

اس مسئلہ کا موضوع لطف کے موضوع سے عام ہے کیونکہ ہر لطف تو اصلح ہوتا ہے لیکن ہر اصلح کا لطف ہونا ضروری نہیں کیونکہ جائز ہے کہ اصلح کا اطاعت کے قریب کرنے اور معصیت سے دور کرنے میں کوئی دخل نہ ہو۔

اصلح کا یہ معنی دنیا کے اعتبار سے تو روشن ہے اور دین کے اعتبار سے اصلح کا مفہوم ذرا غور وخوض کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے مثلاً سکرات موت کی شدت اطاعت کے قریب کرنے کا موجب نہیں لیکن کبھی کسی بندے کے حق میں اسلئے اصلح ہوسکتی ہے کہ اس کے گناہوں کے کفارے کا موجب بن رہی ہو (یعنی سکرات کی سختی کی وجہ سے اس کے گناہ معاف ہوجائیں گے اور وہ آخرت میں جہنم کے عذاب سے محفوظ ہوجائے گا اسلئے اس کیلئے سکرات مفید اور اصلح ثابت ہو گئے)۔

ایک اور مثال یہ ہے کہ جب کسی میت کے وارثان اس کیلئے اعمال خیر انجام دیتے ہیں تو یہ اس میت کیلئے اصلح قرار پاتے ہیں کیونکہ یہ اعمال خیر اگرچہ اس میت کیلئے اس کو اطاعت کے قریب کرنے اور معصیت سے دور کرنے کا موجب تو نہیں بنتے (لیکن آخرت میں اسے ثواب ملے یا عقاب سے محفوظ کئے جانے کا فائدہ تو دیتے ہیں) یا یہ مثال کہ کسی بندہ کی زندگی میں اللہ تعالیٰ ایسے اسباب مہیا کرتا ہے جو اس کیلئے اجر کے اضافے یا تقرب میں ترقی کا موجب بنتے ہیں جیسا کہ ایک حدیث میں وارد ہے

أفضل الأعمال أحمزها

کہ اعمال میں زیادہ فضیلت ان اعمال کی ہوتی ہے جو زیادہ مشقت کا باعث ہوتے ہیں یعنی جو عمل دشوار تر ہوتا ہے اس کا ثواب بیشتر ہوتا ہے لہٰذا اسباب مشقت کا جمع ہونا اطاعت کے اجر میں اضافے کا باعث بنتا ہے اگرچہ مشقت کا خفیف ہونا اطاعت کے زیادہ قریب لانے کا موجب بنتا ہے اور ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں (کہ مشقت تھوڑی ہوگی تو لوگ ایسے اعمال کو زیادہ انجام دینے لگیں گے تو یہ خفیف ہونا لطف قرار پائے گا لیکن مشقت کا زیادہ ہونا لوگوں کے ان

اعمال کے قریب لانے کا باعث تو نہ بنے گا لیکن جو قلیل تعداد ایسے دشوار اعمال کو انجام دے گی ان کے اجر وثواب میں اضافہ ہوتا جائے گا اور وہ زیادہ رتبہ پائیں گے پس مشقت کا زیادہ ہونا اصلح قرار پائے گا)۔

معلوم ہوا کہ مسئلہ لطف کے بیان ہوجانے کے بعد مسئلۂ اصلح کے بیان کی ضرورت ہے۔

شاہ عبدالعزیز دہلوی کا خیال:

شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی کتاب تحفہ اثناعشریہ میں کہا کہ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے شیطان کو پیدا کرنا، پھر اس کے اور انسان کے درمیان عداوت ڈال دینا، پھر اسے لمبی زندگی دے دینا، پھر اسے مہلت دے دینا، پھر اسے بنی آدم کو اغوا کرنے کی قدرت دے دینا، پھر اسے ہر ایک انسان کے بدن میں تصرف کرنے کی اجازت دے دینا، یہ سارے امور بلکہ ان میں سے ہر ایک امر اصلح کے مادہ کو جڑ سے اکھاڑ دینے کا باعث ہے (انتہی کلامہ)۔

علامہ غفران مآبؒ کی طرف سے جواب:

دہلوی کے جواب میں ہمارے والد علامؒ نے کتاب صوارم میں فرمایا ہے کہ: مسئلہ اصلح کا حال کچھ اس طرح ہے کہ بغداد کے معتزلہ کا نظریہ، یہ ہے کہ حق تعالیٰ پر واجب ہے کہ دین یا دنیا میں جو امر اصلح ہو اس پر عمل کرے، اور بصرہ کے معتزلہ کہتے ہیں کہ: جو دنیا کے لحاظ سے اصلح ہو اس پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کیلئے واجب ہے۔ ان لوگوں کی مراد اصلح سے انفع ہے یعنی زیادہ نفع دینے والا امر ہے۔ اور کچھ تعداد والوں کی مراد اصلح سے حکمت و تدبیر رکھنے والا امر ہے۔

مسئلہ اصلح پر ہمارا نظریہ:

اور ہمارا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل ہمیشہ کمال حکمت و مصالح پر مشتمل ہوتا ہے اگرچہ بشری عقول ان کے ادراک سے قاصر ہیں کیونکہ حق تعالی علیم، حکیم، غنی اور تمام ممکنات پر قادر ذات ہے اور جو ایسی ہستی ہو وہ کوئی عبث اور قبیح کام انجام نہیں دیتی (اس کے ہر فعل میں حتماً حکمت اور مصلحت ہوتی ہے)۔

پس اگر بغداد والوں کی مراد اصلح سے یہی ہمارے والا مفہوم ہو تو لاریب کہ یہی بات صحیح ہے، اور اگر اصلح سے مراد ہر ایسی چیز ہو جو دین یا دنیا کے اعتبار سے انسان کیلئے زیادہ نفع بخش ہو اور اس میں کسی لحاظ سے نقصان کا شائبہ نہ ہو تو یہ بات بھی گذشتہ نظریئے کی طرح صحیح ہے بشرطیکہ وہ بندہ علم الٰہی میں اپنے سوء اختیار کی وجہ سے عاصی اور شقی لوگوں میں سے نہ ہو، اور اگر وہ ایسا نہ ہوا تو ممکن ہے کہ اس کے حق میں خذلان و استدراج و اضلال ہو جائے اور اس کیلئے اصلح قرار دیئے جانے والے امر کو ترک کر دیا جائے۔

ہمارے نظریہ پر آیات واحادیث سے استدلال:

واضح باد کہ ہمارا یہ نظریہ عدلیہ کے قواعد کے مطابق ہے اور آیات واحادیث کے ظاہری معانی اس پر شہادت دیتے ہیں اس باب میں آیات واحادیث کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ ان تمام کا استیعاب کرنا مشکل ہے لہٰذا ہم ان میں سے قلیل تعداد کو بیان کر دیتے ہیں۔

(۱) محمد بن یعقوب کلینیؒ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے ایک روایت نقل فرمائی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صبر ورضا اللہ تعالیٰ کی افضل اطاعت ہے اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندے کیلئے جو کچھ کرتا ہے بندے کو پسند ہو یا نہ ہو وہ بندے کیلئے بہتر ہوتا ہے اور اس میں خیر ہوتی ہے۔

(۲) اسی کتاب (الکافی) میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندوں میں کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے دینی امور کا درست ہونا غنا، وسعت، رزق اور صحت بدن کے بغیر نہیں ہوسکتا تو میں ان کو غنا، رزق کی کثرت، اور بدن کی صحت وتندرستی عطا کر دیتا ہوں تا کہ ان کے دینی امور صحیح رہیں۔

اور کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے دینی امور کی اصلاح فقر وفاقہ، افلاس و بیماری کے ساتھ ہوسکتی ہے تو میں ان کو غربت وافلاس، فقر فاقہ اور بیماری میں مبتلا کر دیتا ہوں تا کہ ان کے دینی امور کی اصلاح ہو اور میں زیادہ بہتر جانتا ہوں کہ کن اسباب سے میرے مومن بندے کی اصلاح ہوسکتی ہے؟

واضح رہے کہ میرا مومن بندہ ایک ایسا بھی ہوتا ہے جو میری عبادت میں بہت زیادہ جدوجہد کرتا ہے، آخر شب میں بیدار ہوتا ہے، اپنا آرام اور نیند چھوڑ دیتا ہے، خواب شیرین اور گرم بستر کی لذت ترک کر دیتا ہے، اپنے نفس کو تھکاوٹ میں ڈالتا ہے اور میری عبادت کرتا رہتا ہے لیکن کبھی ایک شب یا دوشب کیلئے میں اس پر نیند کو مسلط کر دیتا ہوں، اور یہ میری طرف سے اس کے حال پر رحم ہوتا ہے پس جب وہ نیند کر کے صبح کو بیدار ہوتا ہے تو اپنے نفس پر غضبناک ہوتا ہے اور اسے ملامت کر رہا ہوتا ہے حالانکہ اگر میں چاہتا تو اس پر نیند مسلط نہ کرتا اور وہ رات کو بیدار رہتا، اور میری عبادت کیلئے قیام کرتا لیکن یہ امر اس کے عجب وغرور اور خود پسندی میں اضافہ کر دیتا، اور اس کی ہلاکت کا موجب بن جاتا، کیونکہ اس کے ذہن میں یہ گمان آجاتا کہ وہ سارے جہاں کے عبادت گزاروں کا سردار بن گیا ہے۔

تو اپنی اسی عبادت کے سبب حدود کو پھلانگتے ہوئے ایسی راہ پر چل نکلتا جو اسے مجھ سے بعید تر کر دیتی جبکہ اپنے خیال میں میرا قرب حاصل کر رہا ہوتا، فَلَا يَتَّكِلِ الْعَامِلُونَ عَلَىٰ أَعْمَالِهِمُ الَّتِي يَعْمَلُونَهَا لِثَوَابِيْ، ان عمل کرنے والوں کو اپنے ان اعمال پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے جو وہ میرے ثواب کیلئے کرتے ہیں (بلکہ انہیں اپنے اللہ پر

توکل کرنا چاہیے)۔

(۳) آنحضرت ﷺ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل کی اس میں فرمایا: اے موسیٰ بن عمران علیہ السلام! میں نے کسی اپنے دوست ترین مومن کو پیدا نہیں کیا مگر اسے ایسے ابتلا کا شکار کرتا ہوں جس میں اس کی بہتری ہوتی ہے، اور میں سب سے زیادہ جانتا ہوں کہ کس چیز میں میرے بندے کی اصلاح ہوتی ہے، پس میرے بندے کو اس مصیبت پر صبر کرنا چاہیے جو میں اس پر نازل کروں اور اس نعمت پر شکر کرنا چاہیے جو میں اس کیلئے روانہ کروں، اسے میری قضاء پر بہرحال راضی ہونا چاہیے تاکہ میں اسے صدیقین میں سے شمار کرلوں۔

(۴) حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میں اس مسلمان کی حالت پر تعجب کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کے بارے میں جو فیصلہ بھی کرتا ہے اس میں اس کی بہتری ہوتی ہے اگرچہ اس میں اس کو قینچی کے ساتھ ریزہ ریزہ کر دیں لیکن اس میں بھی اس کی بہتری ہوتی ہے اور اگر اسے وہ مشرق و مغرب کا بادشاہ بنا دے تو بھی اس میں اس کیلئے بہتری ہوتی ہے۔

ان تمام احادیث کی دلالت اس پر ہے کہ حق سبحانہ تعالیٰ ہمیشہ فی الجملہ اصلح پر عمل کرتا ہے لیکن یہ اقدام اللہ تعالیٰ کے تمام بندوں اور جمیع مکلفین کیلئے عموم نہیں رکھتا (یعنی ہر ایک کے ساتھ اصلح کے مطابق عمل نہیں کرتا، مستحق و غیر مستحق میں فرق کرتا ہے) اور عقل سلیم بھی یہی حکم دیتی ہے، کیونکہ مستحق کیلئے اصلح کے مطابق اقدام نہ کرنا اور غیر مستحق کیلئے اصلح پر عمل کرنا دونوں باتیں قبیح ہیں (اور اللہ تعالیٰ قبیح سے پاک ہے) (کما لا یخفی)۔

صاحب مواقف کا اعتراض غلط ہے:

ہمارے اس نظریئے پر صاحب مواقف نے جو اعتراض کیا، وہ غلط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک ایسا کافر جو ساری زندگی فقیر و مفلس رہا ہو اور آخرت میں عذاب جہنم کا مستحق ہو اس کے بارے میں اصلح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اصلاً خلق ہی نہ کرتا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق اصلح پر عمل کیوں نہ کیا۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہمارے نزدیک اصلح کو عام کرنا واجب نہیں ہے (یہ ضروری نہیں کہ وہ تمام لوگوں کے بارے میں اس پر عمل کرے)۔

نیز یہ کافر کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فعل تو یہ ہے کہ اس نے اس کو پیدا کیا ہے اور اسے پیدا کرنا تو اس کے لئے اصلح ہے کیونکہ اسے حیات زندگانی عطا کرنا ایک نیکی ہے اور اسے اخروی ثواب کی تحصیل کے اسباب مہیا کرنا بالخصوص جبکہ اس کے بارے میں شرائط موجود اور تمام موانع مفقود ہوں اب اگر اس کافر نے خود اپنے اختیار کے ساتھ سعادت ابدی کسب نہ کی، تو اس سے اس کو پیدا کرنا اسے وجود کی نعمت سے مالا مال کرنا اور اس پر احسان و تفضّل کرنا غلط اور اس کے نقصان کا موجب نہیں بنتا اور یہ نکتہ قبل ازیں ثابت ہو چکا ہے کہ علم قدیم کا اشیاء پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

صاحب مواقف سے بیانِ حکایت:

صاحب مواقف ایک واقعہ نقل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے اصلح والے قول کی جڑ اکھڑ جاتی ہے وہ واقعہ یوں ہے: یہ ابوالحسن اشعری نے اپنے استاد ابوعلی الجبائی سے پوچھا: آپ ان تین بھائیوں کے بارے میں فرمایئے کہ ایک نے ساری زندگی حق تعالیٰ کی اطاعت میں گذاری، دوسرے نے ساری عمر حق تعالیٰ کی معصیت میں بسر کردی اور تیسرا بھائی بچپن میں ہی فوت ہوگیا تو ابوعلی الجبائی نے کہا: پہلے بھائی کو بہشت میں داخل کیا جائے گا، دوسرے کو جہنم میں اور تیسرے کو نہ ثواب دیں گے نہ عقاب۔

اس پر ابوالحسن اشعری نے کہا: اگر وہ چھوٹا بھائی کہے اے میرے پروردگار! اگر تو مجھے بھی لمبی زندگی عطا کر دیتا تو میں بھی تیری عبادت کرتا اور بہشت میں داخل ہوتا جیسا کہ میرا مومن بھائی بہشت میں داخل ہوگیا ہے تو جبائی نے جواب دیا دریں صورت حق سبحانہ وتعالیٰ فرما سکتا ہے کہ میں اپنے ازلی علم کے ساتھ جانتا تھا کہ اگر تجھے زیادہ زندگی دوں تو تو فاسق ہوتا اور اپنا معاملہ فاسد وتباہ کر دیتا اور اس لئے جہنم میں داخل ہوتا، ابوالحسن اشعری نے اپنے استاد کا یہ جواب سن کر کہا: اس وقت اگر وہ کافر بھائی کہے تو پھر مجھے کیوں بچپن میں موت نہ دے دی کہ نہ گناہ کرتا اور نہ جہنم میں داخل ہوتا۔ اب جبائی خاموش ہوگیا اور کوئی جواب نہ دے سکا۔

ابوالحسن اشعری نے اس روز سے اپنے استاد کے مذہب کو ترک کر دیا اور مذہب حق کی طرف آ گیا اور یہ سب سے اولین مخالفت تھی جو دو معتزلہ مذہب والے افراد کے درمیان وقوع پذیر ہوئی۔

ہمارا بیان:

ہم اس واقعہ پر یوں کہیں گے اگر کوئی جبائی کو کہے کہ یوں جواب دو کہ حق سبحانہ تعالیٰ اس چھوٹے بھائی کو کہہ سکتا ہے اگر تجھے بڑی عمر والا بناتا تو یہ اقدام عبث ہوتا کیونکہ تجھے لمبی زندگی دینے میں کوئی مصلحت نہ تھی، نہ خود تیرے لئے، نہ کسی دوسرے کیلئے، کیونکہ میں جانتا تھا کہ تو کفر کرے گا اور تیری ذات سے کسی غیر کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا پس اس وقت اگر کافر مرنے والا بھائی کہے کہ مجھے کیوں نہ بچپن میں موت دے دی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس طرح جواب دے سکتا ہے کہ تیری زندگی میں مصلحتیں تھیں اور وہ یہ کہ میرے علم ازلی میں یہ بات موجود تھی کہ تیری صلب سے بہت سارے صلحاء اور مومنین پیدا ہوں گے، یا تو میری مخلوق میں سے بہت ساروں کے امور کا انتظام کرے گا اور تجھ سے کفر کا صادر ہونا یہ تیرے اپنے اختیار کا نتیجہ ہے اس لئے میری ذات پر لازم نہیں کہ تجھے کتم عدم سے میدان وجود میں نہ لاؤں باوجودیکہ تجھے پیدا کرنا میرا احسان ہے تجھ پر، اور تیری اس کثیر اولاد پر جو صلاح وسداد اور صحت عقیدہ وعمل رکھنے والے ہوں گے نیز ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں: کہ ہمارے مذہب میں اصلح کو جمیع اشخاص کیلئے عام کرنا ضروری نہیں۔

اعتراض:

اس پر اگر کوئی کہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سارے کفار لمبی عمر پانے کے بعد اپنے کفر پر مرجاتے ہیں اور ان کے وجود سے کوئی مصلحت ظہور پذیر نہیں ہوتی مثلاً اللہ تعالیٰ نے فرعون، ہامان، زردشت وغیرہ کو بچپن میں موت کیوں نہ دے دی تو ہم جواب دیں گے کہ

جواب:

کہ مصالح کی اقسام محدود نہیں ہیں اور اگر ہم کسی مصلحت کو دریافت کرنے میں کامیاب نہ ہوں تو اس کا لازمہ یہ نہیں کہ اس امر میں کوئی مصلحت نہیں ہے مثلاً آپ دیکھتے ہیں کہ حشرات اور کیڑے مکوڑوں کی ایک کثیر تعداد ایسی ہے جنہیں حق تعالیٰ نے روئے زمین پر خلق فرمادیا ہے ان کا وجود مصالح سے خالی نہیں ہے حکماء اور محققین نے تصریح سے یہ بات کہی ہے باوجودیکہ ہر بشر کی عقل ان مصالح کی تہ تک نہیں پہنچ سکتی تو کیوں جائز نہ ہوگا کہ فرعون جیسوں کو باقی رکھنے کی مصلحت استدراج ہو؟ کیونکہ فرعون اپنے کفر کی شامت میں استدراج کا مستحق ہوگیا تھا، اور کیا فرعون کو لمبی زندگی دینے کی مصلحت دیگر لوگوں کو ابتلاء و امتحان میں ڈالنا نہیں ہوسکتی ؟ اور کیوں اس ملعون کو لمبی زندگی دینے کی مصلحت بنی آدم میں سے ایک کثیر جماعت کا قیامت تک عبرت حاصل کرنا قرار نہیں دیا جاسکتا؟

خلاصہ یہ کہ یوں کہنا کمال حماقت و بے وقوفی ہے کہ چونکہ ہمارے ناقص عقول ان تمام مصالح کے ادراک سے قاصر ہیں جو حق سبحانہ وتعالیٰ نے خلقت اشیاء میں ودیعت فرمائے ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ کے تمام افعال عبث اور سفاہت ہیں اور مصلحتوں سے عاری ہیں۔

شارح مقاصد وغیرہ کا گمان:

وہ گمان کرتا ہے کہ حصول حاجات اور دفع مشکلات کیلئے دعا کرنا اصلیت کے قول کے خلاف اور اس سے منافات رکھتا ہے کیونکہ بنابریں ہر اصلح واجب الصدور قرار دیا جائے گا اور اس میں دعا سے کسی تبدیلی کا واقع ہونا ممکن نہیں۔

اس کا بطلان:

کیونکہ ممکن ہے کہ نفسِ دعا مصلحت کو تبدیل کرنے والی ہو اس طرح کہ دعا سے قبل مصلحت کسی امر کے واقع کرنے میں ہو لیکن دعا کے بعد مصلحت اس امر کو ترک کرنے میں ہو۔

شارح مقاصد کا دوسرا گمان:

یہ ہے کہ اگر اصلح واجب ہو تو تفضّل کی گنجائش نہ رہے گی اور اللہ تعالیٰ کا انعام اور فضل و کرم کرنے کا کوئی اختیار نہ رہے گا۔

اس کا بطلان:

ارشاد رب العزت ہے:

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ ؕ (سورۂ قصص، آیت ۶۸)

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ (سورۂ بقرہ، آیت ۱۰۵)

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۶۹)

ترجمہ: اور تیرا رب جو چاہتا ہے خلق کرتا ہے اور اسے پسند کرتا ہے اور وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مختص کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے حکمت عطا کر دیتا ہے۔

اور بطلان کی وجہ یہ ہے کہ اصلح اور لطف دونوں تفضّل ہیں واجب نہیں اسی لئے کچھ پر ہوتے ہیں اور کچھ پر نہیں۔

نیز اگر ان کا گمان صحیح مان لیا جائے تو حق تعالیٰ کیلئے جہل لازم آئے گا یا اضطرار، اور یہ دونوں اہل اسلام کے اجماع اور آیاتِ مسطورہ کی رو سے باطل ہیں اور لازم آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ حق تعالیٰ ازل سے ان تمام افعال و مخلوقات کے بارے میں علم رکھتا ہے جو اس سے صادر ہوں گے تو اب موجودہ حال میں جس شئے کے متعلق علم رکھتا ہے اس کے وجود یا عدم کے بارے میں تو کیا اپنے اس ازلی علم کی خلاف ورزی پر قادر ہے یا نہیں؟ اگر قادر ہے اور اپنے ازلی علم کی مخالفت کر سکتا ہے تو اس سے حق تعالیٰ کا جہل لازم آتا ہے اور اگر قادر نہیں تو اس ذات کا اضطرار لازم آتا ہے۔

اس گمان کا حلّی جواب:

کسی فعل کے اختیاری ہونے کا معیار یہ ہے کہ فقط قدرت کی طرف نسبت دیتے ہوئے اس کا بجالانا یا ترک کرنا صحیح ہو (یعنی قادر کیلئے اس کا کرنا یا نہ کرنا مساوی ہو) ورنہ آپ دیکھتے ہیں کہ جب کسی فعل کیلئے ارادہ جازمہ ہو جاتا ہے تو وہ فعل واجب ہو جاتا ہے لیکن یہ وجوب اس کے اختیار کو کوئی نقصان نہیں دیتا بلکہ اس کی تاکید کا باعث ہوتا ہے چنانچہ علماء نے صراحت کی ہے کہ اختیار کے ساتھ وجوب کا پیدا ہونا اختیار کے وجود کو ثابت کرتا ہے۔

اور اس طرح جو وجوب بسبب علم الٰہی کے تعلق کے سابق ہونے کے پیدا ہوتا ہے اس کی صورت بھی یہی ہے (یعنی وہ بھی اختیار کے منافی نہیں ہوتا) اور یہی حال اس وجوب کا ہے جو حق تعالیٰ کے علم و حکمت اور اس کی استغناء کے مدنظر

تحقق پذیر ہوتا ہے (وہ بھی اختیار کے مخالف نہیں) اور ہمارے اس نظریئے کی دلیل اس موضوع میں اس فعل اختیاری کے خواص کا وجود ہے مثلاً جب بھی کسی حکیم سے فعل حسن صادر ہوتا ہے تو اس کی مدح کرتے ہیں اور اگر وہ فعل احسان کرنا ہو تو اس کا شکر اور اس پر ستائش کرتے ہیں اگر چہ وہ فعل علم الٰہی کے تعلق کے مدنظر اور اس حکیم کی حکمت کی وجہ سے اس سے واجب الصدور ہی ہو چکا ہو۔

اور اسی طرح جب کسی سخی بادشاہ سے ہدایا مانگے جائیں حالانکہ اگر وہ سوال نہ کرتے تو بھی وہ اپنی سخاوت کے مدنظر خود ہی عطا کر دیتا (یہ مثالیں وجوب کے باوجود فعل کو اختیاری ثابت کرتی ہیں) اب جب مسئلہ اصلح کے اطراف و جوانب روشن کر دیئے گئے اور آپ اس پر مکمل طور پر آگاہ ہو چکے تو اب اس کلام کا جائزہ لیجئے جو ایک دشمنِ حق پر کسی ابلیس کی طرف سے اتری ہے کہ وہ شیطان کے خلق کرنے کو بندگان کیلئے مفسدہ خیال کرتا ہے کیونکہ اس کا یہ خیال ہر طرح ساقط اور بے اعتبار ہے کیونکہ شیطان کا وجود انبیاء و اوصیاء کے اعداء اور اہل بیت طیبین کے دشمنان کے عذاب میں زیادتی کا باعث بنا ہے جو مقربان حضرت صمدیت کے ارواح مقدسہ کے سرور میں افزائش کا سبب بنا ہے اور یہی عدالت و انصاف الٰہی کا تقاضہ بھی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو کوئی قواعد عدل کے علم سے بہرہ ور ہے وہ یقین رکھتا ہے کہ استدراج کے موقع پر استدراج کرنا اور اضلال، طبع، ختم وغیرہ میں ہر ایک کو اس کے مناسب مقام پر انجام دینا ہی عین حکمت وصواب اور صحیح ہے چنانچہ یہ دار دنیا جو ابتلاء و آزمائش کی جگہ ہے اس میں لطف، اصلح، ہدایت اور توفیق پر اپنے اپنے محل میں عمل کرنا برحق ہے اور اس کا تقاضہ ہے کہ رسولوں کو مبعوث کیا جائے، اوصیاء کو منصوب کیا جائے، نیز شہوانی قویٰ اور شیطان کا وجود ہو، کیونکہ اس دار دنیا کی مثال ایک گھر اور منزل کی سی ہے کہ گھر بنانے کا یہ تقاضہ ہے کہ اس میں ایک کمرہ استراحت کیلئے خواب گاہ ہو، تو ایک مطبخ برائے طعام ہو نیز ضروری ہے کہ اس میں ایک جگہ کوڑا کرکٹ ڈالنے کیلئے ہو اور ایک بیت الخلاء ہو لیکن جو کوئی اس دشمن اہل بیت عظام کی سی سوچ کا حامل ہو چونکہ وہ ظاہر و باطن ہر دو لحاظ سے اندھا ہوتا ہے۔

اسلئے وہ جب اس گھر میں داخل ہوگا تو اپنی ناقص فکر کے باعث بیت الخلاء کے علاوہ کسی دوسری جگہ کو اپنے لئے محل استراحت نہ پائے گا اور اپنی یاوہ گوئی میں صاحب خانہ کی تنقیص اور توہین پر اتر آئے گا اور اسے یہ سمجھ نہ آئے گی کہ اس میں صاحب خانہ کا کوئی قصور نہیں اس کے اپنے اندھے پن کا قصور ہے اور اس دشمن حق اور اس کے ہمنوا لوگوں کے خیالات کو رد کرنے کیلئے حضرت صادق علیہ السلام کا کلام معجز نظام کافی وافی ہے کہ اسی سے اہل بیت رسول انام جو سفینۂ نجات ہیں ان کے مقصد و مرام کی بھی تکمیل ہوتی ہے۔

اس کے بعد گذشتہ حدیث مفضل کے چند ایک فقرات نقل فرماتے ہیں آپ نے اس مسئلہ میں جس قدر تدقیق فرمائی ہے وہ پایۂ تحقیق تک پہنچا ہوا ہے تاہم اعلام کا کلام اس مقام میں اجمال سے خالی نہیں ہے۔

محقق طوسیؒ:

محقق طوسیؒ تجرید الاعتقاد میں فرماتے ہیں:

والاصلح قد یجب بوجود الداعی و انتفاء الصارف،

کہ اصلح کبھی داعی کے وجود اور مانع کے مقتضی ہونے کی وجہ سے واجب ہو جاتا ہے۔

علامہ مجلسیؒ:

علامہ مجلسیؒ حق الیقین میں فرماتے ہیں کہ: اکثر امامیہ کا اعتقاد یہ ہے کہ خلق اور نظام عالم کیلئے جو کچھ اصلح ہو اس کا فعل حق تعالیٰ پر واجب ہے۔

اور چند متکلمین کا نظریہ یہ ہے کہ ضروری ہے کہ فعل الٰہی متضمنِ مصلحت ہو، اصلح ہونا ضروری نہیں اور بظاہر اس مسئلہ میں تفکر کرنا بھی ضروری نہیں (انتہیٰ کلامہ)۔

واضح باد کہ اصلح کے مطابق عمل کرنا اس سے نچلے مرتبہ سے ترجیح رکھتا ہے لہٰذا امامیہ کا مشہور قول حق ہے لیکن اکثر حضرات کے نظریہ کے متعلق جو کچھ منقول ہے وہ اجمال سے خالی نہیں ہے اور اس بارے میں تمام مطالب کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص کے بارے میں اصلح پر عمل کرنا ایک کلیہ قاعدہ ہے اور اللہ تعالیٰ پر اس کے مطابق عمل کرنا لازم نہیں ہے بلکہ لازم یہ ہے کہ وہ ایک نظام کلی کے لحاظ سے اصلح کو ملحوظ رکھے۔

محقق طوسیؒ:

محقق طوسیؒ نے شرح الاشارات میں فرمایا کہ: کل کی طرف قیاس کرتے ہوئے جو اصلح ہے وہ بعض کی طرف قیاس کرتے ہوئے غیر اصلح ہو سکتا ہے اور اوّل واجب ہے دوسرا نہیں۔

اس سے بھی روشن ہوتا ہے کہ نظام کل کی نسبت سے جو اصلح اور زیادہ مناسب امر ہو وہ لازم ہے اگرچہ وہ امر کسی خاص شخص کی نسبت سے اصلح نہ ہو بخلاف اس کے جو بعض کی نسبت اصلح ہو لیکن یہ بات بھی اجمال رکھتی ہے کیونکہ اس شخص کی نسبت سے جو اصلح ہے اگر اس پر عمل کرنا ممکن ہو اور کوئی مانع بھی نہ ہو تو حکیم مطلق اسے کیسے مہمل چھوڑ دے گا اور اگر نظام کلی میں اختلال پڑتا ہو یا کوئی دوسرا مانع مقابل میں ہو تو کسی مستحق کو اس کے حق سے محروم کر دینا عدل الٰہی میں کیسے روا ہوگا؟ اور بظاہر مراد یہی ہے کہ حق تعالیٰ کیلئے ہر ایک کیلئے من جمیع الوجوہ اصلح پر عمل کرنا واجب نہیں ہے لیکن استحقاق کی شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اور خارجی موانع کے دور ہونے کو مدنظر رکھتے ہوئے اصلح فالاصلح پر عمل کرنا لازم ہو سکتا ہے پس اس صورت میں شرائط کے پورا نہ ہونے کی صورت میں اصلح کو فوت کر دینا بھی علی الاطلاق ممنوع نہیں ہے

اور یہ امر مذکور ضابطے میں ضرر رساں نہیں۔

اور شاید اسی لئے محقق نے تجزیہ میں فرمایا ہے کہ: اصلح پر عمل کرنا بھی داعی کے وجود اور صارف کے مقتضی ہونے سے واجب ہو جاتا ہے اور اس کے اعلیٰ مرتبہ کو کسی ایک شخص کے بارے میں فوت کرنا یا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس میں استحقاق نہ تھا کہ اس کو ترک کرنا عدالت کے منافی نہیں ہوتا اور یا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ پورے نظام کی ضرورت کا تقاضا یہ ہوتا ہے ایسی صورت میں خداوند عالم اس منافات کا تدارک اس شخص کے حوالے سے اگلے جہاں میں کرے گا بشرطیکہ وہ اس کا مستحق ہو جیسا کہ ان آلام و مصائب میں ہوگا جن کا وہ شخص مستحق نہ تھا اور یہ امر بھی منافات نہیں رکھتا۔

نیز یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اصلح پر ہر دو فرد کی نسبت سے عمل ہوتا ہے لیکن استحقاق کی شرائط کے متحقق ہونے اور موانع کے دور رہنے کے ساتھ، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو ظاہری طور پر اصلح ہو وہ فی الواقع بھی اصلح ہو کیونکہ اصلح وہ ہوتا ہے جو حکمت کے لحاظ سے اصلح ہو، نہ وہ جو ظاہر میں اصلح ہو اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک امر ظاہر میں مستحسن ہوتا ہے لیکن وہی باطن میں مفاسد اور موانع پر مشتمل ہوتا ہے اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے (کہ ظاہر میں مفاسد رکھتا ہے اور باطن میں وہ مستحسن ہوتا ہے) جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (سورۃ بقرہ، آیت ۲۱۶)

ترجمہ: ممکن ہے کہ تم کسی شئے کو ناپسند کرو حالانکہ وہ تمہارے لئے خیر ہو اور ممکن ہے تم کسی شئے کو پسند کرو حالانکہ وہی تمہارے لئے شر ہو (نقصان دہ ہو)۔

لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ امور کے مصالح و مفاسد سے آگاہ ہے اور ہر چیز کے ظاہر و باطن کی باریکیوں کو خوب جانتا ہے اسلئے ہر فرد کی نسبت سے جو اس کی مصلحت کے زیادہ قریب ہوتا ہے اسی پر عمل کرتا ہے۔

پس ہمارے والد ماجد (علامہ غفران مآبؒ) نے جو کچھ ارشاد فرمایا:

"کہ نصوص سے اصلح کا عموم نہ رکھنا معلوم ہوتا ہے"

اگر تو آپ کی مراد یہ ہے کہ اصلح ظاہری کا عموم نہیں یا یہ کہ ہر فرد فرد کی نسبت سے اصلح پر عمل کرنے کا عموم نہیں تو یہ حق ہے لیکن علماء کی اکثریت کی مراد اصلح حقیقی ہے اور اسی طرح جو کل کی نسبت سے اصلح ہے تو پھر یہ اس قید کے ساتھ ہے کہ شرائط استحقاق موجود ہوں اور موانع مفقود ہوں۔

اور فخر الدین رازی کی یہ بات کہ اصلح پر عمل کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ اگر واجب ہو تو لازم آئے گا کہ تمام لوگ خیر پر خلق ہوئے ہیں اور ان کی فطرت اور جبلت ہی خیر پر ہے کیونکہ یہی اصلح ہے تو رازی کی یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنے مخالف کے نظریئے کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔

تتمہ:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مصالح، ادعیہ، تصدقات اور اعمال خیر کی وجہ سے تبدیل ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ادْعُوْنِیٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ۔ (سورۂ غافر، آیت ۶۰)

ترجمہ: تم مجھ سے دعا مانگو میں تمہارے لئے قبول کروں گا۔

حدیث قدسی میں ہے:

فَاسْئَلُوْنِیْ اَکْفِکُمْ وَ اَهْدِکُمْ سَبِیْلَ رُشْدِکُمْ،

ترجمہ: تم مجھ سے سوال کرو تو میں تمہارے لئے کافی ہو جاؤں گا اور کامیابی کی راہ کی طرف تمہیں ہدایت کروں گا۔

حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا:

اَلدُّعَاءُ تُرْسُ الْمُؤْمِنِ وَ مَتٰی تُکْثِرْ قَرْعَ الْبَابِ یُفْتَحْ لَكَ.

ترجمہ: کہ دعا مومن کی ڈھال ہے اور تو جس قدر زیادہ دروازہ کھٹکھٹائے گا بالآخر وہ تیرے لئے کھول دیا جائے گا۔

ہمارے والد ماجد اعلی اللہ درجتہ مواعظہ حسینیہ میں فرماتے ہیں: واضح رہے کہ بابِ دُعا میں تین اشکال وارد ہوتے ہیں۔

دعا مانگنے کا صحیح طریقہ اور موانع قبولیت دعا:

اشکالِ اول:

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت زیادہ لوگ حق تعالیٰ سے بہت سارے سوالات کرتے ہیں لیکن ان کی حاجات پوری نہیں ہوتی ہیں اس پر یہ کہنا صحیح نہیں کہ اور نعوذباللہ من ذالك، اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی وفاداری نہیں کرتا پس ضروری ہے کہ معلوم ہو کہ ان کی دعا کے مستجاب نہ ہونے کے اسباب کیا ہیں؟ تو وہ چند ایک ہیں۔

(۱) دعا کا طریقہ صحیح ہونا چاہیے:

چنانچہ منقول ہے کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کیا کہ قرآن مجید میں دو آیات ایسی ہیں کہ مجھ پر ان کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ حضرت نے فرمایا: وہ کون سی ہیں؟ تو عرض کرنے لگا: ایک تو ان میں سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ

کا یہ قول ہے:

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ،

کیونکہ میں دعا مانگتا ہوں لیکن اللہ تعالیٰ ان کو مستجاب نہیں کرتا تو حضرت نے فرمایا: کیا تو سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ کہنے لگا: نہیں تو جائز نہیں سمجھتا؛ تو حضرت نے فرمایا: جب ایسا ہے تو عدم اجابت دعا کا موجب کیا ہے؟ اس نے کہا: یہی تو مجھے معلوم نہیں؛ تو حضرت نے فرمایا: تو میں تجھے بتاتا ہوں وہ یہ کہ جب کوئی آدمی حق سبحانہ تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری کرتا اور اس کے اوامر کے مطابق عمل کرتا ہے اور پھر دعا اس طریقے سے مانگتا ہے جو طریقہ اس ذات نے فرمایا ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس کی دعا کو مستجاب فرما دیتا ہے۔ تو اس نے پوچھا: دعا کا طریقہ کیا ہے؟

تو آپ نے فرمایا: اول میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرو، اس کی ستائش کرو، اس کے بعد اس کی نعمت کو یاد کرو پھر اس کا شکر ادا کرو اس کے بعد محمد وآل محمد علیہم السلام پر درود بھیجو اس کے بعد اپنے گناہوں کو یاد کرو اور ان کی معافی مانگو، یہ ہے وہ طریقہ جو دعا کیلئے اختیار کرو۔

اس کے بعد امامؑ نے فرمایا: دوسری آیت کون سی ہے؟ تو اس نے کہا: وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَھُوَیُخْلِفُهٗ، (سورۂ سباء، آیت ۳۹)

ترجمہ: اور جو کچھ تم اس کی راہ میں خرچ کرو گے تو وہ اسے اس کا عوض ادا کرے گا؛ لیکن ہم جو کچھ انفاق کر دیتے ہیں تو اس کا عوض ہمیں نصیب نہیں ہوتا،

تو حضرتؑ نے فرمایا: کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ حق تعالیٰ وعدہ خلافی کرتا ہے؟ تو کہنے لگا: نہیں، تو امامؑ نے فرمایا: جب بھی کوئی حلال کا مال حاصل کر کے اسے راہ خدا میں خرچ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے اس کا عوض دیتا ہے۔

(۲) دعا کے قبول نہ ہونے کے اسباب میں سے دوسرا سبب یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے جو کچھ بندہ مانگتا ہے علم حق تعالیٰ میں اس کا مطلوب اس کیلئے موجب فساد ہوتا ہے اور چونکہ انسان اپنے امور کے عواقب سے آگاہ نہیں، خیال کرتا ہے کہ اس مطلوب میں میرے لئے فائدہ ہی فائدہ ہے اسلئے وہ شئے حق سبحانہ تعالیٰ سے مانگتا رہتا ہے لیکن وہ ذات علی الاطلاق علیم ہے وہ اپنے علم وحکمت ورأفت کے مطابق اس حاجت کو پورا نہیں کرتا اور اپنے بندے کے حال پر رحم کرتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس پر شاہد ہے:

وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَخَیْرٌ لَّکُمْ، وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَشَرٌّ لَّکُمْ، وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝۲۱۶ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۱۶)

ترجمہ: ممکن ہے کہ تم کسی شئے کو ناپسند کرو حالانکہ وہی تمہارے لئے مفید ہو اور ممکن ہے تم کسی شئے کو پسند

کرو حالانکہ وہی تمہارے لئے نقصان رساں ہو اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اس بات میں بندہ کی حالت ایک بیمار کی مثل ہے جو عقل و علم سے بہرہ ور نہ ہو اور کسی حکیم کی خدمت میں جائے جو حاذق طبیب ہو اور خوب دانا ہو اور اس مریض پر مہربان اور شفیق بھی ہو، مریض کچھ غذاؤں کے لذت آور ذائقہ دار ہونے کی وجہ سے اس طبیب سے ان کی اجازت مانگے جبکہ یہ غذائیں اس کی بیماری کے لئے ضرر رکھتی ہیں اور چونکہ وہ طبیب حکیم ان اشیاء کے ضرر سے آگاہ ہے وہ کبھی بھی اسے ان کی اجازت نہ دے گا (گویا ایسا اقدام اللہ تعالیٰ کرتا ہے)۔

(۳) دعا کے قبول ہونے میں تاخیر کے اسباب میں سے ایک سبب صلاح و پرہیزگاری میں بلند مرتبہ ہونا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ سبحانہ اپنے کسی بندے کو دوست رکھتا ہے تو کبھی وہ پسند کرتا ہے کہ اس دوست کی مناجات کو سنتا رہے چنانچہ جابر بن عبداللہ انصاری سے مروی ہے کہ حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دوست خدا اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہے تو حق سبحانہ تعالیٰ جبرئیل کو فرماتا ہے کہ اس بندے کی حاجت روا کرو لیکن اس میں تاخیر کرو کیونکہ میں دوست رکھتا ہوں کہ اپنے اس بندے سے ہمیشہ سنتا رہوں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی دشمن خدا دعا مانگتا ہے تو حق تعالیٰ جبرئیل کو حکم دیتا ہے کہ اس شخص کی حاجت بہت جلد پوری کر دو کیونکہ مجھے ناپسند ہے کہ میں اس شخص کی آواز سنوں۔

اور اس قسم کے دیگر بہت سے اسباب ہیں جو دعا کی قبولیت میں رکاوٹ بنتے ہیں لیکن ان تمام کا احاطہ کرنا طول کا باعث ہے۔

وہ لوگ جن کی دعا قبول نہیں ہوتی:

بعض احادیث میں ہے کہ تین قسم کے لوگوں کی دعا قبول نہیں ہوتی۔

(۱) وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے روزی مرحمت فرمائی ہو لیکن وہ اسے راہِ خدا کے غیر میں صرف کردے اور پھر دعا مانگے

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ

اے اللہ! مجھے رزق عطا کر تو اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتا ہے: کیا میں نے تجھے رزق نہ دیا تھا؟

(۲) جو کوئی اپنی بیوی پر ظلم کرے اور پھر اس کے لئے بددعا کرے تو حق تعالیٰ فرماتا ہے تو خود ہی اسے طلاق کیوں نہیں دیتا۔

(۳) جو شخص گھر بیٹھ جائے روزی کمانے کے لئے کوشش نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی روزی کی دعا مانگے

اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ

تو اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے: کیا میں نے تیرے لئے روزی کمانے کا دروازہ نہیں کھولا؟

اشکال دوم:

یہ کہ جب اللہ تعالیٰ وہی کچھ کرتا ہے جو اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے اور جو کچھ حکمت کے خلاف ہوتا ہے نہیں کرتا تو پھر دعا مانگنے کا کیا فائدہ ہوا کیونکہ دعا مانگنے والے کا سوال اگر اس کی حکمت کے مطابق ہے تو وہ کام خود ہی اللہ سبحانہ تعالیٰ انجام دے دے گا اور اگر حکمت کے خلاف ہے تو پھر ایسے کام کا اس ذات سے صادر ہونا محال ہے، دعا مانگی جائے یا نہ مانگی جائے؟

جواب:

جواب یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک امر قبل از دعا حکمت کے تقاضے کے خلاف ہو اور دعا کے بعد مصلحت کے مطابق ہو جائے کیونکہ حق تعالیٰ کی مصلحتیں اوقات اور زمان کے بدلنے سے تبدیل ہو جاتی ہیں اور اشخاص کے بدلنے سے بھی بدل سکتی ہیں چنانچہ آیات کریمہ میں بعض کا دوسری بعض کیلئے ناسخ ہونا اور کچھ شریعتوں کا دوسری شریعتوں کیلئے نسخ کا موجب ہونا اس بنیاد پر ہے۔

نیز یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ دعا مانگنا بجائے خود ایک عبادت ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اس عبادت پر اجر عطا کرتا ہے لہٰذا اگر بالفرض کسی کی دعا حاجت کے حصول میں تاثیر نہ کرے تو بھی وہ شخص اجر سے محروم نہ ہوگا (پس دعا کبھی بھی بے فائدہ نہیں ہوتی)۔

اشکال سوم:

ہمارا مشاہدہ ہے کہ اکثر اوقات کچھ افسون، نقش اور طلسم جادو وغیرہ مؤثر ہوجاتے ہیں لیکن منقول و ماثور دعائیں اور مشروع التجائیں مؤثر نہیں ہوتی اس لئے بہت سارے دنیا دار لوگ ان ادعیہ ماثورہ سے دل برداشتہ ہوجاتے ہیں اور اپنی حاجات کی برآوری کیلئے صاحب افسون و نقش اور علم تکسیر میں مہارت رکھنے والوں کی طرف رجوع کرنے لگتے ہیں۔

جواب:

یہ دنیا عالم اسباب ہے یعنی حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے حکمت و مصلحت کے مطابق بعض اشیا کو دوسری بعض کیلئے سبب بنایا ہے پس جب بھی کوئی سبب اپنی صحیح اور مخصوص صورت میں متحقق ہوتا ہے تو اس پر اس کا اثر مرتب ہوتا ہے خواہ وہ مشروع طریقے سے ہو یا غیر شروع ہو مثلاً ایک مرد جب کسی عورت سے مجامعت کرتا ہے تو شرائط پائے جانے اور مانع نہ ہونے کی صورت میں یہ عمل بچہ بننے اور اس کی ولادت ہونے کا موجب بنتا ہے خواہ وہ جنسی عمل مشروع ہو یا غیر مشروع

ہو۔

اس طرح چوری مال حاصل کرنے کا سبب ہے اور تلوار بدن کاٹنے اور زخمی کرنے کا سبب اور اس کی مثل کثیر اسباب موجود ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے بنا برامتحان و مصالح دیگر کہ وہ خود سب سے بڑا عالم ہے اپنے بندوں کو حکم فرمایا ہے کہ اس فانی جہاں میں ان خاص شرعی طریقوں سے تصرف کریں اور شرعی حدود سے تجاوز نہ کریں، خواہ اس سے ان کو اپنی تمنا کے مطابق دنیوی منافع حاصل ہوں یا نہ ہوں، تو اب اس عالم اسباب میں یہ ممکن ہے کہ افسون و جادو وغیرہ کسی امر کے حصول کا اسی طرح سبب ہوں جس طرح زنا بچے کے تولد یا چوری مال کے حصول کا باعث بنتی ہے لیکن عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی انسان شرعی طریقے کو چھوڑ کر دنیوی منافع کے حصول کیلئے ابدی خسارے اور دائمی عقاب کو اختیار نہ کرے۔ اس امر کی وضاحت کیلئے بہترین مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ دنیا ایک ایسے باغ کی طرح ہے جس میں انواع واقسام کے پھل اور میوے ہوں، اشجار و ازھار سے بھرا ہوا ہو، اس باغ کا مالک اپنے غلاموں کو کہے: تم لوگ جب بھی اس باغ کے میوہ جات کی ضرورت محسوس کرو تو مجھے بتاؤ میں اگر مصلحت دیکھوں گا تو تمہاری حاجت پوری کردوں گا اور اگر اس میں کوئی مفسدہ ہوا تو تمہاری حاجت پوری نہیں کروں گا لیکن تمہاری اس خواہش اور درخواست کے عوض میں تمہیں انعام دیا کروں گا اور اگر تم لوگوں نے میری اجازت کے بغیر اس باغ سے فائدہ اٹھایا تو کچھ عرصے کیلئے بطور اتمام حجت کوئی مواخذہ نہیں کروں گا لیکن اس مقررہ مدت کے گذر جانے کے بعد ایسے مجرموں کو ہمیشہ ہمیشہ کے سخت ترین عقاب اور گوناگوں عذاب میں ڈال دوں گا۔ پس افسوس اور ہلاکت ہے ایسے غلام کے عقل پر جو فقط اس لئے اپنی حاجت اپنے مالک کی خدمت میں عرض نہ کرے کہ ممکن ہے کہ میری درخواست قبول نہ ہو اور وہ کسی باغبان کے ساتھ سازش کر کے اس باغ کے میوہ جات میں تصرف کرتے رہیں اور پھر ابدی عذاب کا شکار ہو جائیں لیکن خوش بخت ہے وہ غلام جو کچھ عرصے گرسنہ رہے لیکن اپنے مالک کی خدمت میں درخواست پیش کرے، وہ مالک جس مقدار کو مصلحت سمجھے اسے دے دے اور اس اقدام سے وہ غلام اپنے آقا کا محبوب ہوجائے اور پھر وہ اسے ایسی ابدی نعمات عطا کرے گا کہ چشم روشن اور دل شاد ہوجائے اور اسے ابدی نجات حاصل ہوجائے، و ذالك فضل الله یوتیه من یشاء۔

فصل نہم:

آلام واعواض کا بیان

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ یہ دارِ دنیا رنج ومصائب وآلام وبلایا سے بھری ہوئی ہے اور اس دارِ فانی میں زندگانی انواع واقسام کے جسمانی اور روحانی آلام سے ملی ہوئی ہے یہاں راحت والم باہم اکٹھے ہیں اور اس کا خاتمہ اور انقطاع بھی یقینی ہے اور اس زندگی کا رنج والم، نیک وبد اور مستحق وغیر مستحق ہر ایک کیلئے آمادہ ہے پس کوئی اس توہم کا حق نہیں رکھتا کہ یہ سارے امور اللہ تعالیٰ کے عدل کے منافی ہیں کیونکہ خداوند عالم کی طرف سے بنی آدم کو جو تکالیف وآلام لاحق ہوتے ہیں وہ اس کے عدل وحکمت کے منافی اور فضل ورأفت کے مخالف نہیں ہیں نیز جو دکھ انسانوں کو دوسرے انسانوں کے ہاتھوں پہنچتے ہیں وہ نہ فعل خدا ہوتے ہیں اور نہ وہ ان پر راضی ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ تو دنیا یا آخرت میں ان آلام کا تدارک کرتا ہے اس طرح کہ وہ ہر ظالم کو اس کے اعمال کی سزا دیتا ہے اور کوئی ظالم اپنے ظلم کے بعد اس کی سزا سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

آلام کی تقسیم:

مندرجہ بالا اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آلام کی دو قسمیں ہیں: حَسَن اور قبیح اور اس بلند وعظیم ذات سے کوئی قبیح عمل صادر نہیں ہوتا، ہر قبیح عمل فقط عاصی بندوں سے سرزد ہوتا ہے۔ پس ہر وہ الم جو حسن ہے اس کا باری تعالیٰ سے صادر ہونا کوئی عیب نہیں بلکہ اس کا وقوع مستحسن ہوتا ہے۔

مستحسن الم کی چھ وجوہ:

ہمارے علماء کرام فرماتے ہیں: کہ الم مندرجہ ذیل چھ جہات سے مستحسن ہوسکتا ہے۔

اول:

ایسا الم کہ جس پر کافی زیادہ نفع مترتب ہو، الم دینے والا اس الم کے عوض اتنا نفع جزیل وجمیل مقرر فرما دے کہ الم

اٹھانے والا متألم اس الم پر راضی ہو جائے اور اس میں کوئی استبعاد نہیں ہے، کیونکہ بکثرت دیکھا گیا ہے کہ لوگ کثیر منافع کیلئے معمولی آلام و تکالیف پر راضی ہوتے ہیں چنانچہ اہل دنیا طلب دنیا کیلئے ہر قسم کی زحمات اٹھاتے ہیں، طلاب علم تحصیل علم کی راہ میں کس قدر زحمت کرتے اور مشقت برداشت کرتے ہیں کیونکہ جانتے ہیں اس پر عظیم ثمرات مترتب ہوں گے اسلئے اس رنج والم کو راحت سمجھ کر دانستہ قبول کرتے ہیں۔

دوم:

ایسا الم جس کے سبب بہت بڑا ضرر دور ہوتا ہو مثلاً اگر کسی مریض کے حق میں علاج کیلئے درد والم برداشت نہ کیا جائے تو خوف لاحق ہوتا ہے کہ وہ اس سے سخت تر مصیبت کا شکار ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ فصد (یا آپریشن) کی شدید تکالیف اور صعوبت کو اس سے زیادہ درد والم سے محفوظ رہنے کیلئے قبول کر لیتے ہیں یا بعض اوقات کسی کے ہاتھ یا دوسرے عضو کو کاٹ دینا برداشت کر لیا جاتا ہے جب اس میں پیدا ہونے والا زخم یا پھوڑا پورے بدن میں سرایت کرنے والا ہو۔

سوم:

ایسا الم جو اپنے دفاع کیلئے لگایا جائے لیکن اگر کوئی اس شخص پر سوء نیت کے ساتھ حملہ آور ہونا چاہے اور یہ اپنے دفاع کیلئے اس کے قاتلانہ اقدام سے پہلے اس کو قتل کر دے (تو اس دفاعی اقدام کو قبیح شمار نہیں کیا جاتا بلکہ اسے حسن قرار دیا جاتا ہے)۔

چہارم:

ایسا الم جو نظام کی عادت جاریہ کے تحت حاصل ہو مثلاً جب کوئی آگ میں گر جائے تو جل جاتا ہے یا دریا میں گر پڑے تو غرق ہو جاتا ہے تو اس الم کی نسبت خداوند تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اسلئے کہ اس نے نظام کائنات میں جلانے والی آگ اور غرق کرنے والے دریاؤں اور سمندروں کو خلق کیا ہے لیکن اس کا یہ اقدام قبیح نہیں (کیونکہ نظام کائنات کی ضرورت ہے کہ آگ اور پانی پیدا کرے اور آگ میں جلانے اور پانی میں غرق کرنے کی طاقت پیدا کرے اور ان کی اس صلاحیت کو عادت کے طور پر جاری رکھے ورنہ نظام میں خلل آجائے گا)۔

پنجم:

ایسا الم جو کسی کے اپنے اعمال کی سزا کے طور پر اسے لاحق ہوتا ہے مثلاً جو کسی کو ناحق قتل کر دے تو اس قاتل کو مقتول کے قصاص میں قتل کر دیا جائے۔

ششم:

ایسا الم اور ایسی محنت جس کے عوض اور اجرت میں اسے انعام یا مزدوری دی جائے اور وہ اس الم کو قبول کرے مثلاً بار برداری یا کارگذاری کرنے والوں کو ان کی محنت کی اجرت انہیں دی جاتی ہے اور وہ بخوشی اس زحمت کو برداشت کرتے ہیں۔

ان جہات کے بغیر اگر آلام ہوں تو وہ مستحسن نہیں یعنی جب کسی کو بغیر ایسے عوض کے تکلیف دی جائے جسے وہ بخوشی قبول نہ کرے تو یہ الم بغیر استحقاق کے ہے اور قبیح ہے حَسن نہیں ہے۔

باری تعالیٰ کی طرف سے دی جانے والی تکالیف حَسَن ہیں:

وجوہ حَسن روشن ہونے کے بعد ہم واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جس قدر آلام و تکالیف میں مبتلا کرتا ہے ان میں ان جہات میں سے کوئی ایک وجہ ضرور ہوتی ہے۔ بنابریں وہ مستحسن ہوتی ہیں البتہ اس میں جو وجہ بندگان کے اپنے افعال سے اختصاص رکھتی ہے مثلاً اپنے دفاع کیلئے کسی کو آلام پہنچانا وہ افعال خداوندی میں نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ کو کسی سے کوئی خوف لاحق نہیں ہوتا کہ اسے اس خوف کا دفاع کرنا پڑے البتہ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی دوسرے کو ضرر سے بچانے کیلئے ایسا اقدام فرمائے جیسا کہ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کے واقعہ میں فرمایا ہے۔

فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا (سورۂ کہف، آیت ۸۰)

ترجمہ: پس ہم ڈرے اس بات سے کہ وہ (بچہ) اپنے والدین کو سرکشی اور کفر میں مبتلا کردے۔

خلاصہ یہ کہ جو کوئی الم کا مستحق ہو اس کو الم دینا جائز ہے اس میں کوئی محل کلام نہیں ہے چنانچہ بندوں کو جو فقر و تنگی، بیماری، بلا یا مصیبت لاحق ہوتی ہے وہ بھی اسی قسم سے متعلق ہوتی ہے یعنی یہ ان کے اعمال کی اسی دنیا میں سزا ہوتی ہے لیکن بعض اوقات گناہ اس قدر سخت ہوتا ہے کہ اس کی آخرت میں بھی مزید سزا دی جاتی ہے لہٰذا کافرین، مخالفین اور فاسقین کیلئے عذاب جہنم کا آمادہ کرنا مستحسن اقدام ہے کیونکہ یہ عذاب ان کے اپنے کرتوتوں کی سزا ہے اور کبھی یہ آلام کسی کے گناہوں کا کفارہ بنتا ہے اور وہ اس کے سبب اخروی سزا سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

اور کبھی یہ الم لطف خداوندی ہوتا ہے کہ بندے کو اطاعت کے قریب لانے کا موجب بنتا ہے لیکن وہ بندے اس تکلیف کے سبب توبہ و انابت کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں یعنی یہ الم اس کیلئے تنبیہ کا باعث بن جاتا ہے اور وہ توبہ کر کے مغفرت اور بخشش کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس شخص کو مزید اجر و ثواب دیا جاتا ہے کیونکہ جہاں الم استحقاق کی مقدار سے زیادہ ہوگا وہاں

اللہ تعالیٰ مزید ثواب بھی عطا کرے گا۔

چند احادیث کا بیان:

(۱) حضرت امام زین العابدین علیہ السلام صحیفہ کاملہ کی ایک دعا میں انہیں وجوہ کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَلٰى مَا لَمْ اَزَلْ اَتَصَرَّفُ فِيهِ مِنْ سَلَامَةِ بَدَنِي، وَلَكَ الْحَمْدُ عَلٰى مَا اَحْدَثْتَ بِي مِنْ عِلَّةٍ فِي جَسَدِي (دعا نمبر ۱۵)

دعا کافی طویل ہے اور اس کا ماحصل یہ ہے کہ "اے خداوند تعالیٰ تیری حمد اور تیرا شکر ہے کہ مجھے متواتر بدن کی سلامتی سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کیا ہے اور تیرا حمد و شکر ہے کہ تو نے میرے جسم کو بیماری لاحق کی اور اے اللہ میں نہیں جانتا کہ ان دو حالتوں میں سے کون سی حالت زیادہ لائق شکر ہے، آیا وہ صحت و سلامتی کی حالت کہ اس میں تو نے مجھے ایسی پاکیزہ روزی اور بدن کی نشاط و تازگی عطا کی کہ اس سے میں تیری رضا جوئی میں مصروف رہا اور مجھے ایسی توانائی مرحمت فرمائی کہ اس سے میں تیری اطاعت بجا لا سکا یا وہ مرض و بیماری کی حالت کہ اس میں تیرے گناہوں اور نافرمانیوں سے مبتلا ہونے سے دور رہا،

یہ ایسی نعمتیں بن گئیں کہ اس کی وجہ سے میں اپنی پشت پر لدے ہوئے گناہوں کا بار دور کرنے میں کامیاب رہا کہ اس بیماری کے سبب میں توبہ کی طرف متوجہ ہوا اور معاصی کے بوجھ سے آزاد ہوا اور یہ تیری شفقت قدیم اور احسان جسیم ہے کہ اس وجہ سے میں گناہوں سے دور ہو گیا اور پھر مجھے لامتناہی ثواب نصیب ہوا اور کاتبین کرام نے میرے لئے ایسی نیکیاں لکھیں کہ نہ میرا دل ان کی فکر کر سکا اور نہ میری زبان ان کے بارے میں گویا ہوئی اور نہ میرے اعضاء نے ان حسنات کیلئے مشقت اٹھائی۔

(۲) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ فرمایا: ایک شب کا ثواب تمام گذشتہ اور آئندہ گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔

(۳) حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معتبر حدیث میں منقول ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے جو کوئی تین راتوں تک بیماری برداشت کرے اور اپنے عیادت کرنے والوں کے سامنے میری شکایت نہ کرے تو اس کو اس گوشت کے بدلے بہترین گوشت اور خون کے بدلے بہترین خون عطا کرتا ہوں پھر اگر میں اس کو شفا عطا کردوں تو اسے گناہوں سے پاک کر دیتا ہوں اور اگر اسے موت دے دوں تو اسے اپنی رحمت کی طرف لے جاتا ہوں اور یہی معنی ہے امامؑ کے اس ارشاد کا:

تَخْفِيفًا لِمَا ثَقُلَ بِهِ عَلَيَّ ظَهْرِي

یعنی تخفیف کرتے ہوئے اس بوجھ کی، جو میری پشت پر لدا ہوا تھا۔

(۴) ایک صحیح حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روز اپنا سر آسمان کی طرف بلند کیا اور مسکرانے لگے۔ صحابہ کرام نے اس تبسم کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: میں دو فرشتوں کو دیکھ کر تعجب میں آیا ہوں کہ وہ دونوں زمین کی طرف آئے اور انہوں نے ایک مومن بندے کو اس کی عبادت گاہ میں نماز کے مصلیٰ میں تلاش کیا تا کہ اس کے روز و شب کے اعمال لکھیں لیکن وہ انہیں نماز کی جگہ پر نہ ملا یہ فرشتے واپس آسمان کو گئے اور پروردگار عالم سے عرض کی: ہم نے تیرے فلاں بندے کو اس کی نماز کی جگہ تلاش کیا لیکن ہمیں نہیں ملا وہ تو بیماری میں گرفتار ہو چکا ہے حق تعالیٰ نے فرمایا: اس کیلئے وہ تمام نیکیاں لکھ لو جو وہ حالت صحت میں شب و روز انجام دیا کرتا تھا اور جب تک اس بیماری میں گرفتار ہے ایسے ہی اعمال خیر لکھتے رہو۔ اور یہی مراد ہے:

وَالنِّعَمِ الَّتِیْ اَتْحَفْتَنِیْ بِهَا سے اور احتمال ہے کہ ان نعمتوں سے مراد وہ بیماری و مرض اور آلام ہوں جو گناہوں کے بوجھ کی تخفیف کا باعث بنتے ہیں اگر چہ یہ مفہوم الفاظ کے ظاہر سے بعید دکھائی دیتا ہے لیکن

تَخْفِیْفًا لِمَا ثَقُلَ بِهٖ عَلَیَّ ظَهْرِیْ

کے اندر جو تعلیل بیان کی گئی ہے اس کے لحاظ سے یہ معنی زیادہ مناسب قرار پاتا ہے بنا بریں "بھا" کی باء سببیت کیلئے نہیں ہے بلکہ فقط صلہ بیان کرتی ہے یعنی ان نعمتوں کا صلہ ہے گناہوں کے بوجھ کا تخفیف پانا۔

(۵) حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک دیگر حدیث معتبر میں منقول ہے کہ جب کسی مومن پر بڑھاپے کا ضعف غالب آجاتا ہے تو حق تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ جو اعمال خیر اپنی جوانی اور طاقت کے زمانے میں انجام دیتا تھا وہ سب اس کیلئے لکھو اور اسی طرح ایک فرشتہ اس بیمار مومن کیلئے معین کیا جاتا ہے کہ جو اعمال خیر اپنی صحت و تندرستی میں کیا کرتا تھا وہ سارے اس کیلئے بیماری کے زمانے میں بھی لکھے اور کافر بیمار کیلئے وہ ساری برائیاں لکھے جو وہ عالم صحت میں کرتا تھا۔

(۶) شیخ محمد بن یعقوب کلینیؒ اپنے اسناد کے ساتھ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ: انبیاء بنی اسرائیل میں سے ایک پیغمبر ایک ایسی میت کے پاس سے گزرے جس کے بدن کے کچھ حصے پر ایک دیوار گر پڑی تھی اور جو حصہ دیوار کے باہر تھا اسے درندے، وحشی جانور اور پرندے نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ پھر اس کے بعد وہی پیغمبر ایک ایسی میت کے پاس سے گزرے جسے ایک بہترین تخت پر لٹایا گیا تھا ریشم و دیباج کے پارچات میں اسے لپیٹا گیا تھا اور خوشبو والی انگیٹھیاں اس کے گرد رکھی ہوئی تھیں۔ جب بنی اسرائیل کے اس پیغمبر نے یہ حالات دیکھے تو بارگاہ خداوندی میں عرض کیا: میں گواہی دیتا ہوں کہ تو سارے حاکموں کا حاکم اور عادل بادشاہ ہے لیکن یہ کیا ہے؟ کہ اس پہلے بندے نے کسی کو تیری عبادت میں شریک نہ مانا اور ہمیشہ تیری وحدانیت پر یقین رکھ کر تیری پرستش کرتا رہا لیکن تو نے اسے اس طرح کی ذلت آور موت کا شکار کر دیا ہے

اور اس دوسرے شخص نے کبھی تیری ذات پر ایمان اختیار نہ کیا لیکن تو نے اسے پلید بدن کے باوجود اسے زیب و

زینت سے آراستہ کر دیا ہے تو حق سبحانہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

ہاں یقیناً میں ایسا ہی ہوں جیسے کہ تو نے گواہی دی ہے، عدالت و حکمت کے علاوہ کوئی شئے میری کبریائی میں دخل نہیں رکھتی لیکن وہ پہلا بندہ جو تو نے دیکھا ہے اس سے ایک گناہ سرزد ہوا تھا اسلئے میں نے اسے اس قسم کی ذلت و خواری والی موت دے دی تا کہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے (اور وہ آخرت میں آزاد اور خوشحال رہے) اور اس دوسرے شخص سے ساری عمر ایک نیکی صادر ہوئی تھی اسلئے میں نے اسے اس نیکی کے عوض میں اس قسم کی ظاہری عزت والی موت دے دی تا کہ آخرت میں وہ کسی نیکی کو میری بارگاہ میں پیش نہ کر سکے۔

بغیر استحقاق کے ابتداء میں آلام کیوں؟

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آلام و مصائب ابتداء ہی میں ایسے افراد پر نازل ہو جاتے ہیں جو کسی طرح ان کے مستحق نہیں ہوتے مثلاً اہل عصمت و طہارت ہستیوں پر نازل ہونے والے مصائب یا نابالغ اطفال اور مجنوں افراد پر آنے والے مصائب (کہ ان کے ذمہ کوئی گناہ نہیں ہوتا، تو ان پر یہ مصائب کیوں آتے ہیں؟ تو جواب یہ ہے کہ ان میں دو چیزوں میں سے ایک ضرور ہوتی ہے۔

اول: کہ ان کیلئے ایک عوض ہوتا ہے جو اس مصیبت و الم کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتا ہے کہ اگر اس الم کو برداشت کر کے اس عظیم عوض کو حاصل کر لینے یا الم سے محفوظ رہ کر اس عظیم عوض سے محروم رہنے کے درمیان اختیار دے دیا جائے تو وہ اس عظیم عوض والے الم کو اختیار کرے گا۔

دوم: کہ اس الم میں متالم (مصیبت سے دوچار ہونے والے) کے حق میں ایسا لطف و کرم ثابت ہو کہ اگر اس کے غیر کیلئے بھی مفید ثابت ہوتا تو اس الم کا عبث اور فضول ہونا لازم نہ آئے مثلاً کسی طفل صغیر کو مریض کر دیا جائے تا کہ وہ اس کے والدین کیلئے تذکر اور تنبیہ کا موجب بنے اور وہ لوگ توبہ و انابت کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

الم فقط امتحان کیلئے:

ہمارے والد ماجد (علامہ غفران مآبؒ) نے اس شرط میں کچھ تامل فرمایا ہے: اسلئے کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ الم سے غرض محض امتحان لینا ہو اور مطیع و عاصی کے درمیان تمیز کرنا ہو گویا مقصد اس الم دینے سے ایسی تکلیف ہے جیسی تکلیف اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو اپنے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کا حکم دینے میں مدنظر رکھی تھی کہ یہ اقدام الم پہنچانے کا موجب تھا لیکن اس سے مقصود فقط امتحان لینا اور آزمائش کرنا تھا، کسی دوسری اطاعت کے قریب کرنا نہ تھا۔ لیکن میری نظر قاصر میں یہ تکلیف (ابراہیمؑ) بھی لطف سے خالی نہ تھی لیکن یہ بھی لازم نہیں کہ اصل تکلیف کا

لفظی اشتقاق کُلفت سے ہے اور کُلفت مشقت کو کہتے ہیں اور ہر مشقت میں فی الجملہ الم ضرور ہوتا ہے اور ہر تکلیف کی غرض امتحان ہوتا ہے اور ضروری نہیں کہ ہر تکلیف کسی دوسری اطاعت کے قریب کرنے والی ہو لیکن ایسے الم میں اس کا عوض ایسا ثواب ضرور ہونا چاہئے جو تعظیم پر مشتمل ہو اور زیر بحث الم میں عوض کا تنظیم سے خالی ہونا کافی ہے پس ایسے الم کو الم تکلیفی قرار نہ دیا جائے گا اور اس قسم کے الم میں لطف ہونا شرط ہے۔ الم تکلیفی ہونا شرط نہیں (فتامل)۔

اور یہ بات مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے کہ جب کسی بندے پر کسی سابقہ جرم وقصور کے بغیر خداوند عالم کی طرف سے کوئی الم نازل ہوتا ہے تو اس پر اس قدر ثواب جزیل، اجر کثیر اور حسنات جلیلہ مترتب ہوتی ہیں کہ اگر وہ لوگ ان کی تفاصیل پر آگاہ ہوں تو قضاء الٰہی کی رضا پر اپنی جان دینے کیلئے آمادہ ہو جائیں گے۔

بوقت موت مؤمن اور ملک الموت کا مکالمہ:

تفسیر امام میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ: ہر مومن ہمیشہ اپنے خاتمے کے برے ہونے کے متعلق ڈرتا رہتا ہے اور احتضار کے وقت اور ملک الموت کی آمد تک اسے اپنے اوپر باری تعالیٰ کے راضی ہونے کا کامل یقین حاصل نہیں ہوتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مومن بیماری کی سختی اور تنگیٔ سینہ کی شدت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے پاس ملک الموت وارد ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ یہ مومن اپنے اموال وعیال کو چھوڑنے اور دیگر امور کی وجہ سے مضطرب اور پریشان ہے۔

اس کے دل میں اپنے پس ماندگان اور اہل وعیال کے بارے میں حسرتیں اور کئی قسم کی آرزوئیں ان سے وابستہ تھیں لیکن وہ سب ختم ہو رہی ہیں اور وہ ان سب کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکا تو ملک الموت اس مومن سے کہتا ہے: کیوں اس قدر غم وغصہ کا شکار ہو اور پریشان ہو رہے ہو؟ تو مومن جواب میں کہتا ہے: اسلئے کہ اپنے امور کے پراگندہ ہونے کو دیکھ رہا ہوں اور تو میرے اور میری آرزوؤں کے درمیان حائل ہو گیا ہے تو ملک الموت کہتا ہے:

کیا کوئی عاقل اس وقت غمگین ہوتا ہے جب وہ ایک معمولی سا درہم دے کر ہزارہا دینار حاصل کر رہا ہو تو مومن کہتا ہے: نہیں، تو ملک الموت کہتا ہے: ذرا اوپر کی طرف دیکھو!

اب مومن کو بہشت کے بلند درجات اور عظیم محلات نظر آتے ہیں۔ اس زیارت سے اس کے دل کی ساری آرزوئیں محو ہو جاتی ہیں اور دنیا کی باتیں اسے بھول جاتی ہیں اب ملک الموت کہتا ہے: یہ ہیں تیری منزلیں اور نعمتیں اور تیرے اہل وعیال اور تیری ذریت واولاد میں سے جو کوئی دار دنیا میں صالح اور نیکوکار ہو گا وہ بھی ان میں تیرے ساتھ ہو گا، کیا تو ان عظیم انعامات پر اس دنیا کے مال ومتاع کے بدلے راضی ہے؟

تو مومن کہتا ہے: ہاں، قسم بخدا میں راضی ہوں۔ اب ملک الموت دوبارہ کہتا ہے: ذرا دوبارہ اوپر دیکھ اب وہ

دیکھتا ہے کہ حضرت رسول اکرم ﷺ، حضرت امیر المومنینؑ اور دیگر تمام ائمہ معصومین علیہم السلام اعلیٰ علیین میں تشریف فرما ہیں۔ ملک الموت پوچھتا ہے: کیا تو نے اپنے ان سرداران، بزرگان اور اپنے ائمہ و پیشوایان کی زیارت کی ہے جو یہاں پر تیرے ہم نشین اور باعث اُنس ہوں گے، کیا تو ان پر راضی ہے؟ ان اشیاء دنیا کے عوض میں جن کو تو دنیا میں چھوڑ رہا ہے اور جدا ہو رہا ہے، تو مومن جواب میں کہتا ہے: ہاں، قسم بخدا میں راضی ہوں۔

اس کے بعد آنحضور ﷺ نے فرمایا: یہ معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا جس میں وہ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا (سورۂ فصلت، آیت ۳۰)

ترجمہ: بے شک جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہتے ہیں ان پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں (اور کہتے ہیں) کہ تم نہ خوف کھاؤ، نہ غم و حزن کرو۔

فرزند کی موت پر مومن کا ثواب:

(۱) حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ: ایک مومن کے فرزند کی موت پر ثواب بہشت ہے، صبر کرے یا نہ کرے۔ اگر کسی مومن کا فرزند اس کے سامنے فوت ہو تو یہ فرزند اس کیلئے ان ستر بیٹوں سے بہتر ہے جو اس کے بعد زندہ رہیں اور راہ خدا میں جہاد کریں۔

(۲) اور حضرت سید الانبیاء والمرسلین ﷺ سے منقول ہے کہ وہ شخص بہشت میں داخل نہیں ہوسکتا جس کے آگے کوئی پیش رو نہ ہو (جو اس سے پہلے فوت ہوا ہو) ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اگر کسی کا فرزند پیدا ہی نہ ہوا ہو یا اس سے قبل اس کا فرزند فوت نہ ہوا ہو تو اس کا حال کیا ہوگا؟ تو حضرت ﷺ نے فرمایا: اس کا مومن بھائی اس کا پیش رو ہوتا ہے۔

(۳) آنحضرت ﷺ نے اولاد جننے والی عورت سے تزویج کرنے پر ترغیب دیتے ہوئے فرمایا!

اَنِّیْ اُبَاهِیْ بِكُمُ الْاُمَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ حَتّٰی بِالسِّقْطِ یَظَلُّ مُحْبَنْطِئًا عَلٰی بَابِ الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ ادْخُلِ الْجَنَّةَ فَیَقُوْلُ لَا اَدْخُلُ حَتّٰی یَدْخُلَ اَبَوَایَ قَبْلِیْ فَیَقُوْلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی لِمَلَكٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ ائْتِنِیْ بِاَبَوَیْهِ فَیَأْمُرُ بِهِمَا اِلَی الْجَنَّةِ فَیَقُوْلُ هٰذَا بِفَضْلِ رَحْمَتِیْ لَكَ. (الکافی ۔ ج ۵ ۔ ص ۳۳۴)

ترجمہ: میں اپنی امت کے دیگر امتوں سے کثیر ہونے پر بروز قیامت فخر کروں گا حتی کہ اس حمل پر جو سقط ہو گیا ہوگا کہ وہ بچہ بہشت کے دروازے پر آ کر رک جائے گا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور ملال کے

آثار ہویدا ہوں گے پس خداوند عالم اسے فرمائے گا بہشت میں داخل ہو جاؤ، تو وہ عرض کرے گا جب تک میرے والدین بہشت میں داخل نہ ہوں میں داخل نہیں ہوں گا۔ پس حق تعالیٰ ملائکہ میں سے ایک کو حکم دے گا اس کے والدین کو لے آؤ پس اللہ تعالیٰ ان کو بہشت میں داخل ہونے کا حکم فرمائے گا پس خداوند عالم فرمائے گا کہ یہ تیری عزت ہے میری رحمت کے فضل سے ہے۔

ان روایات سے روشن ہوتا ہے کہ جو الم اطفال اور ان کے والدین کو لاحق ہوتا ہے وہ ان اطفال اور ان کے والدین کے درجات کی بلندی کا باعث بنتا ہے نیز ان والدین اور ان کے رشتہ داران کیلئے ایسا لطف ہوتا ہے جو ان سب کیلئے اطاعت خداوندی کے قریب ہونے کا موجب بنتا ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اطفال کو لاحق ہونے والے مصائب ان کے اولیاء کیلئے تذکر وتنبیہ کا باعث بنتے ہیں اور ان کو اللہ تعالیٰ سے توبہ وانابت کی طرف مائل کرتے ہیں۔

انبیاء، امام حسینؑ اور معصومینؑ کے مصائب کی حکمت:

تمام انبیاء کرام علیہم آلاف التحیۃ والسلام کے مصائب وآلام بھی اسی باب سے متعلق ہیں یعنی یہ مصائب ان کے مدارج عالیہ میں مزید بلندی کا باعث بنتے ہیں اور اسی طرح حضرت امام حسین علیہ السلام کا شہادت کے درجہ پر فائز ہونا بھی عاصیان امت کیلئے شفاعت کا درجہ اور دیگر درجات عالیہ پر فائز ہونے کا موجب ہے۔

حضرت ام سلمیٰ سلام اللہ علیہا سے منقول ہے کہ جبرئیلؑ رب جلیل کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: حق تعالیٰ نے حسنین علیہما السلام کے بارے میں فیصلہ فرمایا ہے اور آپ کو صبر کرنا ہوگا۔ آنحضرتؐ نے پوچھا وہ حکم کیا ہے؟ تو جبرئیل نے عرض کیا کہ حضرت امام حسن علیہ السلام زہر دغا کے ساتھ اور حضرت امام حسین علیہ السلام تیغ اعداء کے ساتھ شہید ہوں گے اور ہر نبی ووصی کی دعا مستجاب ہوتی ہے پس اگر آپ چاہیں تو اپنی عزت سے اس مصیبت کو دور کرانے کیلئے استعمال کریں اور چاہیں تو ان شہزادگان اور اپنی عترت کی مصیبت کو اپنی امت کے گنہگاروں کی شفاعت کیلئے ذخیرہ فرما دیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

میں وہی چاہتا ہوں جو میرا خدا چاہتا ہے اور میں اپنی دعا کو عاصیانِ امت کیلئے ذخیرہ کروں گا۔

حضرت امام صاحب العصر والزمان علیہ السلام کی ناحیۂ مقدسہ سے ایک دعا وارد ہوئی ہے اس میں یہ جملہ موجود ہے:

اَلْمُعَوَّضِ مِنْ قَتْلِهٖ اَنَّ الْأَئِمَّةَ مِنْ نَسْلِهٖ وَ الشِّفَاءَ فِيْ تُرْبَتِهٖ وَ الْفَوْزَ مَعَهٗ فِيْ اَوْبَتِهٖ وَ الْاَوْصِيَاءَ مِنْ عِتْرَتِهٖ بَعْدَ قَائِمِهِمْ وَ غَيْبَتِهٖ.

یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کو شہادت کے عوض چند چیزیں عطا کی گئی ہیں: امامت آپؑ کی نسل میں رکھ دی گئی، آپ کی تربت میں شفا رکھ دی گئی، اور کامیابی آپ کی قربانی میں اور آپ کی عترت کے اوصیاء کے مصائب میں رکھ دی

گئی اور آخری کامیابی قائم آلِ محمد علیہم السلام کی غیبت کے ختم ہونے کے بعد ہوگی۔

بعض مخالفین حق کا اشکال:

اس حقیقت کے روشن ہونے کے باوجود کچھ اہلِ خلاف بلکہ اہلِ موافقت میں سے چند ایک قاصر العقل لوگوں نے بھی یہ اشکال کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے فرزند بے گناہ حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے کا جو حکم دیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے عدل کے خلاف ہے کیونکہ ایسا خون ناحق کیسے مامور بہ ہوسکتا ہے (یعنی یہ تو ایک ناحق اور ناجائز قتل کا حکم ہے، اس کا حکم خلاف عدالت ہے)۔

جواب:

ان لوگوں نے اپنی نافہمی اور کم عقلی کی وجہ سے عدلِ الٰہی کے خلاف سوال اٹھانے کی ناکام کوشش کی ہے حالانکہ یہ شک و شبہ درحقیقت ابلیس اور اس کے تابعین کی باتوں سے اخذ کیا گیا ہے، کیونکہ ایک روایت میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے بحکم پروردگار حضرت اسماعیل علیہ السلام کو پہلو کے بل لٹا دیا اور اس کو ذبح کرنے کے ارادے سے چھری اس کی گردن پر رکھ دی تو شیطان ایک مرد پیر (بوڑھے) کی شکل میں سامنے آیا اور کہنے لگا: اے ابراہیم! اپنے بیٹے کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا! اسے ذبح کرنا چاہتا ہوں، شیطان بولا: سبحان اللہ، ایسا بیٹا جس نے چشم زدن کیلئے بھی معصیت خدا نہیں کی، اس کو ذبح کرنا چاہتے ہو؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ہاں، اسلئے کہ خداوند تعالیٰ نے مجھے اس کو ذبح کرنے کا امر دیا ہے۔ اسلئے میں اپنے فرزند کو راہِ خدا میں قربان کرنا چاہتا ہوں۔

شیطان نے کہا: پروردگار تو خون ناحق سے منع فرماتا ہے۔ شیطان نے خواب میں تجھے ایسے قبیح فعل کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا! لعنت ہو تجھ پر، میں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا ہے، اسی کے کلام نے مجھے اس امر عظیم پر آمادہ کیا ہے۔ قسم بخدا: اب میں تجھ سے کوئی کلام نہیں کروں گا، اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود کو اپنے فرزند کے ذبح والے خصوصی حکم کی اطاعت کیلئے آمادہ کر لیا تو ابلیس نے پھر کہا:

اے ابراہیم علیہ السلام تو لوگوں کا امام اور پیشوا ہے، سارے لوگ تیری پیروی کرتے ہیں۔ اگر تو نے اپنے فرزند کو ذبح کر دیا تو لوگ بھی اپنے فرزندان کو ذبح کرنے لگیں گے لہٰذا ایسے اقدام سے باز رہ۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مثل مشہور کے مطابق خاموشی اختیار کر لی (جواب جاہلاں باشد خاموشی)، اس کی باتوں سے بے اعتنائی کر لی، اس سے کوئی کلام نہ کیا اور خالق انس و جان کے حکم کی تابعداری پر کمر باندھ لی اور مصروف عمل ہو گئے۔

پس ہمارے بیان کردہ ضابطہ سے اس ابلیسی اعتراض اور اس کے تابعداروں کے شبہات کا جواب روشن ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مقرب بندوں اور مطیع و فرماں بردار ہستیوں کو امتحان و آزمائش کے مقام میں سخت ترین تکالیف میں ڈالتا ہے تا کہ ان مصائب پر صبر و اصطبار و حسن اختیار کا اظہار کرنے پر ان کو مدارج عالیہ اور مراتب رفیعہ عطا فرماوے چنانچہ اس صبر آزما معرکہ میں حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام دونوں کی قوت صبر ظاہر ہوگئی۔

اسی طرح کفعمیؒ کی روایت میں ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سچا خواب دیکھا تو رکن اور مقام (حجر اسود اور مقام ابراہیمؑ) کے درمیان تھے عالم خواب میں دیکھا کہ اپنے فرزند کو ذبح کر رہا ہوں تو خوف کھا کر اس خواب سے بیدار ہوئے۔

اور ایک روایت میں نقل ہے کہ ماہ ذوالحجہ کی شب ہشتم میں آپ نے یہ خواب دیکھا تو سارا دن اس فکر میں رہے کہ یہ کیسا خواب ہے؟ اس لئے اس روز کو "روزِ ترویہ" کہتے ہیں۔ پھر آپ نے یہی خواب شب عرفہ (نویں ذوالحجہ کی شب) کو دیکھا اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس تکلیف کی یقینی معرفت حاصل ہوگئی اسی لئے اس روز کو "روزِ عرفہ" کہا جاتا ہے۔

اور سابقہ روایت میں موجود ہے کہ آپ نے خواب سے بیدار ہو کر اس کا اپنے بیٹے کے سامنے ذکر کیا اور کہا اے بہترین نبی و انبیاء کی عظیم اولاد! اے میرے بیٹے! بے شک میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے قربان کر رہا ہوں راہِ خدا میں "فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى" تو اس بارے میں فکر کر اور مجھے بتا، تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جواب دیا:

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ (سورۂ صافات، آیت ۱۰۲)

یعنی اے پدر بزرگوار! آپ کو جو امر دیا گیا ہے وہ آپ پورا کریں، انشاء اللہ مجھے آپ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔

پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے باپ کو وصیت کی اور جب وہ وصیتوں سے فارغ ہوئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو خوب اچھی طرح باندھا اور پہلو پر سلا دیا اس حال کو دیکھ کر ہوا کے پرندے حزن و ملال کی وجہ سے ان کے گرد اکٹھے ہونے لگے، زمین اور پہاڑ لرزنے اور رونے لگے، فرشتے اس پر تضرع و زاری کرنے لگے، حیوانات ان کی طرف دوڑنے لگے، اوپر آسمان رویا، نیچے زمین نے گریہ کیا، وہ سب اس طفل صغیر پر رحم کھا رہے تھے اور شیخ کبیر کے صبر پر تعجب کر رہے تھے تو جب حق سبحانہ و تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صدق نیت اور قوت صبر کا مشاہدہ فرما لیا تو رحم فرمایا اور اس کا فدیہ ایک گوسفند کو قرار دے دیا جیسا کہ اس ہستی کی عادت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور پھر اس امتحان کے مقابلے میں ان کیلئے بے حساب ثواب مقرر فرماتا ہے اور اسی وجہ سے اس قسم کے آلام میں ڈالنا مستحسن قرار پاتا ہے اور مصائب اٹھانے والا مؤمن بے حساب اجر و ثواب کے مدنظر اس الم اور مصیبت کو راضی ہو کر برداشت کرتا ہے۔

چنانچہ بسند معتبر حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے

فرزند کو ذبح کرنے کے عوض میں ایک گوسفند کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا تو وہ اس کے اس فرمان میں موجود ہے۔

وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰاِبْرٰهِيْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۰۵﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَالْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۷﴾ (سورۂ صافات، آیت ۱۰۴ تا ۱۰۷)

ترجمہ: اور ہم نے اس کو ندا دی اے ابراہیم! بے شک آپ نے خواب سچ کر دکھایا ہے ہم نیک بندوں کو اسی طرح جزاء دیتے ہیں، بے شک یہ ایک روشن اور کھلی آزمائش ہے اور ہم نے اس کا فدیہ ایک اور عظیم ذبح کو قرار دے دیا ہے۔

شہادت امام حسین علیہ السلام ذبح عظیم ہے:

امام رضا علیہ السلام نے فرمایا: پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آرزو کی تھی کہ کاش مجھے گوسفند ذبح کرنے کا حکم نہ دیا جاتا اور راہ خدا میں اپنے ہاتھ سے بیٹے کو ذبح کرنے کی وجہ سے میرا دل درد کرتا اور اس طرح میں اہل مصاب کو ملنے والے بلند ترین درجات کا مستحق قرار پاتا، تو حق تعالیٰ نے آپ پر وحی فرمائی اور پوچھا اے ابراہیمؑ! تیرے ہاں ساری مخلوق میں سے محبوب ترین ہستی کون ہے؟ تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا، خداوندا! تو نے جس قدر مخلوق خلق کی ہے اس ساری مخلوق میں سے میرے ہاں محبوب ترین ہستی تیرے حبیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ کوئی نہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: آیا وہ محبوب ترین ہے یا اے ابراہیمؑ تیرا اپنا نفس!؟ تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میں ان کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب رکھتا ہوں اور ان کے فرزندان کو اپنے فرزندان سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: آیا ان کے فرزندان کے دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے تیرا دل زیادہ درد کرے گا یا اپنے فرزند کو میری اطاعت میں اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے کے ساتھ زیادہ دکھی ہوگا؟ تو ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی: ان کے فرزندان کا دشمنوں کے ہاتھ قتل ہونا میرے دل کو بیشتر اذیت پہنچائے گا، تو اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا: اے ابراہیم! ایک ایسا گروہ ہوگا جو امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہونے کا دعویٰ کرے گا وہی ان کے فرزند کو ظلم وعدوان سے اس طرح قتل کرے گا جیسے گوسفند کو ذبح کیا جاتا ہے۔

وہ لوگ اس ظلم کی وجہ سے میرے غضب کے مستحق قرار پائیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام یہ سن کر سخت غمگین ہوئے، آپ کے دل میں درد اٹھا اور گریہ کرنے لگے۔ پس حق تعالیٰ نے ندا دی: اے ابراہیم! اگر تو اپنے فرزند اسماعیل کو قربان کر کے جزع کرتا تو میں نے تیرے اس غم کو پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم فرزند امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے غم پر قربان کر دیا اور اس سبب سے آپ کو اہل مصائب کے بلند ترین درجات کا حقدار قرار دے دیا اور یہی معنی ہے قول خداوندی "وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ" کا۔

راہِ خدا میں شہادت پانا، سب سے افضل عمل ہے:

ان حقائق سے آگاہی کے بعد روشن ہے کہ لوگوں کا ایک دوسرے کو ناحق قتل کرنا انتہائی قبیح عمل ہے کیونکہ اس سے یہ لوگ اس عوض جزیل پر قدرت نہیں رکھتے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث ہوتا ہے۔ یہ الم پہنچانا محض الم دنیا ہی ہوتا ہے اور اس عمل کا نتیجہ مقتول کو ضرر پہنچانے، وارثان کو الم دینے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا بخلاف اس قربانی کے جو راہِ خدا میں دی جائے کیونکہ اس سے انسانی جانوں کا مالک اور روز حساب کو ثواب بخشنے والا ایسی جزا دیتا ہے کہ اس کی ایک نظر رحمت کا مقابلہ پوری دنیا و مافیہا نہیں کر سکتے لہٰذا بندوں کیلئے سزاوار یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے امتحان و آزمائش کی راہ میں ہر قسم کی تکلیف و مشقت برداشت کریں اور مجاہدین و سرفروشان کا راہِ خدا میں اپنی جانوں کو قربان کرنا انتہائی مستحسن اور بجا اقدام ہوتا ہے اور تمام شہیدوں کے سرور و سردار حضرت امام حسین علیہ السلام نے اپنے تمام جانثار و وفادار اصحاب سمیت جس طرح راہ خدا میں قربانیاں دی ہیں اور آزمائش کے سنگین لمحات میں سعادت مندی اور مردانگی کے جوہر دکھائے ہیں اور کشادہ پیشانی کے ساتھ ثبات قدم کا مظاہرہ کیا ہے اس کی دوسری مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔

امام زین العابدین علیہ السلام کا بیان روزِ عاشور کے جان نثاران:

چنانچہ حضرت امام علی بن الحسین (زین العابدین) علیہ السلام سے مروی ہے کہ

كَانَ الْحُسَيْنُ عليه السلام وَ بَعْضُ مَنْ مَعَهُ مِنْ خَصَائِصِهِ تُشْرِقُ اَلْوَانُهُمْ وَ تَهْدَأُ جَوَارِحُهُمْ وَ تَسْكُنُ نُفُوسُهُمْ فَقَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ انْظُرُوا لَا يُبَالِي بِالْمَوْتِ.

ترجمہ: فرمایا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور آپ کے چند مخصوص اصحاب کی کیفیت معرکہ کربلا میں دوران جنگ یوں تھی کہ آپ کا رنگ نور کی طرح روشن اور چمک رہا تھا، آپ کے اعضاء و جوارح انتہائی پرسکون تھے اور آپ کے قلوب مکمل طور پر مطمئن تھے اور وہ سب ایک دوسرے کو کہہ رہے تھے کہ حضرت امام کو دیکھو ان کو موت کی کوئی پرواہ نہیں اس لئے تمام اصحاب ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے اور مدارج عالیہ کو اپنی نظروں میں لئے ہوئے تھے۔

شب عاشورا امام حسین علیہ السلام کا خطبہ:

امام چہارمؑ سے مروی ہے کہ:

قال كنتُ مع ابي فى ليلة التى قتل فى صبيحتها فقال لاصحابه هذا الليل قد غشيكم فاتخذوه جنة فان القوم انما يريدوننى ولو قتلونى لم يلتفتوا اليكم و انتم فى حل وسعة فقالوا، والله لا يكون هذا ، فقال، انكم تقتلون غدا كلكم ولا يفلت منكم رجل قالوا

الحمدلله الذی شرفنا بالقتل معك، ثم دعا لهم، فقال ارفعوا رؤسكم وانظروا فجعلوا فينظرون إلى مواضعهم ومنازلهم فی الجنة وهو يقول لهم، هذا منزلك يافلان فكان الرجل يستقبل الرماح والسيوف بصدره و وجهه ليصل الی منزله فی الجنة.

ترجمہ: میں (علی زین العابدین علیہ السلام) اس شب اپنے پدر بزرگوار (امام حسین علیہ السلام) کے ساتھ تھا جس کی صبح آپؑ شہید کر دیئے گئے، اس شب (عاشور) آپ نے اپنے اصحاب کو فرمایا: اس تاریک شب نے تمہیں ڈھانپ لیا ہے تمہیں چاہیئے کہ اس کی تاریکی کو سلامتی و کامیابی کی ڈھال کے طور پر استعمال کرو (یعنی اندھیرے سے استفادہ کرتے ہوئے چلے جاؤ) کیونکہ یہ لوگ فقط مجھے قتل کرنے کا ارادہ کئے ہوئے ہیں اور اگر مجھے شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے تو تمہاری طرف کوئی توجہ نہ دیں گے اور تم سب محفوظ رہو گے اور آرام پاؤ گے اس پر آپ کے اصحاب کہنے لگے: اللہ کی قسم! ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا (یعنی ہم آپ کو ان کے حوالے چھوڑ کر چلے جائیں، ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا)۔

تو امامؑ نے فرمایا: ایسی صورت میں تم سب کل شہید کر دیئے جاؤ گے اور کوئی ایک بھی زندہ نہ رہ سکے گا۔ اصحاب نے عرض کی: اس اللہ کا شکر ہے جو ہم سب کو آپ کی نصرت میں قتل ہوجانے کا شرف دے۔ اس پر امامؑ نے ان سب کو دعا فرمائی کیونکہ جب ان سب کی نیت کی صداقت اور قلبی خلوص دیکھ لیا اور واضح ہوگیا کہ یہ لوگ راہِ حق میں جان کی بازی لگانے میں دریغ کرنے والے نہیں ہیں تو امامؑ نے چاہا کہ ان کو اخروی درجات کا نظارہ کرادیں۔

تو دعا کی اور فرمایا: اپنے سروں کو بلند کرو اور ادھر دیکھو تو ان سب کو اپنے اپنے جنت کے مدارج دکھائی دینے لگے اور امامؑ ہر ایک کو فرمانے لگے اے فلاں: یہ جنت کی منزل تیرے لئے ہے اور اے فلاں: وہ منزلِ بہشت تیرے لئے ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے ہر ایک نیزوں اور تلواروں کو اپنے چہرے اور سینے پر برداشت کرتا تھا تاکہ ان سے گذر کر اپنی بہشت والی منزل تک پہنچ جائے۔

موت اور دیگر مصائب کا وقوع ظلم نہیں:

اگر خوب غور کریں تو یہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ ساری مخلوقات کی موت و حیات اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے اگر کوئی شخص ایسے مصائب و تکالیف کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منسوب کرنا ناروا خیال کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملک الموت اس کے حق میں جس امر کو اپنی حکمت کے مطابق قرار دیتا ہے اسی پر عمل کرتا ہے

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (سورۂ انبیاء، آیت ۲۳)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ جو کرے اس سے کوئی سوال نہیں کرسکتا اور لوگ جو کچھ کریں ان سے پوچھ کچھ ہوتی ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ پر کوئی حاکم نہیں جو اس سے پرسش کر سکے دیگر ساری مخلوق اس کے حکم کے تحت ہے ان سے پرسش کرنا اور مواخذہ کرنا اس کا اختیار ہے۔

وَلَا يُقَاسُ رَبِّ النَّاسِ

لوگوں کے رب کو لوگوں کے ساتھ قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

لوگوں کی طرف آلام و مصائب کی حکمت اور ظلم کی اقسام:

تمام ایسے آلام و مصائب جو عوام کی طرف سے وقوع پاتے ہیں ان کی چند صورتیں بن سکتی ہیں:

(۱) وہ آلام جو اللہ تعالیٰ رب العالمین کی اجازت کے ساتھ ہوتے ہیں اور شرعاً مباح قرار پاتے ہیں مثلاً گوشت کھانے کیلئے حلال حیوانات کا ذبح کرنا کہ کبھی ایسا کرنا واجب ہوتا ہے مثلاً حج پر منیٰ میں جانور کا قربانی میں ذبح کیا جانا اور کبھی ایسا کرنا سنت موکدہ ہوتا ہے مثلاً عید قربان کے موقع پر پورے عالم میں جانوروں کی قربانی کیا جانا ان تمام صورتوں میں ان تکالیف کا عوض دینا پروردگار عالم کے ذمہ عائد ہوتا ہے (جو وہ عطا کرتا ہے اور کرے گا) پس ہندو قوم کے برہمن جو کہتے ہیں کہ بے گناہ حیوانات کو ذبح کر دیا قبیح عمل ہے۔

ان کا یہ خیال فاسد ہے کیونکہ قبیح تب قرار پاسکتا ہے جب اس کا عوض نہ ہو حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ شارع نے ان آلام کو روا بنایا ہے تو اس کے عدل کا تقاضہ ہے کہ اس پر عوض مقرر فرمائے چنانچہ جب فیاض مطلق اپنے خزائن رحمت سے الم رسیدہ شخص کو عوض عطا فرماتا ہے تو یہ قبح کا سارا تصور برطرف ہو جاتا ہے بعض روایات میں وارد ہے کہ ذبح کیے گئے ایسے حیوانات اہل بہشت کی سواریاں بنائے جائیں گے۔

ایسے آلام و مصائب جو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر اور اس کی نہی کے باجود وقوع پاتے ہیں ان کا قبیح ہونا واضح ہے اور ان کا عوض ان کے فاعل کے ذمہ ہوتا ہے ان کے ظلم کے برابر ہوتا ہے اور خداوند عالم پر لازم ہے کہ وہ مظلوم کا حق ظالم سے وصول کرائے اور انصاف کرے اور اللہ تعالیٰ بروزِ قیامت ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا کیونکہ وہی عادل ذات ہے جو خود ظلم نہیں کرتا اور کوئی ظالم اس کی گرفت سے فرار نہیں کر سکتا چنانچہ اس بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنینؑ کا ارشاد منقول ہے

أَلَا وَ إِنَّ الظُّلْمَ ثَلَاثَةٌ فَظُلْمٌ لَا يُغْفَرُ وَ ظُلْمٌ لَا يُتْرَكُ وَ ظُلْمٌ مَغْفُورٌ (الحدیث)

آگاہ رہو کہ ظلم کی تین قسمیں ہیں:

اول: وہ ظلم، وہ ناقابل بخشش ہے کبھی معاف نہیں ہوسکتا۔

دوم: وہ ظلم، جس کے فاعل کو پوچھ گچھ اور بازخواست سے واگزار نہیں کیا جاسکتا۔

سوم: وہ ظلم، جس کی بخشش کی امید ہے۔

پہلی قسم کی مثال شرک کرنا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ (سورہ نساء، آیت۔۴۸)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرے گا (اس امر کو کہ اس کا شریک مانا جائے)۔

دوسری قسم کی مثال لوگوں کا ایک دوسرے پر ظلم ہے جب تک مظلوم راضی نہ ہو ظالم کو پرسش اور بازخواست سے چھوڑا نہیں جاتا اور آخرت کا بدلہ تو بہت سخت ہے،

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى (سورۂ طہ، آیت ۱۲۷)

اور تیسری قسم آدمی کا اپنے نفس پر ظلم کرنا ہے یعنی معصیت الٰہی کرنا اور اس ظلم کو خداوند عالم اپنی مہربانی کے ساتھ بخش دیتا ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ لائق مغفرت گناہ وہ ہے جس کے فاعل کا اللہ تعالیٰ نے دنیا میں مواخذہ کر لیا ہو اور کسی مشکل میں مبتلا کر دیا ہو پھر حق تعالیٰ وہ کریم تر اور بلند ہستی ہے کہ کسی کو دوبارہ اسی گناہ کے عذاب میں گرفتار کرے۔

حق اللہ اور حق الناس:

گناہ کی دو قسمیں ہیں: حق اللہ یا حق الناس۔

اللہ تعالیٰ کے حق سے تعلق رکھنے والی معصیت یا شرک ہے یا وہ جو اس شرک کے حکم میں ہے کیونکہ نبوت و امامت اور تمام ضروریات دین و مذہب کا انکار بھی شرک کے حکم میں ہے اگر کوئی ایسا منکر ایمان کی طرف واپس آئے بغیر مرے اور اس سے توبہ نہ کرے تو اس کا یہ جرم پہلی قسم یعنی ناقابل بخشش گناہ قرار پاتا ہے اور ایسا مجرم ہمیشہ جہنم کی سزا پانے والوں میں سے قرار پاتا ہے:

لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ (سورۂ آل عمران، آیت ۸۸)

ان کا عذاب کبھی تخفیف نہیں پاتا،

اور اگر گناہ ایسا نہ ہو تو اگر گناہ گار کا ایمان و عقیدہ صحیح ہو، منکر نہ ہو اور توبہ کرے تو اس کا گناہ بخش دیا جائے گا۔

قبول توبہ کا واجب ہونا، عدل کا تقاضہ ہے یا رحمتِ الٰہی کا؟:

اس بارے میں اختلاف ہے، کیا توبہ قبول کرنا اللہ تعالیٰ پر لازم ہے؟ یعنی توبہ کرنے والے کا حق ہے کہ اللہ تعالیٰ از راہِ عدل و انصاف اس کی توبہ کو لازماً قبول کرے یا ایسا نہیں؟ بلکہ از راہِ فضل و کرم و رأفت و رحمت اللہ تعالیٰ نے اپنے

او پر لازم کرلیا ہے کہ توبہ قبول فرمائے گا۔

احادیث اور ادعیہ کی اکثریت سے دوسرا قول ثابت ہوتا ہے (یعنی قبولیتِ توبہ عدل کا مقتضی نہیں بلکہ تفضل خداوندی ہے اور اس کا وعدہ ہے)۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام صحیفۂ کاملہ کی دعاءِ شکر میں فرماتے ہیں:

لَا يَجِبُ لِاَحَدٍ اَنْ تَغْفِرَ لَهُ بِاسْتِحْقَاقِهِ وَ لَا اَنْ تَرْضٰى عَنْهُ بِاسْتِيجَابِهِ، فَمَنْ غَفَرْتَ لَهُ فَبِطَوْلِكَ وَ مَنْ رَضِيتَ عَنْهُ فَبِفَضْلِكَ.

اے اللہ! کسی کا حق نہیں ہے کہ تو اس کو اس کے استحقاق کے تحت بخش دے اور نہ لازم ہے کہ تو اس پر راضی ہو جائے جب وہ اس کی درخواست کرے، پس جسے بخش دیتا ہے تیرا احسان ہوتا ہے اور جس پر راضی ہوتا ہے تیرا فضل و کرم ہوتا ہے۔

لیکن یہ احتمال بھی دیا جاسکتا ہے کہ عدم استیجاب (یعنی درخواست نہ کرنے) سے مراد یہ ہو کہ جب کوئی اطاعت میں کوتاہی اور تقصیر کرے اور صحیح شرائط و مدارج کے مطابق توبہ نہ کرے تو وہ، مغفرت کا مستحق نہیں بنتا، اسی لئے امام علی ابن حسین علیہما السلام نے اس دعا کی ابتداء میں فرمایا ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّ اَحَدًا لَا يَبْلُغُ مِنْ شُكْرِكَ غَايَةً اِلَّا حَصَلَ عَلَيْهِ مِنْ اِحْسَانِكَ مَا يُلْزِمُهُ شُكْرًا، وَ لَا يَبْلُغُ مَبْلَغًا مِنْ طَاعَتِكَ وَ اِنِ اجْتَهَدَ اِلَّا كَانَ مُقَصِّرًا دُوْنَ اسْتِحْقَاقِكَ بِفَضْلِكَ. فَاَشْكَرُ عِبَادِكَ عَاجِزٌ عَنْ شُكْرِكَ، وَ اَعْبَدُهُمْ مُقَصِّرٌ عَنْ طَاعَتِكَ، لَا يَجِبُ لِاَحَدٍ اَنْ تَغْفِرَ لَهُ بِاسْتِحْقَاقِهِ.

میرے اللہ! اور یقینی ہے کہ کوئی شخص تیری رفعت شان کے مطابق تیرے شکر کی انتہا کو نہیں پہنچ سکتا مگر تیرے احسان کے طفیل اس قدر شکر بجالاتا ہے جو اس پر لازم ہوتا ہے اور کوئی تیری شان وعظمت کے لائق تیری اطاعت نہیں کرسکتا اگرچہ پوری کوشش کرے مگر تیرے فضل و کرم کے وسیلہ سے تیرے استحقاق سے کم ترین حد تک اطاعت کرسکتا ہے لہٰذا سب سے زیادہ شکر گذار بندہ بھی تیرے شکر کا حق ادا کرنے سے عاجز ہے اور سب سے بڑا عبادت گذار شخص بھی تیری اطاعت کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔

بنابریں کسی کو حقدار ہونے کی وجہ سے بخشنا تیرے اوپر واجب نہیں ہے ہاں جو کوئی اپنی پوری وسعت و طاقت خرچ کر کے تیری عبادت و اطاعت کرتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حق کے برابر نہیں کرتا البتہ اپنی لیاقت کے مطابق کرتا ہے جیسے کہ اس دعائیہ جملہ کا مفہوم ہے

يَا مَنْ يَقْبَلُ الْيَسِيْرَ وَ يَعْفُو عَنِ الْكَثِيْرِ.

اے وہ جو تھوڑے عمل کو قبول کرتا ہے اور کثیر گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

پس خداوند عالم ہمیشہ اپنی رأفت ورحمت کے طفیل قبول فرمالیتا ہے۔

لہٰذا اگر استحقاق سے مراد یہ ہو کہ پروردگار عالم جل شانہ وعز سلطانہ کی بلند ترین شان کے لائق خضوع وخشوع اور اطاعت واتباع بجالانا واجب ہے تو ایسا کرنا بندگان خدا کے امکان میں نہیں ہے اسی لئے تو تمام انبیاء واوصیاء علیہم السلام نے ہمیشہ اپنی زبان سے اس امر کا اقرار واعتراف کیا ہے کہ ہم اس رب قدیر کی اطاعت سے قاصر ہیں اور اس کا حق ادا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

اور اگر استحقاق سے مراد یہ ہو کہ بندگان اپنے امکان کے مطابق اطاعت اور اپنے عجز کے مطابق ناقص عبادت بجا لائیں اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے مطابق قبول کرلے تو یہ صحیح ہے اور اس کے انکار کی گنجائش نہیں کیونکہ اگر ایسا بھی نہ ہو تو نظام تکلیف بے کار ہو جائے گا اور مقام آزمائش برقرار نہ رہے گا اور پھر عامہ کا یہ نظریہ درست قرار پائے گا کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو تمام اطاعت گزاروں کو جہنم بھیج دے اور تمام معصیت کاروں کو بہشت روانہ کرے کیونکہ اطاعت گذار جب تقصیر کرتے ہیں تو لائق مواخذہ رہتے ہیں اور معصیت کار ہمیشہ لائق بخشش ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ استحقاق کے پہلے معنی کی نفی سے استحقاق کے دوسرے معنی کی نفی نہیں ہوسکتی اور عامہ اس دعا کے جملوں اور اس کی مثل دیگر ایسے حکمات سے استدلال نہیں کر سکتے اور حکیم مطلق ذات کیلئے مرجوح کو ترجیح دینا اور مفضول کو افضل پر مقدم رکھنا قبیح ہوتا ہے اور وہ کبھی قبیح اقدام نہیں کرتا۔

اور واضح رہے کہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں توبہ کا امر فرمایا ہے اور عفو کا وعدہ کیا ہے۔ ارشاد قدرت ہے:

تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ۭ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (سورۂ تحریم، آیت ۸)

ترجمہ: تم سب اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو اور اسکی معافی مانگو جو باعث نصیحت ہو تو تمہارا پروردگار تمہارے گناہوں کو مٹا دے گا۔

اہل البیت علیہم السلام سے منقول ہے کہ کلام الٰہی میں "عسیٰ" موجبہ ہوتا ہے یعنی قبولیت کے واجب ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔

توبہ کا مفہوم اور اس کے شرائط:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ قبول کرنے کا وعدہ ایک روشن حقیقت ہے پس ضروری ہے کہ توبہ کی حقیقت کو واضح کیا جائے۔ توبہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی معصیت و نافرمانی پر پشیمان اور نادم ہو، اور اپنے منان پروردگار کی درگاہ کی طرف رجوع کرے اور اس سے عزم صادق کے ساتھ پختہ عہد کرے کہ میں دوبارہ نافرمانی نہیں کروں گا اور فرائض و

واجبات سے بھی غفلت نہ برتوں گا اور اپنے سابقہ گناہوں کی تلافی کیلئے جو اقدام کرنا لازم ہو اور ان کے تدارک کیلئے جو عمل ضروری ہو ان کو بجا لائے تو اسے توبہ کہتے ہیں۔

حقوق اللہ کی توبہ:

پس اگر اس کا گناہ حقوق اللہ سے مربوط ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کام سے منع کیا ہو اور بندگان خدا کا حق اس میں نہ ہو مثلاً شراب پینا، بے شوہر عورت سے زنا کرنا، تو ایسے گناہ کی توبہ کیلئے یہ کافی ہے کہ وہ سابقہ گناہ سے ندامت و پشیمانی کرے، اس کو آئندہ کیلئے ترک کرے، اور اس کے نہ کرنے پر عزم بالجزم کرے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کو دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عہد کرے۔

اسی طرح اگر وہ گناہ ایسے واجب کو ترک کر دینا ہو جس کی قضا نہیں ہوتی مثلاً واجب نمازِ عید کو ترک کر دے تو اس کی توبہ کیلئے بھی اپنے گناہ پر ندامت و پشیمانی کرنا اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا عہد کرنا کافی ہے۔

لیکن تمام واجبات ایسے نہیں ہیں۔ کئی واجبات ایسے ہیں جن کی تلافی کیلئے کچھ اقدامات کرنا ضروری ہوتے ہیں اسلئے ان کی تین قسمیں بنتی ہیں۔

پہلی قسم: وہ واجبات جن کے قضا کرنے سے تلافی ہوسکتی ہے مثلاً نماز یومیہ (ہر روز کی نماز پنجگانہ) خمس، زکوٰۃ۔

دوسری قسم: وہ واجبات جن کی قضا کے ساتھ کفارہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے مثلاً ماہِ رمضان کے روزوں کا ترک کرنا بغیر کسی شرعی عذر کے۔

تیسری قسم: وہ واجبات جن کی تلافی فقط کفارہ میں منحصر ہے مثلاً قسم توڑنا، شرعی عہد کی خلاف ورزی کرنا۔

اور یہ تو ہم درست نہیں کہ کفارہ ادا کرنے سے نامشروع کام شروع ہو جاتا ہے اور اس سے یکدم گناہ ساقط ہو جاتا ہے بلکہ کفارہ تو ایک جرمانہ ہے اور الٰہی مواخذہ کی راہوں میں سے ایک راہ ہے جو اس دارِ فانی میں کیا جاتا ہے اور آخرت کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں رہتا ہے (لہٰذا فقط کفارہ ادا کر دینا کافی نہیں، بلکہ توبہ کرنا بھی ضروری ہے یعنی کفارہ دینے کے ساتھ ساتھ اپنے گناہ پر نادم ہونا اور آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا پختہ عہد کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا عذابِ آخرت سے نجات دے سکتا ہے)۔

حقوق الناس کی توبہ:

اگر گناہ کسی آدمی کے حق سے مربوط ہو تو اس کی توبہ کیلئے فقط ندامت کافی نہیں بلکہ توبہ اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کے ساتھ ضروری ہے کہ حق والے کو اس کا حق ادا کرے، اس کا عوض اسے دے یا اس سے معافی مانگے اور مغفرت

چاہے اور اس سے اپنا حق حلال کرنے کی استدعا کرے۔

(۱) مالی حقوق کی توبہ:

پس اگر وہ حق مال ہو مثلاً کسی سے اس کا مال غصب کیا ہو یا اس کے حقوق میں سے کسی حق کو روک لیا ہو اور صاحب حق معلوم شخص ہو، زندہ موجود ہو اور اس کے حق کی مقدار بھی معین ہو تو لازم ہے کہ وہ اس شخص کو ادا کرے اور اگر وہ صاحب حق فوت ہو گیا ہو تو اس کا حق اس کے شرعی وارثان کو ادا کرے یا ان سے حق ابراء (معاف کر دینے) کی استدعا کرے اور اگر صاحب حق کو تو پہچانتا ہو لیکن حق کی مقدار معلوم نہ ہو تو اس سے مصالحت کرے اور اسے راضی کرے اور اگر مقدار معلوم ہو لیکن صاحب مال کا علم نہ ہو تو اگر وہ مال لُقطہ تھا (یعنی کسی جگہ پڑا ہوا مل گیا تھا) تو ضروری ہے کہ عوام کے مقاماتِ اجتماع، اور مساجد کے ابواب پر اس کے اعلانات کرائے، لوگوں کو اس مال سے آگاہ کرے۔ ایک سال تک اس فریضے کو ادا کرے اور پھر مالک کی طرف سے تصدق کر دے اور اگر وہ مال لقطہ نہ تھا تو پھر سال بھر انتظار کئے بغیر تصدق کر دیا جائے پھر اگر وہ مالک معلوم ہو جائے تو اگر وہ اس تصدق پر راضی ہو جائے تو فبہا، ورنہ اسے اس مال کا عوض اپنی طرف سے ادا کر دے (پس صدقہ اس کی اپنی طرف سے قرار پا جائے گا اور یہ خود اس کے ثواب کا حق دار بنے گا)۔

اور اگر کسی کے ہاں حرام کا مال حلال سے مخلوط ہو گیا ہو اور اسے نہ تو صاحب مال کا علم ہو اور نہ ہی مال حرام کی مقدار کا، تو لازم ہے کہ اس سارے مخلوط مال کا خمس نکالے وہ خمس سادات (اور امامؑ) کو ادا کرے اور وہ مال کسی لاوارث کا ہو (یعنی کسی ایسے مرحوم کا ہو جس کا کوئی نسبی وسببی رشتہ دار وارث نہ رہا ہو) تو یہ مال امامؑ یا نائبِ امامؑ کی خدمت میں پہنچایا جائے، تاکہ وہ اس میں تصرف کریں۔

(۲) قتل وجرح کی توبہ:

اور اگر وہ حق مالی نہ ہو بلکہ کسی کے نفس یا بدن پر کیا گیا جرم ہو، اس کو مجروح کیا ہو، اس کو قتل کر دیا ہو پس اگر ناحق قتل کیا ہو تو تین افراد کا حق مواخذہ اس قاتل سے تعلق پا لیتا ہے ایک تو اللہ تعالیٰ کو حق مواخذہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس ذات ربانی نے ایک مومن کے قتل کو حرام قرار دیا ہے اور اس اقدام پر سخت ترین تہدید فرمائی ہے، ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا (سورۂ نساء آیت ۹۳)

ترجمہ: جو کوئی کسی مومن کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

لہٰذا جو کوئی اس قتل کا ارتکاب کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کا عاصی ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کو اس مواخذہ کا حق ہوتا ہے۔ اور دوسرا حق مواخذہ مقتول کے وارثان کو حاصل ہوتا ہے کیونکہ قاتل نے ان کے دل میں درد پیدا کیا ہے

اور تیسرا حق مواخذہ خود اس مقتول کو حاصل ہوتا ہے کہ اس نے اس سے زندگی چھین لی ہے اور زندگی کے تمام مفادات سے اس کو محروم کر دیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے حق کی تلافی اس طرح ہوتی ہے کہ قتل کا کفارہ ادا کرے، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے، توبہ کرے، تضرع وزاری کرے اور جس قدر باری تعالیٰ کی درگاہ میں استغفار کر سکتا ہے کرے۔

اور ورثا ان کے حق کی تلافی کا طریقہ یا ان کا عفو کر دینا ہے، یا اس سے قصاص لینا یعنی قتل میں قتل اور زخم کی صورت میں زخم، پس قاتل یا جارح پر لازم ہے کہ خود کو صاحبِ قصاص کی خدمت میں پیش کرے وہ اگر قصاص لینا چاہے تو یہ قصاص دے (یعنی قتل ہونے یا زخمی ہونے کو برداشت کرے) اور اگر وہ دیت لینا چاہے تو یہ خون بہا ادا کرے اور اگر وہ عفو کر دے تو اس کا اختیار ہے۔

اور تیسرا حق جو خود مقتول کو حاصل ہے تو اس کیلئے علاوہ ازیں کوئی راستہ نہیں کہ وہ آخرت میں اسے معاف کرے کیونکہ یہ اختیار خود اسی سے مربوط ہے اور اس کا معاملہ کسی کو معلوم نہیں۔

(۳) بغیر توبہ مرنے والے کی معافی:

اگر کسی شادی شدہ یا منکوحہ عورت سے زنا ہو یا کسی کا مال غصب کیا ہو اور دنیا میں اس کی تلافی کئے بغیر مر گیا ہو کہ صاحب حق کے عفو کئے بغیر مواخذہ سے آزادی حاصل نہیں ہوسکتی تو ایسی صورتوں میں خداوند عالم ظالم سے مظلوم کی حق رسی کیلئے ظالم کو زیادہ عذاب دے کر انتقام لے گا یا ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دے کر مظلوم کو راضی کرے گا۔

اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اگر کوئی گناہ گار پوری نیت صادق کے ساتھ توبہ واستغفار کرے اور اپنے اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ اطاعت کر کے راضی کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم اور مہربانی کے ساتھ صاحب حق کو خود ہی معاف کرنے پر راضی کرے اور اپنی طرف سے اسے زیادہ نعمت عطا کرے جیسا کہ بعض روایات میں فرمایا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے بہشت میں بہت سارے درجات عالیہ معاف کرنے والوں کیلئے آمادہ کر رکھے ہیں کہ ان صاحبان حق کیلئے ان درجات کو جلوہ گر فرمائے گا اور ارشاد ہوگا کہ اگر تم میرے فلاں مومن بندے کو معاف کر دو تو یہ درجات تمہیں عطا کر دوں گا۔

(۴) گمراہ کرنے والے کی توبہ:

اگر معصیت کسی کو گمراہ کرنے اور منحرف راہ پر لگانے والی ہو تو اس گناہ کی توبہ یہی ہے کہ ان لوگوں کو ہدایت کرے اور گمراہی سے واپس لے آ کر رشد وہدایت کی راہ پر لگائے اس کے بغیر اس گمراہ کرنے والے کی توبہ قبول نہیں ہوسکتی چنانچہ ہمارے والد ماجد (علامہ غفران مآب) طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ نے مواعظ حسینیہ میں فرمایا ہے کہ بعض احادیث میں یہ بات منقول ہے (خلاصہ مضمون ان کا یہ ہے) ایک شخص ایک طویل مدت تک حلال طریقے سے دنیا حاصل کرنے

میں کوشاں رہتا ہے لیکن اسے یہ مطلوبہ دنیا حاصل نہ ہوئی پھر وہ ایک مدت مزید تک حرام طریقے سے اس دنیا کے حصول میں جدوجہد کرتا رہا لیکن اس طریق سے بھی اپنی مراد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو شیطان مجسم ہو کر اس کے سامنے آیا اور اس سے کہا کہ تو نے حلال وحرام دونوں طریقے آزمائے ہیں لیکن حصول دنیا میں کامیاب نہیں ہوا اور مطلوب تجھے میسر نہیں آیا اب اگر میری بات پر عمل کرے تو اپنی مراد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اپنے مطلوب و مقصود کی شیرینی سے تیرا کام و دہن شیرین ہو سکے گا تو اس شخص نے پوچھا اسے کیا کرنا ہوگا؟ شیطان نے جواب دیا اس کے لئے تو دین میں ایک بدعت ایجاد کر، پیغمبرؐ کے طریقے کے خلاف اور شریعت کے حکم کے مخالف لوگوں کو دعوت دے "تیرا مقصد حاصل ہوگا"۔ چنانچہ اس شخص نے دنیا کی محبت اور فریفتگی میں یہ اقدام کیا جس سے عوام کی کثیر جماعت کو گمراہی کا شکار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چند روز نہ گزرے تھے کہ دنیا اس کی طرف رجوع کرنے لگی مال و متاع اور اسباب دنیا کے انبار اس کو ملنے لگے اور اپنی تمنا سے زیادہ دولت اس کے پاس جمع ہوگئی..... ایک طویل مدت کے بعد یہ شخص خوابِ غفلت سے بیدار ہوا اور فکر کرنے لگا اور کہنے لگا ہائے افسوس میں نے کس قدر جرم کیا ہے۔ میں نے دین کو دنیا کے بدلے فروخت کر دیا ہے اور عذابِ ابدی کا مستحق بن گیا ہوں پس وہ توبہ پر آمادہ ہو گیا۔

خود کو ایک صحرا میں لے گیا وہاں ایک کلے اور رسی کے ساتھ باندھ دیا اور اللہ تعالیٰ سے توبہ و استغفار اور تضرع و زاری میں مصروف ہو گیا۔ اس قدر توبہ و زاری کی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبران میں سے ایک کو وحی کی کہ میرے اس بندے کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ کہ اگر اس حال میں اس قدر رہو کہ تمہارا گوشت، پوست اور ہڈیاں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو بھی تجھے اس وقت تک نہ بخشوں گا جب تک ان لوگوں کو ہدایت پر نہ لائے جن کو تو نے گمراہ کیا ہے اس کے بغیر تیری توبہ ہرگز قبول نہیں ہو سکتی، فَاعْتَبِرُوْا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ (مقام عبرت ہے صاحبانِ بصیرت کیلئے)۔

تقدیر میں موت کا وقت مقرر ہے تو قاتل کو سزا کیوں:

سوال: یہ تو ہم بکثرت پایا جاتا ہے کہ آیت کریمہ میں فرمایا گیا ہے:

فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (سورۂ اعراف، آیت ۳۴)

ترجمہ: کہ جب ان کی موت کا مقررہ وقت آجاتا ہے تو نہ ایک گھڑی کیلئے موخر کئے جاتے ہیں اور نہ ہی مقدم۔

اس سے معلوم ہوا کہ موت کا ایک لحہ معین ہے تو اگر مقتول کی موت اسی لحہ تقدیر میں معین کر دی گئی تھی جس لحہ قاتل نے اسے قتل کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قاتل اس کو قتل کرتا یا نہ کرتا اس کی زندگی اسی لحہ ختم ہونا ہی تھی تو پھر قاتل کا مواخذہ کیوں ہو؟ اور اگر اس لحہ اس کی موت مقدر نہ تھی تو قتل کرنے سے اس کا موت پا جانا مقررہ لحہ سے قبل موت کا آجانا بنتا ہے جو آیت کریمہ کے مفاد کے خلاف ہے۔

اجل مسمّٰی، اجل غیر مسمّٰی اور محتوم و مقضی کا فرق:

جواب: یہ ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کی اکثر احادیث اور علماء دین کے ارشادات سے یہ مفہوم ثابت ہوتا ہے کہ اجل (موت کا مقررہ شدہ وقت) کی دو قسمیں ہیں:

اول: وہ اجل جس سے تقدیم یا تاخیر ممکن نہیں ہے

دوم: وہ اجل جس میں تقدیم یا تاخیر ہوسکتی ہے۔

تفسیر عیاشی میں مصدق بن صدقہ سے روایت ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: کہ آیت الٰہی ہے:

ثُمَّ قَضٰی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنۡدَهٗ (سورۂ انعام، آیت ۲)

ترجمہ: پھر اس نے اپنی اجل کو پورا کیا اور مقررہ اجل اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر کیا ہے؟ ارشاد فرمایئے تو آپؑ نے فرمایا:

اَجَلٌ غَیۡرُ مُّسَمًّی

(غیر معین اجل) موقوف اور معلق ہوتی ہے (یعنی بعض شرائط پر موقوف رکھی گئی ہوتی ہے) اس میں تقدیم و تاخیر ہوسکتی ہے اور

اَجَلٌ مُّسَمًّی

(معین شدہ اجل) وہ ہوتی ہے جس کے بارے میں حق تعالیٰ شب قدر میں فیصلہ دیتا ہے کہ اس سال آئندہ شب قدر تک کس کس نے فوت ہونا ہے۔ اور حمران سے روایت ہے کہ سابقہ آیت

فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمۡ.....

سے یہی اجل (مسمی) مراد ہے اور دیگر بعض روایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ

ثُمَّ قَضٰی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی

میں اجلا سے مراد وہ (غیر مسمّٰی) اجل مراد ہے جس کی اطلاع انبیاء اور ملائکہ کو دی جاتی ہے اور اجل (مسمّٰی) وہ اجل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری مخلوق سے مستور کیا ہوا ہے۔

ہمارے والد ماجد اعلی اللہ درجتہ مواعظہ حسینیہ میں فرماتے ہیں کہ: بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اجل مسمّٰی میں بداء واقع ہوسکتی ہے اور اجل محتوم مقضی وہ ہوتی ہے جس میں بداء واقع نہیں ہوتی۔

اور ان احادیث سے وہی بات ظاہر ہوتی ہے جو علی بن ابراہیم قمیؒ نے اپنی تفسیر میں فرمائی ہے یعنی یہ کہ اجل محتوم و مقضی وہ اجل ہے جس کا حتمی فیصلہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے لہٰذا اس میں کوئی تغیر نہیں ہوسکتا اور اجل مسمیٰ وہ ہوتی ہے جس میں بداء (تبدیلی) ہوسکتی ہے پس اس میں تقدیم و تاخیر ممکن ہوتی ہے لیکن اجل محتوم میں ایسا ممکن نہیں رہتا۔

خلاصہ یہ کہ ان تمام روایات سے یہ امر روشن ہو جاتا ہے کہ اجل کی کئی صورتیں ہیں البتہ یہ امر زیرِ اختلاف ہے کہ اجل مسمی کیا ہے؟ کیا اس سے مراد وہی اجل محتوم ہے جس میں تقدیم و تاخیر ممکن نہیں کیا اجل مسمیٰ اس کے مقابل میں دوسری قسم ہے یعنی جس میں تقدیم و تاخیر ممکن ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ یہ اختلاف بھی نام کے بارے میں ہے کہ کسی قسم کا نام کیا ہے؟ اور یہ کوئی سنگین اختلاف نہیں ہے لہٰذا معاملہ آسان ہے پس اجل محتوم کا نام ہی اجل مسمیٰ ہو یا نہ بہر حال اجل محتوم وہ ہوتی ہے جس میں تغیر و تبدل اور تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی۔

اور جہاں تک بداء کے مفہوم اور اس کی تفصیل کا تعلق ہے تو وہ اور اس کی تمام مصلحتوں کا بیان توحید کے مباحث میں عرض کیا جا چکا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رائے میں ہم خطا کار لوگوں کی طرح ہونے والا تغیر و تبدل کبھی نہیں ہوتا وہ اس سے پاک اور بَری ذات ہے۔ اس کے تمام افعال و اقوال اس کی تقدیر میں اور سارے احکام کثیر حکمتوں اور فراوان مصلحتوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

پس غیر حتمی فیصلوں اور تقدیروں میں مصلحت و حکمت کے مطابق وہ تبدیلی کر دیتا ہے جیسا کہ بعض شرعی احکام کو منسوخ کر دینے میں ہوتا ہے اسی طرح وہ خود بہتر جانتا ہے کہ ایجاد و اعدام یا موت و حیات کے باب میں کسی کیلئے کس قدر زندگی فی حد ذاتہ مناسب ہے اور کس قدر زندگی کا اس کے اعمال خیر، صدقات اور صلہ رحمی کی وجہ سے زیادہ کر دینا بہتر ہے یا کس قدر زندگی کا اس کے اعمالِ بد مثلاً قطع رحمی یا اس کی مثل اعمال کے سبب کم کر دینا مناسب ہے۔

لوح کی دو قسمیں:

اللہ تعالیٰ کی لوح کی بھی دو قسمیں ہیں (۱) لوحِ محو و اثبات (۲) لوحِ محفوظ

کتاب التوحید میں ابی حنان تیمی سے روایت ہے کہ: میں حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی خدمت میں جنگ صفین میں حاضر تھا۔ ایک روز حضور کے لشکر کے آگے آنحضرت کے سامنے اپنے گھوڑے پر سوار موجود تھا۔ اس کا گھوڑا کچھ تندی دکھا رہا تھا اور ادھر حضرت امیر المومنینؑ حضور اکرم سید المرسلین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھوڑے پر سوار تھے اور آپ کے ہاتھ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار تھی۔ آپ رجز پڑھ رہے تھے اور اپنی تلوار ذوالفقار کو بھی حمائل کئے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے اسی وقت عرض کیا: یا امیر المومنین علی علیہ السلام! ذرا خبر دار رہیں، مجھے خوف ہے کہیں وہ ..... آپ کے بارے میں کوئی مکارانہ اقدام نہ کر دے اور آپ کو کوئی آسیب و گزند لاحق نہ ہو جائے تو آپ نے فرمایا! تو نے بجا کہا ہے ہمیں اس شخص کی

دیانت وامانت پر واقعاً کوئی اعتماد نہیں ہے اور یہ قاسطین میں سے شقی ترین اور خوارج میں سے ملعون ترین فرد ہے۔

اس نے امام زمان علیہ السلام کے خلاف خروج کیا ہے "باغی" ہے لیکن یہ بات بھی یاد رکھو کہ اجل خود ہر شخص کی نگہبان ہوتی ہے، جب تک موت کا وقت موعود نہ آجائے آدمی ہلاک نہیں ہوتا۔ کوئی جاندار نہیں مگر ملائکہ اس کی حفاظت کرتے ہیں، وہ کنویں میں گرے یا اس پر کوئی دیوار گرے یا اسے کوئی خطرہ لاحق ہونے لگے "ایسے تمام مراحل میں ملائکہ اس کے محافظ ہوتے ہیں" لیکن جب اس کی اجل آجاتی ہے تو ملائکہ اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اسی لئے جب میری اجل آپہنچے گی (وقت مقرر برائے موت آجائے گا) تو خوارج میں سے ایک شقی ترین مرد برانگیختہ ہو کر آئے گا اور میرے سر کے خون سے میری ریش کو رنگین کر دے گا اور یہ ایسا مقررہ عہد اور وعدہ ہے جس میں کوئی خلاف ورزی نہ ہوگی۔

باپ کا نظریہ:

پس ہمارے والد علامہ غفران مآب اعلی اللہ درجتہ نے جو فرمایا ہے: اس سے ظاہری مفہوم یہی مراد ہے کہ جب بھی کسی زندہ کی موت قتل کرنے سے یا ایسے کسی مہلک سبب سے ہوتی ہے تو وہ اجل غیر حتمی ہوتی ہے بایں معنی کہ اگر وہ قتل نہ کیا جاتا تو مقتول زندہ رہ جاتا اور اسی لئے ہی تو قاتل پر قصاص ادا کرنا واجب کیا گیا ہے۔

اس پر فرزند کا اشکال:

لیکن میری نگاہ میں "ان کی فرمائش درست نہیں" محل اشکال ہے کیونکہ ہم نے عرض کیا ہے اجل محتوم وہ اجل ہوتی ہے جو لوح محفوظ میں درج ہوتی ہے اور اس میں کمی یا بیشی ہونے کی گنجائش نہیں۔ اس شخص کو مزید زندہ رہنے کا استحقاق حاصل ہو یا نہ ہو لہٰذا ہر ایسا شخص جس کی موت کا وقوع علم الٰہی میں قتل کے سبب ہونا ہو یا کسی دوسرے بیرونی مہلک سبب کے ساتھ ہونا ہو اور وہ اس سبب سے فوت ہو اور اسی وقت ہو جس میں اس کا استحقاق تھا تو بھی اس مقتول کا قصاص یا مواخذہ اس وجہ سے لیا جاتا ہے کہ اس نے ایک عبد غیر مستحق کو الم پہنچایا ہے لہٰذا یہ بات لازمی اور صحیح نہیں کہ اگر وہ قتل نہ کیا جاتا تو وہ زندہ رہتا اور اگر وہ اس سے زندہ رہنے کا مستحق ہوتا تو لامحالہ زندہ رہتا۔

لوحِ محو و اثبات:

اور پہلی قسم لوح محو و اثبات ہے، اس میں ہر شخص کے ذاتی استحقاق کے مطابق مقدر کو درج کیا گیا ہوتا ہے لیکن وہ سب شروط کے ساتھ مشروط ہوتا ہے پس اگر شروط میں نقصان اور کمی ہوگئی تو اس مقدر کو محو کر دیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کی عمر کو کم کر دیتا ہے اور اگر اس کے زیادہ شروط ثابت ہو جائیں تو سابقہ عمر کو محو کر کے زائد زندگی کو لکھ دیتا ہے:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ (سورۂ رعد، آیت ۳۹)۔

اس لوح محو و اثبات کو بنانے کی مصلحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس عالم میں تصرفات اور اعمال خیر و اعمال بد کے اثرات، نفع ونقصان مرتب کرنے کے اعتبار سے بندگان اور ملائکہ پر ظاہر ہوسکیں تا کہ وہ اس ذات کی طرف رجوع کریں اور اعمالِ خیر بجالانے میں رغبت پیدا کریں اور اعمالِ بد سے خوف کھائیں اور اپنے مولیٰ وآقا کی اطاعت سے خارج نہ ہوں۔

لوحِ محفوظ:

اور دوسری قسم لوحِ محفوظ ہے، اس میں وہی کچھ لکھا جاتا ہے جو حتماً واقع ہونا ہوتا ہے اور اس میں تخلف کا امکان نہیں لہٰذا اجل محتوم کا ذکر لوح محفوظ پر ہوتا ہے اور وہی حتمی اجل ہوتی ہے۔ اس میں تغیر وتبدل ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس موت کا سبب خواہ تقدیر ربانی ہو یا کسی دوسرے انسان کی مداخلت اس کا سبب ہو۔

مثلاً اگر کوئی کسی دوسرے کو قتل کردے اور بالفرض اگر اس سبب سے قطع نظر اس کی اجل میں یا وہی لمحہ ہوگا جو اس وقت موت کے مطابق ہے، یا وہ لمحہ نہ ہوگا بلکہ اس سے زیادہ فرض ہوگا۔ اس دوسری صورت میں بھی اس قاتل سے مواخذہ کرنا اور اسے اس کی سزا دینا درست ہے، اور واضح ہے کیونکہ اس صورت میں وہ قاتل اس شخص کی زندگی کو ختم کرنے والا اور موت کو جلدی لے آنے والا قرار پایا ہے اور یہ اجل مسمیٰ سے تعجیل "بمعنی اُجل محتوم سے تعجیل" نہیں ہوئی اور نہ اجل غیر محتوم سے تعجیل ہوئی ہے پس قاتل سے مواخذہ اسلئے ہوتا ہے کہ وہ مقتول کے منافع کو فوت کرنے کا باعث قرار پاتا ہے۔

اور پہلی صورت میں (یعنی اگر اجل معین بھی وہی لمحہ تھا) قاتل سے مواخذہ کی وجہ یوں بیان کی جاسکتی ہے کہ موت کا وقوع دوسببوں میں سے کسی ایک طرف مستند ہوا، فعل الٰہی کی طرف، یا علیٰ سبیل البدل فعلِ قاتل کی طرف (یعنی دونوں اسباب ایک دوسرے کے بدلے سبب بنتا تھے) اور قاتل سے مواخذہ کی وجہ وہ الم ہے جو مقتول کو لاحق ہوا کہ اگر وہ فعل خداوند عالم سے ظہور پایا ہے تو اس کا عوض دینا بھی اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، اور اللہ تعالیٰ کے خزانے بے انتہا ہیں، اور اس کی جود وسخاوت ورحمت بھی بے کراں ہے اور جو الم کسی بندے سے صادر ہوا ہے اس کا عوض بھی اس بندے کے ذمہ ہے لیکن بندہ تو اس کی ادائیگی سے عاجز ہے پس جو الم اس شخص سے شارع کے اذن کے بغیر وقوع پذیر ہوا ہے اس کا مواخذہ بھی اسی شخص سے ہونا ہے کیونکہ موت اس کے فعل کی طرف مستند ہے۔

لیکن واضح رہے کہ ان دونوں مذکورہ صورتوں میں اجل محتوم اس بندے کی مداخلت اور تقدیر ربانی کی مساعدت سے واقع ہوتی ہے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ نے اس مقتول کی موت اسی لمحہ مقدر نہ کی ہوتی تو اس کی اجل محتوم اس وقت نہ ہوتی اور لامحالہ اس کی ضربت کارگر نہ ہوتی۔

اور والد علام مرحوم اعلی اللہ درجتہ فرماتے ہیں کہ: قتل نہ ہونے کی صورت میں وہ لامحالہ زندہ رہتا لیکن چونکہ اس کی

موت اس وقت قتل کے ساتھ ہوئی تو اللہ تعالیٰ کے مانع نہ ہونے کے سبب ہوئی لہٰذا قاتل دو جہت سے قابل مواخذہ قرار پایا ایک غیر مستحق الم دینے کی وجہ سے، دوسرے طویل حیات کے منافع مستحقہ کو فوت کرنے کی وجہ سے۔

لیکن ہم نے جو قرار دیا وہ محققین کے کلام میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ محقق طوسیؒ تجرید میں فرماتے ہیں:

والمقتولُ یجوز فیه الأمران لولاہ

کہ اگر قتل نہ ہوتا تو مقتول کے بارے میں دونوں احتمال جائز ہیں۔

اور فاضل احسائی ابن ابی جمہور شرح زاد المسافرین میں فرماتے ہیں:

واختلف فی المقتول لو لم یقتل هل کان یعیش قطعا أو یموت قطعا أو یحتمل الأمرین..... الی أخر العبارة.

کہ اگر بالفرض کوئی مقتول قتل نہ ہوتا تو اس بارے میں اختلاف ہے کیا وہ قطعاً زندہ رہتا یا وہ قطعاً مرجاتا یا دونوں احتمال ممکن ہیں۔

فرمایا: پہلا قول اشاعرہ کا ہے (یعنی قطعاً زندہ رہتا) دوسرا قول معتزلہ کا ہے (یعنی قطعاً مرجاتا) اور تیسرا قول بصریین کی ایک جماعت کا ہے (یعنی دونوں باتیں جائز اور ممکن ہیں) اور یہی تیسرا قول زیادہ صحیح ہے۔

اور ہمارے والد ماجد اعلی اللہ درجتہ نے اپنی کتاب عماد الاسلام میں یوں فرمایا:

ولو فرضنا محالا عدم قتل عمرو ایاہ جاز عند العقل ان یموت فی ذالك الوقت بسبب أخر أو لا یموت و العلم بالتعیین عند اللہ تعالی.

اگر ہم بطور فرضِ محال یہ فرض کریں کہ اس کو اس کا قاتل (عمرو) قتل نہ کرتا جو عقل کے نزدیک ممکن ہے کہ وہ اسی وقت کسی دوسرے سبب سے مرجاتا یا ممکن ہے کہ وہ نہ مرتا اور ان دونوں میں سے تعیین حقیقی کا علم تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

پس آپ نے جو کچھ "مواعظہ" میں فرمایا ہے وہ ابتدائی نظر پر مبنی کلام ہے اور جو کچھ "عماد" میں فرمایا ہے وہ زیادہ دقیق نظر پر مشتمل ہے کہ عقلی دقت نظر اور باریک بینی اسی کا حکم دیتی ہے۔

یہ سب کچھ تو اس صورت میں ہے جب اللہ تعالیٰ قاتل کو اپنے ارادہ پر عمل کرنے میں آزاد رکھے اور مصلحت خداوندی بھی اسی میں ہو لیکن اگر اللہ تعالیٰ قاتل کے ارادے اور اس کی مراد کے درمیان حائل ہو جائے تو پھر موت حتمی کا وقوع قتل کے بغیر ہوگا اور اسی طرح اگر علم خداوندی میں یہ ہو کہ فلاں شخص کی محتوم موت کسی قاتل کے قتل کے بغیر ہوگی یا اس کا قاتل فلاں معین شخص ہوگا تو کوئی دوسرا نہیں ہوگا تو اسی صورت میں کوئی قاتل اس تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوگا یا

اس معین شخص کا کوئی غیر اس خاص وقت میں اس کو قتل نہ کر سکے گا کیونکہ مقدر شدہ موت خود زندگی کی محافظ ہوتی ہے کہ قرآن ناطق اور مخبر صادق، علی علیہ اسلام نے یہی فرمایا ہے اور اسی کی گواہی دی ہے۔

فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل نہ کر سکا:

اسی لئے تو جب فرعون نے سنا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہوگا، اس کی سلطنت اور شاہی اس شخص کے ہاتھوں ختم ہو جائے گی تو اس نے اپنے اہلکاروں کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کی حاملہ خواتین کے شکم چاک کر دو اور ان سے تمام بچوں کو نکال کر قتل کر دو تا آنکہ اس ظالم کے حکم سے بیس ہزار سے زیادہ بچے حضرت امام صادق علیہ السلام کی روایت کے مطابق قتل کر دیئے گئے لیکن اس کے باوجود وہ ملعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے میں کامیاب نہ ہوا اسلئے کہ ان کی حقیقی محافظ ان کی زندگی تھی بلکہ خداوند عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خود اس ظالم کے ہاتھوں اس دشمن کے گھر میں پرورش کرائی۔

اور اسی طرح حجاج بن یوسف ملعون اپنی تمام کوششوں کے باوجود مختارِ ثقفی کو قتل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا جس کی تفصیل بحار الانوار میں موجود ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو ضرر سے محفوظ رکھنا اور اسے زندہ وسلامت رکھنا چاہے تو صاحب شر اور اس کے مقصود کے درمیان حائل ہو جاتا ہے پس وہ خائف اس ظالم کے شر سے محفوظ ہو جاتا ہے اور ایسی صورت میں اگر سارے جن و انس اکٹھے ہو کر اس کو ضرر پہنچانے کی کوشش کریں تو بھی اس کو گزند نہیں پہنچا سکتے اور اگر رب کریم کی مصلحت حائل ہونے اور مانع بننے کی نہ ہو تو پھر صاحب شر کا ضرر مظلوم تک پہنچ جاتا ہے۔

سوال:..... اگر کوئی یوں کہے کہ کیا عدل الٰہی کے خلاف نہیں کہ وہ اپنے دشمنوں اور ظالموں کو اپنے مظلوم دوستوں پر مسلط کر دے؟

جواب:..... یہ ہے کہ یہ عالم دنیا مقام آزمائش و امتحان ہے، نیکیوں کو بروں سے جدا کرنے کا جہاں ہے، ابدی ثواب وعقاب کے استحقاق کے مدارج کی جلوہ گاہ ہے، پس اگر خداوند تعالیٰ لوگوں کو ان کے اپنے حال پر واگذار نہ کرے تو پھر صابرین کے مدارج اور سرکش اور بے دین عناصر کے ہلاکت وضلالت کے مقامات کیسے روشن ہوں گے جبکہ فصل وتدارک کا روز ان کے اعمال کے بعد آئے گا۔ اس دن ہر ایک کا فیصلہ ہوگا، کوئی ظالم اور اہل عدوان اپنے ظلم و عدوان کی سزا سے بچ نہ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہر مظلوم کا انتقام ظالم سے وصول کر کے اسے راضی کرے گا اور جس قدر عوض کا مظلوم مستحق ہوگا اسے عطا کرے گا بلکہ اس سے زیادہ بھی دے گا اور اس کے علاوہ دیگر بہت سی مصلحتیں اور اغراض و مقاصد اس نظام جزا وسزا میں اس خالق کریم کی موجود ہیں لہٰذا اس دنیا میں بدکاروں اور ظالموں کو نہ روکنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ حکمت کے عین مطابق ہے۔

حضرت ابوالقاسم حسین بن روح نائب امام العصر علیہ السلام کا ارشاد:

احتجاج طبرسیؒ میں ابن بابویہ قمیؒ سے نقل ہے، انہوں نے محمد بن ابراہیم بن اسحاق طالقانی سے روایت کی ہے، طالقانی کا بیان ہے کہ میں نے حضرت صاحب الزمان علیہ السلام (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) کی طرف سے مقرر کردہ وکیل حضرت ابوالقاسم حسین بن روح کی خدمت میں حاضری دی۔ میرے سامنے ایک مرد نے کھڑے ہو کر پوچھا: مجھے بتائیے کیا حضرت حسین بن علی بن ابی طالب علیہما السلام خدا کے محبوب دوست تھے یا نہیں؟

تو انہوں نے فرمایا: یقیناً وہ دوست خداوند متعال تھے۔ تو اس نے کہا: مجھے فرمائیے کیا ان کا قاتل ملعون، دشمن خدا تھا یا نہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: ہاں، تھا۔

تو وہ بولا کیا یہ روا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دشمن کو اپنے دوست پر مسلط کر دے۔ اس پر حضرت حسین بن روح نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کو عیاناً دیکھنا اور اس کے کلام کو بالمشافہ سننا ناممکن ہے، اسلئے اس ذات والا صفات نے اپنے سفیر اور پیغمبر بنائے ہیں، جنہیں جنس بشر اور نوع انسانی سے قرار دیا ہے تاکہ لوگ ان سے وحشت و نفرت نہ کر سکیں اور ان کی تصدیق اور سچائی کے ثبوت کیلئے ان کو معجزات عطا فرمائے ہیں مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے آتش کو گلزار بنا دیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کیلئے دریا میں شگاف ڈال کر "راستہ" بنا دیا اور اس کے عصا کو اژدھا بنا دیا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر مردے زندے کر دیئے۔ بایں ہمہ اس قادرِ مطلق نے یہ بھی مقدر فرمایا کہ یہ ہستیاں کبھی غالب آئیں تو کبھی مغلوب بھی رہیں۔

حَتّٰی یَدْرُکُ النَّاسُ فَرْقَ مَا بَیْنَ الرَّبِّ وَ الْمَرْبُوْبِ فَلَوْ لَمْ یَبْتَلِهِمْ وَ لَمْ یَمْتَحِنْهُمْ لَاتَّخَذُوْهُمْ آلِهَةً مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ وَ لَوْ لَا ذٰلِكَ لَمَا عُرِفَ فَضْلُ صَبْرِهِمْ عَلَی الْبَلَاءِ وَ الْمِحَنِ وَ الْاِخْتِبَارِ.

تاکہ لوگ رب اور مربوب کے درمیان فرق دیکھ سکیں پس اگر اللہ تعالیٰ اپنے ان انبیاء کو ان مصائب میں مبتلا نہ کرتا اور ان کا امتحان نہ لیتا تو لوگ ان ہستیوں کو معبود بنا لیتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کو ترک کر دیتے نیز اگر یہ امتحان نہ ہوتے تو ان ہستیوں کا ان ابتلاءات و امتحانات اور اختیارات پر صبر کرنے کا مقام اور اس کی فضیلت بھی واضح نہ ہو سکتی۔ (آپ کے کلام کا خلاصہ بیان ہوا)۔

آتش نمرود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا صبر و توکل:

مروی ہے کہ جب نمرودِ مردود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آتش میں پھینکنا چاہا جسے اس نے بڑے اہتمام کے ساتھ بھڑکایا تھا وہ ایسی سخت آگ تھی کہ انسان اس سے بہت دور اور گریزاں رہنے پر مجبور تھے، پرندے ہوا میں اس کی تپش

سے جلنے لگتے تھے اسلئے وہ ظالم مجبور ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق میں رکھ کر اس آگ میں دور سے پھینک دیں کیونکہ اس قدر سخت ترین تپش کی وجہ سے خود قریب آ کر تو ان کو اس میں ڈالنے سے عاجز تھے۔ ایسے میں حضرت جبرئیلؑ کو حضرت ابراہیمؑ پر بہت رحم آیا، بے چین ہوا اور ان کی دلسوزی کے جذبے سے مضطرب ہو کر درگاہِ رب جلیل میں عرض کرنے لگا: اے رب جلیل! پورے روئے زمین پر اس ابراہیم خلیل اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا تو تیرا خلیل نہیں ہے، یہی ایک ہی ہے جو تیری عبادت کرتا ہے اور تیرے غیروں کی عبادت سے انکاری ہے اور تو نے اس پر بھی دشمن کو مسلط فرما دیا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: تو اسلئے مضطرب ہے کہ تو ایک عاجز بندہ ہے

ولا یعجل الا من یخاف الفوت،

مجھے کوئی جلدی نہیں کیونکہ جلدی وہی کرتا ہے جسے معاملہ اپنے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف ہوتا ہے۔ میری حکمت و مصلحت کا جو تقاضہ ہوگا میں اسی پر عمل کروں گا۔ یہ سن کر حضرت جبرئیلؑ کا دل مطمئن ہوا اور حضرت ابراہیمؑ کی خدمت میں آیا۔ یہ وہ لحہ تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق سے پھینک دیا گیا تھا اور وہ ہوا میں آگ کی طرف جا رہے تھے عرض کیا:

أبك حاجة؟

کیا آپ کو کوئی ضرورت ہے؟

تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا:

بلی، أما الیك، فلا

ہاں ضرورت و احتیاج تو ضرور ہے لیکن تیری طرف کوئی احتیاج نہیں،

جبرئیلؑ نے کہا: پھر اس ذات سے سوال کیوں نہیں کرتے ہو کہ وہ آپ کو اس ہلاکت سے نجات دے دے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا:

حسبی من سوالی علمہ بحالی،

مجھے وہ ذات کافی ہے جو میرے حال کو بہتر جانتی ہے اور اس کا یہ علم رکھنا کافی ہے، مجھے سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

چنانچہ جب وہ آگ تک پہنچے تو آگ ٹھنڈی تھی اور سلامتی میں تبدیل ہو چکی تھی اور آپ اس آگ میں بیٹھے ہوئے حضرت جبرئیلؑ سے اطمینان کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ اس واقعہ سے نتیجہ حاصل ہوا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کی مصلحتیں خود بہتر جانتا ہے اور اسے جلدی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر چیز کا تدارک اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ جب چاہتا ہے اپنے دوستوں سے ضرر دور کر دیتا ہے اور جب مناسب سمجھتا ہے ظلم کے تدارک میں تاخیر کر دیتا ہے اور جو لوگ

صابر ہوتے ہیں وہ اس کی قضا پر راضی اور اس کی مرضی کے تابع ہوتے ہیں

لا جور فی مشیته ولا ظلم فی قضیته

اس کی مشیت میں کوئی جور نہیں اور اس کی قضا میں کبھی ظلم نہیں۔

تکملہ

مسئلہ رزق کی تحقیق:

سارے بندوں کا رازق وہی اللہ تعالیٰ ہے جو ان سب کا خالق ہے چنانچہ فرمایا ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا (سورۂ ہود، آیت ٦)

ترجمہ: زمین میں حرکت کرنے والا کوئی زندہ نہیں مگر اس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔

بظاہر رزق کی دو قسمیں ہیں: (۱) حلال (۲) حرام۔

مذہب عدلیہ میں رزق حرام کو خداوند عالم کی طرف نسبت دینا صحیح نہیں مگر اس پر سوال پیدا ہوتا ہے اگر حرام کو اللہ تعالیٰ کی روزی شمار نہ کرو گے تو جو شخص ساری عمر مال حرام کھاتا ہے لازم آئے گا اسے مرزوق خدا نہ مانا جائے (کہ اس نے ساری زندگی رزق خدا کے بغیر گزاری ہے حالانکہ قرآن مجید کی آیت بالا تو فرما رہی ہے کہ ہر زندہ اللہ تعالیٰ کا رزق کھاتا ہے) تو اس پر بحث کیلئے بابِ عدل میں متکلمین نے مسئلہ رزق پر تحقیق کی ہے۔ بنابریں ہمارے لئے بھی ضروری ہے کہ اس پر تحقیق عرض کی جائے۔

اشاعرہ کا نظریہ:

ہر وہ شئے جو کھائی جائے، استعمال کی جائے وہ رزق و روزی ہے حلال ہو یا حرام۔ بنابریں ان کے نزدیک حرام بھی روزی میں داخل ہے۔

اور اشاعرہ کی فاسد بنیادوں کے مدنظر اس نظریہ کو قبول کرنا بعید نہیں ہے کیونکہ ان کی نگاہ میں کوئی شئے قبیح نہیں ہے اسلئے ان کے ہاں کسی بھی امر کو حق تعالیٰ کی طرف نسبت دینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ وہ ہر شئے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

اہل عدل کا نظریہ:

لیکن اہل عدل کے نزدیک وہی رزقِ خدا ہے جس سے فائدہ اٹھانا جائز ہو اور شریعت میں اس سے منع نہ کیا گیا ہو بنابریں ان کے ہاں حرام اللہ تعالیٰ کی روزی نہیں ہے۔

دونوں اقوال کی تحقیق:

اشاعرہ کے قول کے مطابق رزق کو مرزوق بالفعل کے معنی میں لیا جاتا ہے اور ان کے کلام سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے کیونکہ انہوں نے کہا ہے:

ما لم ينتفع فليس برزق و لا يأكل أحد رزق غيره،

جس کو استعمال کیا گیا ہو اور جس سے نفع نہ اٹھایا گیا ہو، وہ رزق نہیں اور کوئی شخص غیر خدا کا رزق نہیں کھاتا اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (سورۂ ذاریات، آیت ۲۲)

ترجمہ: اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور وہ سب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

وَلَوْ بَسَطَ اللهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ، اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (سورۂ شوریٰ، آیت ۲۷)

ترجمہ: اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کیلئے رزق کو وسعت دے دیتا تو زمین میں یہ سارے لوگ بغاوت کرنے لگتے لیکن وہ جس قدر چاہتا ہے اسی قدر نازل کرتا ہے اور بے شک وہ اللہ اپنے بندوں کے اس بارے میں سب کچھ خبر رکھنے والا اور بصیرت والا ہے۔

اشاعرہ کہتے ہیں: اگر رزق سے مراد وہ شئے ہو جس سے کسی خاص انسان نے فائدہ اٹھا لیا ہے یا عنقریب فائدہ اٹھانے والا ہے اگرچہ تا حال بالقوۃ سے بالفعل تک نہیں آیا تو اس کی کوئی صورت بنتی ہے کیونکہ رزق خاص وہی ہوتا ہے جس سے نفع اٹھانا ایک خاص انسان کیلئے مقدر ہو چکا اور آیت کریمہ میں موجود:

وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ

کہ تمہارا رزق آسمان میں ہے، کے الفاظ اس کے منافی قرار نہیں پاتے (کیونکہ وہ بھی مقدر ہو چکا ہوتا ہے) لیکن رزق کا اطلاق فقط اس سے مخصوص نہیں ہے اور آیت کریمہ کے الفاظ

وَلَوْ بَسَطَ اللهُ الرِّزْقَ

اور اگر اللہ تعالیٰ رزق کو وسعت دے دیتا، سے بھی اسی مفہوم کی طرف اشارہ ہے (یعنی اللہ تعالیٰ ہر ایک کیلئے مقدر شدہ رزق کثیر قرار دے دے)۔

بہر حال اشاعرہ کے نزدیک حرام اشیاء بھی رزق خدا محسوب ہوتے ہیں، حالانکہ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ حرام کو رازق انام کی طرف منسوب کرنا قبیح ہے اور دوسرے قول یعنی عدلیہ کے قول کے مطابق رزق سے مراد مرزوق بالقوۃ ہوتا ہے یعنی ہر وہ شئے رزق ہے جو اس لائق ہے کہ اس سے مخلوق کو رزق دیا جا سکے اور چونکہ حرام شئے کے بارے میں شریعت نے منع فرما رکھی ہے اسلئے اس کو رزق میں محسوب نہیں کیا جا سکتا لہٰذا حرام کو رزق خدا میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔

اب اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس نظریئے کے مطابق لازم آتا ہے کہ جو شخص غیر حلال غذائیں کھاتا ہے وہ مرزوقِ خدا نہیں پھر یہ لوگ مرزوق کے معنی میں مزید تعمیم کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہوا اور نسیم سحر جیسی اشیاء بھی اس رزق کے اندر ہیں (یعنی یہ اشیاء تو حلال ہیں لہٰذا کوئی شخص ایسا نہیں ہو سکتا جو غیر حلال پر اکتفاء کر سکے اور مرزوق خدا نہ ہو) لیکن ان کا یہ تعمیم کرنا بھی بُعد سے خالی نہیں ہے (بات پوری طرح بن نہیں پاتی)۔

ہمارے والد ماجد (علامہ غفران مآبؒ) کی عماد الاسلام میں گفتگو:

فرمایا کہ: اس موضوع کے بارے میں دونوں فریقوں کا کلام خلط و ابہام سے خالی نہیں ہے، کیونکہ رزق بمعنی مرزوق ہو تو وہ حلال و حرام ہونے کی صفت سے متصف نہیں ہوتا، اسلئے کہ اللہ تعالیٰ تو رزق کا خالق ہے اس نے سارے رزق کو پیدا فرمایا ہے اور پھر اس رزق کے حصول کی راہیں بنائی ہیں اور ان میں سے حلال راہوں کو مقرر فرما دیا ہے پس جو کوئی ان حلال طریقوں کو چھوڑ کر غیر مشروع طریقے سے اپنی روزی کو حاصل کرتا ہے تو روزی اس کو بھی پہنچ جاتی ہے اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے لیکن ناجائز راستے سے استفادہ کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوتا ہے۔

زیادہ واضح بات یوں ہے کہ رزق کو اللہ تعالیٰ کی طرف اس لحاظ سے نسبت دیں کہ رزق کا خلق کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے پس وہ رزق دینے والا ہے یعنی وہ رزق کا خالق ہے اور در اصل خلق کرنا تو ایک حسن کام ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ساری مخلوق کی روزی کو حلال طریقے سے مقرر کر دیا ہے اور اسے مقسوم بنا دیا ہے لیکن لوگ اپنے سوءِ اختیار کے ساتھ اس حلال کو چھوڑ دیتے ہیں اور حرام کی طرف میلان کر لیتے ہیں میں خود مرزوق اس امر کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ اسے حلال یا حرام کی صفت سے متصف کیا جائے لیکن اس کا اکتساب کرنا اور اس کو حاصل کرنا مختلف وجوہ سے ہو سکتا ہے اور چونکہ یہ اکتساب و تحصیل بندے کا اپنا فعل ہوتا ہے اسلئے وہ حسن و قبح سے متصف ہو سکتا ہے کیونکہ جب کوئی انسان اس کو حلال طریقے سے حاصل کرتا ہے تو اس کا یہ فعل مستحسن قرار دیتا ہے بلکہ کبھی یہ کام واجب بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ محقق طوسیؒ تجرید میں فرماتے ہیں:

والسعی فی التحصیل قد یجب،

یعنی کبھی روزی کمانے کی کوشش کرنا واجب ہوتی ہے اور یہ اس وقت ہے جب اپنے اور اپنے اہل وعیال کا نان و نفقہ کی ضروریات اس کی متقاضی ہوتی ہے جس کا خرچہ دینا انسان پر شرعاً واجب قرار دیا گیا ہے مثلاً بیوی، اولاد، مملوک، غلام و کنیز وغیرہ کا نفقہ واجب ہے اور کبھی یہ روزی کمانا مستحب اور سنت بنتا ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب اپنے عیال کو خوشحال رکھنا اور وسعت سے خرچہ دینا مقصود ہو اور کبھی یہ روزی کمانا مباح اور جائز ہوتا ہے مثلاً جب کسی کا مقصود حلال کے مال کو جمع کرنا اور اپنے مال محفوظ کرنا ہو۔

محقق طوسیؒ نے حرام اور مکروہ اسباب کسب رزق کا تذکرہ نہیں کیا اور ممکن ہے کہ اس آخری شق (مال کا جمع کر رکھنا) کو مکروہات میں دخل مانا جائے۔

اور کبھی کچھ لوگ یہ رزق غیر مشروع طریقوں سے حاصل کرتے ہیں تو اس وقت یہ حرام قرار پاتا ہے۔ بہر حال رزق کمانے کا قبیح عمل اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوسکتا اور اسی لئے فرمایا ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (سورۂ ہود، آیت ۶)

یعنی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہر جاندار کا رزق ہے،

اسلئے کہ اس نے اس رزق کو حلال طریقے سے حاصل کرنے پر قدرت عطا کر دی ہے۔ پس اگر کوئی غیر حلال طریقے سے حاصل کرتا ہے تو اس بندے کا سوء اختیار ہوتا ہے اور اس کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جو امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حجۃ الوداع پر ارشاد:

شیخ محمد بن یعقوب کلینیؒ حضرت ابوحمزہ ثمالی کے واسطے سے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ فرمایا کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: آگاہ رہو کہ روح الامین نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ کوئی زندہ اس وقت تک فوت نہیں ہوتا جب تک اپنی روزی حاصل نہیں کر لیتا لہٰذا تم خدا کیلئے پرہیز کرو اور دنیا کی طلب میں نہ مبالغہ کرو، نہ چشم پوشی اور حلال کا دیر سے ملنا اس کا موجب نہ بنے کہ اسے جلدی حاصل کرنے کیلئے حرام راستے کو اختیار کرو کیونکہ خداوند عالم نے اپنے بندوں کے درمیان روزی کو حلال طور پر تقسیم فرمایا، نہ حرام طریقے سے، پس جو کوئی حرام سے پرہیز کرتا ہے اور صبر کرتا ہے اسے حلال راہ سے روزی مل جاتی ہے لیکن جو کوئی پردہ دری کرتا ہے اور غیر حلال طریقے سے لینے کی جسارت کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کی حلال روزی کم کر دیتا ہے اور اس سے حساب بھی لیتا ہے۔

اور صفوان بن عمیر سے مروی ہے کہ ہم حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ناگاہ عمر بن قرۃ

آ گیا عرض کرنے لگا: یارسول اللہ! میرے مقدر میں اللہ تعالیٰ نے شقاوت و بدبختی قرار دے دی ہے:

فلا اری ارزق الا من دف بکفی فاذن لی فی الغناء من غیر فاحشة،

میں دیکھ رہا ہوں کہ میری روزی دف بجانے میں منحصر ہو کر رہ گئی ہے پس آپ مجھے اذن دیں کہ میں غناء گیا کروں بغیر فحاشی اور حرام کے، اس پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: دشمن خدا میں تجھے اس کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا:

لقد رزقك الله طيبا فاخترت ما حرم الله عليك من رزقه مكان ما أحل لك من حلاله أما انك لو قلت بعد هذا ضربتك ضربا وجيعا.

اللہ نے تجھے رزق حلال وطیب دیا ہے لیکن تو نے خود سے اس کے حلال کی بجائے حرام کردہ کو چن لیا ہے، اور اگر تو نے اس کے بعد پھر کبھی ایسی بات کی تو میں تجھے دردناک سزا دوں گا، تازیانوں کی ضربیں لگاؤں گا۔

عامہ اس روایت کو ضعیف السند قرار دے کر کمزور سی تاویلات کا نشانہ بناتے ہیں لیکن حق بات وہی ہے جو بیان ہو چکی، بنابریں حق تعالیٰ کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ حرام روزی وہ دیتا ہے۔ ہاں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جس طرح بمعنی توفیق دینا اور اضلال بمعنی آزاد چھوڑنا اور نہ روکنا استعمال ہوتا ہے اسی طرح علی الاطلاق رزق پہنچانے کی نسبت خداوند عالم کی طرف مجازی طور پر دے دیتے ہیں اور کہتے ہیں ہر قسم کا رزق اللہ دیتا ہے اور ایسا کہنے میں کوئی عیب نہیں کیونکہ ہر قسم کے رزق کو خلق کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص صفات میں سے ہے اور رزق حلال کو تقسیم کرنا، اس کی مقدار مقرر کرنا اور اس پر قبضہ کرنے کا قدرت واختیار دینا، سب کچھ ذات باری تعالیٰ کے ساتھ اختصاص رکھتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد اپنی شان وشوکت والی حکمرانی کے باوجود بعض حیوانات کو غذا فراہم کرنے سے عاجز آ گئے تھے (کیونکہ ساری مخلوقات کو رزق فراہم کرنا اللہ تعالیٰ کی مخصوص شان ہے)۔

قوشجی کے خیالات:

شارح تجرید قوشجی نے کہا کہ ہر ایسی حلال ومباح روزی جو بندہ اپنی محنت ومشقت سے حاصل کرتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو رازق نہیں کہتے۔ اللہ تعالیٰ کو رازق اس روزی کی وجہ سے کہتے ہیں جسے بندہ اپنی محنت ومشقت کے بغیر حاصل کر لیتا ہے۔

جواب:

ایک فاضل بزرگوار نے اس کے بارے میں فرمایا ہے کہ: قوشجی کا یہ کلام اس کے اپنے مذہب کے منافی ہے کیونکہ اس کے اشاعرہ کا قول تو یہ ہے کہ کوئی بندہ اپنے فعل کا فاعل نہیں ہے تو پھر اس کیلئے کیسے مناسب ہے کہ وہ بندہ کو اپنے کسی

رزق کا رازق کہے کیونکہ اس کا عقیدہ تو یہ ہے کہ بندہ کبھی بھی فعل کا فاعل نہیں ہوتا۔

اشکال:

لیکن اس فاضل بزرگوار پر ہمارا اشکال یہ ہے کہ آپ کی بات واقع کے لحاظ سے تو صحیح ہے لیکن ممکن ہے کہ شارح قوشجی نے اس خیال کا اظہار بنا بر ظاہر کیا ہو نہ کہ بنا بر حقیقت کیونکہ عرف عام میں تو اس فعل کی نسبت فاعل کی طرف دی جاسکتی ہے جس کا سبب ظاہر ہو اور اگر سبب ظاہر نہ ہو تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دی جاتی ہے۔

تاہم حق یہ ہے کہ قوشجی کے خیالات خلافِ تحقیق ہیں اور درست نہیں ہیں، اور شرعی عرف میں حلال کی نسبت خداوند عالم کی طرف دی جاتی ہے حرام کی نہیں دی جاتی، البتہ بالجملہ سارے رزق کی نسبت مجازاً اللہ تعالیٰ کی طرف دے دی جاتی ہے اور وہاں رزق بمعنی روزی دینے اور پہنچانے کے ہوتا ہے، اور ہر صاحب رزق تک رزق پہنچانے کی نسبت خداوند قیوم کی طرف دینا فقط اس طور جائز ہے کہ وہ اسباب کو آزاد چھوڑ دیتا ہے تمکین دیتا ہے اور رکاوٹ نہیں بنتا، یا اسلئے جائز ہے کہ وہ تقدیر وقضاء کا مالک ہے اور توفیق وسلب توفیق اسی کی طرف سے ہوتی ہے اسی لئے ہر قسم کے رزق کو اس کی طرف نسبت بطور مجاز دے دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں بھی نسبت کی وجہ یہی قاعدہ ہے کہ فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۷)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ بنا کر بھیجا ہے۔

اور ارشادِ خداوندی ہے:

وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَشَاءُ ۚ (سورۂ بقرہ، آیت ۲۴۷)

ترجمہ: کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ملک کی بادشاہی دے دیتا ہے۔

ان دونوں آیات میں طالوت یا بادشاہ کو شاہی دے دینا اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنے کی وجہ وہی ہے جو اوپر کر دی گئی ہے (کہ چونکہ وہ روکتا نہیں یا تقدیر وقضاء وہی بناتا ہے اسلئے یہ لوگ بادشاہ بن جاتے ہیں اور اس کی بادشاہی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف مجازاً دے دی جاتی ہے)۔

نرخ، ارزانی اور گرانی کا مسئلہ:

نرخ سے مراد ہے وہ قیمت اور عوض جس کے ساتھ اشیاء کو فروخت کیا جاتا ہے اور واضح ہے کہ اس میں بازار کی عادت، اوقات اور مکان معتبر ہے اور ان کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف دی جاتی ہے اور کبھی ان کو لوگوں کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے (کہ بازار والوں نے مہنگائی کی ہوئی ہے یا ارزانی رکھی ہوئی ہے یا نرخ ان کے اختیار میں ہے)

محقق طوسیؒ نے تجرید میں اس کی صراحت فرمائی ہے۔

چنانچہ تجرید الاعتقاد کے شارحین نے اس کلام کی شرح میں اس طرح لکھا ہے، کہ کبھی ارزانی یا گرانی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دے دی جاتی ہے کہ اس نے فلاں معین متاع کی جنس کی کمی کی ہے، اور لوگوں میں اس شئے کی خریداری کا میلان اور اس کی طرف رغبت زیادہ ہوگئی ہے لہٰذا اس وقت گرانی ہوگئی ہے، یا اس نے فلاں جنس کو زیادہ مقدار میں پیدا کر دیا ہے اور لوگوں نے اس کی طرف میلان یا رغبت بہت کم کر دی ہے لہٰذا ارزانی ہوگئی ہے، (اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے) اور کبھی اسی ارزانی یا گرانی کی نسبت بندوں کی طرف دے دیتے ہیں مثلاً بادشاہ یا کوئی حکمران ظالمانہ حکم دیتا ہے کہ فلاں شئے کو گراں قیمت پر فروخت کیا جائے، یا اس جنس کو ذخیرہ کر لیا جائے، یا کچھ لوگ سرمایہ دار، دکاندار کسی جنس کی ذخیرہ اندوزی کر لیتے ہیں جسے شریعت میں احتکار کہا جاتا ہے، اور شارع مقدس نے طعام کے احتکار کو حرام یا مکروہ قرار دیا ہے۔ حدیث میں ہے "الجالب مرزوق والمحتکر ملعون" کہ بازار میں سامان برائے فروخت کے آنے والا رزق پاتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا لعنت پاتا ہے تو ایسے اسباب سے گرانی مرتب ہو جاتی ہے اور ان کے فاعل خود عوام اور لوگ ہوتے ہیں۔

یہ جو کچھ عقلی دلیل سے عرض کیا گیا مکاسب میں ذکر شدہ کثیر احادیث بھی اسی پر واضح دلالت کرتی ہیں لہٰذا اشاعرہ کا یہ قول فاسد ہے کہ "السعر هو الله" کہ نرخ بنانے والا فقط اللہ ہی ہے کہ اس میں انہوں نے حصر کی راہ اپنائی ہے اور نرخ کی نسبت فقط اور فقط اللہ تعالیٰ کی طرف دی ہے حالانکہ بعض اوقات اسباب خود عوام کی اپنی طرف سے وجود میں آتے ہیں۔

اور ایک حدیث کہ جس میں آیا ہے

إِنَّ اللهَ وَكَّلَ بِالسِّعْرِ مَلَكاً فَلَنْ يَغْلُوَ مِنْ قِلَّةٍ وَلَا يَرْخُصَ مِنْ كَثْرَةٍ وَ إِنَّهٗ يُدَبِّرُهٗ بِأَمْرِهٖ.

کہ اللہ تعالیٰ نے نرخ کے بارے میں ایک فرشتہ معین کر رکھا ہے لہٰذا کبھی کوئی مہنگائی مال کی قلت کی وجہ سے نہیں ہوتی، اور نہ ہی متاع کی کثرت کی وجہ سے کوئی ارزانی ہوتی ہے اور وہی فرشتہ حکم الٰہی کے ساتھ اس کی تدبیر کرتا رہتا ہے۔

اس کا مفہوم بھی یہ ہے کہ مہنگائی اور ارزانی کے اسباب میں سے بہت سارے اسباب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اموال کی کثرت و قلت میں ہی انحصار نہیں ہے، یعنی فقط یہی سبب نہیں بلکہ ان کے علاوہ دیگر بھی بہت سارے اسباب ہیں جو ارزانی یا مہنگائی کا موجب بن جاتے ہیں، یا اس سے مراد یہ ہے کہ باوجودیکہ عوام بہت زیادہ حریص ہوتے ہیں اموال کی بیع و شراء میں حد اعتدال سے باہر نکل جاتے ہیں، ذخیرہ اندوزی وغیرہ کی راہیں اپناتے ہیں، تاہم بات یہاں تک منحصر نہیں ہے اور ایسا نہیں ہے کہ نرخوں کے تعیین میں اللہ تعالیٰ کا ارادہ کوئی دخل نہیں رکھتا (بلکہ مشیت الٰہی اور ارادۂ خداوندی ہر امر سے مربوط ہے) اسلئے گرانی اور ارزانی اللہ تعالیٰ کے نظام میں اس کے ارادے سے بھی ہوتی ہے۔ واللہ اعلم بالحقیقة۔

فصل دہم:

طینت کا بیان

کثیر احادیث اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ طینت کا اختلاف نیکی اور بدی کا باعث بنتا ہے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی حدیث:

کافی میں امام زین العابدین علیہ السلام سے منقول ہے، فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو علیین کی طینت سے خلق فرمایا پس انبیاء کرام کے دل اور بدن اسی طینت سے ہیں لیکن مومنین کے فقط دل اس طینت سے پیدا کئے ہیں جبکہ ان کے بدن دوسری طینت سے خلق فرمائے ہیں اور کافروں کو سجین کی طینت سے پیدا کیا ہے اور ان کے دل اور بدن دونوں اس طینت سے ہیں پھر اللہ تعالیٰ نے (علیین اور سجین) دونوں طینتوں کو مخلوط کر دیا ہے اسی لئے مؤمن سے کافر اور کافر سے مومن پیدا ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ مومن کبھی گناہ کا مرتکب ہو جاتا ہے اور کافر کبھی نیک کام کر لیتا ہے مومنین کے دل ان نیک چیزوں کی طرف رغبت کرتے ہیں جن سے خلق ہوئے ہیں اور کافروں کے دل ان بری چیزوں کی طرف مائل ہوتے ہیں جن سے وہ پیدا ہوئے ہیں۔

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیث:

شیخ صدوق ؒ نے اپنی کتاب علل الشرائع میں اپنی سند کے ساتھ ابو اسحاق ابراہیم لیثی سے ایک روایت نقل کی ہے اس نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک طولانی حدیث بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

ابو اسحاق نے عرض کیا کہ میں آپ کے شیعہ میں ایسے افراد پاتا ہوں جو شراب پیتے، زنا کرتے اور دیگر بہت سارے گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ فرمایئے یہ کیسے ہے اور اس کا سبب کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: تیرا دل اگر مزید خلجان و پریشان ہے تو بیان کر۔ ابو اسحاق نے عرض کیا: ہاں، اس سے بھی بڑا ہے اور وہ یہ کہ میں آپ کے دشمنوں کو پاتا ہوں کہ وہ بہت ساری اطاعات اور نیکیوں کو بجالاتے ہیں اور خداوند تعالیٰ کے مناہی سے اجتناب کرتے ہیں یہ سب کس

لئے ہے؟

مجھے یہ وضاحت دلیل و برہان کے ساتھ فرمایئے، کیونکہ میں اس بارے میں کافی طویل مدت سے فکر کرتا رہتا ہوں اور اس وجہ سے مجھے راتوں بیدار رہنا پڑتا ہے۔ پس امام علیہ السلام مسکرائے اور فرمایا: مجھ سے اس بارے میں شافی بیان حاصل کرو اور خزائن علم الٰہی میں سے ایک مخفی علم مجھ سے وصول کرو۔ البتہ یہ بتاؤ کہ اس موضوع کے بارے میں اہل حق اور اہل باطل کا اعتقاد کیسا پاتے ہو؟ تو اس نے عرض کیا:

یابن رسول اللہ! میں آپ کے دوستان و شیعیان کو اس طرح دیکھتا ہوں کہ ان میں سے فسق و فجور والوں کو اگر مشرق مغرب کے مابین کا علاقہ سیم وزر سے پر کر کے دیا جائے، اور کہا جائے کہ ان خزانوں کے عوض میں آپ کی دوستی اور محبت سے دست بردار ہو جائیں تو وہ کبھی بھی اس کو قبول نہ کریں گے۔ وہ ان تمام خزانوں کو رڈ کر دیں گے لیکن آپ ہستیوں کی محبت کو چھوڑ کر آپ کے غیر کی محبت و دوستی کو کبھی بھی اختیار نہیں کریں گے حتیٰ کہ اگر ان کے دماغوں اور سروں پر تلواریں برسا کر کھڑے کر دیا جائے اور اس طرح ان کو قتل کر دیا جائے تو بھی وہ آپ کی محبت سے روگردانی اختیار نہیں کریں گے۔

اور ادھر آپ سے دشمنی رکھنے والے ناصبیوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ جن جابروں اور طاغوتوں کی محبت کا شکار ہو چکے ہیں، اگر شرق و غرب کے مابین کو سیم وزر سے پر کر کے انہیں دیا جائے اسلئے کہ وہ ان طاغوتوں کی محبت ترک کر کے آپ کی محبت کی طرف آ جائیں تو وہ بھی ایسا نہیں کریں گے، اور اگر ان کے چہروں پر شمشیریں برسا برسا کر ان کو قتل کر دیا جائے تو بھی وہ اپنے طریقے پر برقرار رہیں گے اور ان طاغوتوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ اگر ان ناصبیوں کے سامنے اہل البیت علیہم السلام کی کوئی منقبت وفضیلت بیان کی جائے تو ان کے ماتھے کے تیور بدل جاتے ہیں، نفرت و کراہت کے آثار ان کے چہروں سے ہویدا ہونے لگتے ہیں، اور واضح ہورہا ہوتا ہے کہ وہ آپ حضرات سے سخت بغض اور غیروں کے ساتھ بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں۔

پس حضرت امامؑ یہ سن کر تبسم فرمانے لگے اور فرمایا: اسی وجہ سے وہ ہلاکت میں گر گئے ہیں اسی لئے انہیں جہنم کی جلانے والی سخت آگ میں پھینکا جائے گا اور گرم ابلتا ہوا پانی ان پر ڈالا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد انہیں لوگوں کے بارے میں ہے:

وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (سورہ فرقان، آیت ۲۳)

ترجمہ: اور ہم بروز قیامت ان کے بجا لائے ہوئے اعمال کی طرف آئیں گے اور ان کو پراگندہ غبار کی طرح بنا دیں گے۔

تا آنکہ امامؑ نے فرمایا: اے ابراہیم! بتحقیق اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے آگاہ و عالم ہے، قدیم ہونا اسی کیلئے ثابت ہے۔ اس نے تمام اشیاء کو کتم عدم سے خلق فرمایا ہے کسی موجود مادہ اور چیز سے آغازِ خلق نہیں فرمایا:

مَنْ زَعَمَ اَنَّہٗ خَلَقَ الْاَشْیَاءَ مِنْ شَیْءٍ فَقَدْ کَفَرَ،

جو کوئی یہ نظریہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کی تخلیق کی ابتداء ایک دوسری قدیم شئے سے کی ہے تو وہ کفر کہتا ہے اور کافر ہے، پس جو حکماء اور فلسفی یہ کہتے ہیں کہ: اشیاء کی تخلیق ایک قدیم مادہ سے کی گئی ہے وہ کافر ہیں، کیونکہ خداوند عالم نے ایسے کسی قدیم مادہ سے تمام عالم کی اشیاء کو خلق کیا ہو تو وہ قدیم مادہ قدیم ہونے میں اللہ تعالیٰ کا شریک ہو جائے گا حالانکہ شریک کا ہونا باطل ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ بنابریں اللہ تعالیٰ نے کتم عدم سے کائنات کی تخلیق کی ابتداء کی ہے (پہلے کچھ نہ تھا، عدم محض تھا، فقط خداوند عالم تھا، اس نے اپنے قدرت و اختیار کے ساتھ عالم کی اشیاء کو خلق کرنے کا آغاز فرمایا) اس کے سوا کوئی دوسری شئے قدیم نہیں ہے۔

ان اشیاء میں سے ایک زمین خلق فرمائی پاکیزہ زمین، پھر اس پاکیزہ زمین میں سے ایک آب شیریں و صافی برآمد کیا اور اس پر اہل البیت علیہم السلام کی محبت و دوستی کو پیش کیا، اس نے قبول کیا تو اس پانی کو اس زمین پر جاری کر دیا۔ سات روز میں وہ پانی زمین کی ہر جگہ تک پہنچ گیا۔ پھر اس پانی کو اس زمین میں جذب کر دیا پھر اس زمین کے خلاصہ و نچوڑ کو آئمہ علیہم السلام کی طینت قرار دیا پھر اس کے ثقیل حصے کو لیا اور اس سے ہمارے شیعہ کو بنایا اگر اس انتخاب کا یہ فرق نہ ہوتا تو ہماری اور تمہاری طینت ایک ہی ہوتی۔

میں نے عرض کیا: پھر ہماری طینت کو کیا، کیا گیا؟

تو فرمایا: تجھے اطلاع دیتا ہوں، پھر فرمایا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک شوریلی زمین کو پیدا کیا جس میں بدبوتھی، وہ خبیث زمین تھی، پھر اس سے ایک شوریلا، نمکین اور تلخ پانی برآمد کیا اس پر ہماری ولایت و محبت کو پیش کیا اس نے قبول نہ کیا تو اس پانی کو اس شوریلی زمین پر جاری کیا سات روز میں یہ پانی اس ساری زمین تک پہنچ گیا اور اس میں جذب ہو گیا۔ پھر اس نے تمام طاغوتوں، سرکشوں اور ان کے تابعداروں کو خلق کیا پھر ان کی طینت کو تمہاری ثقیل طینت کے ساتھ مخلوط کر دیا۔ اگر ان کی طینت کو تمہاری طینت کے ثقیل حصے کے ساتھ آمیختہ نہ کرتا تو وہ لوگ نہ شہادتین کی گواہی دیتے، نماز پڑھتے، نہ روزہ رکھتے، نہ حج کرتے اور نہ امانتیں ادا کرتے اور نہ ہی تمہاری صورتوں سے ان کی صورتیں مشابہت رکھتیں اور کسی مومن کیلئے بدی نہیں اس میں کہ وہ اپنے دشمن کی صورت کو بھی اپنی صورت کی مثل دیکھتا ہے۔

تو عرض کیا: اے فرزند رسول! پھر دونوں قسم کی طینت کو کیا کیا؟

تو فرمایا کہ: ان دونوں کو باہم مخلوط کیا پھر دونوں میں رکھ کر ایک باب کو دوسرے باب پر خوب مارا کہ اچھی طرح دونوں مخلوط ہو گئیں پھر ان میں ایک مٹھی بھری اور فرمایا کہ یہ جنت کیلئے ہے اور پرواہ نہیں پھر دوسری مرتبہ مٹھی بھری اور فرمایا جہنم کیلئے ہے اور مجھے کوئی پرواہ نہیں پھر ان دونوں کو باہم مخلوط کر دیا اس طرح کہ مومن کی طینت کے اجزاء کافر کی طینت پر گرے اور اسی طرح برعکس ہوا۔ پس یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ہمارے شیعہ میں سے کچھ لوگ زنا، لواطت، ترکِ

نماز و روزہ اور دیگر گناہانِ کبیرہ اور واجبات کو ترک کرنے والے انجام دیتے ہیں تو یہ دراصل ناصبیوں کے آب وگل کے اثرات ہیں جو ان کی طینت میں مخلوط ہو گئے ہیں اور اسی طرح مخالفین میں بعض افراد جو نیک اعمال بجالاتے ہیں یہ مومن کے آب وگل کے اثرات ہیں جو ان کی طینت میں مل گئے ہیں

فَإِذَا عُرِضَتْ هٰذِهِ الْأَعْمَالُ كُلُّهَا عَلَى اللهِ الْعَزِيزِ الْمُتَعَالِ قَالَ اَنَا عَدْلٌ لَا اَجُورُ وَ مُنْصِفٌ لَا اَظْلِمُ وَ حَكَمٌ لَا اَحِيفُ وَلَا اَمِيلُ وَلَا اَشْطُطُ.

(جب سارے اعمال اس غالب اور بلند ترین ہستی اللہ تعالیٰ کی خدمت میں پیش کئے جائینگے تو وہ فرمائے گا میں عدالت والا ہوں میں جور نہیں کرتا، میں انصاف والا ہوں، ظلم نہیں کرتا، میں فیصلہ کرنے والا ہوں، نہ جانبداری کرتا ہوں، نہ خیانت کرتا ہوں اور نہ ہی ناحق کرتا ہوں) لہٰذا مومن کے اعمال بد کو ناصبی کی طینت کے ساتھ ملحق کر دو اور ناصبی نے جس قدر اعمال حسنہ کئے ہیں وہ سب مومن کی طینت کی اصل کے ساتھ ملا دو۔

اس کے بعد امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: اس آیت کریمہ کی تلاوت کرو!

مَعَاذَ اللهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ (سورۂ یوسف، آیت ۷۹)

ترجمہ: پناہ بخدا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جس کے ہاں ہم نے اپنا سامان پایا ہے اس کے علاوہ کسی اور کو گرفتار کر لیں ایسی صورت میں تو ہم یقیناً ظلم کرنے والے ہوں گے۔

یہ آیت بظاہر تو اسی مفہوم کو ادا کر رہی ہے جسے وہ سمجھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں باطن میں یہی صورت مراد ہے جو بعینہٖ اس گذشتہ کلام میں عرض کر دی گئی ہے (یعنی برادرانِ یوسف کے ہاں بظاہر بنیامین قصوروار قرار پائے کہ عزیز کا پیالہ اس کے سامان میں پایا گیا لیکن درحقیقت معاملہ یہ نہ تھا بلکہ پیالہ تو اہلکاروں نے خود سامان میں رکھ کر بنیامین کو وہاں روک رکھنے کا پروگرام بنایا تھا)۔ فرمایا کہ: قرآن مجید کا ظاہر ہوتا ہے تو باطن بھی ہے، اس کا محکم ہے تو متشابہ بھی، اس میں ناسخ آیات ہیں تو منسوخ بھی ہیں۔

حدیث تو کافی طویل ہے لیکن ہم نے اختصار کے مدنظر اس کا کچھ حصہ نقل کر دیا ہے۔

ان احادیث پر تحقیقی تبصرہ:

واضح باد کہ اس قسم کی روایات اگرچہ جبر و اضطرار ہونے کی طرف وہم ڈالتی ہیں اور متشابہات کی قبیل سے ہیں اور اثبات جبر اور نفی اختیار کرنے والوں کی خصوصی انظار کی محور بنی ہیں اور اسی لئے اس قسم کے مسائل میں غور وخوض کرنے سے عوام کیلئے منع بھی روایات میں وارد ہوتی ہے لیکن چونکہ ان کے خلاف پیدا ہونے والے شبہات کا ازالہ واجب کفائی ہے اسلئے ضروری ہے کہ ہم چند ایک اشکالات اور ان کے جوابات کو بیان کریں۔

اشکالات اور ان کے جوابات:

اول:..... مخفی نہ رہے کہ اربابِ انصاف کے نزدیک جبر کے قائل عامہ کیلئے مسئلہ طینت میں کوئی مستند اور حجت موجود نہیں ہے، کیونکہ اس بات میں زائد سے زائد یہی کچھ دکھائی دیتا ہے کہ طینت بنی نوع انسان کی حقیقت میں داخل ایسی شئے ہے جو ان کے نیک و بد افعال کیلئے ترجیح پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ اس سے وہ انسان مجبور ہو جاتا ہے۔ بنابریں طینت کا وجود مستلزم جبر نہیں ہوتا، اس کی وضاحت یوں ہے کہ اہل منطق کے ہاں یہ ایک مشہور قضیہ ہے کہ "ذاتیات کی کوئی علت نہیں ہوتی" پس اگر بدافراد کی طینت کے خمیر میں بدی داخل ہوتی ہے، اور نیک افراد کی طینت کے خمیر میں نیکی داخل ہوتی ہے، تو اسکی وجہ سے وہ لوگ یہ نہیں کہہ سکتے کہ تو نے ہماری طینت کو ایسا کیوں بنا دیا کہ شیطان و یزید کی حقیقت ایک خاص طینت اور خصوصی آب و گل سے مرکب ہے۔

کہ اگر یہ طینت ایسی نہ ہوتی تو شیطان شیطان نہ ہوتا اور یزید یزید نہ ہوتا، کیونکہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ممکن الوجود کیوں ممکن ہے اور واجب الوجود کیوں واجب ہے؟ پس اسی طرح یوں کہنا بھی درست نہیں کہ فلاں شخص کی طینت ایسی کیوں؟ اور دوسرے فلاں شخص کی طینت ویسی کیوں؟ کیونکہ خالق تدبیر کا کام ماہیت یا وجود کے تقرر کرنے والے فیض کا ایجاد کرنا ہے ذات کے ذات ہونے کو حل کرنا یا ذات کیلئے ذاتیات کا اثبات کرنا نہیں اور شاید کہ یہ امر اولیات میں ہے۔ بنابریں رب کائنات پر اس حوالے سے اعتراض کرنے کا کوئی جواز نہیں پس پروردگار غفار کی طرف جبر و اجبار کی نسبت ہونے کا وہم ڈالنے اس کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔

دوم:..... اور یہ خیال کہ اضطرار خالق کی طرف سے نہ ہو بلکہ خود مخلوقات کی ذوات کی جانب سے ہو یہ بھی مرفوع اور مسترد ہے، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ طینت کا اثر یہ ہو کہ طبیعت فعل یا ترک کیلئے، سبب یا موجب اور علت تامہ نہ بنتا ہو لیکن اگر یہ میلان آدمی کو حد الجاء اور جبر تک نہ لے جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں اور اس کی تائید پہلی روایت میں موجود امام علیہ السلام کے اس ارشاد سے ہوتی ہے:

ولذالك رغب قلوب الكفار..... الى آخره.

پس اس اختیار کا سلب ہونا لازم نہیں آتا، جو اصل تکلیف کا مدار اور ثواب برائے مطیعان وعذاب برائے عاصیان کا معیار ہے (کہ اگر اختیار ثابت نہ ہو تو پھر احکام الٰہی کا مکلف بنایا جانا اور پھر اطاعت گذار کو جنت دینا اور معصیت کار کو عذاب دینا صحیح ہی نہیں ہو سکتا) اور یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ بے اختیار کو مکلف بنائے جبکہ حق تعالیٰ نے خود فرمایا ہے حدیث قدسی ہے۔

أنا الله عدل لا أجور، و منصف لا أظلم،

لہٰذا وہ کسی مضطر و مجبور کو عذاب دے یہ کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ یہ واضح ظلم ہے بلکہ اللہ تعالیٰ تو وہ کریم اور عادل ذات ہے کہ اگر نفس کسی برائی کی طرف میلان اور خواہش کرے جیسا کہ آیت کریمہ:

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ۔ (سورۂ یوسف، آیت ۵۳)

ترجمہ: بے شک نفس تو برائی کا بہت زیادہ حکم دیتا ہے سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم کرے۔

اس سے روشن ہورہا ہے پس اللہ تعالیٰ کسی نفس کو فقط بدی کی خواہش کرنے پر عذاب نہیں دیتا کہ یہی اس کے عدل و انصاف کا تقاضہ ہے اور اسی طرح اگر کوئی حرام کام کا فقط ارادہ کرے کہ جو اس کے اختیار میں ہے تو اللہ تعالیٰ اس وقت تک مواخذہ نہیں کرتا جب تک وہ اپنے سوء اختیار کے تحت ان برے افعال کو انجام نہ دے۔

نیکی کے ارادہ پر ثواب، لیکن برائی کے ارادے پر سزا نہیں:

(۱) کافی (ج ۴، ص ۲۲۳) میں ابوبصیر سے روایت ہے اس نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے، فرمایا:

اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيَهُمُّ بِالْحَسَنَةِ وَلَا يَعْمَلُ بِهَا، فَتُكْتَبُ لَهٗ حَسَنَةٌ، وَاِنْ هُوَ عَمِلَهَا، كُتِبَتْ لَهٗ عَشْرُ حَسَنَاتٍ، وَاِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيَهُمُّ بِالسَّيِّئَةِ اَنْ يَعْمَلَهَا، فَلَا يَعْمَلُهَا، فَلَا تُكْتَبُ عَلَيْهِ۔

بے شک جب کوئی مومن نیکی کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا تو بھی اس کیلئے ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اگر وہ اس نیکی پر عمل کر دے تو اس کیلئے دس نیکیاں لکھ لی جاتی ہیں اور مومن اگر برائی کرنے کا ارادہ کرے تو اس کی برائی نہیں لکھی جاتی (یعنی عمل کرنے پر برائی قرار پاتی ہے، فقط ارادہ کرنے سے نہیں)۔

اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا (سورۂ انعام، آیت ۱۶۰)

ترجمہ: جو کوئی نیکی کرتا ہے اس کو اس نیکی کے دس گنا ملتا ہے اور جو کوئی برائی کرتا ہے اس کو اس کی مثل ایک برائی کی سزا ملتی ہے۔

(۲) نیز کتاب کافی میں فضیل بن عثمان سے مروی ہے کہ بندہ جب عمل خیر کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کرتا نہیں مگر حق تعالیٰ اس کیلئے نیکی لکھ لیتا ہے اور اگر اس نیکی پر عمل کر دیتا ہے تو اس کیلئے دس نیکیاں لکھتا ہے اور اگر کوئی برائی کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اگر اس پر عمل نہیں کرتا تو اس کیلئے کچھ نہیں لکھتا اور اگر وہ اس برائی پر عمل کر دیتا ہے تو اسے سات گھنٹے مہلت دی جاتی ہے اور حسنات کا کاتب، سیئات کے کاتب کو فرماتا ہے: جلدی نہ کرو شاید یہ ایسا کوئی عمل خیر کرے جو اس کے گناہ کے محو ہونے کا باعث بن جائے۔

فَإِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ: إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں یا یہ معافی مانگ لے اور اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے۔

پس اگر کوئی شخص کہے:۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ وَ اَتُوْبُ اِلَيْهِ.

ترجمہ: میں اس اللہ سے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں جس کے بغیر کوئی لائق عبادت نہیں فقط وہی اکیلا لائق عبادت ہے وہی غیب وشہادت (حاضر) کا عالم ہے۔ وہ غالب، حکمت والا، بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے، وہ جلالت وعزت والا ہے اور میں اس کی طرف توبہ کرتا ہوں۔

تو اللہ تعالیٰ اس کیلئے گناہ نہیں لکھتا اور اگر سات گھنٹے گذر جائیں اور یہ شخص نہ کوئی عمل خیر کرے اور نہ ہی استغفار کرے تو صاحب حسنات، صاحب سیئات کو فرماتا ہے:

اُكْتُبْ عَلَى الشَّقِيِّ الْمَحْرُوْمِ.

اب اس بدبخت اور محروم شخص کا گناہ لکھ لو۔

پس وہ خداوند عالم جو فقط طبعی میلان اور گناہ کے قصد وعزم پر مواخذہ نہیں کرتا اس ذات کریم کی طرف سے جبر و اکراہ اور ظلم کے روا ہونے کا احتمال کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔

یا اگر یہ میلان بنی آدم کی طینت میں خداوند عالم کی طرف سے بنی آدم کی آزمائش کی خاطر داخل کر دیا گیا ہو تو بھی یہ جبر کے لازم ہونے کا باعث نہیں ہوسکتا، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے بنی آدم کو قدرت و اختیار اور عقل وفہم کی نعمت سے نوازا ہے، کہ اگر وہ ان تقاضوں پر عمل کرے تو اپنی خواہشات نفس سے خود کو نجات دے سکتا ہے۔

فاذا أطاع الله بكسر شهواته إستحق أرفع درجات المطيعين.

کہ جب کبھی کوئی شخص اپنی خواہشات کو توڑ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ مطیع لوگوں کے درجات میں سے بلند ترین درجات کا مستحق بن جاتا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ نفس کے خلاف جہاد کرنے کو جہاد اکبر کا نام دیا گیا ہے۔

مطیع انسان فرشتوں سے افضل ہے:

اور یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان میں سے جو انسان مطیع بنتے ہیں وہ فرشتوں پر ترجیح پا لیتے ہیں، کیونکہ ملائکہ کی طبیعت میں اعمال بد کی خواہش پیدا نہیں کی گئی بخلاف انسان کے کہ اس کی خلقت میں شہوات اور غضب کی قوتیں پیدا

کی گئی ہیں، پس اگر کوئی اس کے باجود نفس کی خواہشات اور شہوانی قویٰ کے خلاف جہاد کرنے اور ان کو شکست دے دے تو یہ انسان ملائکہ سے افضل اور بالاتر ہو جاتا ہے پس یہ سب کچھ اس انسان کے حق میں اصلح (زیادہ مناسب) ہے، یہ ظلم و قبیح نہیں۔

علل الشرائع میں ایک روایت بڑے شافی بیان کے ساتھ موجود ہے جس کے ذریعہ حضور اکرمؐ کی طرف سے ایک توجیہ مشہور ہوئی ہے وہ یہ کہ مخالفین کی اطاعتوں اور نیکیوں کا اجر، حق کے حامیان کو دے دینا عدل نہیں۔

اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۸۲)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ کبھی بھی اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

خلاصۃ المرام:

تمام ادلہ قطعیہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ رب کریم عدل و داد کرے گا، اور یہ کہ تمام مشابہ اور موہم آیات اور روایات کی تاویل ضروری ہے جیسا کہ ان روایات کی تاویل لازم ہے جو اللہ تعالیٰ کیلئے تشبیہ یا تجسیم پر دلالت کرتی ہے (یعنی ان کے ظاہری مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا مثل والا ہونا اور جسم والا ہونا ثابت ہوتا ہے) اور یہ جائز نہیں کہ متشابہات کی طرف معمولی التفات ہوتے ہی ان کو تسلیم کرلیا جائے حالانکہ یہ کلام امتحان ہے جذبات، اوہام کے برانگیخت ہونے کا باعث ہے ان کو عدل کی مرصوص عمارت میں رخنہ ڈالنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور اللہ تعالیٰ کا عادل ہونا اپنی پوری طاقت وقوت کے ساتھ صحیح اور درست ہے۔

وَ اللّٰهُ الْمُوَفِّقُ لِعَمَلِ الْخَيْرِ وَ الثَّوَابَ

وَ الْهَادِيْ اِلٰى سُبُلِ الصَّوَابِ،

اللہ تعالیٰ خیر وثواب کے اعمال بجالانے پر توفیق دینے والا ہے

اور وہی صحیح اور درست راستوں کی طرف ہدایت فرمانے والا ہے۔

تَمَّ هٰذَا الْبَابُ بِعَوْنِ الْمَلِكِ الْوَهَّابِ.

یہ باب عدل اس بخشنے والے بادشاہ کی مدد کے ساتھ مکمل ہوا۔

حدیقہ سلطانیہ کے باب العدل کا اردو ترجمہ اتوار کی رات
ایک بجکر پینتیس منٹ پر اختتام پذیر ہوا جب کہ میں سید مرید ہاشم نقوی
کے گھر واقع بھکر شہر گڈ ولہ روڈ میں صفر المظفر ۱۴۲۶ھ کے پہلے
عشرہ کی مجالس عزاء قصر زینب سلام اللہ علیہا میں پڑھنے کیلئے قیام
پذیر ہوں اور اس سلسلے کی آخری مجلس سے فارغ ہو کر آیا ہوں اور
ترجمہ کی آخری سطور رقم کی ہیں۔ رب العزت قبول فرمائے، ذخیرۂ
آخرت قرار دے اور بقیہ کتاب کے ترجمہ کو مکمل کرنے کی
توفیق بخشے، بحق معصومین علیہم السلام۔ آمین۔

الحقیر
السید محمد تقی النقوی
ابن العلامہ المرحوم المغفور السید گلاب علی شاہ النقوی اعلی اللہ مقامہ
مدیر الجامعہ العربیۃ مخزن العلوم الجعفریہ،
شیعہ میانی ملتان، پاکستان۔
بمطابق ۲۰ مارچ ۲۰۰۵ء

جلد شائع ہو رہی ہے

قرآن فہمی کیلئے عظیم الشان پیش کش

مواہب الرحمٰن (جلد اول)

فی تفسیر القرآن

فقیہ عالی مقام، مفسر قرآن

آیۃ اللہ العظمیٰ السید عبد الاعلیٰ الموسوی السبزواری (قدس سرہ)

نجف اشرف، عراق

ترجمہ:

سید العلماء، رئیس الواعظین، محسن ملت

علامہ سید محمد تقی نقوی (حفظہ اللہ تعالیٰ)

جامعہ عربیہ مخزن العلوم الجعفریہ
شیعہ میانی ملتان